جاوید احمد غامدی

البیان

الفاتحة - المائدة

۱—۵

۱

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نئی اشاعت
نظر ثانی کے بعد

ناشر: المورد
طابع: ٹو پیکل پرنٹنگ پریس، لاہور
طبع اول: جولائی 2018ء
کتابت: محمد یوسف نگینہ
قیمت:
ISBN: 978-969-8799-92-2

Address: Post Box 5185, Lahore Pakistan.
Website: www.al-mawrid.org
Email : info@al-mawrid.org, almawrid@brain.net.pk

فہرست

۱- الفاتحة ۱۸
۲- البقرة ۲۶
۳- آل عمران ۳۱۵
۴- النساء ۴۴۳
۵- المائدة ۵۸۷

بسم الله الرحمن الرحيم

دیباچہ

یہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہے۔ آں سوے افلاک کے اِس شہ پارۂ ادب کا حسن بیان تو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ میں نے، البتہ اِس ترجمے میں یہ کوشش کی ہے کہ اِس کا مدعا نظم کلام کی رعایت سے اردو زبان میں منتقل کر دوں۔ تراجم کی تاریخ میں یہ اِس لحاظ سے پہلا ترجمۂ قرآن ہے کہ اِس میں قرآن کا نظم اُس کے ترجمے ہی سے واضح ہو جاتا ہے۔ اِس کے لیے مزید کسی شرح و وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی۔

ترجمے کے حواشی زیادہ تر استاذ امام امین احسن اصلاحی کی تفسیر ‘‘تدبر قرآن’’ کا خلاصہ ہیں۔ میرا نقطۂ نظر جن مقامات پر اُن سے مختلف ہے، وہ بھی کم نہیں ہیں۔ اہل نظر تقابلی مطالعے سے اُنھیں خود متعین کر سکتے ہیں۔ ترجمہ و تفسیر کی کتابوں میں ہر جگہ اِس کا اظہار ممکن نہیں ہوتا۔

مجھے امید ہے کہ نظم کلام کے ساتھ قرآن کے اسلوب بیان کا جلال و جمال بھی ارباب ذوق اِس ترجمے میں کسی حد تک جلوہ فرما دیکھ سکیں گے:

قدر مجموعۂ گل مرغ سحر داند و بس
نہ کہ ہر کو ورقی خواند معانی دانست

المورد، لاہور ——— جاوید
۱۰؍ اپریل ۲۰۰۷ء

مقدمہ

اپنے مضمون کے لحاظ سے قرآن ایک رسول کی سرگذشت انذار ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق معلوم ہے کہ آپ نبوت کے ساتھ رسالت کے منصب پر بھی فائز تھے۔ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو خلق کی ہدایت کے لیے مبعوث فرماتے ہیں اور اپنی طرف سے وحی والہام کے ذریعے سے اُن کی رہنمائی کرتے ہیں، اُنھیں نبی کہا جاتا ہے، لیکن ہر نبی کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ رسول بھی ہو۔ رسالت ایک خاص منصب ہے جو نبیوں میں سے چند ہی کو حاصل ہوا ہے۔ قرآن میں اِس کی تفصیلات کے مطابق رسول اپنے مخاطبین کے لیے خدا کی عدالت بن کر آتا ہے اور اُن کا فیصلہ کر کے دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ رسولوں کی دعوت میں یہ فیصلہ انذار، انذار عام، اتمام حجت اور ہجرت و براءت کے مراحل سے گزر کر صادر ہوتا اور اِس طرح صادر ہوتا ہے کہ آسمان کی عدالت زمین پر قائم ہوتی، خدا کی دینونت* کا ظہور ہوتا اور رسول کے مخاطبین کے لیے ایک قیامت صغریٰ برپا ہو جاتی ہے۔ اِس دعوت کی جو تاریخ قرآن میں بیان ہوئی ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس موقع پر بالعموم دو ہی صورتیں پیش آتی ہیں: ایک یہ کہ پیغمبر کے ساتھی بھی تعداد میں کم ہوتے ہیں اور اُسے کوئی دارالہجرت بھی میسر نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ وہ معتد بہ تعداد میں اپنے ساتھیوں کو لے کر نکلتا ہے اور اُس کے نکلنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کسی سرزمین میں اُس کے لیے آزادی اور تمکن کے ساتھ رہنے بسنے کا سامان کر دیتا ہے۔ اِن دونوں ہی صورتوں میں رسولوں سے متعلق خدا کی وہ سنت لازماً روبہ عمل ہو جاتی ہے جو قرآن میں اِس طرح بیان ہوئی ہے:

---

* یعنی قضا اور جزا و سزا۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ، فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ
قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ.
(یونس ۱۰: ۴۷)

”ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر
جب اُن کا رسول آجاتا ہے تو اُن کے
درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا
ہے اور اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا۔“

پہلی صورت میں رسول کے قوم کو چھوڑ دینے کے بعد، عام اِس سے کہ وہ اُس کی وفات کی صورت میں ہو یا ہجرت کی صورت میں، یہ فیصلہ اِس طرح صادر ہوتا ہے کہ آسمان کی فوجیں نازل ہوتیں، ساف و حاصب کا طوفان اٹھتا اور ابر و باد کے لشکر قوم پر اِس طرح حملہ آور ہو جاتے ہیں کہ رسول کے مخالفین میں سے کوئی بھی زمین پر باقی نہیں رہتا۔ تاہم یہ معاملہ اُنھی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جن کے لیے قرآن اپنی اصطلاح میں 'مُشْرِكِيْن' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو اصلاً توحید ہی سے وابستہ ہوتے ہیں، اُن کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہوتا۔ اُن کے بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ اُن کے استیصال کے بجائے اُن پر ذلت اور محکومی کا عذاب مسلط کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ معلوم ہے کہ بنی اسرائیل کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا اور قوم نوح، قوم ہود، قوم صالح، قوم لوط، قوم شعیب اور اِس طرح کی بعض دوسری قومیں اِس کے برخلاف زمین سے مٹا دی گئیں۔*

دوسری صورت کے لیے بھی یہی قانون ہے، لیکن اُس میں عذاب کا یہ فیصلہ رسول اور اُس کے ساتھیوں کی تلواروں کے ذریعے سے نافذ کیا جاتا ہے۔ اِس صورت میں قوم کو مزید کچھ مہلت مل جاتی ہے۔ رسول اِس عرصے میں دار الہجرت کے مخاطبین پر اتمام حجت بھی کرتا ہے، اپنے اوپر ایمان لانے والوں کی تربیت اور تطہیر و تزکیہ کے بعد اُنھیں اِس معرکۂ حق و باطل کے لیے منظّم بھی کرتا ہے اور دار الہجرت میں اپنا اقتدار بھی اِس قدر مستحکم کر لیتا ہے کہ اُس کی مدد سے وہ منکرین کے استیصال اور اہل حق کی سرفرازی کا یہ معرکہ سر کر سکے۔

---

* یہ وہی ضابطہ ہے جو قیامت میں اختیار کیا جائے گا۔ چنانچہ سورۂ نساء (۴) کی آیت ۴۸ میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ وہاں بھی شرک کو معاف نہیں کرے گا۔ اِس کے نیچے، البتہ جس کے لیے جو گناہ چاہے گا، معاف فرما دے گا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں یہی دوسری صورت پیدا ہوئی۔ چنانچہ آپ کی طرف سے انذار، انذار عام، اتمام حجت، ہجرت و براءت اور اپنے مخاطبین کے لیے جزا و سزا کی یہ سرگذشت ہی قرآن کا موضوع ہے۔ اِس کی ہر سورہ اِسی پس منظر میں نازل ہوئی ہے اور اِس کے تمام ابواب اِسی لحاظ سے مرتب کیے گئے ہیں۔

اِس ترتیب کی نوعیت بالاجمال یہ ہے کہ قرآن کی تمام سورتیں آپس میں توام بنا کر اور سات ابواب کی صورت میں جمع کی گئی ہیں، یعنی ہر سورہ مضمون کے لحاظ سے اپنا ایک جوڑا اور مثنیٰ رکھتی ہے اور دونوں میں اُسی طرح کی مناسبت ہے، جس طرح کی مناسبت زوجین میں ہوتی ہے۔ اِس سے مستثنیٰ چند سورتیں ہیں جن میں سے فاتحہ پورے قرآن کے لیے بمنزلۂ دیباچہ اور باقی تتمہ و تکملہ یا خاتمۂ باب کے طور پر آئی ہیں۔ پھر سات مجموعوں کی صورت میں جنھیں ہم نے ابواب سے تعبیر کیا ہے، یہ سورتیں قرآن میں مرتب کر دی گئی ہیں۔ قرآن سے متعلق یہ حقیقت سورۂ حجر میں اِس طرح بیان ہوئی ہے:

وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ۔ (۱۵:۸۷)

”ہم نے، (اے پیغمبر)، تم کو سات مثانی*، یعنی قرآن عظیم عطا کر دیا ہے۔“

قرآن کے اِن ساتوں ابواب میں سے ہر باب ایک یا ایک سے زیادہ مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور ایک یا ایک سے زیادہ مدنی سورتوں پر ختم ہو جاتا ہے۔

پہلا باب فاتحہ سے شروع ہوتا اور مائدہ پر ختم ہوتا ہے۔ اِس میں فاتحہ مکی اور باقی چار مدنی ہیں۔

دوسرا باب انعام اور اعراف، دو مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور دو مدنی سورتوں، انفال اور توبہ پر ختم ہوتا ہے۔

تیسرے باب میں یونس سے مومنون تک پہلے چودہ سورتیں مکی ہیں اور آخر میں ایک سورۂ نور ہے جو مدنی ہے۔

---

* ’مَثَانِی‘ ’مَثْنٰی‘ کی جمع ہے اور اِس کے معنی ہیں وہ چیز جو دو دو کر کے ہو۔

چوتھا باب فرقان سے شروع ہوتا ہے، احزاب پر ختم ہوتا ہے۔ اِس میں پہلی آٹھ سورتیں مکی اور آخر میں ایک، یعنی احزاب مدنی ہے۔

پانچواں باب سبا سے شروع ہوتا ہے، حجرات پر ختم ہوتا ہے۔ اِس میں تیرہ سورتیں مکی اور آخر میں تین مدنی ہیں۔

چھٹا باب ق سے شروع ہو کر تحریم پر ختم ہوتا ہے۔ اِس میں سات مکی اور اِس کے بعد دس مدنی ہیں۔

ساتواں باب ملک سے شروع ہو کر ناس پر ختم ہوتا ہے۔ اِس میں آخری دو، یعنی معوذتین مدنی اور باقی سب مکی ہیں۔

اِن میں سے ہر باب کا ایک موضوع ہے۔

پہلے باب کا موضوع یہود و نصاریٰ پر اتمام حجت، اُن کی جگہ ایک نئی امت کی تاسیس، اُس کا تزکیہ و تطہیر اور اُس کے ساتھ خدا کا آخری عہد و پیمان ہے۔

دوسرے باب میں مشرکین عرب پر اتمام حجت، مسلمانوں کے تزکیہ و تطہیر اور خدا کی آخری دینونت کا بیان ہے۔

تیسرے، چوتھے، پانچویں اور چھٹے باب کا موضوع ایک ہی ہے اور وہ انذار و بشارت اور تزکیہ و تطہیر ہے۔

ساتویں اور آخری باب کا موضوع قریش کے سرداروں کو انذار قیامت، اُن پر اتمام حجت، اِس کے نتیجے میں اُنھیں عذاب کی وعید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سر زمین عرب میں غلبۂ حق کی بشارت ہے۔ اِسے ہم مختصر طریقے پر محض انذار و بشارت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

اِن میں سے پہلے باب کو الگ کر لیجیے تو قرآن میں اِن کی ترتیب خاتمہ سے ابتدا کی طرف ہے۔ چنانچہ ساتواں باب انذار و بشارت ہی پر مکمل ہو جاتا ہے۔ اِس کے بعد چھٹے، پانچویں، چوتھے اور تیسرے باب میں انذار و بشارت کے ساتھ تزکیہ و تطہیر کا مضمون بھی شامل ہو گیا ہے۔ پھر دوسرا اور

اِس سلسلے کا آخری باب ہے جس میں پیغمبر کا انذار اپنے منتہا کو پہنچتا ہے۔ لہٰذا اتمام حجت اور تزکیہ و تطہیر کے ساتھ اُس میں مخاطبین کے لیے آسمان کی عدالت کا وہ فیصلہ بھی سامنے آجاتا ہے جسے ہم قیامت سے پہلے خدا کی آخری دینونت سے تعبیر کرتے ہیں۔

پہلا باب اِس لحاظ سے بالکل الگ ہے کہ مشرکین عرب کے بجاے وہ یہود و نصاریٰ کے لیے خاص ہے، لیکن قرآن کی ابتدا سے دیکھیے تو یہ بھی اتمام حجت اور تزکیہ و تطہیر کے بعد سورۂ توبہ میں دینونت کے مضمون سے بالکل اُسی طرح مربوط ہوتا ہے، جس طرح اوپر کے ابواب، اگر خاتمے سے ابتدا کی طرف آئیے تو ترتیب صعودی سے مربوط ہوئے ہیں۔ لہٰذا دوسرا باب گویا ایک ذروۂ سنام ہے جہاں دونوں طرف سے ایک ہی مضمون محض اِس فرق کے ساتھ کہ مخاطبین تبدیل ہو گئے ہیں، اپنے نقطۂ کمال تک پہنچتا اور ختم ہو جاتا ہے۔

اِس سے واضح ہے کہ دوسرے باب سے آگے ترتیب نزولی کا طریقہ پہلے باب کے لیے ربط کی اِسی ضرورت کے پیش نظر اختیار کیا گیا ہے۔

پہلا باب اِس ترتیب میں مقدم اِس لیے ہوا ہے کہ حاملین قرآن اب اولاً اِسی کے مخاطب ہیں۔ انذار و بشارت اور اتمام حجت کا مضمون، پہلے باب کو چھوڑ کر بالعموم مکیات اور تزکیہ و تطہیر کا مضمون مدنیات میں بیان ہوتا ہے، لیکن یہ دونوں بھی ہر باب میں اِس طرح ہم رنگ اور ہم آہنگ ہیں گویا جڑ سے تنا اور تنے سے شاخیں پھوٹ رہی ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے نتیجے میں خدا کی جو عدالت سرزمین عرب میں قائم ہوئی، اُس کی روداد اِس حسن ترتیب کے ساتھ اِس کتاب میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دی گئی ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھیے تو قرآن مذہب کا یہ بنیادی مقدمہ بالکل آخری درجے میں ثابت کر دیتا ہے کہ خدا کی عدالت پورے عالم کے لیے بھی ایک دن اِسی طرح قائم ہو کر رہے گی۔

باب اول

الفاتحة ـ المائدة

یہود و نصاریٰ پر اتمام حجت
اُن کی جگہ ذریت ابراہیم ہی کی ایک دوسری شاخ،
بنی اسمٰعیل میں سے امت مسلمہ کی تاسیس
اُس کا تزکیہ و تطہیر
اور اُس کے ساتھ خدا کے آخری
عہد و پیمان کا بیان

باب اول

الفاتحة ۔ المائدة

۱ ـــــ ۵

یہ قرآن مجید کا پہلا باب ہے۔ اِس میں ’الفاتحة‘ سے ’المائدة‘ تک پانچ سورتیں ہیں۔ اِن سورتوں کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن میں سے پہلی سورہ ـــــ ’الفاتحة‘ ـــــ ام القریٰ مکہ میں اور باقی چار سورتیں ـــــ ’البقرة‘، ’آل عمران‘، ’النساء‘، ’المائدة‘ ـــــ ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی ہیں۔

قرآن مجید کے دوسرے سب ابواب کی طرح یہ چیز اِس باب میں بھی ملحوظ ہے کہ یہ ایک مکی سورہ سے شروع ہوتا اور مدنیات پر ختم ہو جاتا ہے۔ مضمون کے لحاظ سے اِن کا باہمی تعلق دعا اور جواب دعا کا بھی ہے اور اجمال اور تفصیل کا بھی۔ سورۂ فاتحہ میں ہم بالاجمال جن سلبی اور ایجابی حوالوں سے دعا کرتے ہیں، اِس کے بعد کی مدنیات میں اُنھی کی تفصیل کی گئی ہے۔

اِس میں خطاب اگرچہ، ضمناً نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہوا ہے اور مدینہ کے مشرکین سے بھی، لیکن اصل مخاطب اگر غور کیجیے تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ذریت ہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عالمی سطح پر اتمام حجت کے لیے اُسی طرح منتخب کیا، جس طرح وہ بنی آدم میں سے بعض ہستیوں کو نبوت و رسالت کے لیے منتخب کرتا ہے۔

اِس کا موضوع ، یہود و نصاریٰ پر اتمام حجت ، اُن کی جگہ ذریت ابراہیم ہی کی ایک دوسری شاخ ، بنی اسمٰعیل میں سے امت مسلمہ کی تاسیس ، اُس کا تزکیہ و تطہیر اور اُس کے ساتھ خدا کے آخری عہد و پیمان کا بیان ہے۔

یہ موضوع اِس باب میں اِس حسن ترتیب کے ساتھ ابتدا سے انتہا تک پہنچتا ہے کہ تورات و انجیل کے بعد ایک نئی ہدایت کی ضرورت اور اِس ہدایت کے مطابق امت مسلمہ کی تاسیس سے لے کر اِس امت کے لیے تکمیل دین اور اتمام نعمت تک کے سب مراحل بالکل نمایاں ہو کر سامنے آ جاتے ہیں۔

اِس ترتیب کو سمجھنے کے لیے اِس کے مباحث کا خلاصہ ہم ذیل میں بیان کیے دیتے ہیں:

الفاتحة: نئی ہدایت کی دعا۔

البقرة: اِس ہدایت کے بارے میں یہود کا رویہ ، اُن پر اتمام حجت اور اُن کی جگہ ذریت ابراہیم کی ایک دوسری شاخ ، بنی اسمٰعیل میں سے امت مسلمہ کی تاسیس اور اُس کے فرائض کا بیان۔

آل عمران: یہود و نصاریٰ پر اتمام حجت اور امت مسلمہ کا تزکیہ و تطہیر۔

النساء: امت کے لیے صالح معاشرت کی اساسات اور اُس کا تزکیہ و تطہیر۔

المائدة: امت پر اتمام نعمت اور اُس کے ساتھ اللہ پروردگار عالم کا آخری عہد و پیمان۔

الفاتحة

١

الفاتحة

اپنے مضمون کے لحاظ سے یہ سورہ پروردگار عالم کے حضور میں اُس سیدھی راہ کے لیے ہدایت کی دعا ہے جو زمانۂ بعثت نبوی میں ہر سلیم الفطرت انسان کی تمنا تھی۔ یہود و نصاریٰ نے اپنے انحرافات اور ضلالتوں سے دین کا چہرہ جس بری طرح بگاڑ دیا تھا، اُس کے بعد اِس راہ کی ہدایت گویا ہر دل کی صدا تھی جسے اللہ تعالیٰ نے اِس سورہ کے بے مثل اور لافانی الفاظ میں اپنے پیغمبر کی زبان پر جاری فرمایا ہے۔

تورات و انجیل کے بعد آں سوے افلاک سے ایک نئی ہدایت کی دعا ـــــ یہی اِس سورہ کا مرکزی مضمون ہے۔ چنانچہ قرآن کے اِس پہلے باب کی مدنیات کے ساتھ اِس کا تعلق تو جیسا کہ باب کے تعارف میں بیان ہوا، اجمال اور تفصیل ہی کا ہے، لیکن اپنے اِس مضمون کی رعایت سے یہ نہایت موزوں دیباچۂ قرآن بھی ہے۔

اِس لحاظ سے دیکھیے تو صاف واضح ہوتا ہے کہ یہ قرآن کی پہلی سورہ ہے جو ام القریٰ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آپ پر نازل ہوئی ہے۔

سورة الفاتحة

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۙ﴿۱﴾ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۙ﴿۲﴾

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے[1]۔

شکر[2] اللہ[3] ہی کے لیے ہے، عالم کا پروردگار[4]، سراسر رحمت، جس کی شفقت ابدی

---

[1] یہ آیت سورۂ توبہ کے سوا قرآن مجید کی ہر سورہ کے شروع میں بالکل اُسی طرح آئی ہے، جس طرح یہاں ہے۔ لہٰذا یہ قرآن کی ایک آیت تو یقیناً ہے اور اِس کی سورتوں کے شروع میں اِسی طرح نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے لکھی گئی ہے، لیکن اپنے اِس محل میں سورۂ فاتحہ سمیت کسی سورہ کی بھی آیت نہیں ہے، بلکہ ہر جگہ سورہ سے الگ اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ 'إقرأه علی الناس' کا مفہوم اِس میں عربیت کی رو سے مقدر ہے، یعنی اللہ، رحمٰن و رحیم کے نام سے یہ قرآن لوگوں کو پڑھ کر سناؤ، اے پیغمبر ـــــ چنانچہ اِس لحاظ سے دیکھیے تو اِس میں 'ب' گویا سند کے مفہوم میں ہے اور یہ قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق تورات کی اُس پیشین گوئی کا ظہور ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ آپ خدا کا کلام خود اُسی کے نام سے لوگوں کے سامنے پیش کریں گے۔ استثنا میں ہے:

> ''میں اُن کے لیے، اُنھی کے بھائیوں میں سے، تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا، وہی وہ اُن سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری اُن باتوں کو، جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سنے تو میں اُن کا حساب اُس سے لے لوں گا۔''
>
> (۱۸:۱۸-۱۹)

[2] اصل میں لفظ 'اَلْحَمْدُ' استعمال ہوا ہے۔ عربی زبان میں یہ کسی کی خوبیوں اور کمالات کے

مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ ؕ‏ ﴿۳﴾

ہے[۵]، جو روزِ جزا کا مالک ہے[۶]۔ ۱-۳

اعتراف کے لیے بولا جاتا ہے۔ پھر اِن خوبیوں اور کمالات کا فیض اگر حمد کرنے والے کو بھی پہنچ رہا ہو تو اِس میں شکر کا مفہوم آپ سے آپ شامل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سورۂ اعراف (۷) آیت ۴۳، سورۂ یونس (۱۰) آیت ۱۰ اور سورۂ ابراہیم (۱۴) آیت ۳۹ میں اِس کے نظائر سے واضح ہوتا ہے کہ 'اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ' کی ترکیب میں یہ بالعموم اُسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے جسے ہم لفظ شکر سے ادا کرتے ہیں۔ اِس سورہ میں، اگر غور کیجیے تو یہ اُس جذبۂ شکر و سپاس کی تعبیر ہے جو اللہ تعالیٰ کی عالم گیر ربوبیت اور بے پایاں رحمت کے مشاہدے اور قیامت میں اُس کی ہمہ گیر دینونت کے بارے میں انبیا علیہم السلام کی تذکیر سے پیدا ہوتا ہے یا پیدا ہونا چاہیے۔

[۳] اللہ کا نام لفظ 'اله' پر الف لام داخل کر کے بنا ہے۔ نزول قرآن سے پہلے عرب جاہلیت میں بھی یہ نام اُسی پروردگار کے لیے خاص تھا جو زمین و آسمان اور اُن کے مابین تمام مخلوقات کا خالق ہے۔ اہل عرب مشرک ہونے کے باوجود اپنے دیوی دیوتاؤں میں سے کسی کو بھی اُس کے برابر قرار نہیں دیتے تھے۔

[۴] اصل میں 'رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ رب کے معنی اصلاً پالنے والے کے ہیں۔ پھر اِس مفہوم کے لازمی نتیجے کے طور پر مالک اور آقا کے معنی اِس لفظ میں پیدا ہوئے اور اردو کے لفظ پروردگار کی طرح اِس پر ایسا غلبہ حاصل کر لیا کہ پرورش کرنے والے کے معنی میں اِس کا استعمال عربی زبان میں باقی نہیں رہا۔ سورہ کی ابتدا جس جذبۂ شکر کی تعبیر سے ہوئی ہے، یہ 'رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ' اور اِس کے بعد کی صفات اُس کی دلیل ہیں جو استدلال کے طریقے پر نہیں، بلکہ ایک بدیہی حقیقت کے اعتراف و اقرار کے اسلوب میں بیان ہوئی ہیں۔ یعنی شکر اُس اللہ کے لیے ہے جو پوری کائنات کا مالک ہے۔ ہم اُس کی مخلوق ہیں۔ چنانچہ وہی ہمارا بھی مالک ہے۔ ہم دنیا میں قدم نہیں رکھتے کہ ہماری پرورش، نگہداشت اور تربیت کا پورا سامان اُس مالک کی طرف سے بالکل تیار

موجود ہوتا ہے۔ پھر جب تک ہم زندہ رہتے ہیں، صبح و شام اِس حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ سورج، چاند، ابر و ہوا، غرض یہ کہ کائنات کے سب چھوٹے بڑے عناصر ہماری ہی خدمت کے لیے سرگرم عمل ہیں اور اِس لیے سرگرم عمل ہیں کہ اُن کی باگ ایک ایسی ہستی کے ہاتھ میں ہے جو اُن کے دائرۂ عمل اور اُن کی غایت اور مقصود سے اُنھیں سر مو انحراف کی اجازت نہیں دیتی۔ 'رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ' یہاں اِسی حقیقت کی تعبیر ہے۔

۵ اصل میں 'رَحْمٰن' اور 'رَحِیْم' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ دونوں اگرچہ رحمت ہی سے صفت کے صیغے ہیں، لیکن معنی کے لحاظ سے دیکھیے تو اِن میں واضح فرق ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں اِس فرق کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اسم 'رحمٰن'، 'غضبان' اور 'سکران' کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے، اور اسم 'رحیم'، 'علیم' اور 'کریم' کے وزن پر صفت کا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ 'رحیم' کے مقابل میں 'رحمٰن' میں زیادہ مبالغہ ہے، اِس وجہ سے 'رحمٰن' کے بعد 'رحیم' کا لفظ اُن کے خیال میں ایک زائد لفظ ہے جس کی چنداں ضرورت تو نہیں تھی، لیکن یہ تاکید مزید کے طور پر آ گیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ عربی زبان کے استعمالات کے لحاظ سے 'فعلان' کا وزن جوش و خروش اور ہیجان پر دلیل ہوتا ہے اور 'فعیل' کا وزن دوام و استمرار اور پایداری و استواری پر۔ اِس وجہ سے اِن دونوں صفتوں میں سے کوئی صفت بھی برائے بیت نہیں ہے، بلکہ اِن میں سے ایک خدا کی رحمت کے جوش و خروش کو ظاہر کر رہی ہے، دوسری اُس کے دوام و تسلسل کو۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ خدا کی رحمت اِس خلق پر ہے بھی اِسی نوعیت سے۔ اُس میں جوش ہی جوش نہیں ہے، بلکہ پایداری اور استقلال بھی ہے۔ اُس نے یہ نہیں کیا ہے کہ اپنی رحمانیت کے جوش میں دنیا پیدا تو کر ڈالی ہو، لیکن پیدا کر کے پھر اُس کی خبر گیری اور نگہداشت سے غافل ہو گیا ہو، بلکہ اُس کو پیدا کرنے کے بعد وہ اپنی پوری شان رحیمیت کے ساتھ اُس کی پرورش اور نگہداشت بھی فرما رہا ہے۔ بندہ جب بھی اُسے پکارتا ہے، وہ اُس کی پکار سنتا ہے اور اُس کی دعاؤں اور التجاؤں کو شرف قبولیت بخشتا ہے، پھر اُس کی رحمتیں اِسی چند روزہ زندگی ہی تک محدود نہیں ہیں، بلکہ جو لوگ اُس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہیں گے، اُن پر اُس کی

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ﴿٤﴾ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ

(پروردگار)، ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں[۷]۔ ہمیں

> رحمت ایک ایسی ابدی اور لازوال زندگی میں بھی ہوگی جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ ساری حقیقت اُس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتی، جب تک یہ دونوں لفظ مل کر اُس کو ظاہر نہ کریں۔" (۴۸/۱)

'رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ' کے بعد یہ دونوں صفات جس حقیقت کو ظاہر کرتی ہیں، وہ یہ ہے کہ جس پروردگار نے عالم میں ربوبیت کا یہ اہتمام فرمایا ہے، اُس کے بارے میں یہ بات اگر نہیں کہی جا سکتی اور یقیناً نہیں کہی جا سکتی کہ اُس کی کوئی ذاتی غرض اِس اہتمام سے وابستہ ہے یا وہ اپنی سلطنت کے قیام و بقا کے لیے اِس کا محتاج ہے یا کسی کا کوئی حق اُس پر قائم ہوتا ہے جسے ادا کرنے کے لیے یہ اہتمام اُسے کرنا پڑا ہے تو اِس کی وجہ پھر یہی ہو سکتی ہے کہ وہ رحمٰن و رحیم ہے۔ اُس کی رحمت کا جوش ہے کہ اُس نے ہمیں پیدا کیا ہے اور اِس رحمت کا دوام و استمرار ہے کہ اُس کا فیضان برابر ہمیں پہنچ رہا ہے۔

۶ یعنی یہ اُس کی پروردگاری اور اُس کی رحمت کے دوام و استمرار کا تقاضا ہے کہ وہ ایک دن اپنی عدالت برپا کرے۔ چنانچہ وہ اُسے برپا کرے گا اور اِس طرح برپا کرے گا کہ اُس دن سارا زور و اختیار اُسی کو حاصل ہوگا۔ سب کے سر اُس کے سامنے جھکے ہوں گے، کسی کو یارا نہ ہوگا کہ اُس کے سامنے زبان کھول سکے۔ ہر معاملے کا فیصلہ وہ خود کرے گا اور کوئی اُس کے فیصلے پر کسی پہلو سے اثر انداز نہ ہو سکے گا۔

۷ عبادت کا لفظ عربی زبان میں اصلاً خضوع اور تذلل کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں یہ اُس خضوع و خشوع کے لیے خاص ہو گیا ہے جو بندہ اپنے خداوند کے لیے ظاہر کرتا ہے۔ اِس کے ظہور کی اصل صورت پرستش ہی ہے، لیکن انسان چونکہ اِس دنیا میں اپنا ایک عملی وجود بھی رکھتا ہے، اِس وجہ سے اِس ظہور سے آگے بڑھ کر یہ عبادت انسان کے اِس عملی وجود سے بھی لازماً متعلق

الْمُسْتَقِيْمَ ۙ ۝۵ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ ۵

سیدھی راہ[۸] کی ہدایت بخش دے[۹]، اُن لوگوں کی راہ جن پر تو نے عنایت فرمائی ہے[۱۰]، جو

ہوتی ہے اور اِس طرح پرستش کے ساتھ اطاعت کو بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اُس وقت یہ انسان سے مطالبہ کرتی ہے کہ اُس کا باطن جس ہستی کے سامنے جھکا ہوا ہے، اُس کا ظاہر بھی اُس کے سامنے جھک جائے۔ اُس نے اپنے آپ کو اندرونی طور پر جس کے حوالے کر دیا ہے، اُس کے خارج میں بھی اُس کا حکم جاری ہو جائے۔ یہاں تک کہ اُس کی زندگی کا کوئی پہلو اِس سے مستثنیٰ نہ رہے۔ یہی عبادت ہے جسے شرک کی ہر آلایش سے پاک کر کے اللہ ہی کے لیے خاص کرنے کا اقرار اِس آیت میں کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس میں صرف اتنی بات نہیں کہی گئی کہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں، بلکہ پورے زور کے ساتھ اِس بات کا اقرار کیا گیا ہے کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ اِس اعتراف و اقرار کے بعد، ظاہر ہے کہ نہ بندے کے پاس کسی کو دینے کے لیے کچھ رہا ہے اور نہ کسی سے کچھ مانگنے کی کوئی گنجایش اُس کے لیے باقی رہ گئی ہے۔ چنانچہ خاص عبادت کے معاملے میں بھی اور زندگی کے دوسرے تمام معاملات میں بھی وہ اللہ ہی سے مدد کی درخواست کرتا ہے۔ سورہ کی ابتدا جس جذبۂ شکر کے اظہار سے ہوئی ہے، غور کیجیے تو یہ اُس کا لازمی نتیجہ ہے جو اِس اعتراف و اقرار کی صورت میں بندے کی زبان پر جاری ہو گیا ہے۔

[۸] اصل الفاظ ہیں: 'اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'۔ اِن میں الف لام عہد کا ہے، یعنی وہ سیدھی راہ جس کی وضاحت آگے کی آیت میں کی گئی ہے۔

[۹] آیت میں 'اِهْدِنَا'، 'الی' کے بغیر آیا ہے۔ چنانچہ عربیت کی رو سے اب اِس کا مفہوم صرف اِسی قدر نہیں رہا کہ ہمیں سیدھی راہ دکھا، بلکہ اِس سے بہت کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔ یعنی اِس پر ہمارے دلوں کو مطمئن کر دے۔ اِس پر چلنے کا شوق عطا فرما، اِس پر ثبات و استقامت بخش دے۔ اِس کے نشیب و فراز میں ہماری رہنمائی کر اور مرتے دم تک اِس پر اِسی طرح چلتے رہنے کی توفیق عنایت فرما دے۔

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ⑥

نہ مغضوب ہوئے ہیں[11]، نہ راہ سے بھٹکے ہیں[12]۔ ۴-۶

---

[10] یعنی اُن لوگوں کی راہ جنھیں تو نے اپنی ہدایت سے نوازا اور اُنھوں نے پورے دل اور پوری جان کے ساتھ اِس طرح اُسے قبول کیا کہ تیری نعمت ہر لحاظ سے اُن پر پوری ہو گئی۔ سورۂ نساء (۴) آیت ۶۹ میں وضاحت ہے کہ اِس سے مراد انبیا و صدیقین اور شہدا و صالحین کی مقدس جماعت ہے۔

[11] یعنی وہ لوگ جنھوں نے اپنی سرکشی کے باعث اِس ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا یا قبول کیا تو دل کی آمادگی سے قبول نہیں کیا اور ہمیشہ اِس سے انحراف پر مصر رہے۔ خدا کے جن بندوں نے اُن کی اصلاح کرنا چاہی، اُنھیں جھٹلایا۔ یہاں تک کہ اُن میں سے بعض کو اذیتیں دیں اور بعض کو قتل کر دیا۔ چنانچہ اپنے اِن جرائم کی پاداش میں وہ خدا کے غضب کے مستحق ٹھیرے۔ اِس میں اشارہ یہود کی طرف ہے جن پر آگے سورۂ بقرہ میں اتمام حجت کیا گیا ہے۔

[12] یعنی جنھوں نے دین کا چہرہ اپنی بدعتوں اور ضلالتوں سے اِس طرح مسخ کر دیا کہ اب خود بھی اُسے پہچاننے سے قاصر ہیں۔ اِس میں اشارہ سیدنا مسیح علیہ السلام کے پیروؤں کی طرف ہے جن پر آگے سورۂ آل عمران میں اتمام حجت کیا گیا ہے۔

لاہور

۸ر جولائی ۱۹۹۸ء

البقرة - آل عمران

٢ ـــــ ٣

البقرۃ - آل عمران

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ میں یہود اور دوسری میں یہود کے ساتھ، خاص کر نصاریٰ پر اتمام حجت کے بعد بنی اسمٰعیل میں سے ایک نئی امت ـــــ امت مسلمہ ـــــ کی تاسیس کا اعلان کیا گیا ہے۔ اِن میں خطاب اگرچہ، ضمناً نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہوا ہے اور مشرکین عرب سے بھی، لیکن دونوں سورتوں کے مخاطب اصلاً اہل کتاب اور اُن کے بعد مسلمان ہی ہیں۔ اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ یہ ہجرت کے بعد مدینہ میں اُس وقت نازل ہوئی ہیں، جب مسلمانوں کی ایک باقاعدہ ریاست وہاں قائم ہو چکی تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اہل کتاب پر اتمام حجت اور مسلمانوں کا تزکیہ وتطہیر کر رہے تھے۔

پہلی سورہ ـــــ البقرۃ ـــــ کا موضوع اہل کتاب پر اتمام حجت، اُن کی جگہ ایک نئی امت کی تاسیس اور اُس کے فرائض کا بیان ہے۔

دوسری سورہ ـــــ آل عمران ـــــ کا موضوع اہل کتاب، خاص کر نصاریٰ پر اتمام حجت، اُن کی جگہ ایک نئی امت کی تاسیس اور اُس کا تزکیہ وتطہیر ہے۔

سورة البقرة

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الٓمّٓ ۚ ① ذٰلِكَ الۡكِتٰبُ لَا رَيۡبَ ۛۚ فِيۡهِ ۛۚ هُدًى

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورہ 'الم' ہے[1]۔ یہ کتابِ الٰہی ہے[2]، اِس کے کتابِ الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں[3]۔

---

[1] اِس جملے میں مبتدا عربیت کی رو سے محذوف ہے۔ اِسے کھول دیجیے تو پوری بات اِس طرح ہوگی: 'هذه الم' (یہ الف لام میم ہے)۔ اصطلاح میں اِنھیں حروف مقطعات کہتے ہیں۔ سورتوں کے شروع میں یہ حروف جس طرح آئے ہیں اور قرآن نے جگہ جگہ 'ذٰلك' اور 'تلك' کے ذریعے سے اِن کی طرف جس طرح اشارہ کیا ہے، اُس سے واضح ہے کہ یہ سورتوں کے نام ہیں۔ اِن کے معنی کیا ہیں؟ اِس باب میں سب سے زیادہ قرین قیاس نظریہ برصغیر کے جلیل القدر عالم اور محقق امام حمید الدین فراہی کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عربی زبان کے حروف تہجی چونکہ اصلاً عرب قدیم میں رائج وہی حروف ہیں جو صرف آواز ہی نہیں بتاتے تھے، بلکہ چینی زبان کے حروف کی طرح معانی اور اشیا پر بھی دلیل ہوتے تھے اور جن معانی یا اشیا پر دلیل ہوتے تھے، اُنھی کی صورت پر لکھے بھی جاتے تھے، اِس لیے قرآن کی سورتوں کے شروع میں بھی یہ اپنے اُنھی قدیم معنی کے لحاظ سے آئے ہیں۔ اِس کی نہایت واضح مثال سورۂ نون ہے۔ حرف 'ن' کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ یہ اب بھی اپنے قدیم معنی میں بولا جاتا ہے۔ اِس کے معنی مچھلی کے ہیں اور جس سورہ کو یہ نام دیا گیا ہے، اُس کے بارے میں معلوم ہے کہ اُس میں سیدنا یونس علیہ السلام کا ذکر 'صاحب الحوت' یعنی مچھلی والے کے نام سے ہوا ہے۔

[2] اصل الفاظ ہیں: 'ذٰلِكَ الۡكِتٰبُ'۔ اِن میں 'ذٰلِكَ' کا اسم اشارہ سورہ کے لیے آیا ہے

لِلْمُتَّقِيْنَ ② ۙ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ
وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ③ ۙ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ

ہدایت ہے اِن خدا سے ڈرنے والوں کے لیے[۴] جو بن دیکھے مان رہے ہیں[۵] اور نماز کا اہتمام کر رہے ہیں اور جو کچھ ہم نے اِنھیں دیا ہے، اُس میں سے (ہماری راہ میں)

اور 'اَلْکِتٰب' کے معنی کتاب الٰہی کے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ جگہ جگہ اِس معنی کے لیے استعمال ہوا ہے اور اُسی طریقے پر استعمال ہوا ہے، جس پر کوئی لفظ اپنے مختلف مفاہیم میں سے کسی ایک اعلیٰ اور برتر مفہوم کے لیے خاص ہو جایا کرتا ہے۔

۳ یہی اِس جملے کا سیدھا اور صاف مفہوم ہے اور قرآن کے نظائر سے بھی اِسی کی تائید ہوتی ہے۔

۴ ہدایت راستہ پانے کے لیے بھی ہوتی ہے اور راستے پر چلنے کے لیے بھی۔ الہامی صحائف اصلاً اِسی دوسری ہدایت کے لیے نازل ہوئے ہیں۔ قرآن نے بھی یہاں اور بعض دوسرے مقامات پر اپنے آپ کو اِسی لحاظ سے ہدایت قرار دیا ہے۔ اِس ہدایت سے بہرہ مند ہونے والوں کی جو خصوصیات اِن آیتوں میں بیان ہوئی ہیں، وہ اگر غور کیجیے تو ٹھیک اُن خصوصیات کی نقیض ہیں جو یہود میں من حیث القوم پائی جاتی تھیں۔ قرآن نے اِسی سورہ میں آگے اُن کی یہ خصوصیات بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں۔ اُس نے بتایا ہے کہ خدا سے ڈرنے کے بجائے وہ اُس کے مقابلے میں سرکش ہوئے۔ اُنھوں نے خدا پر ایمان لانے کے لیے اُسے آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ کیا۔ وہ نماز سے غافل ہو گئے اور خدا کی راہ میں انفاق کے بجائے لوگوں کو بخل کی ترغیب دینے لگے۔ اُنھوں نے محض اپنے تعصّبات کی بنا پر خدا کے پیغمبروں کا انکار کیا اور آخرت اُن کے لیے ایک رسمی عقیدہ بن کر رہ گئی، اُن کے طرزِ عمل میں اِس پر ایمان کی کوئی جھلک کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔

۵ اصل الفاظ ہیں: 'يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ'۔ اِن میں 'ب' ہمارے نزدیک ظرفیت کے لیے

وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ؕ ۝۴ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵

خرچ کر رہے ہیں[۶] اور جو اُسے بھی مان رہے ہیں جو تمھاری طرف نازل کیا گیا اور اُسے بھی جو تم سے پہلے نازل کیا گیا[۷] اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں[۸]۔ یہی اپنے

ہے، یعنی وہ غیب میں ہوتے ہوئے ایمان لاتے ہیں۔ غیب میں ہوتے ہوئے ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ محض محسوسات کے غلام اور مادیات کے پرستار نہیں ہیں، بلکہ ایک عقلی اور روحانی ہستی ہیں، لہٰذا ہر چیز کو دیکھ کر ماننے کے لیے مصر نہیں ہوتے۔ وہ اپنا سفر عقل کی رہنمائی میں طے کرتے ہیں اور جو باتیں عقل سے ثابت ہوتی ہیں یا اُن کی فطرت جن باتوں کی شہادت دیتی ہے، اُنھیں وہ تسلیم کرتے ہیں اور اُن کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اپنی محسوس اور مادی لذتوں کو ہر لحظہ قربان کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

[۶] ہم نے جس مدعا کو نماز کا اہتمام کرنے سے ادا کیا ہے، اُس کے لیے اصل میں اقامت صلوٰۃ کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ اِس کے معنی عربی زبان میں نماز کی حفاظت کرنے اور اُس پر قائم رہنے کے ہیں۔ نماز اہل عرب کے لیے کوئی اجنبی چیز نہ تھی۔ دین ابراہیمی کی ایک روایت کی حیثیت سے وہ اُس کے اعمال و اذکار سے نہ صرف یہ کہ واقف تھے، بلکہ اُن کے صالحین اِس کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اِس کی کوئی تفصیلات بیان نہیں کی ہیں۔ نماز کے ساتھ یہاں انفاق کا ذکر بھی ہوا ہے۔ قرآن کی رو سے یہ بنیادی نیکیاں ہیں۔ انجیل متی میں سیدنا مسیح علیہ السلام نے بھی ذرا مختلف اسلوب میں یہی بات فرمائی ہے:

> ”اور اُن میں سے ایک عالم شرع نے آزمانے کے لیے اُس سے پوچھا: اے استاد، توریت میں کون سا حکم بڑا ہے؟ اُس نے اُس سے کہا کہ خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ۔ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے۔ اور دوسرا اِس کی مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔ اِنھی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیا کے صحیفوں

اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ

پروردگار کی ہدایت پر ہیں[۹] اور یہی ہیں جو فلاح پانے والے ہیں[۱۰]۔ ۱-۵

اِس[۱۱] کے برخلاف جن لوگوں نے اِس کتاب کو نہ ماننے کا فیصلہ کرلیا ہے،[۱۲] اُن

کا مدار ہے۔'' (۲۲: ۳۵-۴۰)

۷۔ یعنی ہر طرح کے تعصّبات سے بالاتر ہو کر حق کو سمجھ رہے اور اِسی حیثیت سے اُسے تسلیم کر رہے ہیں۔

۸۔ یعنی آخرت کو محض مانتے ہی نہیں، ہر طرح کے ریب و گمان سے بالکل پاک ہو کر اُس پر یقین رکھتے ہیں۔ لٰہذا یہی سبب ہے کہ حق کو ماننے میں کوئی تعصب اور اُس کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کوئی غفلت کسی طرح اُن کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔

۹۔ یعنی ٹھیک اُس طریقے پر ہیں جو ہمیشہ سے اہل ایمان کا طریقہ رہا ہے۔

۱۰۔ فلاح سے مراد وہ کامیابی ہے جو آدمی کو اگرچہ حاصل تو بڑی صبر آزما اور جاں گسل جدوجہد کے بعد ہوتی ہے، لیکن جب حاصل ہو جاتی ہے تو اِس طرح نہال کر دیتی ہے کہ اُس کی توقعات کے سارے پیمانے اُسے ناپنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔

۱۱۔ یہاں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور آپ کے مخالفین کے لیے سرزنش کا مضمون سورہ کی اِس تمہید میں نمایاں ہوتا ہے۔ گویا آپ کو یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ لوگ اگر آپ کی بات نہیں سن رہے ہیں تو اِس میں نہ آپ کا کوئی قصور ہے اور نہ آپ کی تبلیغ و دعوت میں کوئی کسر رہ گئی ہے، بلکہ یہ سرتاسر اِن کے دل کی خرابی ہے جس کی وجہ سے یہ حق کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

> ''... اللہ کے دین کی صداقتوں کو جھٹلاتے جھٹلاتے اب یہ قانون الٰہی کی زد میں آ چکے ہیں جس کے سبب سے اِن کے دلوں کے اندر سے اثر پذیری کی، اِن کے کانوں کے اندر سے حق نیوشی

لَا يُؤْمِنُوْنَ ⑥ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ز وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ⑦

کے لیے برابر ہے، تم اُنھیں خبردار کرو یا نہ کرو، وہ نہ مانیں گے۔ اُن کے دلوں اور کانوں پر[۱۳] اب اللہ نے (اپنے قانون کے مطابق[۱۴]) مہر لگا دی ہے اور اُن کی آنکھوں

کی اور اِن کی آنکھوں کے اندر سے عبرت نگاہی کی ساری صلاحیتیں سلب ہو چکی ہیں۔ اب آپ اِن کی صلاح و فلاح کی طرف سے بالکل مایوس ہو جائیں۔ اب اِن کے لیے اگر کوئی چیز باقی رہ گئی ہے تو وہ اللہ کا عذاب ہے جس سے وہ لازماً دوچار ہوں گے۔'' (تدبر قرآن ۱/۱۱۶)

[۱۲] اصل میں 'اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں فعل فیصلۂ فعل کے معنی میں ہے اور اِس سے مراد وہ لوگ ہیں جن پر قرآن اور پیغمبر کی حقانیت اگرچہ پوری طرح واضح ہو چکی تھی، لیکن محض اپنی ضد، ہٹ دھرمی اور انانیت کے باعث وہ اُن کی مخالفت کر رہے تھے اور اُنھیں کسی طرح مان کر دینا نہیں چاہتے تھے۔

[۱۳] اصل الفاظ ہیں: 'وَعَلٰى سَمْعِهِمْ'۔ اِن میں 'سمع' مصدر ہے اور اِسی بنا پر واحد آیا ہے۔

[۱۴] یعنی اپنے اُس قانون کے مطابق جو قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے اور جس کی رو سے جب کوئی شخص حق کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرتا اور جانتے بوجھتے اُسے ماننے سے انکار کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسے مہلت دی جاتی ہے۔ پھر اِس مہلت سے وہ اگر فائدہ اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتا تو اُس کے دل و دماغ پر مہر کر دی جاتی ہے اور اِس طرح وہ اِسی دنیا میں خدا کے عذاب کی زد میں آ جاتا ہے۔ اِس مہر کے نتیجے میں آدمی کا مذاق طبیعت اِس قدر بگڑ جاتا ہے اور اُس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اِس قدر ماؤف ہو جاتی ہے کہ صرف وہی باتیں اُسے اچھی لگتی ہیں جن سے اُس کے بگڑے ہوئے مذاق کو غذا ملے۔ اُس کی ساری دل چسپی صرف بدی کے کاموں سے رہ جاتی ہے۔ نیکی کی بات معقول سے معقول اسلوب میں بھی کہی جائے تو اُس سے اُس کو

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ

پر پردہ ہے[۱۵]، اور (قیامت کے دن) ایک بڑا عذاب ہے جو اُن کے لیے منتظر ہے۔ ۶-۷

اور اِنھی لوگوں میں[۱۶] وہ (منافقین) بھی ہیں[۱۷] جو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اللہ کو مانا ہے

وحشت ہوتی ہے۔ وہ کبھی دل کی آمادگی اور اُس کے حضور کے ساتھ اُسے سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اِس قانون کی وضاحت کے لیے دیکھیے: سورۂ نساء (۴) آیت ۱۵۵، اعراف (۷) آیات ۱۰۰-۱۰۲، نحل (۱۶) آیات ۱۰۶-۱۰۸ اور صف (۶۱) آیت ۵۔

[۱۵] اِس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ آدمی کے اندر ایمان و ہدایت کی دعوت اُس کے دل و دماغ اور اُس کی آنکھوں اور کانوں ہی کے راستے سے داخل ہوتی ہے۔ وہ اگر انفس و آفاق کی نشانیوں پر بصیرت کی نگاہ ڈالے، اُن پر غور کرے، خدا کے کلام اور دعوت حق کے علم برداروں کی باتیں سراپا گوش ہو کر سنے تو اُس کو ہدایت ملتی ہے؛ اور اُنھیں دیکھنے، سننے اور سمجھنے سے انکار کر دے تو گم راہی اور ضلالت کی بھول بھلیاں اُس کا مقدر ٹھیرتی ہیں، ایمان و ہدایت کی راہ پھر اُس کے لیے ہرگز نہیں کھل سکتی۔

[۱۶] یعنی اِنھی منکرین میں۔

[۱۷] اِس سے مراد وہ منافقین یہود اور اوس و خزرج میں سے اُن کے ساتھی ہیں جو اسلام کی کھلی مخالفت کے بجائے اُس کے اور یہودیت کے درمیان ایک قسم کے سمجھوتے کی خواہش رکھتے تھے۔ اُن کی مخالفت مصلحت اندیشی اور مصالحت پسندی کے پردے میں چھپی ہوئی تھی۔ اپنے زعما کے طریقے پر وہ اسلام کے مقابلے میں مجرد انکار اور ضد کی پالیسی کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ اِس کے برعکس اُن کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جس حد تک اپنے آبائی طریقے پر قائم رہتے ہوئے اسلام سے موافقت پیدا کی جا سکتی ہے، کی جائے۔ چنانچہ وہ اللہ اور آخرت پر اپنا ایمان مسلمانوں کے سامنے

بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ
اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ؕ﴿۹﴾ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ

اور قیامت کے دن کو مانا ہے،[۱۸] دراں حالیکہ وہ اِن میں سے کسی چیز کو بھی نہیں مانتے۔[۱۹] وہ اللہ اور اہل ایمان، دونوں کو فریب دینا چاہتے ہیں،[۲۰] اور حقیقت یہ ہے کہ اپنے آپ ہی کو فریب دے رہے ہیں، لیکن اِس کا شعور نہیں رکھتے۔[۲۱] اِن کے دلوں میں

پیش کرتے اور اُن سے یہ چاہتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ اپنے لیے، بے شک پیغمبر مانیں، لیکن یہود کے لیے آپ کو اپنا پیغمبر ماننے کا مطالبہ وہ اُن سے نہ کریں اور اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہوئے دین داری اور خدا پرستی کا ایک مقام اُن کے لیے بھی تسلیم کرنے پر راضی ہو جائیں۔ اُن کا خیال تھا کہ اِس طرح کفر و ایمان کی جو کشمکش یثرب میں پیدا کر دی گئی ہے، اُس کا خاتمہ ہو جائے گا اور دونوں فریق امن و سلامتی کے ساتھ وہاں رہ سکیں گے۔ اپنے اِس طرز عمل کو وہ اِسی لحاظ سے اصلاح کی کوشش سے تعبیر کرتے تھے۔

[۱۸] یعنی یہ دونوں باتیں ہم مانتے ہیں، لہٰذا اِس پر مزید کسی ایمان کا تقاضا تم کو ہم سے نہیں کرنا چاہیے۔

[۱۹] اِس لیے کہ وہ اگر خدا اور آخرت پر فی الواقع ایمان رکھتے ہوتے تو حق کے معاملے میں یہ منافقانہ طرز عمل کبھی اختیار نہ کرتے۔

[۲۰] اصل الفاظ ہیں: 'یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ'۔ 'مخادعة' کے معنی کسی کو دھوکا دینے کی کوشش کرنے کے ہیں۔ غور کیجیے تو 'خدع' کے مقابلے میں یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے تعلق سے نہایت موزوں استعمال ہوا ہے، اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کی کوشش تو کوئی شخص اپنی حماقت کے سبب سے کر سکتا ہے، لیکن اُس کو دھوکا دے نہیں سکتا۔

[۲۱] یعنی اِس کا نتیجہ چونکہ ابھی اِن کے سامنے نہیں آیا، اِس لیے یہ اِس حقیقت کا احساس نہیں

مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ ۙ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ⑩ وَاِذَا قِيْلَ
لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ ۙ قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ⑪ اَلَاۤ
اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ⑫ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ
اٰمِنُوْا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ كَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمْ

(حسد کی) بیماری تھی تو اللہ نے اب اِن کی اِس بیماری کو اور بڑھا دیا ہے[۲۲]، اور اِن کے اِس جرم کی پاداش میں کہ یہ جھوٹ بولتے رہے ہیں، اِن کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے۔ اور جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ (اپنے اِس رویے سے) تم اِس سرزمین میں فساد پیدا نہ کرو[۲۳] تو جواب میں کہتے ہیں کہ ہم ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں[۲۴]۔ خبردار، یہی فسادی ہیں، لیکن اِس کا احساس نہیں کر رہے۔ اور جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی اُسی طرح ایمان لاؤ، جس طرح (تمھارے سامنے)

کر رہے ہیں کہ خدا کو دھوکا دینے کی کوشش میں یہ خود دھوکا کھا رہے ہیں۔

[۲۲] یعنی اِنھیں اِس بات پر حسد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت سے بنی اسمٰعیل کو کیوں نوازا ہے۔ پھر جب اسلام اور اُس کی برکتوں میں روز بروز ترقی ہوئی تو اِن کا یہ حسد اور بڑھ گیا، یہاں تک کہ اِس نے اِن کو بالکل تباہی کے کنارے پر پہنچا کر چھوڑا۔

[۲۳] اصل میں 'لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں نہی نتیجے کے لحاظ سے ہے۔ یعنی خدا کی جو دینونت اِس سرزمین میں برپا ہے، اُس میں لوگوں کو ایمان کی دعوت دینے اور اِس طرح صلح و امن پر آمادہ کرنے کے بجائے جنگ کی آگ نہ بھڑکاؤ جس کا نتیجہ حرث و نسل کی تباہی کی صورت میں نکلے گا۔ آگے آیت ۲۰۵ میں قرآن نے اِسے صراحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

[۲۴] اِن کی اِس بات کا مطلب یہ تھا کہ دو فریقوں میں مصالحت کی جو پالیسی ہم نے اختیار کی ہے، تم اُسے فساد قرار دیتے ہو، دراں حالیکہ اصلاح اگر ہو سکتی ہے تو ہمارے اِس طریقے ہی کو

هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ⑬ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا
اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ
مُسْتَهْزِءُوْنَ ⑭ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ

یہ لوگ[۲۵] ایمان لائے ہیں تو (بڑے تکبر سے) کہتے ہیں کہ ہم کیا اِن احمقوں کی طرح ایمان لائیں؟ سن لو، یہی احمق ہیں، لیکن نہیں جانتے۔ اور جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے مان لیا[۲۶] اور جب علیحدگی میں اپنے شیطانوں کے پاس پہنچتے ہیں[۲۷] تو کہتے ہیں کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں، ہم تو مذاق کر رہے تھے۔ (یہ کیا مذاق کریں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ) اللہ اِن سے مذاق کر رہا ہے اور اِن کی سرکشی میں

اختیار کرنے سے ہو سکتی ہے۔

[۲۵] یعنی یہ انصار و مہاجرین۔

[۲۶] یہود اِس بات سے مسلمانوں کو یہ تاثر دیتے تھے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار کر رہے ہیں، لیکن اپنے دل میں یہی سمجھتے تھے کہ وہ اگر آپ کو مان رہے ہیں تو اِن امیوں ہی کے لیے اللہ کا رسول مان رہے ہیں۔ رہے وہ تو اُن کے لیے اُن کے اپنے نبی اور اپنے صحیفے ہی کافی ہیں، وہ اِس دائرے سے باہر کسی ہدایت کو ماننے کے مکلّف نہیں ہیں۔

دور حاضر میں بھی یہود و نصاریٰ میں سے جو لوگ اسلام لائے بغیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار کرتے ہیں، اِسی مفہوم میں کرتے ہیں۔

[۲۷] اصل میں 'خَلَوْا اِلٰی' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'خلا' کے بعد 'الٰی' کا تقاضا ہے کہ اِسے کسی ایسے فعل پر متضمن مانا جائے جو اِس صلہ سے مناسبت رکھنے والا ہو۔ اِسی طرح یہ بات بھی واضح رہے کہ لفظ 'شَیْطَان' اِس آیت میں یہود کے لیڈروں کے لیے بالکل اُسی طرح استعمال ہوا ہے، جس طرح ہم اردو میں یہ لفظ اِس طرح کے مواقع پر استعمال کرتے ہیں۔

يَعْمَهُوْنَ ⑮ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ص
فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ⑯
مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ج فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ

اِن کی رسی (اپنے قانون کے مطابق) دراز کیے جاتا ہے[۲۸]، اِس طرح کہ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ یہی ہیں جنھوں نے ہدایت پر گم راہی کو ترجیح دی[۲۹] تو اِن کا یہ سودا (اِن کے لیے) کچھ بھی نفع بخش نہ ہوا اور نہ یہ راستہ پا سکے ہیں[۳۰]۔ ۸-۱۶

اِن[۳۱] کی مثال ایسی ہے، جیسے[۳۲] (اندھیری رات میں) کسی شخص نے الاؤ جلایا، پھر

۲۸۔ اصل الفاظ ہیں: 'وَيَمُدُّهُمْ فِىْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ'۔ اِن میں 'يَعْمَهُوْنَ' حال واقع ہوا ہے اور 'فِىْ طُغْيَانِهِمْ' کا تعلق 'يَمُدُّهُمْ' سے ہے، اِس لیے کہ 'مده فيه' عربی زبان میں زیادہ آتا ہے۔ مدعا کے لحاظ سے یہ اللہ تعالیٰ کے اُسی مذاق کی وضاحت ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ یعنی وہ سرکشی میں جتنا آگے بڑھ رہے ہیں، اللہ اُسی کے حساب سے اُن کی رسی دراز کیے جاتا ہے تاکہ جب اُنھیں پکڑا جائے تو اُن کے پاس کوئی عذر اُس کے حضور میں پیش کرنے کے لیے باقی نہ رہ جائے۔

۲۹۔ اصل میں لفظ 'اِشْتَرٰى' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی خریدنے کے ہیں۔ خریدنا چونکہ قیمت کے مقابل میں ایک لحاظ سے اُس شے کو ترجیح دینا بھی ہے جسے آدمی کوئی قیمت ادا کر کے خریدتا ہے، اِس وجہ سے ترجیح دینے کے یہ معنی اِس میں پیدا ہو گئے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ اِس مفہوم میں جگہ جگہ آیا ہے۔

۳۰۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اِن کی منافقت کا پردہ چونکہ بالکل چاک کر دیا ہے، لہٰذا مصالحت کی اِس پالیسی سے جو راہ اُنھوں نے پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے نتائج سے بچنے کے لیے نکالنا چاہی تھی، وہ اُس میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔

ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿١٧﴾ صُمٌّۢ بُكْمٌ
عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿١٨﴾ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ
وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ

جب آگ نے اُس کے ماحول کو روشن کر دیا تو جن کے لیے آگ جلائی گئی تھی، اللہ نے اُن کی روشنی سَلب کر لی اور اُنھیں اِس طرح اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ وہ کچھ دیکھ نہیں سکتے: بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، سو اب وہ کبھی نہ لوٹیں گے۔[۳۳] یا ایسی ہے جیسے آسمان[۳۴] سے بارش ہو رہی ہے، اُس میں اندھیری گھٹائیں بھی

---

[۳۱] یہ دو تمثیلیں ہیں۔ اِن میں حرف 'اَوْ' تقسیم کے لیے ہے۔ پہلی تمثیل اُن لوگوں کی ہے جن کا ذکر اوپر 'اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا' کے الفاظ میں ہوا ہے اور دوسری اُن کی جو اِس کے بعد 'وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ' کے الفاظ میں مذکور ہیں۔ تمثیل کے بارے میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اِس میں اور تشبیہ میں بڑا فرق ہے۔ تشبیہ میں اصل اہمیت مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان مطابقت کی ہوتی ہے اور تمثیل میں صورت واقعہ کو صورت واقعہ کے مقابل میں رکھ دیا جاتا ہے، اِس میں تمثیل کے اجزا کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

[۳۲] یہ تمثیل ایک قافلے کی ہے جو اندھیری رات میں اپنے لیے راستہ تلاش کر رہا ہے۔ اِس میں آگ جلانے والے سے اشارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے، جنھوں نے آگ جلا کر گویا راستہ بالکل روشن کر دیا ہے، لیکن قافلے کے تمام افراد چونکہ اندھے، بہرے اور گونگے ہیں، اِس لیے نہ پکارنے والے کی پکار سن سکتے ہیں، نہ اُسے جواب دے سکتے ہیں اور نہ اِس آگ کی روشنی میں اپنے لیے کوئی راہ تلاش کر سکتے ہیں۔

[۳۳] یہ دوسری تمثیل ایک ایسے قافلے کی ہے جو رات کی تاریکی میں کسی جگہ بارش میں گھر گیا ہے۔ اِس میں بارش سے اشارہ قرآن مجید کی طرف ہے۔ اندھیری گھٹاؤں سے اُن مشکلات راہ کا

حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ⑲ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ
اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ
قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى

ہیں اور کڑک اور چمک بھی، وہ موت کے ڈر سے کڑک کے مارے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونسے لے رہے ہیں[۳۵] دراں حالیکہ اِس طرح کے منکروں کو اللہ ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔[۳۶] بجلی کی چمک اِن کی آنکھیں خیرہ کیے دے رہی ہے؛ جب اِن پر چمکتی ہے، یہ اُس میں کچھ چل لیتے ہیں اور جب اِن پر اندھیرا چھا

تصور دلانا مقصود ہے جو قرآن کی دعوت قبول کرنے والوں کو اُس زمانے میں لازماً پیش آتی تھیں؛ کڑک اور چمک سے قرآن کی وہ وعیدیں مراد ہیں جو قرآن اپنے جھٹلانے والوں کو سنا رہا تھا اور جن کی زد اُس وقت بطور خاص یہود پر پڑ رہی تھی۔

[۳۴] بارش کے ساتھ آسمان کا ذکر اِس لیے ہوا ہے کہ اِس سے ایک تو تمثیل کے تقاضے سے بارش کی تصویر نگاہوں کے سامنے آ جائے، دوسرے اِس سے جب قرآن کو مراد لیا گیا ہے تو اُس کے آسمانی ہونے کی طرف بھی ایک لطیف اشارہ ہو جائے۔

[۳۵] یہود کے اِس موخر الذکر گروہ کو چونکہ قرآن کی حقانیت کا پورا احساس تھا، اِس وجہ سے قرآن کی وعیدیں اُسے بہت شاق گزرتی تھیں۔ اُن کا علاج اُس نے یہ سوچا کہ سرے سے قرآن کی بات سنی ہی نہ جائے۔ تمثیل میں یہ اِسی صورت حال کی تصویر ہے۔

[۳۶] یعنی کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر وہ اپنے آپ کو کچھ دیر کے لیے اِس غلط فہمی میں تو یقیناً مبتلا کر سکتے ہیں کہ ہلاکت سے بچے رہیں گے، لیکن فی الواقع وہ بچ نہیں سکتے، اِس لیے کہ اللہ ہر طرف سے اپنی سب قوتوں کے ساتھ اُن کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ⑳

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ

جاتا ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں[۳۷]۔ اِن کے کان اور آنکھیں بھی اگر اللہ چاہتا تو سلب کر لیتا[۳۸]۔ بے شک، اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ ۱۷-۲۰

(اِن[۳۹] کے پیچھے لگ کر تم اپنے آپ کو برباد کیوں کرتے ہو)؟ تم اپنے اُس

---

[۳۷] یہ اُس پریشانی کی تصویر ہے جس میں نزول قرآن کے بعد وہ مبتلا ہو گئے تھے۔ قرآن کی چمک اور دمک نگاہوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی اور اُس کی بجلیوں سے بچنے کی کوئی راہ وہ تلاش نہیں کر پا رہے تھے۔ اِس چیز نے اُنھیں بالکل حیران و درماندہ کر دیا تھا کہ کریں تو کیا کریں۔ اِس حیرانی و درماندگی میں کوئی بات بنتی نظر آتی تو بنانے کی کوشش کرتے تھے اور جب بگڑ جاتی تھی تو حیران و درماندہ ہو کر کھڑے رہ جاتے تھے۔ قرآن نے یہ اِسی صورت حال کی تصویر کھینچی ہے۔

[۳۸] یہ وعید ہے کہ اِنھوں نے اگر اِس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا اور دوسروں کو فریب دینے کا طریقہ چھوڑ کر حق کو، جس طرح کہ وہ ہے، پوری سچائی کے ساتھ قبول نہ کیا تو اندیشہ ہے کہ پہلے گروہ کی طرح اِن کی روشنی بھی سلب کر لی جائے اور یہ حق کو پانے کی صلاحیت ہی سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیے جائیں۔ ''اللہ چاہتا تو اِن کے کان اور آنکھیں سلب کر لیتا'' ـــــ اِن الفاظ کا مدعا یہ ہے کہ ابھی اِنھیں مہلت ملی ہوئی ہے، لیکن اِس مہلت سے یہ بے خوف اور بے پروا نہ ہوں، یہ نہیں جانتے کہ کب یہ مہلت ختم ہو جائے گی اور کب یہ عذاب الٰہی کی زد میں آ جائیں گے۔

[۳۹] یہود سے صرف نظر کر کے یہ ذرا دیر کے لیے یثرب اور اُس کے نواح کے مشرکین کی طرف التفات ہے جو خدا کے اِن دشمنوں کی وسوسہ اندازیوں سے متاثر ہو کر اِن کے اعتراضات بے جانے بوجھے دہرا رہے تھے اور اِس طرح اپنے آپ کو اُس نعمت عظمیٰ سے محروم کر رہے تھے جو خدا نے قرآن اور پیغمبر کی صورت میں اُنھیں عطا فرمائی تھی۔

قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ۙ﴿۲۱﴾ الَّذِىۡ جَعَلَ لَكُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا
وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۖ وَّاَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ
رِزۡقًا لَّكُمۡ ۚ فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا وَّاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۲﴾
وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ

البقرة
۲

پروردگار کی بندگی کرو[۴۰] لوگو، جس نے تمھیں پیدا کیا ہے اور تم سے پہلوں کو بھی[۴۱]، اِس لیے کہ تم (اُس کے عذاب سے) بچے رہو[۴۲]۔ (وہی) جس نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا ہے اور آسمان سے پانی اتارا ہے، پھر اُس سے تمھاری روزی کے لیے طرح طرح کے میوے پیدا کر دیے ہیں۔ لہٰذا تم اللہ کے ہم سر نہ ٹھیراؤ، دراں حالیکہ تم اِن سب باتوں[۴۳] کو جانتے ہو[۴۴]۔ ۲۱-۲۲

(یہی اِس کتاب کی دعوت ہے، اِسے قبول کرو[۴۵])، اور جو کچھ ہم نے اپنے

---

[۴۰] یعنی وہ بندگی جس کی دعوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں۔ بندگی کے لیے اصل میں 'اُعْبُدُوْا' آیا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں یہ لفظ جب اپنے جامع مفہوم میں استعمال کیا جائے تو پرستش اور اطاعت، دونوں کو شامل ہوتا ہے۔

[۴۱] یعنی تمھارے اُن بزرگوں کو بھی پیدا کیا ہے جنھیں تم خدائی صفات میں شریک قرار دیتے ہو اور اُن کے بت بنا کر اُن کی پرستش کرتے ہو۔

[۴۲] اصل الفاظ ہیں: 'لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ'۔ اِن میں 'لَعَلَّ' کسی چیز کے متوقع نتیجے کو بیان کرنے کے معنی میں ہے اور 'تَتَّقُوْنَ' کا مفعول یہاں محذوف ہے۔ اِسے قرآن نے اِس کے بعد کی آیت 'فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ' میں خود واضح کر دیا ہے۔

[۴۳] یعنی خدا کے بارے میں وہ سب باتیں جن کا ذکر اِن آیات میں ہوا ہے۔

[۴۴] 'جانتے ہو' کے الفاظ یہاں 'مانتے ہو' اور 'اقرار کرتے ہو' کے مفہوم میں آئے ہیں۔

مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲۳)
فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ
وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ (۲۴) وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

بندے پر نازل کیا ہے، اُس کے بارے میں اگر تمھیں شبہ ہے تو (جاؤ اور) اِس کے مانند ایک سورہ ہی بنا لاؤ[۴۶] اور (اِس کے لیے) خدا کے سوا تمھارے جو زعما[۴۷] ہیں، اُنھیں بھی بلا لو، اگر تم (اپنے اِس گمان میں) سچے ہو[۴۸]۔ پھر اگر نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو اُس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن[۴۹] وہ لوگ بھی ہوں گے جو نہیں مانتے

---

[۴۵] یعنی شرک کی ہر آلایش سے بالکل پاک ہو کر خدا کی بندگی کرنے کی جو دعوت یہ کتاب لے کر نازل ہوئی ہے، اُسے مانو اور اُس کے مطابق خدا کی بندگی کرو۔

[۴۶] مطلب یہ ہے کہ تم اگر اِسے خدا کی کتاب نہیں سمجھتے تو اپنی ہدایت، مضامین اور اپنے اسلوب بیان کے لحاظ سے جس شان کا یہ کلام ہے، اِس شان کی کوئی ایک سورہ ہی بنا کر پیش کر دو۔ تمھارے گمان کے مطابق یہ کام اگر بغیر کسی علمی اور ادبی پس منظر کے تمھاری قوم کے ایک فرد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کر سکتے ہیں تو تمھیں بھی اِس میں کوئی دقت نہ ہونی چاہیے۔ اپنے متعلق یہ قرآن کا چیلنج ہے جو اُس نے اپنے اولین مخاطبین کو دیا اور اُن میں سے کوئی بھی اِس کا سامنا کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔

[۴۷] اصل میں لفظ 'شُهَدَآء' استعمال ہوا ہے۔ یعنی زعما، ترجمان اور نمایندے۔ مدعا یہ ہے کہ جنوں اور انسانوں میں سے اپنے وہ زعما بلا لو جو تمھارے اِس دعوے میں شریک ہیں اور جن میں سے بعض کو تم خدائی اختیارات کے حامل سمجھتے ہو۔

[۴۸] یعنی اپنے اِس گمان میں کہ یہ خدا کا کلام نہیں ہے، بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اِسے اپنی طرف سے گھڑ کر پیش کر رہے ہیں۔

[۴۹] مطلب یہ ہے کہ اِس آگ کی مرغوب غذا یا وہ جسم ہوں گے جن میں کفر و شرک کا مواد بھرا ہوا

الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا
مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ
مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۗ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور اُن کے وہ پتھر بھی جنھیں وہ پوجتے ہیں[۵۰]۔ وہ اِنھی منکروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اور اُن کو جو (اِس کتاب پر) ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے، اِس بات کی بشارت دو، (اے پیغمبر) کہ اُن کے لیے ایسے باغ ہیں[۵۱] جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اُن کا کوئی پھل اُنھیں جب بھی کھانے کے لیے دیا جائے گا[۵۲] تو کہیں[۵۳] گے: یہ وہی ہے جو اِس سے [۵۴]پہلے ہمیں دیا گیا، دراں حالیکہ اُن کو یہ اُس سے ملتا جلتا دیا جائے گا[۵۵]، اور اُن کے لیے وہاں پاکیزہ[۵۶] بیویاں ہوں گی اور وہ اُن میں ہمیشہ رہیں

ہے اور یا وہ پتھر جو معبود کی حیثیت سے اِس دنیا میں پوجے گئے ہیں۔ یہ آگ اپنے اصلی رنگ میں اِنھی دو چیزوں سے بھڑکے گی۔

[۵۰] یہ پتھر اپنے پوجنے والوں کی فضیحت اور اِس طرح اُن کے عذاب میں اضافے کے لیے دوزخ میں پھینکے جائیں گے تاکہ وہ دیکھ لیں کہ دنیا میں جن کی خدائی کا شہرہ تھا، آج وہ کس انجام کو پہنچے ہیں۔

[۵۱] اصل میں 'اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'اَنَّ' سے پہلے 'ب' عربی قاعدے کے مطابق حذف ہوگئی ہے۔

[۵۲] اصل الفاظ ہیں: 'كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا'۔ اِن میں 'رِزْقًا' دوسرا مفعول ہے اور 'مِنْ ثَمَرَةٍ' ہمارے نزدیک 'مِنْهَا' سے بدل واقع ہوا ہے۔

[۵۳] یعنی اپنے دل میں کہیں گے۔

[۵۴] یعنی اِس سے پہلے اِسی جنت میں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ
فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ

گے۔ ۲۳-۲۵

(یہ[57] جنت کی تمثیل ہے، اور) اللہ اِس بات سے نہیں شرماتا کہ (کسی حقیقت کی وضاحت کے لیے) وہ مچھر یا اِس سے بھی حقیر کسی چیز کی تمثیل بیان کرے[58]۔ پھر جو ماننے والے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ اُن کے پروردگار کی طرف سے حق آیا

---

۵۵ مطلب یہ ہے کہ وہ نہیں ہوگا، بلکہ اُس سے ملتا جلتا ہوگا۔ یہ جنت کی نعمتوں کے اِس پہلو کو نمایاں کیا ہے کہ وہ ہر دفعہ نئے حسن، نئی لذت اور نئے ذائقے کے ساتھ سامنے آئیں گی۔ ایک ہی پھل جب بار بار کھانے کے لیے دیا جائے گا تو ہر مرتبہ لذت، حسن اور ذائقے کی ایک نئی دنیا اپنے ساتھ لے کر آئے گا۔

۵۶ اصل الفاظ ہیں: 'اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ'۔ اِن میں 'مُطَهَّرَةٌ' کی صفت سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ وہ اچھوتی ہیں، اُن کی تربیت نہایت اہتمام اور توجہ کے ساتھ ہوئی ہے اور اُنھیں اِس طرح سنوارا اور پاکیزہ بنایا گیا ہے کہ اہل جنت کی رفاقت کے لیے وہ پوری طرح موزوں ہوگئی ہیں۔

۵۷ یہاں سے آگے آیت ۲۷ تک یہ ایک مناسب موقع تنبیہ ہے جو سلسلۂ کلام کے بیچ میں جملۂ معترضہ کے طور پر آگئی ہے۔ یثرب اور اُس کے نواح کے مشرکین کو اِس میں متنبہ کیا گیا ہے کہ یہود کی پیروی میں وہ تمثیلات کے بارے میں بے ہودہ حجت طرازی کا مذاق اپنے اندر پرورش نہ کریں۔ یہ اُن کے لیے حق سے محرومی کا باعث بن جائے گا۔

۵۸ اصل میں 'اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'مَثَلًا' مفعول اور 'بَعُوْضَةً' اُس سے بدل واقع ہوا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ جنت اور اُس کی نعمتوں کا

وَّ يَهۡدِىۡ بِهٖ كَثِيۡرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الۡفٰسِقِيۡنَ ۙ﴿۲۶﴾ الَّذِيۡنَ
يَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِيۡثَاقِهٖ ۖ وَيَقۡطَعُوۡنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ
اَنۡ يُّوۡصَلَ وَيُفۡسِدُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ ؕ اُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۲۷﴾

ہے، اور جو نہیں مانتے، وہ کہتے ہیں کہ اِس مثال سے اللہ نے کیا چاہا؟[۵۹] (اِس طرح) اللہ بہتوں کو اِس سے گم راہ کرتا اور بہتوں کو اِس سے راہ دکھاتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اِس سے گم راہ تو سرکشوں[۶۰] ہی کو کرتا ہے[۶۱] جو اللہ کے عہد کو اُس کے باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں[۶۲] اور اللہ نے جس چیز کے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اُسے کاٹتے ہیں[۶۳]، اور

جو ذکر اوپر ہوا ہے، وہ تمثیل ہی کے اسلوب میں ہے اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ جنت اور دوزخ کے بارے میں جو بات بھی اِس دنیا میں سمجھائی جا سکتی ہے، تمثیل کے اسلوب ہی میں سمجھائی جا سکتی ہے۔ لہٰذا تمھاری نگاہ بھی اصل حقیقت پر رہنی چاہیے، تمثیل کے طور پر جن باغوں اور نہروں کا ذکر ہوا ہے، اُن میں اُلجھ کر نہیں رہ جانی چاہیے۔ اللہ جب کسی حقیقت کو واضح کرنا چاہتا ہے تو مکھی اور مچھر جیسی حقیر چیزوں کو بھی مثال میں پیش کر دیتا ہے۔ علم و ہدایت کے جویا اُس کی قدر کرتے ہیں، وہ اُس کا مذاق نہیں اڑاتے۔

[۵۹] اصل الفاظ ہیں: 'مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا'۔ اِن میں 'مَثَلًا' اسم اشارہ سے حال ہے۔ یعنی یہ کس طرح کی مثال ہے؟ کیا خدا کو تمثیل کے لیے مکھی اور مچھر ہی میسر ہوئے ہیں؟

[۶۰] اصل میں لفظ 'فَاسِق' استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں اِس کے معنی معروف سے منکر اور اطاعت سے نافرمانی کی طرف نکل جانے کے ہیں۔

[۶۱] یہ اشارہ ہے یہود کی طرف۔ اِس سے آگے اُن کے وہ جرائم بیان ہوئے ہیں جن کے باعث وہ توفیق ہدایت سے محروم ہوئے۔

[۶۲] یہود یہ عہد کس طرح باندھتے اور توڑتے رہے، اِس کی تفصیلات آگے سورہ میں بڑی

كَيۡفَ تَكۡفُرُوۡنَ بِاللّٰهِ وَكُنۡتُمۡ اَمۡوَاتًا فَاَحۡيَاكُمۡ ۚ ثُمَّ يُمِيۡتُكُمۡ
ثُمَّ يُحۡيِيۡكُمۡ ثُمَّ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۸﴾ هُوَ الَّذِيۡ خَلَقَ لَكُمۡ مَّا

اِس طرح زمین میں فساد برپا کرتے ہیں[۶۴]۔ یہی ہیں جو (دنیا اور آخرت، دونوں میں) نامراد ہیں۔ ۲۶-۲۷

(لوگو[۶۵])، تم اللہ کے منکر[۶۶] کس طرح ہوتے ہو، دراں حالیکہ تم مردہ تھے تو اُس نے تمھیں زندگی عطا فرمائی؟ پھر وہی تم کو مارتا ہے، پھر وہی زندہ کرے گا، پھر تم اُسی کی

وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔

[۶۳] اِس سے مراد رشتۂ رحم اور رشتۂ قرابت کا کاٹنا ہے۔ قرآن نے یہ اسلوب جہاں بھی اختیار کیا ہے، موقع کلام کی دلالت سے واضح ہے کہ رشتۂ رحم و قرابت کے لیے اختیار کیا ہے۔ اِس میں جو ابہام ہے، اُس سے رشتۂ رحم کی عظمت واضح ہوتی ہے۔ گویا یہ ایسی معروف اور بدیہی حقیقت ہے کہ اِس کا نام لیے بغیر ہی ہر شخص سمجھ لیتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جسے خدا نے کاٹنے کا نہیں، بلکہ جوڑنے کا حکم دیا ہے۔

[۶۴] یعنی اللہ تعالیٰ سے عہد و پیمان توڑنے کے بعد جب یہ دوسرا قدم بھی اٹھا لیتے ہیں تو اِس سے زمین میں فساد برپا ہو جاتا ہے، اِس لیے کہ تمدن اور معاشرت میں صلاح و فلاح کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے تقویٰ اور رشتۂ رحم کی حرمت ہی پر قائم ہے۔

[۶۵] یہاں سے پھر وہ دعوت سامنے آ گئی ہے جو 'اُعۡبُدُوۡا رَبَّكُمۡ' سے شروع ہوئی تھی۔

[۶۶] اصل میں 'كَيۡفَ تَكۡفُرُوۡنَ بِاللّٰهِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں استفہام انکار اور تعجب کے لیے ہے اور 'کفر' سے مراد خدا کا انکار نہیں، بلکہ قیامت کا انکار ہے۔ اِس کو خدا کے انکار سے اِس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ قیامت کا انکار درحقیقت خدا کی تمام اعلیٰ صفات — قدرت، ربوبیت، علم اور حکمت — کا انکار ہے۔ جو شخص اِن صفات کے بغیر خدا کو مانتا ہے، اُس کا ماننا اور نہ ماننا، دونوں برابر ہیں۔

فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا ۗ ثُمَّ اسۡتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىہُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَ ہُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۲۹﴾
وَ اِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً ؕ

طرف لوٹائے جاؤ گے۔[۶۷] وہی[۶۸] جس نے تمھارے لیے زمین کی سب چیزیں پیدا کیں، پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا[۶۹] اور سات آسمان استوار کر دیے، اور وہ ہر چیز سے واقف ہے۔ ۲۸-۲۹

(اِن سے پوچھو، اے پیغمبر کہ یہ منکر کس طرح ہوتے ہیں)؟ اور (اِس دنیا کے

---

[۶۷] یہ معاد اور قیامت کے ممکن ہونے کی دلیل ہے، یعنی جس نے تمھیں پہلی مرتبہ پیدا کیا اور اِس طرح گویا مردہ سے زندہ کیا ہے، وہ مرنے کے بعد دوسری مرتبہ پیدا کرنے سے کیوں قاصر رہ جائے گا؟

[۶۸] یہاں سے پیرے کے آخر تک اب قیامت کے ضروری ہونے کی دلیل بیان ہوئی ہے۔ یعنی جس پروردگار کی قدرت، ربوبیت اور علم و حکمت کی گواہی یہ آسمان و زمین دے رہے ہیں، کس طرح ممکن ہے کہ وہ تمھیں پیدا کر کے یوں ہی چھوڑ دے اور تمھارے نیک و بد میں کوئی امتیاز نہ کرے؟ لہٰذا قیامت اٹل ہے، وہ ہر حال میں ہو کر رہے گی۔

[۶۹] اصل الفاظ ہیں: 'ثُمَّ اسۡتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىہُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ'۔ اِن میں 'استواء' کے معنی سیدھے کھڑے ہونے کے ہیں اور 'اِلٰی' کے ساتھ اِس کا صلہ دلالت کرتا ہے کہ یہ توجہ کرنے کے مفہوم پر متضمن ہے۔ 'سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ' اِس جملے میں ضمیر منصوب سے حال واقع ہوا ہے۔ یہ آسمان کی استواری کے لیے اللہ تعالیٰ کے متوجہ ہونے کی تصویر ہے جسے اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نیچے اترے، بیٹھے اور پھر کھڑے

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ
نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ط قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾
وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ

بارے میں ہماری اسکیم کو سمجھنے کے لیے) وہ واقعہ اِنھیں سناؤ، جب تمھارے پروردگار نے فرشتوں[۷۰] سے کہا: میں زمین میں ایک ایسی مخلوق بنانے والا ہوں جسے (اُس کی) بادشاہی دی جائے گی۔[۷۱] اُنھوں نے عرض کیا: کیا آپ اُس میں وہ مخلوق بنائیں گے جو وہاں فساد کرے گی اور خون بہائے گی،[۷۲] اور اِدھر ہمارا معاملہ یہ ہے کہ آپ کی حمد وثنا

ہوئے۔

[۷۰] اصل میں لفظ 'اَلْمَلٰٓئِکَة' استعمال ہوا ہے۔ یہ 'ملك' کی جمع ہے جس کے معنی پیغام بر کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا جو مکالمہ اِن آیات میں اُن کے ساتھ نقل ہوا ہے، اُس سے واضح ہے کہ یہ محض قوتیں نہیں ہیں جنھیں 'اَلْمَلٰٓئِکَة' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، بلکہ نہایت پاکیزہ صفات کی حامل ایک مستقل مخلوق کی حیثیت رکھتے ہیں۔

[۷۱] اصل میں لفظ 'خَلِیْفَةً' استعمال ہوا ہے۔ سورۂ ص (۳۸) کی آیت ۲۶ سے واضح ہے کہ یہ جس طرح نائب اور جانشین کے معنی میں آتا ہے، اُسی طرح نیابت اور جانشینی کے مفہوم سے مجرد ہو کر محض صاحب اقتدار کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ہم نے اِسی لحاظ سے اِس کا ترجمہ 'بادشاہ' کیا ہے۔ لفظ کے اِس طرح اپنے معنی کے کسی پہلو سے مجرد ہو کر آنے کی مثالیں عربی زبان میں اور بھی ہیں۔

[۷۲] فرشتوں نے انسان کے بارے میں اِس اندیشے کا اظہار لفظ 'خَلِیْفَةً' کی بنا پر کیا ہے۔ اُنھوں نے محسوس کیا کہ جب ایک صاحب اختیار مخلوق کو زمین کی بادشاہی دی جائے گی تو اقتدار پا کر وہ بھکے گی اور اِس بھکنے کا نتیجہ لازماً خوں ریزی اور فساد کی صورت میں ظاہر ہو گا۔

اَنۡۢبِـُٔوۡنِیۡ بِاَسۡمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ (۳۱) قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ
لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَكِیۡمُ (۳۲) قَالَ

کے ساتھ ہم آپ کی تسبیح و تقدیس کر رہے ہیں[۳]؟ فرمایا: میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے[۴]، اور (اُنھیں سمجھانے کے لیے) آدم کو سب نام سکھا دیے[۵]۔ پھر (جن کے نام سکھائے)، اُن ہستیوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔ پھر فرمایا: مجھے اِن لوگوں کے نام بتاؤ[۶]، اگر تم (اپنے اِس خیال میں) سچے ہو[۷]۔ اُنھوں نے عرض کیا: آپ کی

---

[۳] یہ عبادت کی تعبیر ہے۔ یعنی آپ کے سامنے سرافگندہ ہیں اور اپنے علم و عمل میں آپ کی شان الوہیت سے منافی صفات سے آپ کو پاک قرار دیتے اور اُن صفات سے متصف قرار دیتے ہیں جن کی بنا پر آپ سزاوار حمد و شکر ہیں۔ مدعا یہ تھا کہ زمین کا نظم و نسق پہلے کی طرح ہمارے ہی ہاتھ میں کیوں نہ رہے۔ اِس میں کسی مخلوق کو اقتدار دے کر اِسے فتنہ و فساد کے حوالے کیوں کیا جائے؟ فرشتوں کی بات سے یہ مدعا اگرچہ واضح ہے، لیکن ادب کے تقاضے سے وہ اِسے زبان پر نہیں لائے۔

[۴] مطلب یہ ہے کہ میری اسکیم کے سارے پہلوؤں پر تمھاری نظر نہیں ہے۔ یہ جب واضح ہو جائیں گے تو تمھارا اشکال بھی ختم ہو جائے گا۔

[۵] اصل الفاظ ہیں: 'عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا'۔ اِن میں 'اَسۡمَآء' پر الف لام عہد کا ہے اور مراد اِس سے آدم علیہ السلام کی ذریت میں سے، خاص کر اُن لوگوں کے نام ہیں جو اللہ تعالیٰ کے تفویض کردہ اختیارات پا کر خود بھی اُن کا حق ادا کریں گے اور دوسروں کو بھی اُن کا حق ادا کرنے کی ترغیب دیں گے، یہاں تک کہ اِس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے بارہا اپنا سب کچھ قربان کر دیں گے، یعنی اولادِ آدم میں سے انبیا و رسل، مجددین، مصلحین اور شہدا و صدیقین۔

[۶] 'نام بتاؤ' ــــ یعنی تعارف کراؤ۔ اِس مفہوم کے لیے یہ اسلوب ہماری زبان میں بھی

يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ
اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ
وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

ذات ہر عیب سے پاک ہے، ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں، جتنا آپ نے ہمیں بتایا ہے، علیم و حکیم تو اصل میں آپ ہی ہیں۔[۷۸] فرمایا: آدم، تم اِن ہستیوں کے نام اِنھیں بتاؤ۔ پھر جب اُس نے اُن کا تعارف اُنھیں کرا دیا تو فرمایا: میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے بھید جانتا ہوں[۷۹] اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کر رہے ہو[۸۰]

معروف ہے۔

۷۷ یعنی اپنے اِس خیال میں کہ اولادِ آدم کو زمین کا اقتدار دیا گیا تو وہ اِس میں فساد برپا کر دے گی۔

۷۸ آیت کی ابتدا میں لفظ 'سُبْحٰنَكَ' آیا ہے۔ عربی زبان میں یہ کئی مواقع پر آتا ہے۔ یہاں مدعا یہ ہے کہ پروردگار، آپ کی شان اِس سے بلند ہے کہ آپ کا کوئی کام حکمت سے خالی ہو۔ ہم نے اپنا جو شبہ ظاہر کیا ہے، وہ محض ہمارے علم کی کمی کا نتیجہ ہے۔ ہمارا علم محدود ہے، علم و حکمت کا اصلی خزانہ تو آپ ہی کے پاس ہے۔

۷۹ آدم کی تخلیق اور اُسے زمین کی بادشاہی عطا کرنے کا جو بھید ذریت آدم کے صالحین کو فرشتوں کے سامنے پیش کرنے اور اُن کا تعارف کرانے سے واضح ہوا، وہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی جنت کے لیے اُن لوگوں کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں جو اِس اقتدار کے باوجود اُن کی اطاعت پر قائم رہیں۔ یہ مقصد، ظاہر ہے کہ اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا تھا، جب تک اطاعت کے مقابلے میں سرکشی کو گوارا نہ کیا جائے۔ اِس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ جاننے کے باوجود کہ فساد برپا ہوگا، آدم کو بنانے اور زمین کی بادشاہی عطا کرنے کا فیصلہ فرمایا اور فرشتوں کو بتا دیا کہ یہ اسکیم ہرگز ناکام نہ ہوگی

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ط
اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ ق وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ ﴿۳۴﴾ وَقُلْنَا یٰٓاٰدَمُ اسْکُنْ

اور جو تم چھپا رہے تھے[۸۱]۔ ۳۰-۳۳

اور[۸۲] (ہماری اِس اسکیم میں انسان کے امتحان کو سمجھنے کے لیے) وہ واقعہ بھی اِنھیں سناؤ، جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو[۸۳] تو وہ سب سجدہ ریز ہو گئے،

اور خدا کے اذن سے صالحین کی ایک بڑی جماعت جنت الفردوس کے لیے منتخب ہو جائے گی۔

[۸۰] یعنی اپنے اور بنی آدم کے وہ اوصاف جو فرشتوں نے بیان کر دیے تھے۔

[۸۱] یعنی فرشتوں کا وہ مدعا جس کے بارے میں ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ ادب کے تقاضے سے وہ اُسے زبان پر نہیں لائے تھے۔

[۸۲] اصل الفاظ ہیں: 'وَ اِذْ قُلْنَا'۔ آیت ۳۰ کی ابتدا میں پہلے 'اِذْ' کے بعد یہ دوسرا 'اِذْ' اِس بات کا واضح قرینہ ہے کہ یہ ایک مستقل واقعہ ہے۔ لہٰذا ضروری نہیں کہ یہ پہلے واقعے کے بعد ہی پیش آیا ہو۔

[۸۳] یہ سجدہ تعظیم کے لیے تھا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا، اِس لیے اِس میں شرک کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی اطاعت کا یہ امتحان جس وجہ سے لیا، وہ یہ تھی کہ اولاً، آدم پر واضح ہو جائے کہ اصلی سرفرازی نور یا نار سے پیدا ہونے میں نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری میں ہے۔ لہٰذا اُسے بھی اپنی انانیت کو ایک طرف رکھ کر ہمیشہ حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ ثانیاً، وہ یہ سمجھ لے کہ اُسے جب اللہ تعالیٰ نے یہ درجہ دیا ہے کہ فرشتوں نے اُس کو سجدہ کیا تو یہ بات کسی طرح اُس کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ کسی برتر سے برتر مخلوق کو بھی خدا کا شریک سمجھ کر اُس کی پرستش کرے۔ بندگی اور پرستش اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے۔ وہ اگر اِس حق میں کسی کو شریک کرتا ہے تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی اہانت نہیں کرتا، بلکہ خود اپنی بھی اہانت کرتا ہے۔

اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ص وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (٣٥) فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ

ابلیس[۸۴] کے سوا[۸۵]۔ اُس نے انکار کر دیا اور اکڑ بیٹھا اور اِس طرح منکروں میں شامل ہوا۔ اور ہم نے کہا: اے آدم، تم اور تمھاری بیوی، دونوں اِس باغ[۸۶] میں رہو اور اِس میں سے جہاں سے چاہو، فراغت کے ساتھ کھاؤ۔ ہاں، البتہ تم دونوں اِس درخت[۸۷] کے

---

۸۴ یہ 'ابلس' سے 'افعیل' کے وزن پر اُس جن کا لقب ہے جس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ 'ابلس' کے معنی مایوس اور غم زدہ ہونے کے ہیں۔ بعض لوگ اِسے فرشتہ سمجھتے ہیں، لیکن قرآن میں صراحت ہے کہ یہ جنات میں سے تھا۔

۸۵ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات چونکہ اپنی خلقت کے لحاظ سے فرشتوں سے زیادہ دور نہیں ہیں، اِس لیے اُنھیں جب سجدہ کا حکم دیا گیا تو علیٰ سبیل التغلیب جنات بھی اِس حکم میں شامل تھے۔

۸۶ یہ غالباً اِسی دنیا کا کوئی باغ تھا جسے آدم و حوا کا مستقر قرار دیا گیا۔ اِس میں جو امتحان اُنھیں پیش آیا، اُس سے دونوں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ شیطان اُن پر حملہ کرے گا تو کہاں سے کرے گا۔

۸۷ سورۂ طٰہٰ (۲۰) کی آیت ۱۲۰ میں اِسے 'شَجَرَةُ الْخُلْد' کہا گیا ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ لفظ 'اَلشَّجَرَة' یہاں مجازی مفہوم میں ہے۔ 'شَجَرَةُ الْخُلْد' کے لفظ سے جو معنی ظاہر ہوتے ہیں اور اِس درخت کا پھل کھانے کے جو اثرات قرآن کے دوسرے مقامات پر بیان ہوئے ہیں، دونوں اِس بات کی طرف صاف اشارہ کرتے ہیں کہ اِس سے مراد وہی شجرۂ تناسل ہے جس کا پھل کھانے کے باعث انسان اِس دنیا میں اپنے آپ کو باقی رکھے ہوئے ہے، لیکن آج بھی دنیا میں اُس کے لیے سب سے بڑی آزمایش اگر کوئی ہے تو یہی درخت ہے۔ سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۲۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان سب سے بڑھ کر اِسی کو فتنے کا ذریعہ بناتا ہے۔ اللہ تعالیٰ

عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ
عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿٣٦﴾ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ
مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿٣٧﴾ قُلْنَا

پاس نہ جانا، ورنہ ظالم ٹھیرو گے۔ پھر شیطان[۸۸] نے اُن کو وہاں سے پھسلا دیا[۸۹] اور جس حالت میں وہ تھے، اُس سے اُنھیں نکلوا کر چھوڑا۔ اور ہم نے کہا: (یہاں سے) اتر جاؤ[۹۰]، اب تم ایک دوسرے کے دشمن ہو[۹۱] اور تمھیں ایک خاص وقت تک زمین پر ٹھیرنا ہے اور وہیں گزر بسر کرنی ہے۔ پھر آدم نے اپنے پروردگار سے (توبہ کے) چند

نے میاں بیوی کو ایک دوسرے کے لیے لباس قرار دیا اور اُنھیں اجازت دی کہ وہ یہ لباس پہن کر اِس درخت کا پھل کھائیں، لیکن شیطان ہمیشہ اُنھیں اِس لباس کے بغیر ہی اِس کا پھل کھانے کی ترغیب دیتا رہتا ہے۔

۸۸۔ اِس سے مراد وہی ابلیس ہے جس کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا ہے۔

۸۹۔ اُس نے آدم و حوا سے کہا کہ حیات جاوداں اور ابدی بادشاہی کا راز اِسی درخت کے پھل میں ہے جس سے تمھیں محروم کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ترغیب سے وہ اِس پھل کی طرف متوجہ ہوئے اور اِس کی خواہش میں جو غیر معمولی کیفیت انسان پر طاری ہو جاتی ہے، اُس سے مغلوب ہو کر شیطان کے فریب میں آ گئے اور یہ پھل کھا بیٹھے۔

۹۰۔ اصل میں لفظ 'اِهْبِطُوْا' استعمال ہوا ہے۔ اِس میں 'اترو' کا مفہوم وہی ہے جو اِسی سورہ کی آیت ۶۱ کے الفاظ 'اِهْبِطُوْا مِصْرًا' میں ہے، یعنی اے آدم و حوا اور ابلیس، تم سب اِس باغ سے نکل کر زمین میں اتر جاؤ۔

۹۱۔ یعنی ابلیس تمھارا دشمن ہے اور تم اُس کے دشمن ہو۔ تمھارے اور اُس کے درمیان فطری تعلق دشمنی کا ہے، لہٰذا تم کو ہمیشہ اُسے اپنا دشمن ہی سمجھنا چاہیے۔

اهۡبِطُوۡا مِنۡهَا جَمِيۡعًا ۚ فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى فَمَنۡ تَبِعَ هُدَاىَ

الفاظ سیکھ لیے[۹۲] (اور اُن کے ذریعے سے توبہ کی[۹۳]) تو اُس پر اُس نے عنایت فرمائی اور اُس کو معاف کر دیا۔[۹۴] بے شک، وہی بڑا معاف فرمانے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔[۹۵]

---

۹۲ اِس سے اللہ تعالیٰ کی سنت معلوم ہوتی ہے کہ انسان جب گناہ کر لینے کے بعد ندامت اور شرمندگی کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ اُسے توبہ کی توفیق دیتا ہے، بلکہ اِس کے لیے موزوں الفاظ بھی اُس کے دل میں ڈال دیتا ہے۔ آدم علیہ السلام کو جو الفاظ اِس موقع پر اللہ تعالیٰ نے سکھائے، وہ سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۲۳ میں بیان ہوئے ہیں۔

۹۳ اِس لیے کہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے کوئی مجرم نہیں ہے۔ وہ اگر گناہ کرتا ہے تو اِس وجہ سے نہیں کرتا کہ وہ ازلی گناہ گار ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ و اختیار کی جو نعمت اُسے عطا فرمائی ہے، اُس کے سوءِ استعمال کی وجہ سے گناہ کرتا ہے۔ اِس گناہ سے اپنے آپ کو پاک کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے توبہ و اصلاح کا طریقہ اُسے بتایا ہے۔ اِس کے لیے کفارے کا کوئی عقیدہ وضع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۹۴ اصل الفاظ ہیں: 'فَتَابَ عَلَيۡهِ'۔ اِن میں 'عَلٰى' اِس بات پر دلیل ہے کہ یہ 'اقبل' کے مفہوم پر متضمن ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا التفات اور توجہ اُسے پھر حاصل ہو گئی۔ رحمت و عنایت کے اِس مضمون کو قرآن نے آگے 'اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ' کے الفاظ میں واضح کر دیا ہے۔

۹۵ اِس پورے واقعے سے معلوم ہوا کہ دنیا کی زندگی میں جو سب سے بڑا امتحان انسان کو پیش آئے گا، وہ انانیت اور جنسی جبلت کے راستے سے پیش آئے گا۔ پہلی صورت میں اُسے فرشتوں کا نمونہ سامنے رکھنا چاہیے جو ایک برتر مخلوق ہونے کے باوجود اللہ کے حکم پر اُس کے سامنے جھک گئے اور دوسری صورت میں اپنے باپ آدم کا نمونہ جو شیطان کے بہکانے پر جذبات میں بہ تو گئے، لیکن اِس کیفیت سے نکلتے ہی فوراً اپنے پروردگار کی طرف پلٹ آئے۔ چنانچہ اللہ نے

فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۳۸) وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۳۹)

ہم نے کہا: تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔[۹۶] پھر میری طرف سے اگر کوئی ہدایت تمھارے پاس آئے[۹۷] تو اُسی پر چلنا، اِس لیے کہ جو لوگ میری اِس ہدایت کی پیروی کریں گے، اُن کا صلہ جنت ہے، سو اُن کے لیے نہ وہاں کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ کبھی غم زدہ ہوں گے۔[۹۸] اور جنھوں نے (اِس کا) انکار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا، وہ دوزخ کے لوگ ہیں، وہ ہمیشہ اُسی میں رہیں گے۔ ۳۴-۳۹

اُن کی توبہ قبول کر لی اور اُنھیں برگزیدہ فرمایا۔

۹۶ یہ الفاظ دو مرتبہ دہرائے گئے ہیں۔ ایک مرتبہ آدم علیہ السلام کی لغزش کا ذکر کرنے کے بعد اور دوسری مرتبہ یہاں اُن کی توبہ کے بعد۔ لغزش کے بعد یہ اِس لغزش کا نتیجہ بیان کرنے کے لیے آئے ہیں اور توبہ کے بعد اِس بات کو واضح کرنے کے لیے کہ یہی امتحان اب تمھیں دنیا میں درپیش ہے، اِس لیے جاؤ، تمھاری لغزش اور توبہ سے وہ مقصد پورا ہو گیا جس کے لیے تم اِس باغ میں رکھے گئے تھے۔ تمھارا مستقر اب دنیا ہے اور تمھیں ایک خاص وقت تک اُسی میں رہنا ہے۔

۹۷ یعنی تم جس امتحان میں ڈالے گئے ہو، وہ بڑا سخت امتحان ہے۔ اِس میں تنہا اپنی عقل و فطرت کی رہنمائی سے تمھیں کامیابی میں مشکل ہو سکتی ہے۔ میری رحمت کا تقاضا ہے کہ اِس میں تمھاری ہدایت کا سامان کروں۔ لہٰذا میں یہ سامان کروں گا تاکہ جس نے ہدایت پانی ہے، وہ ہدایت پائے اور جس نے گم راہی کے راستے پر چلنا ہے، وہ پوری طرح اتمام حجت کے بعد چلے اور جزا و سزا کے دن اپنا کوئی عذر پیش نہ کر سکے۔

۹۸ قرآن مجید میں یہ الفاظ جنت کی تعبیر کے لیے خاص ہیں، یعنی ایسی جگہ جہاں نہ مستقبل کا

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿٤٠﴾ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ

(قرآن[99] تمھارے لیے یہی ہدایت لے کر آیا ہے، اِس لیے) اے بنی اسرائیل[100]، میری اُس نعمت[101] کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی تھی[102] اور میرے عہد کو پورا کرو، میں

کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ ماضی کا کوئی پچھتاوا۔ ’خوف‘ اور ’حزن‘ کے جو الفاظ اصل میں آئے ہیں، وہ اِسی مفہوم پر دلالت کرتے ہیں، اِس لیے کہ خوف کسی پیش آنے والے خطرے کا ہوتا ہے اور حزن رفتہ و حاضر کے کسی نقصان کا۔ دنیا کی زندگی، اِس کے برعکس، اگر دیکھیے تو مستقبل کے اندیشوں اور ماضی کے پچھتاووں ہی کا نام ہے۔

اِس سے واضح ہوا کہ انسان کا نصب العین ازل ہی سے جنت الفردوس ہے۔ وہ اِسی کو پانے کے لیے دنیا میں بھیجا گیا ہے، لہٰذا اُس کے تمام اعمال کا محرک یہی جنت ہے۔ وہ اگر اِس کی اصلی جگہ پر اِس کے حصول کی جدوجہد نہ بھی کر رہا ہو تو اِس سے بے پروا نہیں ہوسکتا۔ اپنے علم و عمل کی تمام صلاحیتیں وہ پھر اِسی دنیا میں اِسے پالینے کی جدوجہد میں صرف کر دیتا ہے۔ یہ چیز اُس کی فطرت میں ودیعت ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اِسی نصب العین کے لیے جیتا اور اِسی کے لیے مرتا ہے۔

۹۹ سورہ کی تمہید ختم ہوئی۔ اب یہاں سے اصل خطاب شروع ہوتا ہے۔ اِس میں پہلے یہود کو اُن کی وہ ذمہ داریاں یاد دلائی گئی ہیں جو تورات کی رو سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے متعلق اُن پر عائد ہوتی تھیں۔ اِس کے بعد اِس سلسلۂ بیان کے آخر تک یہ حقیقت اُن پر واضح کی گئی ہے کہ جزا و سزا کا قانون بالکل بے لاگ ہے، لہٰذا کسی گروہ سے تعلق اِس معاملے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ نجات کا فیصلہ ایمان اور عمل صالح کی بنیاد پر ہوگا۔ اِن کے سوا کوئی چیز بھی قیامت کے دن اُن کے کام نہ آسکے گی۔

۱۰۰ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ اِس کے معنی وہی ہیں جو عربی زبان میں لفظ ’عبد اللہ‘ کے ہیں۔

۱۰۱ اِس سے مراد شہادت علی الناس اور دنیا کی امامت کا وہ منصب ہے جس کے لیے بنی اسرائیل

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۖ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ

تمھارے عہد کو پورا کروں گا[۱۰۳]، اور مجھ ہی سے ڈرتے رہو[۱۰۴]۔ اور اِس (قرآن) پر

بالکل اُسی طرح منتخب کیے گئے، جس طرح اللہ تعالیٰ بنی آدم میں سے بعض ہستیوں کو نبوت و رسالت کے لیے منتخب کرتا ہے۔ اِس کے علاوہ جو نعمتیں اُنھیں عطا کی گئیں، وہ بھی تبعاً اِس میں شامل سمجھنی چاہییں، اِس لیے کہ وہ درحقیقت اِسی منصب کے لیے اُن کے انتخاب کا نتیجہ تھیں۔

۱۰۲ ’میری نعمت‘ اور ’جو میں نے تم پر کی تھی‘ کے الفاظ یہود کو اُن کی اِس حماقت پر متنبہ کرنے کے لیے آئے ہیں کہ وہ اِس نعمت کو اپنے پروردگار کی عنایت سمجھنے کے بجاے اپنے ذاتی اور خاندانی استحقاق کا ثمرہ سمجھتے تھے۔

۱۰۳ یعنی میرا وہ عہد جو میں نے تم سے اپنی شریعت کی پابندی اور اپنے آخری پیغمبر پر ایمان کے بارے میں لیا تھا اور تم سے وعدہ کیا تھا کہ اُس کو پورا کرو گے تو میں دنیا کی سب قوموں پر تمھیں سرفرازی عطا کروں گا۔ استثنا کے باب ۲۸ میں یہ عہد تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ اِس کا جو حصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہے، اُس کا ذکر استثنا میں اِس طرح ہوا ہے:

> ”خداوند تیرا خدا تیرے لیے، تیرے ہی درمیان سے، یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اُس کی سننا... میں اُن کے لیے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا، وہی وہ اُن سے کہے گا اور جو کوئی میری اُن باتوں کو، جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سنے تو میں اُن کا حساب اُس سے لوں گا۔“ (۱۸:۱۵-۱۸)

۱۰۴ اصل الفاظ ہیں: ’وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ‘۔ ’رهبة‘ کا لفظ لرزش اور کپکپی کی اُس حالت کے لیے آتا ہے جو کسی کی عظمت و جلالت کے تصور سے آدمی کے دل پر طاری ہوتی ہے۔ اِس جملے میں مفعول مقدم بھی ہے اور فعل کے بعد اُسے دہرایا بھی گیا ہے۔ اِسی طرح فعل پر حرف ’ف‘ بھی آیا ہے جس سے ’اما‘ اور اُس کی جزا کا مفہوم اِس میں پیدا ہو گیا ہے۔ عربیت کی رو سے جملے کی تالیف میں یہ سب چیزیں اہتمام و اختصاص پر دلیل ہیں۔ ’اور مجھ ہی سے ڈرتے رہو‘ —— مطلب یہ

ثَمَنًا قَلِيْلًا ز وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ
وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ

ایمان لاؤ جو میں نے اُس چیز کی تصدیق میں اتارا ہے جو تمھارے پاس ہے[۱۰۵]، اور سب سے پہلے تم ہی اِس کے منکر نہ بن جاؤ[۱۰۶]؛ اور تھوڑی قیمت کے عوض میری آیتیں نہ بیچو[۱۰۷]، اور میرے ہی غضب سے بچو[۱۰۸]؛ اور حق کو باطل سے نہ ملاؤ[۱۰۹]، (یہ حق کو چھپانے کی

ہے کہ تمام مصلحتوں اور اندیشوں سے قطع نظر کر کے تم پر صرف میری ہی عظمت و جلالت کا غلبہ ہونا چاہیے اور تمھیں صرف مجھ ہی سے ڈرنا چاہیے۔

[۱۰۵] یعنی آخری پیغمبر کے بارے میں تورات کی وہ پیشین گوئی جو یہود کے پاس تھی اور جسے قرآن نے سچی ثابت کر دیا اور اِس طرح یہ بات بھی ثابت کر دی کہ تورات فی الواقع اللہ پروردگارِ عالم ہی کی اتاری ہوئی کتاب ہے۔ 'مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ' کے جو الفاظ اصل میں آئے ہیں، اُن کا صحیح مفہوم یہی ہے۔

[۱۰۶] اصل میں 'وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِن میں 'افعل' کا مضاف الیہ مفرد ہے، اِس لیے یہ تمیز کے مفہوم میں ہے۔ اِس کی جگہ اگر 'اول الکافرین' کا اسلوب اختیار کیا جاتا تو اِس کے معنی یہ ہو جاتے کہ منکروں میں تم سب سے پہلے لوگ نہ بنو۔ 'اَوَّلَ كَافِرٍ' کے اسلوب میں یہ بات پیش نظر نہیں رہتی کہ اُن کے علاوہ کوئی دوسرے منکر بھی پائے جاتے ہیں یا نہیں۔ آیت کا مدعا یہ ہے کہ یثرب کی اِس بستی میں تمھیں اِس کتاب کے لیے پہلے مومن ہونا چاہیے تھا نہ کہ سب سے پہلے منکر، لیکن افسوس ہے کہ تم نے یہی دوسری صورت اپنے لیے پسند کی ہے، اِس لیے اب بھی سنبھل جاؤ اور سب سے پہلے اِس کتاب کے منکر نہ بنو۔

[۱۰۷] یعنی اپنے دنیوی مفادات کی خاطر خدا سے باندھے ہوئے سب عہد و پیمان مٹی میں نہ ملاؤ اور تورات کے احکام و ہدایات کو اِن مفادات پر قربان نہ کرو۔ آیت میں تھوڑی قیمت کے عوض

وَارۡكَعُوۡا مَعَ الرّٰكِعِيۡنَ ﴿۴۳﴾ اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ وَتَنۡسَوۡنَ

کوشش ہے) اور تم جانتے بوجھتے حق کو چھپانے کی کوشش نہ کرو[۱۱۰]؛ اور نماز کا اہتمام کرو اور

نہ بیچنے کے جو الفاظ آئے ہیں، اُن کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر زیادہ قیمت مل جائے تو بیچ سکتے ہو۔ اِس میں نہی کا تعلق اصل فعل سے ہے اور تھوڑی قیمت کے الفاظ اِس بات کو واضح کرتے ہیں کہ دین فروشی کا یہ کاروبار نہایت ذلیل طریقے سے ہو رہا ہے، اِس لیے کہ اللہ کی آیتوں کے مقابلے میں اگر دنیا کے سارے خزانے بھی حاصل ہو جائیں تو وہ ایک متاع حقیر ہی ہیں۔ جملے میں اِس طرح کی قیود سے کسی چیز کی شناعت کو واضح کرنے کا یہ اسلوب ہماری زبان میں بھی عام ہے۔

۱۰۸؎ 'وَاِيَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ' ہی کے طریقے پر یہاں اصل الفاظ ہیں: 'وَاِيَّایَ فَاتَّقُوۡنِ'، یعنی اصل ڈرنے کی چیز میرا غضب ہی ہے، مجھے ہر حال میں نرم نہ سمجھو، میرا غضب جب نازل ہوتا ہے تو اُس وقت کوئی نہیں ہوتا جو اُس سے چھڑانے کے لیے کھڑا ہو سکے۔ یہاں اور اِس سے آگے کی ایک آیت میں 'رهبة'، 'تقوٰی' اور 'خشوع' کے جو الفاظ آئے ہیں، استاذ امام امین احسن اصلاحی اُن کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

> ”...(یہ) سب ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔ کسی کے عظمت و جلال کے تصور سے دل پر جو لرزش اور کپکپی طاری ہوتی ہے، وہ رہبت ہے۔ اِس لرزش اور کپکپی سے صاحب عظمت و جلال کے لیے دل میں جو عجز و فروتنی اور پستی و نیازمندی کی حالت پیدا ہوتی ہے اور طبیعت میں بے نیازی کی جگہ فقر کا اور گھمنڈ کی جگہ اخبات کا جو احساس ابھرتا ہے، وہ خشوع ہے۔ اِسی طرح اُس صاحب عظمت و جلال کے قہر و غضب سے بچنے، اُس کے مقرر کردہ حدود کی مخالفت سے احتراز اور اُس کے احکام و ہدایات کی خلاف ورزی سے اجتناب و احتیاط کی جو بے چینی طبیعت میں پیدا ہوتی ہے اور جو خلوت و جلوت، ہر جگہ آدمی کو بیدار اور چوکنا رکھتی ہے، وہ تقوٰی ہے۔“ (تدبر قرآن ۱/ ۱۸۲)

۱۰۹؎ یہ اشارہ ہے اُن تصرفات کی طرف جو یہود نے تورات میں کر ڈالے تھے اور جن سے

اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاسْتَعِيْنُوْا

زکوٰۃ ادا کرو[۱۱۱]؛ اور اِن جھکنے والوں کے ساتھ تم بھی (خدا کے حضور میں) جھک جاؤ[۱۱۲]۔ کیا

اُن حقائق پر پردہ ڈالنا مقصود تھا جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی قربانی، اُن کی قربان گاہ اور اُن کے قبلہ کا تعلق سرزمین عرب سے ثابت کرتے تھے اور اِس طرح یہود کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے متعلق ایک قطعی حجت کی حیثیت رکھتے تھے۔

۱۱۰ اصل الفاظ ہیں: 'وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ'۔ یہ پچھلے جملے پر عطف ہے، لیکن اِس میں حرف 'لا' کا اعادہ نہیں کیا گیا، اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں ایک ہی حقیقت کا بیان ہیں۔ یہود نے حق کو باطل میں ملانے کی جو کوشش کی، اُس کا مقصود یہی کتمان حق تھا۔ وہ حق کو باطل میں اِسی لیے ملاتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تورات کی پیشین گوئیوں کو خلط ملط کر کے لوگوں کو غلط فہمی میں ڈال دیں۔

۱۱۱ نماز اور زکوٰۃ سے یہود پوری طرح واقف تھے۔ وہ اگرچہ اِنھیں عملاً ترک کر چکے تھے، اور اِسی بنا پر اُنھیں یہ دعوت دی گئی ہے، لیکن یہ اُن کے لیے کوئی اجنبی چیزیں نہ تھیں۔ خدا کی ہر شریعت میں اِنھیں بنیادی احکام کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ قرآن کے سب مخاطبین اِنھیں جانتے تھے۔ چنانچہ اِن کی ہیئت اور شرح و نصاب وغیرہ کے بارے میں کسی تفصیل کی ضرورت نہ تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن کی ابتدا نہیں کی۔ یہ پہلے سے جاری سنن تھیں جنھیں آپ نے قرآن مجید کی ہدایت کے مطابق تجدید و اصلاح کے بعد اپنی امت میں قائم رکھا ہے۔ یہاں اِن کا ذکر اِس لیے ہوا ہے کہ اِن آیات میں یہود کو اسلام کی دعوت دی گئی ہے اور قرآن اِس معاملے میں بالکل صریح ہے کہ اِن دونوں کے بغیر کسی شخص کا اسلام نہ دنیا میں قبول کیا جاتا ہے اور نہ آخرت میں۔

۱۱۲ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے جو بندے آج اللہ کی بندگی کی دعوت لے کر اٹھے ہیں اور مسجدوں میں شب و روز نماز کی صورت میں یہ بندگی کر رہے ہیں، تم بھی اِس بندگی میں اُن کے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ 'وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ' کے جو الفاظ اصل میں آئے ہیں، وہ نماز ہی کی

بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ لا الَّذِيْنَ

تم لوگوں کو نیکی[۱۱۳] کی تلقین کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، دراں حالیکہ تم کتاب الٰہی کی تلاوت کرتے ہو؟[۱۱۴] پھر کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟ اور (اِس راہ پر چلنے کے لیے) صبر[۱۱۵] اور نماز سے مدد چاہو[۱۱۶]، اور اِس میں شبہ نہیں کہ یہ سب بہت بھاری ہے[۱۱۷]، مگر

تعبیر ہیں۔ نماز کے اجزا، مثلاً قیام اور سجدہ وغیرہ کے الفاظ سے نماز کی تعبیر قرآن میں بعض دوسرے مقامات پر بھی کی گئی ہے۔ یہاں اِسے رکوع سے اِس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہود اپنی نمازوں میں رکوع کو فراموش کر چکے تھے۔ تمرد اور سرکشی کو چھوڑ کر قبول حق کی دعوت کا یہ اسلوب کہ 'اِن جھکنے والوں کے ساتھ تم بھی خدا کے حضور میں جھک جاؤ'، اگر غور کیجیے تو نہایت بلیغ اسلوب ہے۔

۱۱۳ اصل میں لفظ 'اَلْبِرّ' استعمال ہوا ہے۔ عربی زبان میں یہ وفاداری، ایفاے عہد اور اداے حقوق کے معنی میں آتا ہے۔ نیکی اور احسان کی تمام قسموں کے لیے یہ قرآن کی ایک جامع تعبیر ہے۔

۱۱۴ اِس سے واضح ہے کہ اِن آیات کے مخاطب اصلاً یہود کے عوام نہیں، بلکہ اُن کے علما اور اکابر ہیں۔ سیدنا مسیح علیہ السلام نے بھی اُن کی یہ حالت اِسی طرح بیان فرمائی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> "...اے شرع کے عالمو، تم پر بھی افسوس کہ تم ایسے بوجھ جن کو اٹھانا مشکل ہے، آدمیوں پر لادتے ہو اور آپ ایک انگلی بھی ان بوجھوں کو نہیں لگاتے۔" (لوقا ۱۱: ۴۶)

۱۱۵ 'صبر' کا لفظ عربی زبان میں اپنے آپ کو گھبراہٹ، پریشانی اور مایوسی سے بچا کر اپنے موقف پر قائم رکھنے کے معنی میں آتا ہے۔ بندہ جب پورے اطمینان قلب کے ساتھ ہر مشکل میں اپنے پروردگار سے وابستہ اور اپنے موقف پر ڈٹا رہے تو قرآن کی اصطلاح میں یہ 'صبر' ہے۔ قرآن نے اِسی سورہ کی آیت ۱۷۷ میں اِس کے تین مواقع ذکر کیے ہیں: غربت، بیماری اور جنگ۔ غور کیجیے تو تمام مصیبتوں کے سرچشمے یہی تین ہیں۔ آدمی اگر اِن میں متزلزل نہ ہو تو بے شک،

يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (۴۶)

اُن کے لیے بھاری نہیں ہے جو خدا سے ڈرنے والے ہیں،[۱۱۸] جنھیں خیال[۱۱۹] ہے کہ اُنھیں اپنے پروردگار سے ملنا ہے[۱۲۰] اور اُن کو (ایک دن) اُسی کی طرف پلٹ کر جانا بھی ہے۔[۱۲۱] ۴۰-۴۶

وہ صابرین میں سے ہے۔

۱۱۶ راہ حق کو اختیار کرنے اور اُس پر قائم رہنے کے لیے یہ قرآن کا بتایا ہوا طریقہ ہے۔ اللہ کی مدد کے بغیر کوئی شخص نہ اِس راہ کو اختیار کر سکتا ہے اور نہ اِس پر قائم رہ سکتا ہے، اور اللہ کی مدد صرف صبر اور نماز کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے۔ آدمی اگر ثابت قدمی کے ساتھ چلنے کا عزم کر لے اور نماز کا اہتمام رکھے تو اِس عزم کی قوت بہت بڑھ جاتی ہے۔ کسی مشکل سے مشکل صورت حال میں بھی اول تو اُس کے پاے استقلال میں لغزش پیدا نہیں ہوتی اور اگر حالات کی نزاکت سے کسی وقت پیدا ہو جائے تو اُس کا پروردگار خود آگے بڑھ کر اُسے سنبھال لیتا ہے۔

۱۱۷ اصل الفاظ ہیں: 'وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ'۔ اِن میں 'هَا' کا مرجع ہمارے نزدیک وہ سب باتیں ہیں جو اِس سلسلۂ بیان میں بنی اسرائیل سے کہی گئی ہیں۔ عربی زبان میں اِس طرح کے مواقع پر بالعموم ضمیر مونث ہی آتی ہے۔

۱۱۸ اصل میں 'اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قومی اور نسلی غرور کو چھوڑ کر حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا اگرچہ آسان نہیں ہے، لیکن آدمی میں خدا کی عظمت و جلالت کا احساس ہو، وہ اُس کے سامنے عجز و فروتنی اور پستی و نیازمندی کے جذبات رکھتا ہو، اُس کے نفس میں اخبات ہو اور وہ خدا کے مقابلے میں اپنے فقر و احتیاج کو سمجھتا ہو تو یہ چیز بہت سہل ہو جاتی ہے۔

۱۱۹ اصل میں لفظ 'يَظُنُّوْنَ' آیا ہے۔ عربی زبان میں یہ جس طرح یقین کے مقابلے میں گمان کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اُسی طرح کسی چیز کا خیال ہونے اور اُس کا اندیشہ رکھنے کے

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ
فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٧﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ

اے بنی اسرائیل، میری اُس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی تھی[۱۲۲] اور اِس بات کو کہ میں نے تمھیں دنیا والوں پر فضیلت دی تھی،[۱۲۳] اور اُس دن سے ڈرو،[۱۲۴] جب کوئی کسی

معنی میں بھی مستعمل ہے۔ اِس دوسرے معنی میں اِس کے ساتھ شک کا ہونا ضروری نہیں ہے۔

۱۲۰؎ اللہ سے ڈرنے والوں کی تعریف میں یہ بات اُن کے باطن کو نمایاں کرتی ہے۔ اِس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اگر خدا سے ڈرتے ہیں تو اِسی وجہ سے ڈرتے ہیں کہ آخرت میں خدا کے سامنے حاضری کا اندیشہ رکھتے ہیں۔

۱۲۱؎ یعنی وہ سمجھتے ہیں کہ مرنے کے بعد اُنھیں اُسی ایک پروردگار کے سامنے پیش ہونا ہے جو روز جزا کا تنہا مالک ہے، جس کے فیصلوں پر وہاں کوئی اثر انداز نہ ہو سکے گا، جس کے غضب سے اگر پناہ ملے گی تو اُسی کے دامن میں ملے گی۔ اُنھیں احساس ہے کہ اُن کا ہر قدم درحقیقت اُسی کی طرف اٹھتا ہے۔ وہ یہاں بھی اُسی کے ہیں اور وہاں بھی اُسی کے ہوں گے۔ کوئی دوسرا کہیں بھی اُن کے کام نہ آ سکے گا۔

۱۲۲؎ یہود کو از سر نو مخاطب کر کے یہ ایک مرتبہ پھر اُنھیں بتایا گیا ہے کہ دنیا میں جو کچھ فضیلت بھی تمھیں حاصل رہی ہے، محض اللہ تعالیٰ کی عنایت سے حاصل رہی ہے۔ اِس میں نہ تمھارے استحقاق کو کوئی دخل ہے اور نہ تمھاری خاندانی شرافت کو، اِس لیے اِس کے غرور میں مبتلا ہو کر اُس دعوت سے منہ نہ موڑو جو اِس وقت تمھارے سامنے پیش کی جا رہی ہے۔

۱۲۳؎ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے اور اُس اجمال کی وضاحت ہے جو لفظ نعمت میں موجود ہے، یعنی ساری دنیا کے لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمھیں یہ شرف بخشا کہ تم لوگوں پر میرے گواہ بنو اور میں تمھارے ساتھ ہو کر تمھارے ذریعے سے اُن پر اپنی حجت پوری کر دوں۔

نَفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ
وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٤٨﴾

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ
يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ

کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ اُس سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ اُس سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ لوگوں کو کوئی مدد ہی ملے گی[۱۲۵]۔ ۴۷-۴۸

اور یاد کرو، جب ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں[۱۲۶] سے چھڑایا۔ وہ تمھیں برے عذاب چکھاتے تھے، تمھارے[۱۲۷] بیٹوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ذبح کر دیتے تھے اور تمھاری

---

[۱۲۴] یعنی اِس دعوت کو قبول کرو اور اِس کے معاملے میں اُس دن سے ڈرو جس میں تمھیں اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔

[۱۲۵] یعنی اِس خیال میں نہ رہو کہ تم چونکہ ابراہیم اور اسحاق و یعقوب جیسے انبیا علیہم السلام کی اولاد ہو، اِس لیے روز قیامت تمھاری نجات کے لیے اِن بزرگوں کی نسبت ہی کافی ہے۔ یاد رکھو، وہاں عمل کے سوا کوئی چیز بھی تمھارے کام نہ آ سکے گی۔

[۱۲۶] اصل میں لفظ ’آل‘ استعمال ہوا ہے۔ اِس سے مراد محض اولاد نہیں ہوتی، بلکہ قرینہ موجود ہو تو عربی زبان میں یہ لفظ کسی بڑے آدمی کی اولاد، قوم، قبیلہ اور پیروکار، سب کو شامل ہوتا ہے۔

یہاں اور اِس کے بعد تاریخ بنی اسرائیل کے جن واقعات کی طرف اشارات کیے جا رہے ہیں، یہ اُن کی تاریخ کے نہایت مشہور واقعات ہیں جن سے اُن کا بچہ بچہ واقف تھا، اِس لیے اِن کی تفصیل کی ضرورت نہ تھی، پھر زمانۂ نزول قرآن کے بنی اسرائیل چونکہ اُنھیں اپنا سرمایۂ فخر و مباہات سمجھتے تھے، اِس بنا پر قرآن نے اُنھیں اِس طرح پیش کیا ہے کہ گویا یہ اُنھی کے ساتھ پیش آئے ہیں۔ اتمام حجت کے نقطۂ نظر سے یہ اسلوب، اگر غور کیجیے تو نہایت موثر ہے۔

مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿٤٩﴾

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿٥٠﴾

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ

عورتیں جیتی رکھتے تھے[۱۲۸] اور (تمھیں) اِس (عذاب سے چھڑانے) میں تمھارے پروردگار کی طرف سے (تمھارے لیے) بڑی عنایت تھی۔ ۴۹

اور یاد کرو، جب ہم نے تمھیں ساتھ لے کر دریا کو چیر دیا[۱۲۹] اور اِس طرح تمھیں بچالیا اور فرعون کے لوگوں کو تمھارے دیکھتے دیکھتے ہم نے اُسی دریا میں غرق کر دیا۔ ۵۰

۱۲۷۔ یہ اُس عذاب کی تفصیل ہے جس میں فرعونیوں کے ہاتھوں بنی اسرائیل مبتلا ہوئے اور جسے اِس آیت میں 'سُوْٓءَ الْعَذَابِ' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرعونی ہر طرح کے عذاب اُن کو دیتے تھے۔ قرآن نے یہ اُن میں سے سب سے بڑے عذاب کا ذکر کیا ہے۔

۱۲۸۔ اِس میں بلاغت کا یہ نکتہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ لڑکوں کو ذبح کرنے کا ذکر بیٹوں کے لفظ سے ہوا ہے اور لڑکیوں کے زندہ رکھنے کا ذکر کرتے ہوئے تمھاری عورتوں کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ پہلی تعبیر، اگر غور کیجیے، تو شفقت پدری کا جذبہ ابھارتی ہے اور دوسری غیرت کو حرکت میں لانے کا باعث بنتی ہے۔

۱۲۹۔ اصل میں 'فَرَقْنَا بِكُمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'ب' جس مفہوم پر دلالت کرتی ہے، اُسے کھول دیجیے تو گویا پوری بات یہ ہے کہ جس طرح کوئی کسی کو گود میں اٹھا کر دریا پار کرا دے، اُسی طرح ہم نے تمھیں ساتھ لے کر دریا کو پھاڑتے ہوئے اُس کے پار کرا دیا۔

مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٥٢﴾

اور یاد کرو، جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ ٹھیرایا[۱۳۰]۔ پھر اُس کے پیچھے تم نے وہ بچھڑا[۱۳۱] بنا لیا اور اُس وقت تم اپنی جانوں پر ظلم ڈھا رہے تھے۔ پھر اِس کے بعد بھی ہم نے تمھیں معاف کر دیا، اِس لیے کہ تم شکر کرنے والے بن جاؤ۔ ۵۱-۵۲

۱۳۰؎ یہ اُس وعدے کی طرف اشارہ ہے جو دریا پار کر لینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنی شریعت دینے کے لیے فرمایا۔ چالیس راتوں کی یہ مدت اُس ذہنی اور قلبی تیاری کے لیے تھی جو کتاب الٰہی کا حامل بننے کے لیے ضروری تھی۔ پہلے یہ وعدہ تیس دنوں کا تھا، لیکن سیدنا موسیٰ علیہ السلام وقت مقررہ سے پہلے پہنچ گئے۔ اُن کی اِس جلد بازی کے باعث اللہ تعالیٰ نے اُن کی تربیت کے لیے یہ مدت تیس دنوں سے بڑھا کر چالیس دن کر دی۔ سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۱۴۲ میں اللہ تعالیٰ نے اِس کی وضاحت فرما دی ہے۔

۱۳۱؎ بائیبل کی کتاب خروج میں بچھڑا بنانے کا یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ یہود نے اگرچہ اِس میں سیدنا ہارون علیہ السلام کو بھی ملوث کر دیا ہے، لیکن قرآن نے دوسری جگہ اِس کی تردید کر دی ہے:

> ”اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ نے پہاڑ سے اترنے میں دیر لگائی تو وہ ہارون کے پاس جمع ہو کر اُس سے کہنے لگے کہ اٹھ ہمارے لیے دیوتا بنا دے جو ہمارے آگے آگے چلے، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اِس مرد موسیٰ کو جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا، کیا ہو گیا... تب خداوند نے موسیٰ کو کہا: نیچے جا کیونکہ تیرے لوگ جن کو تو ملک مصر سے نکال لایا، بگڑ گئے ہیں۔ وہ اُس راہ سے، جس کا میں نے اُن کو حکم دیا تھا، بہت جلد پھر گئے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے لیے ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا اور اُسے پوجا اور اُس کے لیے قربانی چڑھا کر یہ بھی کہا کہ اے اسرائیل یہ تیرا وہ دیوتا ہے جو

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾
وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ
بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ

اور یاد کرو، جب ہم نے موسیٰ کو کتاب، یعنی (حق و باطل کے لیے) فرقان عطا فرمائی،[۱۳۲] اِس لیے کہ (اِس کے ذریعے سے) تم ہدایت حاصل کرو۔ ۵۳

اور یاد کرو، جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: میری قوم کے لوگو، تم نے یہ بچھڑا بنا کر اپنے اوپر ظلم کیا ہے، اِس لیے اب اپنے خالق[۱۳۳] کی طرف لوٹو اور (اِس کے لیے) اپنے اِن لوگوں کو (اپنے ہاتھوں سے) قتل کرو۔[۱۳۴] یہ تمھارے لیے تمھارے پیدا

تجھ کو ملک مصر سے نکال کر لایا اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ میں اِس قوم کو دیکھتا ہوں کہ یہ گردن کش قوم ہے۔ اِس لیے تو مجھے اب چھوڑ دے کہ میرا غضب اِن پر بھڑکے اور میں اِن کو بھسم کر دوں۔'' (۳۲:۱-۱۰)

[۱۳۲] اصل الفاظ ہیں: 'اِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ'۔ اِن میں 'الْفُرْقَانَ' سے پہلے 'وٗ' تفسیر کے لیے ہے، یعنی وہ کتاب جو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہے تاکہ لوگ اُس کی روشنی میں دین سے متعلق اپنے اختلافات کا فیصلہ کر سکیں۔ اِسی سورہ کی آیت ۲۱۳ میں قرآن مجید نے وضاحت فرمائی ہے کہ تورات، انجیل، قرآن، یہ سب صحیفے اِسی مقصد کے پیش نظر نازل کیے گئے ہیں۔ سورۂ حدید (۵۷) کی آیت ۲۵ میں یہی بات 'لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ' کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے، یعنی اِن کے ذریعے سے لوگ حق کے معاملے میں ٹھیک انصاف پر قائم ہو جائیں۔

[۱۳۳] اصل میں لفظ 'بَارِئِكُمْ' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے اور خالق کے مفہوم میں اگرچہ باریک سا فرق ہے، لیکن عام استعمال میں دونوں ایک دوسرے کی جگہ آجاتے ہیں۔

لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ط فَتَابَ عَلَيْكُمْ ط اِنَّهٗ هُوَالتَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

کرنے والے کے نزدیک بہتر ہے۔[۱۳۵] چنانچہ تم نے یہ کیا تو اُس نے تم پر عنایت فرمائی اور تم کو معاف کر دیا۔ بے شک، وہی بڑا معاف کرنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۵۴

۱۳۴؎ اصل الفاظ ہیں: 'فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ'۔ عربی زبان میں اِس جملے کے معنی اپنے آپ کو قتل کرنے کے بھی ہو سکتے ہیں اور اپنے لوگوں کو قتل کرنے کے بھی۔ رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُن کی قوم کے لوگ اگر کفر و شرک پر اصرار کریں تو قرآن کی رو سے اِس جرم کی انتہائی سزا موت ہے۔ اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگوں نے جب پیغمبر کی موجودگی میں شرک کا ارتکاب کیا تو یہی سزا اُن پر نافذ کی گئی اور اُن کے موحدین اِس کے نفاذ پر مامور کیے گئے۔ اُنھیں حکم دیا گیا کہ بچھڑے کو الٰہ بنانے والوں کی گردنیں مار دیں تاکہ اہل ایمان کی آزمایش ہو اور بنی اسرائیل کی جماعت کو مجرموں سے پاک کر دیا جائے۔ بائیبل کی کتاب خروج کے باب ۳۲ میں یہ واقعہ اِس طرح بیان ہوا ہے:

> "...موسیٰ نے لشکر گاہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا جو خداوند کی طرف ہے (یعنی اپنے ایمان پر قائم ہے)، وہ میرے پاس آجائے۔ تب سب بنی لاوی اُس کے پاس جمع ہو گئے اور اُس نے اُن سے کہا کہ خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی اپنی ران سے تلوار لٹکا کر پھاٹک پھاٹک گھوم گھوم کر سارے لشکر گاہ میں اپنے اپنے بھائیوں اور اپنے اپنے ساتھیوں اور اپنے اپنے پڑوسیوں کو قتل کرتے پھرو اور بنی لاوی نے موسیٰ کے کہنے کے موافق عمل کیا۔ چنانچہ اُس دن لوگوں میں سے قریباً تین ہزار مرد کھیت آئے اور موسیٰ نے کہا کہ آج خداوند کے لیے اپنے آپ کو مخصوص کرو، (یعنی اپنے ایمان کی تجدید کرو)، بلکہ ہر شخص اپنے ہی بیٹے اور اپنے ہی بھائی کے خلاف ہو تاکہ وہ تم کو آج ہی برکت دے۔" (۲۶-۲۹)

۱۳۵؎ یعنی ہو سکتا ہے کہ تم اِسے بہت بڑا ظلم اور اپنی قوم کا نقصان خیال کرو، لیکن تمھارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمھارے لیے یہی بہتر ہے۔ اولاً، اِس لیے کہ شہادت حق کے جس

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً
فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿٥٥﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٥٦﴾ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ

اور یاد کرو، جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ، ہم تمھاری بات کا ہرگز یقین نہ کریں گے، جب تک ہم خدا کو سامنے نہ دیکھ لیں[۱۳۶]۔ اِس پر تم کو کڑک[۱۳۷] نے آلیا اور تم دیکھتے رہ گئے۔ پھر تمھاری اِس موت[۱۳۸] کے بعد ہم نے تمھیں اٹھا کھڑا کیا، اِس لیے کہ تم

منصب پر تمھیں فائز کیا جا رہا ہے، اِس کے لیے تمھاری جماعت کی تطہیر ضروری ہے۔ ثانیاً، یہ قتل عام تمھارے اندر خدا کی دینونت صغریٰ کا ظہور ہے جو توحید کے معاملے میں تمھیں ہمیشہ متنبہ رکھے گا۔ ثالثاً، اِس جرم کا ارتکاب تمھاری غفلت کی وجہ سے ہوا ہے۔ لہٰذا اِس کا کفارہ بھی ادا ہونا چاہیے۔ اِس سے توقع ہے کہ تمھارا گناہ معاف ہو جائے گا اور تمھارے پروردگار کی رحمتیں اور برکتیں ایک مرتبہ پھر تمھیں حاصل ہو جائیں گی۔

[۱۳۶] اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی خواہش اگر شرح صدر اور اطمینان قلب کے لیے ہو تو کوئی قابل ملامت چیز نہیں ہے، لیکن بنی اسرائیل کا یہ مطالبہ محض اُن کی بے یقینی اور تشکیک کا مظاہرہ اور انکار و تکذیب کا بہانہ تھا۔ اُنھیں کسی طرح اِس بات کا یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرماتے ہیں۔ لہٰذا اُن پر عتاب ہوا۔

[۱۳۷] اصل میں لفظ 'صَاعِقَة' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی گرج اور کڑک کے بھی ہیں اور اُس بجلی کے بھی جو کڑک کے ساتھ گرتی ہے۔ سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۱۵۵ میں یہی واقعہ 'فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ 'رَجْفَة' کے معنی زلزلے کے ہیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے مطالبے پر اللہ تعالیٰ کی تجلی 'صَاعِقَة' کی صورت میں ظاہر ہوئی اور اُس نے سارے پہاڑ میں ایسا زلزلہ ڈال دیا کہ وہ بالکل بدحواس ہو کر گر پڑے۔

وَالسَّلْوٰی ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ

شکر گزار بن کر رہو۔ اور تم پر بدلیوں کا سایہ کیا اور تم پر منؔ[۱۳۹] وسلویٰ[۱۴۰] اتارے، کھاؤ یہ

---

۱۳۸ عربی زبان میں موت کا لفظ، اگر قرینہ موجود ہو تو نیند اور بے ہوشی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں جس موقع پر یہ لفظ آیا ہے اور جس طرح آیا ہے، اُس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ یہ بے ہوشی ہی کے معنی میں ہے۔ بنی اسرائیل اگرچہ اپنی سرکشی کے باعث اِس کے مستحق تو نہ تھے کہ اِس موت سے پھر زندگی کی طرف لوٹتے، لیکن سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۱۵۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اس موقع پر اِس دل سوزی سے اُن کے لیے معافی کی درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے قبول فرمالیا۔

۱۳۹ یہ شبنم کی طرح کی ایک چیز تھی جو زمین پر ٹپکتی تھی اور پالے کے دانوں کی طرح جم جاتی تھی۔ بنی اسرائیل اِسے سورج کی تمازت بڑھنے سے پہلے جمع کر لیتے تھے۔ تمازت بڑھتے ہی یہ دانے پگھل جاتے تھے۔ ایک بے آب و گیاہ صحرا میں جہاں غذا کے اسباب مفقود تھے، یہ ایک عظیم نعمت تھی جو بغیر کوئی مشقت اٹھائے بنی اسرائیل کو خدا کے حکم پر پیغمبر کے ساتھ ہجرت کرنے کے صلے میں حاصل ہوئی۔ 'مَنّ' کے معنی فضل و عنایت کے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اِسی مناسبت سے اِس کا نام 'مَنّ' قرار پایا۔ بائیبل کی کتاب خروج میں اِس کی تفصیل اِس طرح بیان ہوئی ہے:

> "...اور صبح کو خیمہ گاہ کے آس پاس اوس پڑی ہوئی تھی اور جب وہ اوس جو پڑی تھی سوکھ گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول گول چیز، ایسی چھوٹی جیسے پالے کے دانے ہوتے ہیں، زمین پر پڑی ہے۔ بنی اسرائیل اُسے دیکھ کر آپس میں کہنے لگے: مَن؟ کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا ہے۔ تب موسیٰ نے اُن سے کہا: یہ وہی روٹی ہے جو خداوند نے کھانے کو تم کو دی ہے... اور وہ ہر صبح کو اپنے اپنے کھانے کی مقدار کے مطابق جمع کر لیتے تھے اور دھوپ تیز ہوتے ہی وہ پگھل جاتا تھا۔" (۱۶: ۱۳-۲۱)

۱۴۰ اِس سے مراد وہ پرندے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے صحراے سینا میں بنی اسرائیل کے لیے بھیجے،

كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٥٧﴾
وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا

پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تمھیں دی ہیں۔[۱۴۱] (افسوس کہ جن پر یہ عنایت ہوئی، اُنھوں نے اِس کی ناقدری کی) اور (اِس طرح) اُنھوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا، بلکہ اپنے ہی اوپر ظلم کرتے رہے۔[۱۴۲] ۵۵-۵۷

اور یاد کرو، جب ہم نے کہا کہ اِس بستی[۱۴۳] میں داخل ہو جاؤ، پھر اِس میں سے جہاں

یہ بٹیروں سے ملتے جلتے تھے اور بٹیروں ہی کی طرح نہایت آسانی سے شکار ہو جاتے تھے۔ کتاب خروج میں ہے:

> ”اور بنی اسرائیل کہنے لگے: کاش کہ ہم خداوند کے ہاتھ سے ملک مصر میں جب ہی مار دیے جاتے، جب ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھ کر دل بھر کر روٹی کھاتے تھے، کیونکہ تم تو ہم کو اِس بیابان میں اِسی لیے لے آئے ہو کہ سارے مجمع کو بھوکا مارو... اور خداوند نے موسیٰ سے کہا: میں نے بنی اسرائیل کا بڑبڑانا سن لیا ہے، سو تو اُن سے کہہ دے کہ شام کو تم گوشت کھاؤ گے اور صبح کو تم روٹی سے سیر ہو گے اور تم جان لو گے کہ میں خداوند تمھارا خدا ہوں اور یوں ہوا کہ شام کو اتنی بٹیریں آئیں کہ اُن کی خیمہ گاہ کو ڈھانک لیا۔“ (۱۶: ۳-۱۳)

[۱۴۱] مطلب یہ ہے کہ یہ نعمتیں گویا زبان حال سے دعوت دیتی تھیں کہ اپنے پروردگار کی اِس عنایت سے فائدہ اٹھاؤ اور اُس کے شکر گزار بن کر رہو۔

[۱۴۲] یہ آخری بات اوپر کی باتوں کی طرح یہود کو براہ راست مخاطب کر کے نہیں کہی گئی، بلکہ اُن سے منہ پھیر کر غائب کے صیغے میں کہی گئی ہے۔ قرآن مجید میں یہ اسلوب بالعموم متکلم کی طرف سے اظہار بے زاری کے موقع پر اختیار کیا جاتا ہے۔

[۱۴۳] اصل میں لفظ ’اَلْقَرْيَة‘ استعمال ہوا ہے۔ اِس کے استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ

وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَسَنَزِيْدُ
الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ
فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾

سے چاہو، مزے سے کھاؤ اور (یاد رکھو کہ) اِس کے دروازے[۱۴۴] میں (عجز کے ساتھ) سر جھکائے ہوئے داخل ہونا[۱۴۵] اور دعا کرنا کہ (پروردگار)، ہمارے گناہ بخش دے[۱۴۶]، ہم تمھارے گناہ بخش دیں گے اور (تم میں سے) وہ لوگ جو اچھا رویہ اختیار کریں گے، اُن پر عنقریب ہم اور بھی عنایت فرمائیں گے۔ پھر جو بات اُن سے کہی گئی تھی،

جس طرح چھوٹے دیہات کے لیے مستعمل ہے، اُسی طرح بڑے بڑے شہروں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں اِس سے مراد سرزمین فلسطین ہی کا کوئی شہر ہے، اِس لیے کہ آگے 'فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا' کے جو الفاظ آئے ہیں، وہ اِسی سرزمین کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں۔

[۱۴۴] اصل الفاظ ہیں: 'وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا'۔ 'الْقَرْيَة' کے بعد 'الْبَاب' کا لفظ جس طرح یہاں آیا ہے، اِس سے عربیت کی رو سے بستی کا دروازہ ہی مراد ہو سکتا ہے۔ اِسے 'خیمۂ عبادت کا دروازہ' کے معنی میں لینے کے لیے کوئی قرینہ نہیں ہے۔

[۱۴۵] اِس مفہوم کے لیے اصل میں 'سُجَّدًا' کا لفظ آیا ہے۔ صاف واضح ہے کہ اِس سے مراد یہاں سر جھکانا ہے۔ قرآن کی یہ آیت دلیل ہے کہ 'سجد' عربی زبان میں جس طرح زمین پر پیشانی رکھ دینے کے معنی میں آتا ہے، اُسی طرح محض سر جھکا دینے کے معنی میں بھی آتا ہے۔

[۱۴۶] اصل الفاظ ہیں: 'قُوْلُوْا حِطَّةٌ'۔ اِن میں 'حِطَّةٌ' ایک جملے کا قائم مقام ہے، یعنی 'مسئلتنا حطة'۔ 'حطة' 'حط يحط' سے ہے جس کے معنی جھاڑ دینے کے ہیں۔ یہاں اِس سے مراد گناہوں کا جھاڑ دینا ہے۔ عربی اور عبرانی چونکہ قریب الماخذ زبانیں ہیں، اِس وجہ سے گمان ہوتا ہے کہ عبرانی میں بھی یہ جھاڑ دینے اور بخش دینے کے مفہوم میں مستعمل رہا ہے۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ
فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ

ظالموں نے اُسے ایک دوسری بات سے بدل دیا۔[۱۴۷] چنانچہ اِن ظلم کرنے والوں پر ہم نے آسمان سے عذاب اتارا،[۱۴۸] اُن نافرمانیوں کے باعث جو وہ کر رہے تھے۔ ۵۸-۵۹

اور یاد کرو، جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دعا کی تو ہم نے کہا: اپنی لٹھیا اِس پتھر پر مارو۔ (اُس نے ماری) تو اُس سے بارہ چشمے بہ نکلے،[۱۴۹] اِس طرح کہ ہر گروہ

---

[۱۴۷] یعنی بنی اسرائیل کے کچھ بدبختوں نے 'حِطَّةٌ' کے لفظ کو جو استغفار اور توبہ کا کلمہ تھا، اِس سے بالکل مختلف مفہوم رکھنے والے کسی لفظ سے بدل لیا۔ 'بَدَّلَ' کا جو لفظ اصل میں استعمال ہوا ہے، یہ جب اپنے دو مفعولوں کے ساتھ آتا ہے تو اِس کے معنی ایک چیز کی جگہ دوسری چیز کو رکھ دینے کے ہوتے ہیں۔ لفظ کی یہ نوعیت پیش نظر رہے تو اِسے محض رویے کی تبدیلی کے معنوں میں نہیں لیا جا سکتا۔ اِس کے صاف معنی یہی ہیں کہ اُنھوں نے اِس لفظ کو کسی دوسرے لفظ سے تبدیل کر دیا۔

[۱۴۸] اِس عذاب کے لیے 'آسمان سے عذاب' کی یہ تعبیر اُسی طرح اختیار کی گئی ہے، جس طرح کسی ہول ناک آفت کو قہر آسمانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بنی اسرائیل پر یہ عذاب غالباً ارض فلسطین کے قریب ایک شہر شطیم میں آیا۔ بائیبل کا بیان ہے کہ اِس شہر میں اُنھوں نے موآبی عورتوں سے بدکاریاں کیں، اُن کی دعوت پر مشرکانہ قربانیوں میں شریک ہوئے اور اِس طرح گویا بالواسطہ اُن کے دیوتا بعل فغور کی پرستش میں اُن کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اِن جرائم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے اُن پر ایک سخت وبا بھیجی جس میں اُن کے چوبیس ہزار مرد و زن ہلاک ہوئے۔

[۱۴۹] بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ پتھر کی چٹان سے پانی بہ نکلنے کا یہ واقعہ دشت صین میں پیش آیا ہے۔ گنتی میں ہے:

"اور پہلے مہینے میں بنی اسرائیل کی ساری جماعت دشت صین میں آ گئی اور وہ لوگ قادس

کُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰہِ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ﴿۶۰﴾

نے اپنے لیے پانی لینے کی جگہ متعین کر لی[۱۵۰]۔ اللہ کی اِس روزی سے کھاؤ اور پیو[۱۵۱]، (اے بنی اسرائیل)، اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ ۶۰

> میں رہنے لگے... اور جماعت کے لوگوں کے لیے وہاں پانی نہ ملا۔ سو وہ موسیٰ اور ہارون کے برخلاف اکٹھے ہوئے۔ اور لوگ موسیٰ سے جھگڑنے اور یہ کہنے لگے: ہائے کاش، ہم بھی اُسی وقت مر جاتے، جب ہمارے بھائی خداوند کے حضور مرے۔ تم خداوند کی جماعت کو اِس دشت میں کیوں لے آئے ہو کہ ہم بھی اور ہمارے جانور بھی یہاں مریں؟ اور تم نے کیوں ہم کو مصر سے نکال کر اِس بری جگہ پہنچایا ہے؟ یہ تو بونے کی اور انجیروں اور تاکوں اور اناروں کی جگہ نہیں ہے، بلکہ یہاں تو پینے کے لیے پانی تک میسر نہیں اور موسیٰ اور ہارون جماعت کے پاس سے جا کر خیمۂ اجتماع کے دروازے پر اوندھے منہ گرے۔ تب خداوند کا جلال اُن پر ظاہر ہوا اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اِس لاٹھی کو لے اور تو اور تیرا بھائی ہارون، تم دونوں جماعت کو اکٹھا کرو اور اُن کی آنکھوں کے سامنے اِس چٹان سے کہو کہ وہ اپنا پانی دے اور تو اُن کے لیے چٹان ہی سے پانی نکالنا۔ یوں جماعت کو اور اُن کے چوپایوں کو پلانا۔ چنانچہ موسیٰ نے خداوند کے حضور سے اِسی حکم کے مطابق وہ لاٹھی لی اور موسیٰ اور ہارون نے جماعت کو اُس چٹان کے سامنے اکٹھا کیا اور اُس نے اُن سے کہا: سنو، اے باغیو، کیا ہم تمھارے لیے اِسی چٹان سے پانی نکالیں؟ تب موسیٰ نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اُس چٹان پر دو بار لاٹھی ماری اور کثرت سے پانی بہ نکلا اور جماعت نے اور اُن کے چوپایوں نے پیا۔'' (۲۰:۱-۱۱)

[۱۵۰] بنی اسرائیل کے بارہ خاندان تھے۔ چنانچہ جب بارہ چشمے پھوٹے تو ہر خاندان نے اُن پر اپنا گھاٹ الگ متعین کر لیا اور یہ اندیشہ نہ رہا کہ اُن کے درمیان پانی لینے پر کوئی جھگڑا برپا ہو۔

[۱۵۱] یہاں یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ پیچھے من و سلویٰ کے ذکر کے بعد صرف 'کُلُوْا' (کھاؤ) کا لفظ آیا

وَاِذۡ قُلۡتُمۡ يٰمُوۡسٰى لَنۡ نَّصۡبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادۡعُ لَنَا
رَبَّكَ يُخۡرِجۡ لَنَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ مِنۡۢ بَقۡلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوۡمِهَا
وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسۡتَبۡدِلُوۡنَ الَّذِىۡ هُوَ اَدۡنٰى بِالَّذِىۡ
هُوَ خَيۡرٌ ؕ اِهۡبِطُوۡا مِصۡرًا فَاِنَّ لَكُمۡ مَّا سَاَلۡتُمۡ ؕ وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ

اور یاد کرو، جب تم نے کہا: اے موسیٰ، ہم ایک ہی کھانے پر ہرگز صبر نہ کریں گے[۱۵۲]۔ سو ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کرو کہ یہ سبزی، ککڑی، لہسن[۱۵۳]، مسور اور پیاز جو زمین اگاتی ہے، وہ اِن چیزوں میں سے ہمارے لیے نکال کر لائے[۱۵۴]۔ اُس نے

ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُس وقت تک صرف غذا ہی کا اہتمام ہوا تھا۔ اُس کے ساتھ جب پانی کا اہتمام بھی اِس فراوانی کے ساتھ ہو گیا تو اب 'کُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا' کے الفاظ آئے ہیں، یعنی کھاؤ اور پیو۔

[۱۵۲] یعنی ہر روز من و سلویٰ ہی کھاتے رہیں، یہ ہمارے لیے ممکن نہیں ہے، لذت کام و دہن جس تنوع کا تقاضا کرتی ہے، اُس کی کوئی صورت اِس صحرا میں بھی پیدا ہونی چاہیے۔

[۱۵۳] اِس کے لیے اصل میں 'فُوۡم' کا لفظ آیا ہے۔ یہ اور 'ثوم' ایک ہی چیز ہے۔ لہسن کے لیے یہ لفظ اِس قدر معروف ہے کہ اِس سے روٹی یا گندم اور غلہ وغیرہ کسی طرح مراد نہیں لے سکتے۔

[۱۵۴] بنی اسرائیل کے اِس مطالبے کا ذکر بائیبل کی کتاب گنتی میں اِس طرح ہوا ہے:

> ''اور جو ملی جلی بھیڑ اُن لوگوں میں تھی، وہ طرح طرح کی حرص کرنے لگی اور بنی اسرائیل بھی پھر رونے اور کہنے لگے کہ ہم کو کون گوشت کھانے کو دے گا؟ ہم کو وہ مچھلی یاد آتی ہے جو ہم مصر میں مفت کھاتے تھے اور ہائے وہ کھیرے اور وہ خربوزے اور وہ گندنے اور پیاز اور لہسن۔ لیکن اب تو ہماری جان خشک ہو گئی۔ یہاں کوئی چیز میسر نہیں اور من کے سوا ہم کو کچھ اور دکھائی نہیں دیتا۔'' (۱۱: ۴-۶)

الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ق وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا
يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط ذٰلِكَ

کہا: تم ایک بہتر چیز کو کم تر چیزوں سے بدلنا چاہتے ہو؟[۱۵۵] اچھا تو جاؤ، کسی مصر ہی میں جا رہو۔[۱۵۶] اِس لیے کہ یہ جو کچھ تم مانگتے ہو، وہاں تم کو مل جائے گا۔ (وہ یہی کرتے رہے) اور اُن پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی[۱۵۷] اور وہ اللہ کا غضب کما لائے[۱۵۸]۔ یہ

---

۱۵۵ یعنی یہ من و سلویٰ کی غذا جو تمھیں فرعونیوں کی غلامی اور ذلت کی زندگی سے بالکل آزاد ہو کر مل رہی ہے، اِسے چھوڑ کر تم زبان کے اِن چٹخاروں کے لیے بے تاب ہو رہے ہو؟ تمھیں احساس نہیں ہے کہ آزادی اور حریت کے ساتھ ملنے والی خشک روٹی بھی تمام الوان نعمت اور دنیا کی تمام لذتوں سے بڑھ کر ہے۔

۱۵۶ اصل الفاظ ہیں: 'اِهْبِطُوْا مِصْرًا'۔ 'هبط' کے معنی صرف اوپر سے نیچے گرنے ہی کے نہیں ہیں، یہ کسی منزل میں اترنے یا کسی بستی میں داخل ہونے کے لیے بھی عام مستعمل ہے۔ 'مصر' کا لفظ ملک مصر ہی کے لیے آیا ہے۔ یہ چونکہ غیر منصرف آتا ہے، اِس لیے تنوین نے اِس میں یہاں 'کسی مصر' کے معنی پیدا کر دیے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اِن چٹخاروں کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتے تو پھر جاؤ، کسی مصر ہی کے شکنجے میں اپنی گردن دو، وہاں یہ چیزیں تمھیں میسر ہو جائیں گی۔

۱۵۷ اصل میں 'ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ' کے الفاظ آئے ہیں، یعنی اُن پر ذلت اور پست ہمتی مار دی گئی۔ گویا دیوار پر جس طرح گیلی مٹی تھوپ دی جاتی ہے، اُسی طرح اُن کے جرائم کی پاداش میں ذلت، بے بسی اور بدحالی اُن پر تھوپ دی گئی۔

۱۵۸ اصل میں 'وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ' کے جو الفاظ آئے ہیں، اُن کا مفہوم ہے: اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے۔ یعنی اپنی عنایتوں سے بہرہ یاب ہونے کے جو مواقع اللہ تعالیٰ نے

بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٦١﴾

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ

اِس وجہ سے ہوا کہ وہ اللہ کی آیتوں کو نہیں مانتے تھے اور اُس کے نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ اِس وجہ سے ہوا کہ اُنھوں نے نافرمانی کی اور وہ (اللہ کی ٹھیرائی ہوئی) کسی حد پر نہ رہتے تھے[١٥٩]۔ ٦١

(سو جزا و سزا کا قانون بالکل بے لاگ ہے، اِس لیے) وہ[١٦٠] لوگ جو (نبی امی

اُنھیں فراہم کیے، وہ اپنی نالائقیوں کے باعث اُن مواقع پر لعنت اور پھٹکار لے کر واپس آئے۔

[١٥٩] یعنی یہ ذلت اور مسکنت اِس لیے اُن پر تھوپ دی گئی کہ اُنھوں نے پے در پے جرائم کا ارتکاب کیا اور اپنی سرکشی اور تعدی کے باعث ہر حد توڑ دی، یہاں تک کہ اللہ کے نبیوں تک کو قتل کر ڈالا۔ یہوداہ میں اُن کے بادشاہ یوآس کے حکم سے زکریا علیہ السلام کو عین ہیکل میں مقدس اور قربان گاہ کے درمیان سنگ سار کیا گیا۔ اُنھی کے فرماں روا ہیرودیس کے حکم سے یحییٰ علیہ السلام کا سر ایک تھال میں رکھ کر اُس کی معشوقہ کی نذر کر دیا گیا۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کو بھی اُنھوں نے اپنے زعم کے مطابق سولی پر چڑھا دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں اُن کے شر سے محفوظ رکھا۔ پھر یہی نہیں، اِس بدترین جرم کا ارتکاب اُنھوں نے 'بِغَيْرِ الْحَقِّ'، یعنی بغیر کسی وجہ جواز کے کیا۔ قتل نفس، پھر انبیا علیہم السلام کا قتل اور وہ بھی بغیر کسی وجہ جواز کے، گویا اِس جرم کی تمام سنگینیاں اُنھوں نے ایک ہی جگہ جمع کر دیں۔ قرآن نے یہاں واضح کر دیا ہے کہ اُن کے انبیا کی اولاد ہونے کے باعث اللہ تعالیٰ نے اِن جرائم کے بعد اُنھیں چھوڑ نہیں دیا، بلکہ اِن کی پاداش میں اُنھیں پکڑا اور اِسی دنیا میں اُن کے جرائم کی سزا اُنھیں دی۔

[١٦٠] آیت ٤٠ سے جو مضمون شروع ہوا تھا، یہ اُس کے خاتمہ کی آیت ہے۔ اِس میں قرآن نے نہایت غیر مبہم طریقے پر یہ بات واضح کر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی شخص کو فلاح محض اِس

اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ

پر) ایمان لائے ہیں اور جو (اِن سے پہلے) یہودی[۱۶۱] ہوئے اور جو نصاریٰ[۱۶۲] اور صابی[۱۶۳]

بنیاد پر حاصل نہ ہوگی کہ وہ یہود و نصاریٰ میں سے ہے یا مسلمانوں کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے یا صابی ہے، بلکہ اِس بنیاد پر حاصل ہوگی کہ وہ اللہ کو اور قیامت کے دن کو فی الواقع مانتا رہا ہے اور اُس نے نیک عمل کیے ہیں۔ ہر مذہب کے لوگوں کو اِسی کسوٹی پر پرکھا جائے گا، اِس سے کوئی بھی مستثنیٰ نہ ہوگا۔ یہود کا یہ زعم محض زعم باطل ہے کہ وہ یہودی ہونے ہی کو نجات کی سند سمجھ رہے ہیں۔ یہ بات ہوتی تو اللہ دنیا میں بھی اُن کے جرائم پر اُن کا مواخذہ نہ کرتا۔ لہٰذا وہ ہوں یا مسلمان یا کسی اور مذہب و ملت کے پیرو، اِن میں سے کوئی بھی محض پیغمبروں کو ماننے والے کسی خاص گروہ میں شامل ہو جانے سے جنت کا مستحق نہیں ہو جاتا، بلکہ اللہ اور آخرت پر حقیقی ایمان اور عمل صالح ہی اُس کے لیے نجات کا باعث بنتا ہے۔

[۱۶۱] اصل الفاظ ہیں: 'وَالَّذِیْنَ هَادُوْا'۔ اہل عرب 'هاد یهود' کا فعل جس طرح رجوع کرنے اور توبہ کرنے کے معنی میں استعمال کرتے تھے، اُسی طرح یہودی ہونے کے معنی میں بھی استعمال کرتے تھے۔ قرآن مجید نے یہ لفظ اپنی طرف سے ایجاد کر کے نہیں، بلکہ عربی زبان کے ایک عام لفظ کی حیثیت سے استعمال کیا ہے۔ یہود کو یہ نام سیدنا یعقوب علیہ السلام کے بیٹے یہودا کی نسبت سے ملا اور اُن کا یہ نام جس طرح کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے، 'یهو' اور 'ذا' سے مرکب نہیں ہے، بلکہ ایک ہی لفظ ہے جس کا مادہ 'هود' ہے اور اِس کے تسمیہ میں حمد و طاعت کا مفہوم ملحوظ ہے۔

اِس کی تفصیل کوئی شخص اگر چاہے تو امام حمید الدین فراہی کی کتاب ''مفردات القرآن'' میں دیکھ سکتا ہے۔

[۱۶۲] یہ 'نصران' کی جمع ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کے پیرو شروع میں یہی کہلاتے تھے۔ اُن کے خلیفۂ برحق شمعون کے پیرووں نے اپنے آپ کو اِسی نام سے موسوم کیا۔ پال نے، البتہ سیدنا مسیح علیہ السلام کی تعلیمات میں جس طرح دوسری بدعتیں داخل کیں، اُسی طرح اِس نام کو بھی اُن کے

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

کہلاتے ہیں، اُن میں سے جن لوگوں نے بھی اللہ کو مانا ہے اور قیامت کے دن کو مانا ہے اور نیک عمل کیے ہیں، اُن کے لیے اُن کا صلہ اُن کے پروردگار کے پاس ہے اور (اُس کے حضور میں) اُن کے لیے نہ کوئی اندیشہ ہو گا اور نہ وہ کبھی غم زدہ ہوں

لیے ایک تحقیر کا لفظ بنا دیا، لیکن یہ بالکل قطعی ہے کہ مسیحی متقدمین اپنے لیے یہی نام پسند کرتے تھے۔ امام فراہی نے اپنی کتاب ”مفردات القرآن“ میں اِس لفظ پر بھی مفصل بحث کی ہے۔ تفصیل کے طالب اُسے دیکھ سکتے ہیں۔

۱۶۳؎ یہ کوئی قدیم مذہبی فرقہ ہے جس کا وجود قرآن کے زمانۂ نزول میں بالکل معروف تھا۔ 'صبا' کے معنی طلوع ہونے کے آتے ہیں۔ اِس وجہ سے امام فراہی کے نزدیک یہ بات قرین قیاس ہے کہ یہ لوگ غالباً اپنی ستارہ شناسی اور علم نجوم میں مہارت کے باعث صابئین کے نام سے موسوم ہوئے۔ قرآن نے یہاں اِن کا ذکر جس طرح کیا ہے، اِس سے یہ بات، البتہ واضح ہے کہ یہ دین حق کے پیرووں ہی کا کوئی گروہ تھا جو یہود و نصاریٰ کی طرح بعد میں گم راہ ہو گیا۔ متقدمین میں سے بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ ملائکہ کی پرستش کرتے تھے، قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور زبور کی تلاوت کرتے تھے۔ بعض اِنھیں اہل کتاب کا ایک فرقہ اور بعض سیدنا ابراہیم کے پیرو قرار دیتے ہیں۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو بھی ابتدا میں صابئین کہتے تھے۔ امام فراہی کا خیال ہے کہ اِس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اِن لوگوں کے اندر نماز کی عبادت بہت زیادہ تھی۔ مشرکین جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو پانچ وقت اہتمام کے ساتھ نماز پڑھتے دیکھتے تو خیال کرتے کہ یہ بھی صابی ہو گئے ہیں۔ بعض مستشرقین کا بیان ہے کہ اِس فرقہ کے کچھ لوگ اب بھی عراق میں دیکھے جاتے ہیں اور وہاں کے لوگ اِنھیں حضرت یحییٰ کی امت کہتے ہیں۔ تاہم اِن کی کوئی مستند تاریخ چونکہ اس وقت موجود نہیں ہے، اِس لیے اِن کے

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ط خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ

گے۔[۱۶۴] ۶۲

اور[۱۶۵] یاد کرو، جب ہم نے تم سے عہد لیا[۱۶۶] تھا اور (اِس کے لیے) طور کو تم پر اٹھایا[۱۶۷] تھا

بارے میں اعتماد کے ساتھ کوئی بات کہنا مشکل ہے۔

۱۶۴ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بشارت، ظاہر ہے کہ اِس شرط کے ساتھ ہے کہ آدمی نے کسی ایسے جرم کا ارتکاب نہ کیا ہو جو ایمان اور عمل صالح کے باوجود اُسے جہنم کا مستحق بنا دیتا ہے۔ مثلاً کسی بے گناہ کو قتل کر دینا یا جانتے بوجھتے اللہ کے کسی سچے پیغمبر کو جھٹلا دینا۔

۱۶۵ یہ وہی سلسلۂ بیان پھر شروع ہوا ہے جو آیت ۴۰ سے چلا آ رہا ہے۔

۱۶۶ اصل میں لفظ 'مِیْثَاق' استعمال ہوا ہے۔ یہ اُس عہد و پیمان کے لیے آتا ہے جو کسی اہم معاملے کے لیے پورے شعور اور احساس ذمہ داری کے ساتھ باندھا گیا ہو اور جس کے بارے میں یہ بات مانی گئی ہو کہ اُسے ہر حال میں اور نہایت وفاداری کے ساتھ پورا کیا جائے گا۔ یہاں اِس سے مراد وہ عہد ہے جو بنی اسرائیل سے تورات کو مضبوطی سے پکڑے رہنے اور اُس کے احکام پر عمل کرنے کے بارے میں لیا گیا۔ اِس کا ذکر سورۂ اعراف (۷) کی آیات ۱۶۹-۱۷۱ میں تفصیل کے ساتھ ہوا ہے۔

۱۶۷ قرآن اور بائیبل، دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل سے یہ عہد پہاڑ کے دامن میں اِس طرح لیا گیا کہ طور اپنی جگہ سے اکھڑ کر سائبان کی طرح اُن کے سروں پر لٹک رہا تھا اور اُنھیں لگتا تھا کہ وہ اُن پر گر کر رہے گا۔ قرآن نے یہاں اِس حالت کو پہاڑ کے اُن پر اٹھا لینے سے تعبیر کیا ہے۔ یہ خدا کی قدرت اور اُس کے جلال کا ایک مظاہرہ تھا جو اِس لیے کیا گیا کہ بنی اسرائیل ہمیشہ اِس بات کو یاد رکھیں کہ جس خدا کے ساتھ وہ یہ عہد باندھ رہے ہیں، اُس کی قدرت کتنی بے پناہ ہے اور اُنھوں نے اگر اِس کی خلاف ورزی کی تو وہ اُن کے ساتھ کیا معاملہ کر سکتا ہے۔

بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ
فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَقَدْ
عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً

اور کہا تھا کہ اُس چیز کو پوری قوت کے ساتھ پکڑو جو ہم نے تمھیں دی ہے[۱۶۸] اور جو کچھ اُس میں (لکھا) ہے، اُسے یاد رکھو[۱۶۹] تاکہ تم (اللہ کے غضب سے) بچے رہو۔[۱۷۰] پھر اِس کے بعد بھی تم اُس سے پھر گئے۔[۱۷۱] سو حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ کی عنایت اور اُس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو (اپنے اِس رویے کی وجہ سے) تم بڑے نامراد ہوتے، اور تم اُنھیں بھی جانتے ہی ہو جنھوں نے تمھارے لوگوں میں سے سبت کی بے حرمتی کی[۱۷۲]

---

[۱۶۸] یعنی اُسے پوری مضبوطی کے ساتھ لو اور زندگی کے تمام مراحل میں پورے استقلال اور عزیمت کے ساتھ اُس کی ہدایات کی پیروی کرو۔

[۱۶۹] مطلب یہ ہے کہ اُس کا حرف حرف ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھو، خواہ وہ اُس کے احکام و ہدایات سے متعلق ہو یا اُس کی اُن تنبیہات سے متعلق جو اِن احکام و ہدایات سے انحراف کے نتائج کے بارے میں تمھیں سنائی گئی ہیں۔

[۱۷۰] اصل الفاظ ہیں: 'لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ'۔ اِن سے پہلے چونکہ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کی تنبیہات کے یاد رکھنے کی نصیحت کی گئی ہے، اِس لیے سیاق کلام کا تقاضا ہے کہ 'تَتَّقُوْنَ' کو یہاں خدا کے غضب سے بچنے کے مفہوم میں لیا جائے۔

[۱۷۱] تم اُس سے پھر گئے، یعنی تمھاری قوم کے لوگ اُس عہد سے پھر گئے۔ اسلاف کے کسی فعل پر اخلاف سے خطاب کا یہ اسلوب ہماری زبان میں بھی عام ہے۔ غرناطہ صدیوں پہلے کے مسلمانوں نے کھویا تھا، لیکن ہم اِس زمانے کے لوگوں سے بھی بے تکلف کہتے ہیں کہ مسلمانو، جب تم غفلت کی نیند سو گئے تو غرناطہ تمھارے ہاتھوں سے جاتا رہا۔

خٰسِـِٕيْنَ ۚ ﴿٦٥﴾ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا

تو ہم نے اُن سے کہا: جاؤ، ذلیل بندر بن جاؤ[۱۷۱/۳]۔ اِس طرح اُن کی اُس بستی[۱۷۱/۴] کو، (جس میں اُنھوں نے سبت کی بے حرمتی کی تھی)، ہم نے اُس کے گرد و پیش کے لیے ایک

[۱۷۱/۲] سبت چھٹی کے دن کو کہتے ہیں۔ یہ اصلاً جمعہ کا دن تھا جسے بنی اسرائیل نے اُس کے اگلے دن سے بدل ڈالا۔ اُن کے ہاں یہ دن پشت در پشت تک دائمی عہد کے نشان کے طور پر خدا کی عبادت کے لیے خاص تھا اور اِس میں اُن کے لیے کام کاج، سیر و شکار، حتیٰ کہ گھروں میں آگ جلانا اور لونڈی غلاموں سے کوئی خدمت لینا بھی ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ اُن کی ایک بستی کے لوگوں نے اِس دن کی پابندیوں سے اپنے آپ کو آزاد کرنے کے لیے جو شرعی حیلے ایجاد کیے اور اِس طرح اللہ تعالیٰ کی شریعت کا مذاق اڑایا، یہ اُسی کی طرف اشارہ ہے اور اِس سے مقصود یہاں محض اُس نقض عہد کی ایک مثال بیان کرنا ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ بنی اسرائیل چونکہ اِس داستان سے پوری طرح واقف تھے، اِس لیے قرآن نے اِس کی زیادہ تفصیل نہیں کی۔

[۱۷۱/۳] یہ لعنت کا جملہ ہے۔ آگے کی بات سے واضح ہے کہ اِس کے نتیجے میں وہ بندروں سے جس طرح مشابہ ہوئے، اُس کی نوعیت ایسی محسوس تھی کہ گرد و پیش کی بستیوں کے لوگ اُسے دیکھ کر عبرت حاصل کر سکتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خواہش نفس کی پیروی میں جب وہ بندروں کی طرح کسی حد کے پابند نہیں رہے تو پہلے اُن کی سیرت مسخ ہوئی اور اِس کے بعد ایک ظاہری فرق جو تھوڑا سا رہ گیا تھا، وہ بھی بالآخر مٹ گیا۔ یہاں تک کہ اِس لعنت نے اُن کے ظاہر و باطن، ہر چیز کا احاطہ کر لیا۔

[۱۷۱/۴] سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۱۶۳ میں قرآن نے تصریح کی ہے کہ یہ بستی سمندر کے کنارے آباد تھی اور اِس میں اُن کی آزمایش کے لیے سبت کے دن مچھلیاں ابھر ابھر کر سمندر کی سطح پر آ جاتی تھیں، لیکن سبت کے سوا باقی دنوں میں اِس طرح نہیں آتی تھیں۔ محققین کا غالب رجحان

وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٦﴾
وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ
قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٦٧﴾

نمونۂ عبرت اور خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ایک ذریعۂ نصیحت بنا دیا۔ ٦٣-٦٦

اور[۱۶۵] یاد کرو، جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ (خون پر قسمیں کھانے کے لیے[۱۶۶]) تم ایک گاے ذبح کرو[۱۶۷]۔ وہ کہنے لگے: کیا تم ہم سے مذاق

یہ ہے کہ یہ مقام ایلہ یا ایلات یا ایلوت تھا۔ اسرائیل کی یہودی ریاست نے یہاں اِسی نام کی ایک بندرگاہ بنائی ہے۔ اردن کی مشہور بندرگاہ عقبہ اِس کے قریب ہی واقع ہے۔ حضرت سلیمان کے عہد میں بحر قلزم کے لیے اُن کے جنگی اور تجارتی بیڑے کا صدر مقام یہی بستی تھی۔ اِس کا محل وقوع بحر قلزم کی اُس شاخ کے انتہائی سرے پر ہے جو جزیرہ نماے سینا کے مشرقی اور عرب کے مغربی ساحل کے درمیان ایک لمبی خلیج کی صورت میں نظر آتی ہے۔

[۱۶۵] یہ نقض عہد کی دوسری مثال ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ شریعت الٰہی کے قبول کرنے میں بنی اسرائیل کی ذہنیت شروع ہی سے کیسی حیلہ جویانہ رہی ہے۔

[۱۶۶] اِس کے بعد جو واقعہ سنایا گیا ہے، اُس سے واضح ہے کہ بنی اسرائیل کو گاے کی اِس قربانی کا حکم قسامہ، یعنی خون پر قسمیں کھانے کے لیے دیا گیا تھا۔ تورات میں بھی یہی بات بیان ہوئی ہے۔ استثنا میں ہے:

> ”اگر اِس ملک میں جسے خداوند تیرا خدا تجھ کو قبضہ کرنے کو دیتا ہے، کسی مقتول کی لاش میدان میں پڑی ہوئی ملے اور یہ معلوم نہ ہو کہ اُس کا قاتل کون ہے تو تیرے بزرگ اور قاضی نکل کر اُس مقتول کے گرداگرد کے شہروں کے فاصلے کو ناپیں اور جو شہر اُس مقتول کے سب سے نزدیک ہو، اُس شہر کے بزرگ ایک بچھیا لیں جس سے کبھی کوئی کام نہ لیا گیا ہو اور نہ وہ جوئے میں جوتی گئی

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۭ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ۭ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا

کرتے ہو؟[۱۷۸] اُس نے کہا: میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ اِس طرح کا جاہل بن جاؤں[۱۷۹]۔ اُنھوں نے کہا: اچھا، اپنے رب کو ہمارے لیے پکارو کہ وہ ہمیں بتائے کہ گاے کیسی ہونی چاہیے۔ اُس نے کہا: وہ فرماتا ہے کہ گاے نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا، اِن کے بیچ کی میانہ

ہو اور اُس شہر کے بزرگ اِس بچھیا کو بہتے پانی کی وادی میں جس میں نہ ہل چلا ہو اور نہ اُس میں کچھ بویا گیا ہو، لے جائیں اور وہاں اُس وادی میں اُس بچھیا کی گردن توڑ دیں۔ تب بنی لاوی جو کاہن ہیں، نزدیک آئیں کیونکہ خداوند تیرے خدا نے اُن کو چن لیا ہے کہ خداوند کی خدمت کریں اور اُس کے نام سے برکت دیا کریں اور اُن ہی کے کہنے کے مطابق ہر جھگڑے اور مار پیٹ کے مقدمے کا فیصلہ ہوا کرے۔ پھر اِس شہر کے سب بزرگ جو اُس مقتول کے سب سے نزدیک رہنے والے ہوں، اُس بچھیا کے اوپر جس کی گردن اُس وادی میں توڑی گئی، اپنے اپنے ہاتھ دھوئیں اور یوں کہیں کہ ہمارے ہاتھ سے یہ خون نہیں ہوا اور نہ یہ ہماری آنکھوں کا دیکھا ہوا ہے۔''

(۲۱:۱-۷)

۱۷۷ لفظ 'بَقَرَةٌ' اِس حکم میں جس طرح نکرہ استعمال ہوا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل اگر متوسط درجے کی کوئی سی گاے ذبح کر دیتے تو حکم کا منشا یقیناً پورا ہو جاتا، لیکن یہ اُن کا فساد مزاج تھا کہ اپنے سوالات سے اُنھوں نے اِس حکم کو نہایت مشکل بنا لیا۔

۱۷۸ یعنی قاتل تک پہنچنے کے لیے قسمیں لینے کا یہ طریقہ کیا ہے؟ اِس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تم شاید ہم سے مذاق کر رہے ہو؟

۱۷۹ اصل الفاظ ہیں: 'اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ'۔ اِن میں 'جهل' کا لفظ علم کے بجاے حلم کے مقابل لفظ کے طور پر آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں اِس بات سے اللہ کی پناہ

رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ
لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ
اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ۭ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ
اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ

ہو۔ اب جاؤ اور وہ کرو جس کا تمھیں حکم دیا جا رہا ہے[۱۸۰]۔ بولے: اپنے رب کو ہمارے لیے پکارو کہ وہ ہم پر یہ بھی واضح کرے کہ اُس کا رنگ کیسا ہو۔ اُس نے کہا: وہ فرماتا ہے کہ وہ گاے سنہری ہو[۱۸۱]، شوخ رنگ[۱۸۲]، ایسی کہ دیکھنے والوں کو خوش آ جائے۔ بولے: (ایک مرتبہ اور) اپنے رب کو ہمارے لیے پکارو کہ ہم کو اچھی طرح وضاحت کے ساتھ بتائے کہ وہ کیسی ہو، ہمیں گایوں میں کچھ شبہ پڑ رہا ہے، اور اللہ نے چاہا تو اب ہم ضرور اُس کا پتا پا لیں گے[۱۸۳]۔ اُس نے کہا: وہ فرماتا ہے کہ وہ گاے محنت والی نہ ہو کہ

مانگتا ہوں کہ دین کے معاملے میں کوئی احمقانہ بات کروں۔

[۱۸۰] یعنی اِس قسم کے سوالات کر کے اپنے لیے تنگی پیدا نہ کرو اور کوئی سی گاے لے کر اُسے ذبح کر ڈالو۔

[۱۸۱] گاے کے رنگوں میں زرد اور سنہرا رنگ سب سے زیادہ دل پسند سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے جب پوچھا جائے گا تو ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ پسندیدہ رنگ ہی کی ہدایت کی جائے گی۔

[۱۸۲] اصل میں لفظ 'فَاقِعٌ' استعمال ہوا ہے۔ یہ اِسی سنہرے رنگ کی شوخی کے لیے آتا ہے۔

[۱۸۳] اِن الفاظ سے اُن کا یہ باطن واضح ہوتا ہے کہ اپنے سوالات کی نامعقولیت اب اُن پر بھی واضح ہو چکی تھی۔ چنانچہ اُن کا یہی احساس ہے جس کی برکت سے شاید یہ الفاظ اُن کی زبان سے نکلے اور اِن الفاظ کی برکت سے اُنھیں قربانی کے اِس حکم پر عمل کی توفیق نصیب ہوئی۔

لَّا شِيَةَ فِيهَا ط قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ط فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ (۷۱)

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيهَا ط وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ج (۷۲) فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ط كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى لا وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (۷۳) ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ

زمین جوتتی اور فصلوں کو پانی دیتی ہو۔ وہ ایک ہی رنگ کی ہو، اُس میں کسی دوسرے رنگ کی آمیزش نہ ہو۔ بولے: اب تم واضح بات لائے ہو۔[۱۸۴] اِس طرح اُنھوں نے اُس کو ذبح کیا اور لگتا نہ تھا کہ وہ یہ کریں گے۔ ۶۷-۷۱

اور وہ واقعہ بھی یاد کرو، جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا۔ پھر (جھوٹی قسمیں کھائیں اور) اِس کا الزام ایک دوسرے پر دھرنے لگے،[۱۸۵] اور اللہ نے فیصلہ کرلیا کہ جو کچھ تم چھپا رہے تھے، وہ اُسے ظاہر کر دے گا۔ چنانچہ ہم نے کہا: اِس (مردے) کو اُسی گاے کا ایک ٹکڑا مارو[۱۸۶] (جو قسمیں کھانے کے لیے ذبح کی گئی ہے تو وہ زندہ

---

[۱۸۴] اصل میں 'اَلْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'حق' کا لفظ عربی زبان میں کئی معنوں کے لیے آتا ہے۔ اِن میں سے ایک معنی واضح اور بین ہونے کے بھی ہیں۔ یہاں یہ اِسی معنی میں ہے۔

[۱۸۵] اِس مفہوم کے لیے 'اِدّٰرَءْتُمْ' کا جو لفظ اصل میں آیا ہے، یہ درحقیقت 'تدارء تم' ہے۔ ادغام کے قاعدے سے اِس کی یہ صورت ہوگئی ہے۔

[۱۸۶] اصل الفاظ ہیں: 'اِضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا'۔ اِن میں 'ھا' کی ضمیر جس طرح آئی ہے، اُس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اِس موقع پر بھی اوپر بیان کیے گئے قانون کے مطابق پہلے گاے

ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٧٤﴾

ہوگیا)۔ اللہ اِسی طرح مردوں کو زندہ کرے گا اور وہ تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھ سے کام لو۔[۱۸۷] ۲: ۷۲-۷۳

(تم یہی کرتے رہے[۱۸۸]، یہاں تک کہ) اِس کے بعد پھر تمھارے دل سخت ہوگئے، اِس طرح کہ گویا وہ پتھر ہیں یا اُن سے بھی زیادہ سخت۔ اور پتھروں میں تو ایسے بھی ہیں جن سے نہریں پھوٹتی ہیں اور اُن میں ایسے بھی ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور اُن سے پانی بہ نکلتا ہے

ذبح کر کے قسامہ کا طریقہ اختیار کیا گیا، لیکن جب اُن لوگوں نے جھوٹی قسمیں کھالیں اور ایک دوسرے پر الزام لگانے لگے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی تنبیہ اور اُنھیں آخرت کی یاددہانی کے لیے یہ معجزہ دکھایا۔ قسامہ کے لیے گاے کی قربانی کا حکم چونکہ متصل پہلے ہی بیان ہوا ہے، اِس وجہ سے ضمیر اِس طریقے سے آگئی ہے اور اُس نے نہایت بلیغ طریقے پر اُس پوری بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے جسے ہم نے اپنے ترجمے میں کھولا ہے۔ اِس معجزے کے بارے میں یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ مقتول کی لاش کو قربانی کی گاے کا ٹکڑا مارنا محض ایک علامت تھی۔ اِس سے پہلے اِس سورہ میں جن معجزات کا ذکر ہوا ہے، وہ بھی سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کے اشارے ہی سے نمودار ہوئے۔ معجزات کے بارے میں سنت الٰہی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالعموم اِس طرح کی کسی علامت کے ساتھ ہی نمودار ہوتے ہیں۔

[۱۸۷] یہ اُس یاددہانی کی تعبیر ہے جو اِس معجزے نے زبان حال سے اُنھیں کی۔

[۱۸۸] یعنی دین و شریعت کے ساتھ اِسی طرح حیلہ بازی، کٹ حجتی اور ڈھٹائی کا معاملہ کرتے رہے۔

اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ وَقَدۡ کَانَ فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ یَسۡمَعُوۡنَ کَلٰمَ اللّٰہِ ثُمَّ یُحَرِّفُوۡنَہٗ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡہُ وَہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۵﴾ وَاِذَا

اور اُن میں ایسے بھی ہیں کہ اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں[۱۸۹]۔ (یہ حقیقت ہے کہ تم یہی کرتے رہے ہو)، اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے بے خبر نہیں ہے[۱۹۰]۔ ۷۴

اِس[۱۹۱] کے باوجود، (مسلمانو)، کیا تم (اِن سے) یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ تمھاری بات مان لیں گے؟ اور (یہ وہ لوگ ہیں کہ) اِن میں سے ایک گروہ اللہ کا کلام سنتا رہا ہے اور اُسے اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد جانتے بوجھتے[۱۹۲]، اُس میں تحریف[۱۹۳] کرتا رہا

---

[۱۸۹] مطلب یہ ہے کہ پتھر تو پتھر ہو کر بھی اُن صلاحیتوں سے محروم نہیں ہوتے جو قدرت کی طرف سے اُن کے اندر ودیعت ہوتی ہیں۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو کہ طور کس طرح لرزہ براندام ہوا اور تمھارے لیے کس طرح ایک چٹان سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، لیکن یہ تم ہو کہ اخلاقی بگاڑ نے تمھارے دل کی تمام سوتیں اِس طرح خشک کر دی ہیں کہ تمھارے سینے میں دھڑکتا ہوا گوشت کا یہ لوتھڑا پتھر بن گیا ہے، بلکہ اِس کی سختی پتھروں اور چٹانوں کی سختی سے بھی بڑھ گئی ہے۔

[۱۹۰] یعنی وہ تمھارے کرتوتوں سے خوب واقف ہے، اُس کے سامنے اپنے تقدس اور بزرگی کی حکایت نہ بڑھاؤ۔

[۱۹۱] یہود سے خطاب کے بیچ میں یہ مسلمانوں کی طرف التفات ہے۔ اِسی طرح کا ایک التفات اِس سے پہلے آیات ۲۱-۲۹ میں یثرب اور اُس کے نواح کے مشرکین کی طرف گزر چکا ہے۔ اِس سے مقصود مسلمانوں کو یہ اطمینان دلانا بھی ہے کہ وہ یہود کی مخالفت سے بددل نہ ہوں اور یہود کی بعض پس پردہ حرکتوں سے اُنھیں آگاہ کرنا بھی ہے تا کہ سادہ لوح مسلمان اُن کے ایمان کے دعووں سے متاثر ہو کر اُن کے فریب میں نہ آ جائیں۔

لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا
اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ لِیُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا

ہے۔ اور یہ (وہ لوگ ہیں کہ) جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے مان لیا ہے[۱۹۴] اور جب آپس میں اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: کیا تم اِن کو وہ بتاتے

---

[۱۹۲] تحریف کے ساتھ یہ قید اِس بات کو واضح کرتی ہے کہ تحریف پر تحریف کا اطلاق اُسی وقت ہوتا ہے، جب وہ جانتے بوجھتے ہوئے کی جائے۔ یہی چیز تحریف کو ایک سنگین جرم بناتی ہے اور اِس کے مرتکبین کو اُس روشنی سے یک قلم محروم کر دیتی ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کے ذریعے سے انسانوں کو بخشتا ہے۔

[۱۹۳] تحریف کے معنی کسی بات یا کلام کو بدل دینے کے ہیں۔ اہل کتاب اِس کی جن صورتوں کے مرتکب ہوئے، وہ استاذ امام امین احسن اصلاحی کے الفاظ میں یہ ہیں:

> ”ایک بات کی دیدہ و دانستہ ایسی تاویل کر دی جائے جو قائل کے منشا کے بالکل خلاف ہو۔
>
> کسی لفظ کے طرز ادا اور قراءت میں ایسی تبدیلی کر دی جائے جو لفظ کو کچھ سے کچھ بنا دے، مثلاً مروہ کو بگاڑ کر مورہ یا مریا وغیرہ کر دیا گیا۔
>
> کسی عبارت یا کلام میں ایسی کمی بیشی کر دی جائے جس سے اُس کا اصل مدعا بالکل خبط ہو کر رہ جائے۔ مثلاً حضرت ابراہیم کے ہجرت کے واقعے میں یہود نے اِس طرح ردو بدل کر دیا کہ خانہ کعبہ سے اُن کا کوئی تعلق ثابت نہ ہو سکے۔
>
> کسی ذو معانی لفظ کا وہ ترجمہ کر دیا جائے جو سیاق و سباق کے بالکل خلاف ہو۔ مثلاً عبرانی کے ابن کا ترجمہ بیٹا کر دیا گیا۔ دراں حالیکہ اِس کے معنی بندہ اور غلام کے بھی آتے ہیں۔
>
> ایک بات کا مفہوم بالکل واضح ہو، لیکن اُس کے متعلق ایسے سوالات اٹھا دیے جائیں جو اُس واضح بات کو مبہم بنا دینے والے یا اُس کو بالکل مختلف سمت میں ڈال دینے والے ہوں۔“

(تدبر قرآن ۱/ ۲۵۲)

تَعۡقِلُوۡنَ (۷۶) اَوَلَا یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ اللّٰهَ یَعۡلَمُ مَا یُسِرُّوۡنَ وَمَا یُعۡلِنُوۡنَ (۷۷) وَمِنۡهُمۡ اُمِّیُّوۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ الۡکِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِیَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا یَظُنُّوۡنَ (۷۸) فَوَیۡلٌ لِّلَّذِیۡنَ یَکۡتُبُوۡنَ الۡکِتٰبَ بِاَیۡدِیۡهِمۡ ٭ ثُمَّ یَقُوۡلُوۡنَ هٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ لِیَشۡتَرُوۡا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ؕ فَوَیۡلٌ لَّهُمۡ

ہو جو اللہ نے تم پر کھولا ہے کہ وہ اِس کی بنیاد پر تمھارے پروردگار کے پاس تم سے حجت کریں۔ پھر کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟ کیا یہ نہیں جانتے کہ جو کچھ یہ چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں، اللہ اُن سب باتوں سے باخبر ہے؟ اور (یہ وہ لوگ ہیں کہ) اِن میں بن پڑھے عامی[۱۹۵] بھی ہیں جو اللہ کی کتاب کو صرف (اپنی) آرزوؤں[۱۹۶] کا ایک مجموعہ سمجھتے ہیں اور اپنے گمانوں ہی پر چلتے ہیں ـــــ سو تباہی ہے اُن کے لیے جو اپنے

---

[۱۹۴] یہود یہ اقرار جس مفہوم میں کرتے تھے، اُس کی وضاحت ہم اِس سے پہلے حاشیہ ۲۶ میں کر چکے ہیں۔ یہاں اتنی بات مزید واضح ہوتی ہے کہ اپنے اِس خاص مفہوم میں وہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار کرتے تو اِس موقع پر بعض اوقات وہ پیشین گوئیاں بھی بیان کر دیتے تھے جو آپ کے متعلق اُن کے صحیفوں میں بیان ہوئی ہیں۔

[۱۹۵] اصل میں لفظ 'اُمِّیُّوْنَ' استعمال ہوا ہے۔ یہ 'اُمی' کی جمع ہے جس کے معنی ان پڑھ کے ہیں۔ اِس آیت میں جس طرح اِن کا ذکر ہوا ہے، اُس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اوپر کلام الٰہی میں تحریف کرنے والے جس گروہ کا بیان ہے، اُس سے یہود کے علما اور پڑھے لکھے لوگ مراد ہیں۔

[۱۹۶] یعنی مثال کے طور پر یہ آرزوئیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں گنتی کے چند روز ہی کے لیے چھوئے گی اور جنت میں صرف یہودی اور نصرانی جائیں گے اور آخرت کی فوز و فلاح صرف ہمارے

مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝٧٩ وَقَالُوْا لَنْ
تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ
يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝٨٠ بَلٰى مَنْ
كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ

ہاتھوں سے شریعت تصنیف کرتے ہیں،[197] پھر کہتے ہیں: یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اِس کے ذریعے سے تھوڑی سی قیمت حاصل کر لیں۔ سو تباہی ہے اُن کے لیے اُس چیز کی وجہ سے جو اُن کے ہاتھوں نے لکھی اور تباہی ہے اُن کے لیے اُس چیز کی وجہ سے جو (اُس کے ذریعے سے) وہ کماتے ہیں ـــــ اور (یہ وہ لوگ ہیں کہ) اِنھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ دوزخ کی آگ ہمیں ہرگز نہ چھوئے گی۔ ہاں، گنتی کے چند دنوں کی تکلیف، البتہ ہو سکتی ہے۔[198] اِن سے پوچھو، کیا اللہ سے تم نے کوئی عہد لیا ہے؟ اِس لیے کہ اگر عہد لیا ہے تو اللہ کسی حال میں اپنے عہد کی خلاف ورزی نہ کرے گا یا تم اللہ پر ایسی تہمت باندھ رہے ہو جس کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتے۔[199] ہاں،[200] کیوں نہیں، جن لوگوں

لیے خاص ہے اور ہم اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں۔

[197] اِس سے مراد وہ طبع زاد اور من گھڑت فتوے ہیں جو یہود کے علما محض اپنی دنیوی اغراض کو پورا کرنے اور اپنے پیروؤں کو خوش کرنے کے لیے جاری کرتے تھے۔

[198] اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ نجات کے معاملے میں اُن کا سارا اعتماد عقیدہ و عمل کے بجائے صرف اپنی گروہی نسبت پر رہ گیا تھا۔

[199] یعنی جس کی کوئی سند تمھاری کتاب میں موجود نہیں ہے، تم نے یہ بات محض اپنے جی سے گھڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دی ہے۔

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۣ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا

نے کوئی بدی کمائی ہے اور اُن کے گناہ نے اُنھیں پوری طرح گھیر لیا ہے، وہی دوزخ کے لوگ ہیں[۲۰۱]، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جو ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے، وہی جنت کے لوگ ہیں[۲۰۲]۔ وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۷۵-۸۲

اور[۲۰۳] یاد کرو، جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد[۲۰۴] لیا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت

---

۲۰۰ پچھلے سلسلۂ بیان کے آخر میں جس طرح 'اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا' والی آیت آئی تھی، اُسی طرح یہاں یہ آیت وارد ہوئی ہے۔ دونوں کا موقع و محل اور مقصد ایک ہی ہے، اِس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کے مضامین کس خوب صورتی کے ساتھ اُس کے نظم میں پروئے ہوئے ہیں۔

۲۰۱ مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی برائی کا ارتکاب کرے اور وہ برائی اُس کی زندگی کا اِس طرح احاطہ کر لے کہ وہ خدا کے حضور میں پیشی کے شعور اور توبہ و ندامت کی توفیق ہی سے محروم ہو جائے تو اُس کے لیے ہمیشہ کی جہنم ہے، خواہ اُس کا تعلق کسی گروہ سے ہو۔

۲۰۲ یعنی خواہ اُن کا تعلق کسی گروہ سے ہو، وہ بہر حال جنت میں جائیں گے۔

۲۰۳ یہ اب یہود کو اُن کے نقض عہد کی یاد دہانی کی جا رہی ہے تا کہ اُن پر واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے جس عہد و میثاق کو وہ اپنا سرمایۂ فخر و ناز سمجھتے ہیں، اُس کے ساتھ اُن کا رویہ کیا رہا ہے۔

لِلنَّاسِ حُسۡنًا وَّ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّیۡتُمۡ اِلَّا قَلِیۡلًا
مِّنۡکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۸۳﴾

نہ کرو گے اور والدین[۲۰۵] کے ساتھ اور قرابت مندوں اور یتیموں اور مسکینوں[۲۰۶] کے ساتھ حسن سلوک کرو گے[۲۰۷]۔ اور عہد لیا کہ لوگوں سے اچھی بات کہو[۲۰۸] اور نماز کا اہتمام کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ پھر تم میں سے تھوڑے لوگوں کے سوا تم سب (اُس سے)

---

[۲۰۴] اِس سے مراد وہ ابتدائی عہد ہے جو بنی اسرائیل سے توحید اور ادائے حقوق سے متعلق لیا گیا۔ 'لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰہَ' کے الفاظ اِس کے لیے اصل میں حرف بیان کے بغیر بالکل اُسی طرح آ گئے ہیں، جس طرح ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں: میں نے تم سے کہا ہے، تم یہ کام نہیں کرو گے۔

[۲۰۵] اللہ تعالیٰ کا حق بیان کرنے کے فوراً بعد یہ والدین کے حق کا ذکر اِس بات کو واضح کرتا ہے کہ خدا کے بعد سب سے بڑا حق انسان پر اگر کوئی ہے تو اُنھی کا ہے۔

[۲۰۶] والدین اور اقربا کے معاً بعد یتیموں اور مسکینوں کا ذکر اسلامی معاشرے میں اُن کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔

[۲۰۷] حسن سلوک ادائے حقوق سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ اِس کے معنی ہی یہ ہیں کہ دوسروں کے حقوق نہایت خوبی کے ساتھ ادا کر دیے جائیں۔

[۲۰۸] یہ کم و بیش وہی بات ہے جو اِسی سورہ کی آیت ۲۶۳، سورۂ نسا (۴) کی آیات ۵، ۸، ۹ اور سورۂ بنی اسرائیل (۱۷) کی آیت ۲۸ میں بالترتیب 'قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ وَّ مَغۡفِرَۃٌ'، 'قُوۡلُوۡا لَھُمۡ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا'، 'وَلۡیَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِیۡدًا' اور 'فَقُلۡ لَّھُمۡ قَوۡلًا مَّیۡسُوۡرًا' کے الفاظ میں کہی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ادائے حقوق کے ساتھ اِن حق داروں کی عزت نفس بھی ہر حال میں ملحوظ رہنی چاہیے۔ لہٰذا اِن سے جو بات بھی کی جائے، نہایت شریفانہ اور مہذب انداز میں کی جائے، سختی اور ترش کلامی کا رویہ ہرگز اختیار نہ کیا جائے۔ ادائے حقوق کے ساتھ یہ چیز نہ ہو تو آدمی کا

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ
اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ
هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ز
تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ط وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ
وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ط اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ

پھر گئے اور حقیقت یہ ہے کہ تم پھر جانے والے لوگ ہی ہو[۲۰۹]۔ ۸۳

اور یاد کرو، جب ہم نے تم سے عہد[۲۱۰] لیا کہ آپس میں خون نہ بہاؤ گے اور اپنے لوگوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالو گے۔ پھر تم نے اقرار کیا اور تم اُس کے گواہ ہو[۲۱۱]۔ پھر یہ تمھی ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو اور اپنے ہی ایک گروہ کو اُن کی بستیوں سے نکالتے ہو، اِس طرح کہ ظلم اور حق تلفی کے ساتھ اُن کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو، اور اگر وہ تمھارے پاس قیدی ہو کر آئیں تو فدیہ دے کر اُنھیں چھڑاتے ہو[۲۱۲]، دراں حالیکہ

سارا احسن سلوک غارت ہو سکتا ہے۔

[۲۰۹] یعنی یہ کوئی ایسا جرم نہیں ہے جو تم سے اتفاقاً صادر ہو گیا ہو، بلکہ تمھارا مستقل رویہ یہی رہا ہے۔

[۲۱۰] یہ اب ایک دوسرے عہد کا حوالہ دیا ہے۔

[۲۱۱] یعنی جب یہ اقرار تم نے کیا تو تمھارے بزرگوں کی پوری جماعت اُس وقت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ موجود تھی۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا طریقہ یہی تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کے احکام سے ہمیشہ سب لوگوں کے سامنے آگاہ کرتے اور پھر پوری جماعت سے اُن کی پابندی کا عہد لیتے تھے۔

بِبَعۡضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ یَّفۡعَلُ ذٰلِکَ مِنۡکُمۡ اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ
الدُّنۡیَا ۚ وَیَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اشۡتَرَوُا الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا بِالۡاٰخِرَۃِ ۫
فَلَا یُخَفَّفُ عَنۡہُمُ الۡعَذَابُ وَلَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۸۶﴾
وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ وَقَفَّیۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِہٖ بِالرُّسُلِ ۫

اُن کا نکالنا ہی سرے سے تمھارے لیے جائز نہ تھا۔ پھر کیا تم کتابِ الٰہی کے ایک حصے کو مانتے اور ایک حصے کا انکار کرتے ہو؟ سو تم میں سے جو یہ کرتے ہیں، اُن کی سزا دنیا کی زندگی میں رسوائی کے سوا کچھ نہیں اور قیامت کے دن وہ سخت سے سخت عذاب میں پہنچا دیے جائیں گے۔ (تم یہی کرتے ہو) اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے بے خبر نہیں ہے —— یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے آخرت دے کر دنیا کی زندگی خرید لی،[۲۱۳] اِس لیے اب نہ اِن سے عذاب ہی ہلکا ہو گا اور نہ کوئی مدد اِنھیں پہنچے گی۔ ۸۴-۸۶

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی اور اُس کے پیچھے پے در پے اپنے پیغمبر[۲۱۴] بھیجے تھے،[۲۱۵]

۲۱۲۔ اس کی صورت تاریخ سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ پہلے دشمنوں سے ساز باز کر کے اپنے ہی بھائیوں کی کسی جماعت پر چڑھائی کرا دی جاتی۔ پھر قتل و غارت کے بعد جب وہ دشمنوں کے ہاتھوں میں قیدی ہو کر مدد کے طالب ہوتے تو اُن کو چھڑا کر قومی ہم دردی اور حسن سلوک کا مظاہرہ کیا جاتا۔

۲۱۳۔ یعنی آخرت کے مقابلے میں دنیا کو ترجیح دی۔ اِس مفہوم کے لیے یہ تعبیر ہماری زبان میں بھی عام ہے۔

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ط اَفَكُلَّمَا
جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ج فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ز

اور مریم کے بیٹے عیسیٰ کو (اِن سب کے بعد) کھلی کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس[۲۱۶] سے اُس کی تائید کی[۲۱۷] (تو جانتے ہو کہ اُن کے ساتھ تمھارا رویہ کیا رہا)؟ پھر کیا یہی ہوگا کہ جب بھی (ہمارا) کوئی پیغمبر وہ باتیں لے کر تمھارے پاس آئے گا جو تمھاری

---

۲۱۴ اصل میں لفظ 'اَلرُّسُل' آیا ہے۔ یہ نبوت سے آگے ایک خاص منصب کے حاملین کے لیے بھی آتا ہے اور خدا کے فرستادوں کے لیے ایک عام لفظ کے طور پر بھی۔ قرآن میں جبریل امین کو اِسی دوسرے معنی میں 'رَسُوْلٌ کَرِیْم' کہا گیا ہے۔ یہ معلوم ہے کہ پہلے معنی میں رسول کی حیثیت بنی اسرائیل کے لیے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے بعد صرف حضرت مسیح کو حاصل تھی۔ اِس وجہ سے یہ بالکل قطعی ہے کہ یہاں یہ لفظ دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اِس سے مراد انبیاے بنی اسرائیل ہیں۔

۲۱۵ یعنی اوپر جس عہد کا ذکر ہوا ہے، اُس کی یاددہانی کے لیے پھر ہم نے سلسلۂ نبوت کو تمھارے اندر بغیر کسی انقطاع کے قائم رکھنے کا یہ اہتمام بھی کیا۔

۲۱۶ پرانے صحیفوں میں 'الروح القدس' سے جبریل امین مراد لیے جاتے ہیں۔

۲۱۷ سیدنا مسیح علیہ السلام کے لیے روح القدس کی تائید کا یہ ذکر اِس لیے کیا جاتا ہے کہ اُن سے جو کھلے کھلے معجزے صادر ہوئے، یہود نے اپنی بدبختی کے باعث اُنھیں بدروحوں کے سردار بعلزبول کی تائید کا نتیجہ قرار دیا۔ متی باب ۱۲ میں ہے:

> ''اُس وقت لوگ اُس کے پاس ایک اندھے گونگے کو لائے جس میں بدروح تھی۔ اُس نے اُسے اچھا کر دیا۔ چنانچہ وہ گونگا بولنے اور دیکھنے لگا اور ساری بھیڑ حیران ہو کر کہنے لگی کہ کیا یہ ابن داؤد ہے؟ فریسیوں نے سن کر کہا: یہ بدروحوں کے سردار بعلزبول کی مدد کے بغیر بدروحوں کو

وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ (۸۷) وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ (۸۸)

خواہشوں کے خلاف ہوں گی، تو تم (اُس کے سامنے) تکبر ہی کرو گے؟ پھر ایک گروہ کو جھٹلا دو گے اور ایک گروہ کو قتل کرو گے[۲۱۸] ـــــ اور (یہ وہ لوگ ہیں کہ) اِنھوں نے کہا: ہمارے دلوں پر غلاف ہیں[۲۱۹]۔ نہیں، بلکہ اِن کے اِس کفر کی وجہ سے اللہ نے اِن پر لعنت کردی ہے[۲۲۰]، اِس لیے (اب) یہ کم ہی مانیں گے۔ ۸۷-۸۸

نہیں نکالتا۔ اُس نے اُن کے خیالوں کو جان کر اُن سے کہا: جس بادشاہی میں پھوٹ پڑتی ہے، وہ ویران ہو جاتی ہے اور جس شہر یا گھر میں پھوٹ پڑے گی، وہ قائم نہ رہے گا۔ اور اگر شیطان ہی نے شیطان کو نکالا تو وہ آپ اپنا مخالف ہو گیا۔ پھر اُس کی بادشاہی کیونکر قائم رہے گی اور اگر میں بعلزبول کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہوں تو تمھارے بیٹے کس کی مدد سے نکالتے ہیں؟ پس وہی تمھارے منصف ہوں گے۔ لیکن اگر میں خدا کے روح کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہوں تو خدا کی بادشاہی تمھارے پاس آ پہنچی۔'' (۲۲-۲۸)

[۲۱۸] اصل الفاظ ہیں: 'وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ'۔ اِن میں فعل اُس مفہوم کے لحاظ سے آیا ہے جو اِس سے پہلے کے افعال میں 'كُلَّمَا' کے لفظ سے پیدا ہو گیا ہے۔

[۲۱۹] اِن کی اِس بات کا مطلب یہ تھا کہ اِس پیغمبر کی باتوں کے لیے ہمارے دل بند ہیں، اِس لیے کہ اِن کی باتیں ہی ایسی ہیں جو کسی معقول آدمی کے دل میں نہیں اتر سکتیں۔ اگر اُن میں کچھ بھی معقولیت ہوتی تو سب سے بڑھ کر ہم اُنھیں قبول کرتے۔

[۲۲۰] یعنی پیغمبر جو باتیں اِن کے سامنے پیش کر رہے ہیں، وہ ہرگز ایسی نہیں ہیں۔ وہ تو نہایت معقول اور دل میں اترنے والی باتیں ہیں، لیکن اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے باعث یہ اُن کو سمجھنے اور ماننے کی صلاحیت سے محروم ہو گئے ہیں۔ چنانچہ کفر کا ارتکاب کر رہے ہیں اور اُس کی پاداش میں

وَلَمَّا جَآءَهُمۡ كِتٰبٌ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمۡ ۙ وَكَانُوۡا
مِنۡ قَبۡلُ يَسۡتَفۡتِحُوۡنَ عَلَى الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَهُمۡ مَّا عَرَفُوۡا
كَفَرُوۡا بِهٖ ز فَلَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۸۹﴾ بِئۡسَمَا اشۡتَرَوۡا بِهٖۤ اَنۡفُسَهُمۡ
اَنۡ يَّكۡفُرُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ بَغۡيًا اَنۡ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ عَلٰى مَنۡ
يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَلِلۡكٰفِرِيۡنَ

اور (یہ وہ لوگ ہیں کہ) جب اللہ کی طرف سے ایک کتاب[۲۲۱] اِن کے پاس آئی، اُن پیشین گوئیوں کی تصدیق میں جو اِن کے ہاں موجود ہیں، اور اِس سے پہلے یہ (اُسی کے حوالے سے) اپنے دین کا انکار کرنے والوں کے خلاف فتح کی دعائیں مانگ رہے تھے،[۲۲۲] پھر جب وہ چیز اِن کے پاس آئی جسے خوب پہچانتے ہوئے تھے تو یہ اُس کے منکر ہو گئے۔ سو اللہ کی لعنت ہے اِن منکروں پر۔ کیا ہی بری ہے وہ چیز جس کے بدلے میں اِنھوں نے اپنے آپ کو بیچ دیا[۲۲۳] کہ محض اِس بات کی ضد میں کہ

اللہ نے اِن پر لعنت کر دی ہے۔

[۲۲۱] یعنی قرآن مجید۔

[۲۲۲] نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآنِ مجید کے بارے میں جو پیشین گوئیاں یہود کے ہاں موجود تھیں، اُن کی بنا پر اُنھیں امید تھی کہ جب اُن کا ظہور ہو گا تو اُن کی بدبختی کے دن دور ہو جائیں گے اور اُن کے دشمنوں پر اُنھیں فتح حاصل ہو گی۔ چنانچہ اِس حوالے سے وہ فتح کی دعائیں مانگتے تھے۔

[۲۲۳] مطلب یہ ہے کہ اپنی ضد قائم رکھی اور اِس بات کی کوئی پروا نہیں کی کہ اِس طرح وہ اپنے آپ کو دوزخ کے حوالے کر رہے ہیں۔ گویا یہ ضد اُنھیں ایسی عزیز ہو گئی کہ اِس سے اُنھوں

عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿٩٠﴾
وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا
وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ
تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٩١﴾ وَلَقَدْ

اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اپنا فضل اتارے،[۲۲۴] یہ اُس چیز کا انکار کر دیں جو اللہ نے اتاری ہے۔ سو یہ غضب پر غضب کما لائے[۲۲۵] اور (دنیا اور آخرت میں) اِن منکروں کے لیے (اب) بڑی ذلت کا عذاب ہے۔ ۸۹-۹۰

اور (یہ وہ لوگ ہیں کہ) جب اِن سے اصرار کیا جاتا ہے کہ اُس چیز کو مان لو جو اللہ نے اتاری ہے تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اُسے ہی مانتے ہیں جو ہم پر اترا ہے اور اِس طرح جو کچھ اُس کے علاوہ ہے، اُس کا صاف انکار کر دیتے ہیں،[۲۲۶] دراں حالیکہ

نے اپنی جانوں کا مبادلہ کر لیا۔

[۲۲۴] اصل میں 'بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'اَنْ' سے پہلے 'علٰی' اِن میں عربی قاعدے کے مطابق حذف ہو گیا ہے، یعنی محض اِس ضد کی بنا پر کہ یہ قرآن بنی اسمٰعیل پر کیوں اترا ہے، خود اُن کے اندر کے کسی پیغمبر پر کیوں نہیں اترا۔

[۲۲۵] غضب پر غضب کے معنی یہ ہیں کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی وساطت سے خدا کے ساتھ باندھا ہوا عہد توڑ دینے کے باعث مغضوب تو وہ پہلے ہی تھے، لیکن قرآن کے ذریعے سے جب ایک مرتبہ پھر اُنھیں اِس عہد میں داخل ہونے کا موقع ملا اور اُنھوں نے اِس سے فائدہ نہیں اٹھایا تو ایک کے بعد اب وہ دوسرے غضب کے بھی مستحق ہو گئے ہیں۔

[۲۲۶] یعنی تورات کے بعد اب وہ کسی چیز پر ایمان لانے کے قائل نہیں ہیں۔

جَآءَكُمْ مُّوْسٰی بِالْبَیِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ
وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾
وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ط خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰكُمْ
بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ط قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا ق وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ

وہی حق ہے[۲۲۷]، اُن پیشین گوئیوں کے ٹھیک مطابق جو اِن کے ہاں موجود ہیں۔ اِن سے پوچھو، (وہ ہدایت جو تم پر اتری ہے)، اگر تم (اُس کے) ماننے والے ہو تو اِس سے پہلے پھر اللہ کے (اُن) نبیوں کو قتل کیوں کرتے رہے ہو (جو تمھاری طرف آئے)؟ اور حقیقت یہ ہے کہ موسیٰ تمھارے پاس کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آیا، پھر اُس کے پیچھے تم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا اور اُس وقت تم بڑے ظلم کا ارتکاب کر رہے تھے[۲۲۸]۔ ۹۱-۹۲

اور یاد کرو، جب ہم نے تم سے عہد لیا اور (اِس کے لیے) طور کو تم پر اٹھا دیا اور حکم دیا کہ یہ جو کچھ ہم نے تمھیں دیا ہے، اِسے مضبوطی سے پکڑو، اور سنو (اور مانو) تو

---

[۲۲۷] یعنی تورات کی پیشین گوئیوں کے مطابق اب قرآن ہی صحیفۂ حق ہے۔

[۲۲۸] اصل الفاظ ہیں: 'وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ'۔ قرآن کی رو سے سب سے بڑا ظلم چونکہ شرک ہے، اِس لیے 'وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ' یہاں ٹھیک 'وانتم مشرکون' کے مفہوم میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تورات پر اپنے ایمان کے دعوے میں اگر تم سچے ہو تو سیدنا موسیٰ کے دنیا میں ہوتے ہوئے بچھڑے کی پرستش کر کے پھر تم نے اِس ظلم کا ارتکاب کیوں کیا؟ پچھلے نبیوں نے بنی اسرائیل کی تاریخ کے اِسی شرم ناک واقعے کی طرف تعریض کرتے ہوئے یہاں تک کہا کہ اے اسرائیل، تو وہ ہے کہ تو نے پہلی شب میں بے وفائی کی ہے۔

بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾
قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ
دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ
اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾

(تمھارے بزرگوں نے جو رویہ اُس کے ساتھ اختیار کیا، اُس نے بتا دیا کہ) اُنھوں نے (گویا اُس وقت یہی) کہا کہ ہم نے سنا اور نہیں مانا۔ اور اُن کے اِس کفر کے باعث وہ بچھڑا اُن کے دلوں میں بسا دیا گیا۔[۲۲۹] اِن سے پوچھو، اگر تم ماننے والے ہو تو کیا ہی بری ہیں یہ باتیں جو تمھارا یہ ایمان تمھیں سکھاتا ہے! ۹۳

اِن سے کہو، اگر آخرت کا گھر اللہ کے نزدیک، سب لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمھارے لیے خاص ہے تو مرنے کی تمنا کرو، اگر تم (اپنے اِس دعوے میں) سچے ہو۔[۲۳۰] اور (تم دیکھو گے کہ) اپنے ہاتھوں کی جو کمائی یہ آگے بھیج چکے ہیں، اُس کی وجہ سے یہ کبھی اِس کی تمنا نہ کریں گے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ اِن ظالموں سے خوب واقف ہے۔ ۹۴-۹۵

---

[۲۲۹] یعنی اُس کی محبت بسا دی گئی کہ اُسے معبود بنا کر اُس کی پرستش کریں۔

[۲۳۰] قرآن نے یہ یہود کو شرم دلائی ہے کہ آخرت اگر تمھارے لیے خاص ہے اور اُس کی نعمتوں کے حق دار اِس دنیا میں اگر تنہا تمھی ہو تو اِس کا تقاضا تو یہ ہونا چاہیے کہ تم اپنے پروردگار سے ملاقات کے لیے موت کی آرزوئیں کرو، لیکن تمھیں معلوم ہے کہ تم جینے کے کیسے حریص ہو۔ یہ حقیقت، ظاہر ہے کہ یہود کے لیے بڑی تلخ اور اُنھیں اپنی نگاہوں میں بالکل رسوا کر دینے والی تھی۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَیٰوةٍ ۚۛ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا ۚۛ
یَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ
الْعَذَابِ اَنْ یُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾
قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

اور اِنھیں تم سب سے بڑھ کر جینے کا حریص پاؤ گے، اور (حد یہ ہے کہ) اُن لوگوں سے بھی بڑھ کر جنھوں نے شرک کو اپنا مذہب بنایا ہے[۲۳۱]۔ اِن میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ کاش، وہ ہزار سال جیتا رہے، دراں حالیکہ اگر یہ عمر بھی اُس کو مل جائے تو (اِس سے) وہ اپنے آپ کو اللہ کے عذاب سے بچا نہ سکے گا۔ اور (اِس میں شبہ نہیں کہ) جو کچھ یہ کرتے ہیں، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے[۲۳۲]۔ ۹۶

(قرآن کی دشمنی میں اب یہ جبریل کے بھی دشمن ہو گئے ہیں)، اِن سے کہہ دو: جو لوگ جبریل کے دشمن ہیں، وہ درحقیقت اللہ کے دشمن ہیں[۲۳۳]، اِس لیے کہ اُس نے

---

[۲۳۱] یعنی مشرکین عرب جنھیں ایک لمبی مدت تک نبیوں کی رہنمائی سے محروم رہنے کے باعث یہود اپنے مقابلے میں نہایت حقیر سمجھتے تھے۔ قرآن نے یہ واضح کیا ہے کہ دین و شریعت کی علم برداری کے بلند بانگ دعووں کے باوجود وہ اخلاقی طور پر اِن مشرکین سے بھی گرے ہوئے ہیں۔

[۲۳۲] یہاں اِس دیکھنے کا لازم مراد ہے، یعنی جب دیکھ رہا ہے تو اِنھیں لازماً اِن کے جرائم کی سزا بھی دے گا۔

[۲۳۳] یہ الفاظ اُس اسلوب کا تقاضا ہیں، جو اِس آیت میں جوابِ شرط کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٩٧﴾ مَنْ كَانَ
عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ
عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٩٨﴾

تو (اے پیغمبر)، اِسے اللہ کے اذن ہی سے تمھارے قلب پر نازل کیا ہے[۲۳۴]، اُن پیشین گوئیوں کی تصدیق میں جو اِس سے پہلے موجود ہیں اور اُن لوگوں کے لیے ہدایت اور بشارت کے طور پر جو ایمان والے ہیں[۲۳۵]۔ (اِنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) جو اللہ اور اُس کے فرشتوں اور اُس کے رسولوں اور جبریل اور میکائیل[۲۳۶] کے دشمن ہیں تو اللہ بھی ایسے کافروں کا دشمن ہے[۲۳۷]۔ ۹۷-۹۸

---

[۲۳۴] اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود اِس معاملے میں حماقت کی اِس حد تک پہنچ گئے تھے کہ قرآن کی دشمنی میں اُنھوں نے جبریل علیہ السلام کو بھی محض اِس لیے اپنا دشمن قرار دے دیا کہ اُنھوں نے یہ وحی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں اتاری ہے، اُن کے کسی آدمی پر کیوں نہیں اتاری۔

[۲۳۵] قرآن کے بارے میں اِس تفصیل سے مقصود یہود پر یہ واضح کرنا ہے کہ اُن کی مخالفت صرف قرآن کی مخالفت نہیں ہے، بلکہ اُن کی اپنی کتاب کی مخالفت ہے جس کی پیشین گوئیوں کے مطابق یہ نازل ہوا ہے اور محض ایک کتاب کی مخالفت نہیں ہے، بلکہ اُس ہدایت اور بشارت کی مخالفت ہے جو اُن کے پروردگار کی طرف سے اُن کے پاس آئی ہے۔

[۲۳۶] عام فرشتوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ جبریل اور میکائیل کا ذکر اُسی طرح ہوا ہے، جس طرح عام کے بعد خاص کا ذکر ہوتا ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ فرشتوں میں یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے ہاں خصوصی حیثیت کے حامل ہیں۔

[۲۳۷] اِس سے واضح ہوا کہ جبریل کی مخالفت تنہا جبریل کی مخالفت نہیں ہے، بلکہ خود اللہ تعالیٰ، اُس کے تمام فرشتوں اور تمام رسولوں کی مخالفت ہے۔ پھر یہ بھی واضح ہوا کہ اللہ، اُس کے فرشتوں

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾
اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ
لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾
وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ

اور (اِس قرآن کی صورت میں، اے پیغمبر)، ہم نے تمھاری طرف نہایت واضح دلیلیں اتار دی ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اُنھیں صرف اِس طرح کے نافرمان ہی نہیں مانتے۔ کیا یہی ہوتا رہے گا کہ یہ جب کوئی عہد باندھیں گے، اِن میں سے ایک گروہ اُسے اٹھا کر پھینک دے گا؟[۲۳۸] بلکہ (حق یہ ہے کہ) اِن میں سے اکثر تو ایمان ہی نہیں رکھتے۔ ۹۹-۱۰۰

اور (اب بھی یہی ہوا ہے کہ) جب اللہ کی طرف سے ایک پیغمبر[۲۳۹] اُن پیشین گوئیوں

اور اُس کے پیغمبروں کی مخالفت ایک بدترین کفر ہے اور اِس مخالفت کا یہ نتیجہ بھی سامنے آ گیا کہ اللہ بھی ایسے کافروں کا دشمن ہے۔ اِس کے بعد، ظاہر ہے کہ یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ جو لوگ اللہ کو اپنا دشمن بنا لیں، اُن سے زیادہ بدبخت کون ہو سکتا ہے۔ قرآن کے ایجاز بیان نے اِن سب باتوں کو اِس طرح سمیٹ دیا ہے کہ بات وہاں پہنچ بھی گئی ہے، جہاں اُسے پہنچنا چاہیے تھا اور مخاطبین کے لیے اُس سے انکار کی کوئی گنجایش بھی پیدا نہیں ہوئی۔

۲۳۸؎ اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب اور آخری پیغمبر کے بارے میں جو عہد یہود سے لیا تھا، اُس سے اُن کے گریز و فرار کا ذکر کرنے کے بعد یہ بانداز تعجب و اظہار حسرت فرمایا ہے کہ کیا اِن کی یہی روش ہمیشہ باقی رہے گی؟

۲۳۹؎ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۰۱) وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ

کے مطابق اِن کے پاس آ گیا ہے جو اِن کے ہاں موجود ہیں تو یہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی، اِن میں سے ایک گروہ نے اللہ کی اِس کتاب کو اِس طرح اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا، گویا وہ اِسے جانتے ہی نہیں۔[۲۴۰] اور (پیغمبر کو ضرر پہنچانے کے لیے) اُس چیز کے پیچھے لگ گئے[۲۴۱] جو سلیمان کی بادشاہی کے نام پر شیاطین پڑھتے پڑھاتے ہیں۔[۲۴۲] (یہ اُسے سلیمان کی طرف منسوب کرتے ہیں)، دراں حالیکہ سلیمان

---

[۲۴۰] مطلب یہ ہے کہ نبی آخر الزماں کے بارے میں خود اپنی ہی کتاب کی پیشین گوئیوں کو اِس طرح نظر انداز کر دیا گویا اُن سے واقف ہی نہیں تھے۔

[۲۴۱] یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے اور اُن کی پیروی کرنے کے بجاے اُن کو ضرر پہنچانے کے درپے ہوئے اور اِس کے لیے اپنے اُن عاملوں کے پیچھے لگے جو اِن کے ہاں سفلی اور روحانی علوم کی دکانیں لگائے بیٹھے ہیں۔ قرآن مجید کی سورۂ فلق (۱۱۳) کے الفاظ 'مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ' میں اللہ تعالیٰ نے یہود کے اِنھی اشرار سے بچنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو برابر اپنے پروردگار کی پناہ چاہنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

[۲۴۲] اصل میں 'عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں تضمین کا اسلوب ہے، یعنی 'مُفْتَرِيْنَ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ'۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح آج کے لوگ سفلی علوم کے لیے سلیمان علیہ السلام کا حوالہ دیتے ہیں، اُسی طرح یہود بھی اپنے اِس نوعیت کے مزخرفات کو اُنھی سے منسوب کرتے تھے۔ اِس کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ شیاطین جن سلیمان علیہ السلام کے تابع فرمان تھے۔ اِس طرح کے علوم چونکہ زیادہ تر جنات کے تصرفات سے پیدا ہوتے ہیں،

وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا

نے کبھی کفر نہیں کیا، بلکہ اِسی طرح کے شیطانوں نے کفر کیا۔ وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔[۲۴۳] اور اُس چیز کے پیچھے لگ گئے[۲۴۴] جو بابل میں دو فرشتوں، ہاروت و ماروت پر

اِس لیے تقدس کا رنگ دینے کے لیے لوگوں نے اِنھیں آں جناب سے منسوب کر دیا۔

۲۴۳؎ اصل میں 'وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ' سے لے کر 'يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ' تک یہ پوری بات ایک جملۂ معترضہ ہے جو سلسلۂ کلام کے بیچ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہود کے لگائے ہوئے الزامات سے بری قرار دینے کے لیے اِس طرح آ گیا ہے گویا متکلم کو اِن علوم سفلیہ کی نسبت اُن سے اتنی ناگوار ہے کہ اُس نے اِس کی تردید کے معاملے میں بات کے پورا ہو لینے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ پھر یہ تردید بھی، اگر غور کیجیے تو ایسے اسلوب میں کی گئی ہے کہ سحر و ساحری کا کفر ہونا اُس سے ایک ثابت شدہ حقیقت کے طور پر بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

۲۴۴؎ اِس سے پہلے کا جملہ، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، ایک جملۂ معترضہ ہے۔ لہٰذا آیت میں عطف لازماً 'مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ' پر ہے۔ یہ سحر و ساحری سے، جسے قرآن نے یکسر کفر قرار دیا ہے، بالکل مختلف کوئی علم تھا۔ یہ بات 'تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ' پر اِس کے عطف سے بھی واضح ہے، اِس علم کے لیے 'مَآ اُنْزِلَ' کے جو الفاظ آئے ہیں، اُن سے بھی معلوم ہوتی ہے، اور اِس کے لیے لفظ 'فِتْنَةٌ' کے استعمال سے بھی صاف مترشح ہے۔ لہٰذا اُن لوگوں کی راے کسی طرح صحیح نہیں ہے جو اِسے جادو سمجھتے ہیں اور اِس کے لیے اُن دو فرشتوں کے بارے میں جن پر یہ نازل ہوا، ایک فضول سا قصہ بھی سناتے ہیں۔ لیکن یہ اگر جادو نہیں تھا تو سوال یہ ہے کہ پھر یہ کون سا علم تھا؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی اِس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ”ہمارے نزدیک اِس سے مراد اشیا اور کلمات کے روحانی خواص اور تاثیرات کا وہ علم ہے جس کا رواج یہود کے صوفیوں اور پیروں میں ہوا اور جس کو اُنھوں نے گنڈوں، تعویذوں اور

مختلف قسم کے عملیات کی شکل میں مختلف اغراض کے لیے استعمال کیا، مثلاً بعض امراض یا تکالیف کے ازالے کے لیے یا نظر بد اور جادو وغیرہ کے برے اثرات دور کرنے کے لیے یا شعبدہ بازوں وغیرہ کے فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے یا محبت اور نفرت کے اثرات ڈالنے کے لیے۔

یہ علم اِس اعتبار سے جادو اور نجوم وغیرہ سے بالکل مختلف تھا کہ اِس میں نہ تو شرک کی کوئی ملاوٹ تھی اور نہ اِس میں شیطان اور جنات کو کوئی دخل تھا، لیکن اپنے اثرات و نتائج کے پیدا کرنے میں یہ جادو ہی کی طرح زود اثر تھا۔ ممکن ہے بنی اسرائیل کو یہ علم بابل کے زمانۂ اسیری میں دو فرشتوں کے ذریعے سے اِس لیے دیا گیا ہو کہ اِس کے ذریعے سے بابل کی سحر و ساحری کا مقابلہ کر سکیں اور اپنی قوم کے کم علموں اور سادہ لوحوں کو جادوگروں کے رعب سے محفوظ رکھ سکیں۔ اِس بات کی طرف ہمارا ذہن دو وجہ سے جاتا ہے: ایک تو اِس وجہ سے کہ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ بابل میں سحر و ساحری اور نجوم کا بڑا زور تھا۔ دوسری یہ کہ یہ بات سنت اللہ کے موافق معلوم ہوتی ہے کہ اگر کسی جگہ ایک غلط علم کا رعب اور زور ہو جس سے مفسد لوگ فائدہ اٹھا رہے ہوں تو وہاں اللہ تعالیٰ اُس کے مقابلے کے لیے اہل ایمان کو کوئی ایسا علم بھی عطا فرمائے جو جائز اور نافع ہو۔“ (تدبر قرآن ۱/ ۲۸۵)

اِس کے بعد اُنھوں نے لکھا ہے:

”ہمارا خیال یہ ہے کہ اِسی علم کے باقیات ہیں جن کو ہمارے صوفیوں اور پیروں کے ایک طبقہ نے اپنایا اور اِس سے اُنھوں نے لوگوں کو فائدہ بھی پہنچایا، بلکہ واقعات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض حالات میں اِس کی مدد سے اُنھوں نے جوگیوں اور جوتشیوں وغیرہ کے مقابل میں اسلام اور مسلمانوں کی برتری بھی ثابت کی، لیکن اخلاقی زوال کے بعد جس طرح یہود کے ہاں یہ علم علوم سفلیہ کا ایک ضمیمہ اور دکان داری کا ایک ذریعہ بن کے رہ گیا، اُسی طرح ہمارے یہاں بھی یہ صرف پیری مریدی کی دکان چلانے کا ذریعہ بن کر رہ گیا اور حق سے زیادہ اس میں باطل کے اجزا شامل ہو گئے جس کے سبب سے لوگوں پر اِس کے اثرات بھی وہی پڑے جو قرآن نے بیان فرمائے۔“ (۱/ ۲۸۶)

يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ
فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ

اتاری گئی تھی،[۲۴۵] دراں حالیکہ وہ دونوں اُس وقت تک کسی کو کچھ نہ سکھاتے تھے،[۲۴۶] جب تک اُسے بتا نہ دیتے کہ ہم تو صرف ایک آزمایش ہیں،[۲۴۷] اِس لیے تم اِس کفر میں نہ پڑو۔[۲۴۸]

---

[۲۴۵] 'وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ' والے جملے کی طرح 'وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ' سے 'فَلَا تَكْفُرْ' تک یہ جملہ بھی آیت میں ایک جملۂ معترضہ ہے جو ہاروت و ماروت کی بریت کے لیے وارد ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِس تنبیہ کے بغیر کہ ہمارے اِس علم کو برے مقاصد کے لیے استعمال کر کے تم لوگ کفر میں نہ پڑ جانا، وہ کسی پر اپنے علم کا انکشاف نہیں کرتے تھے۔

[۲۴۶] اِس سکھانے کی نوعیت اگرچہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ فرشتے انسانی روپ میں لوگوں کو تعلیم دیتے رہے ہوں، لیکن غالب امکان اِسی بات کا ہے کہ لوگ کسی خاص قسم کی ریاضت اور چلہ کشی کے ذریعے سے اُن کے ساتھ کوئی روحانی قسم کا ربط پیدا کر کے یہ علم اُن سے سیکھ لیتے تھے۔

[۲۴۷] اصل میں لفظ 'فِتْنَةٌ' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی امتحان اور آزمایش کے ہیں۔ قرآن میں اِس سے بالعموم وہ چیزیں مراد لی گئی ہیں جو اصلاً انسان کے فائدے ہی کے لیے پیدا کی گئی ہیں، لیکن انسان اپنے استعمال کی غلطی سے اُنھیں اپنے لیے فتنہ بنا لیتا ہے۔ ہاروت و ماروت کی طرف سے اپنے علم کے لیے اِس لفظ کا استعمال دلیل ہے کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ علم کوئی بری چیز نہ تھا۔

[۲۴۸] اصل میں 'فَلَا تَكْفُرْ' کے جو الفاظ آئے ہیں، اُن میں نہی نتیجے کے لحاظ سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا یہ علم ایک دو دھاری تلوار کی حیثیت رکھتا ہے۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ تم لوگ اِسے سیکھ کر برے مقاصد کے لیے استعمال کرو گے اور اِس طرح کفر و شرک میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۗ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۣ قف وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۗ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝١٠٢

پھر بھی یہ اُن سے وہ علم سیکھتے تھے جس سے میاں اور بیوی میں جدائی ڈال دیں[۲۴۹]، اور حقیقت یہ تھی کہ اللہ کی اجازت کے بغیر یہ اُس سے کسی کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکتے تھے[۲۵۰]۔ (یہ اِس بات سے واقف تھے) اور اِس کے باوجود وہ چیزیں سیکھتے تھے جو اِنھیں کوئی نفع نہیں دیتی تھیں، بلکہ نقصان پہنچاتی تھیں[۲۵۱]، دراں حالیکہ یہ جانتے تھے کہ جو اِن چیزوں کا خریدار ہے، اُس کے لیے پھر آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے[۲۵۲]۔ کیا ہی بری

---

[۲۴۹] اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہود اخلاقی فساد، پست ہمتی اور دنایت میں کہاں تک گر چکے تھے۔ فرشتوں کی تنبیہ کے باوجود، قرآن بتاتا ہے کہ اُن کی سب سے زیادہ رغبت اُن اعمال سے تھی جو میاں بیوی کے رشتۂ محبت کے لیے مقراض بن جائیں، دراں حالیکہ یہی رشتہ ہے جس کے استحکام پر پورے انسانی تمدن کے استحکام کی بنیاد ہے۔

[۲۵۰] یہ جملہ بھی بطور استدراک ہے اور اِس سے توحید پر ایمان کا یہ تقاضا واضح ہوتا ہے کہ بندۂ مومن کو اولاً، اِس طرح کی چیزوں سے رغبت ہی نہیں رکھنی چاہیے۔ ثانیاً، اِن میں سے کسی چیز سے واسطہ پڑے تو اِسے موثر بالذات نہیں سمجھنا چاہیے۔ ثالثاً، اِن سے ضرر کا اندیشہ ہو تو صرف اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ تعویذ گنڈوں اور اُن کے ماہر عاملوں اور سیانوں کے چکر میں نہیں پھنسنا چاہیے۔ اِس لیے کہ شیطانی علوم ہوں یا روحانی، اِن سے اللہ کے اذن کے بغیر کسی کو کوئی نفع یا ضرر نہیں پہنچایا جا سکتا۔

[۲۵۱] یعنی اِن کی ذہنیت اِس قدر پست ہو چکی تھی کہ ایک علم جس سے نفع و نقصان، دونوں پہنچ سکتے تھے، یہ اِسے دوسروں کو صرف نقصان پہنچانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ
لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۰۳
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ

ہے وہ چیز جس کے بدلے میں اِنھوں نے اپنی جانیں بیچ دیں۔ اے کاش، یہ جانتے۔ ۱۰۱-۱۰۲

اور اگر یہ ایمان اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ کے ہاں جو صلہ اِنھیں ملتا، وہ (اِن کے لیے) کہیں بہتر تھا۔ اے کاش، یہ سمجھتے[۲۵۳]۔ ۱۰۳

(اِن[۲۵۴] کے فتنوں سے بچنے کے لیے)، ایمان والو، (تم بارگاہِ رسالت میں بیٹھو

---

[۲۵۲] یہود اِس بات سے اچھی طرح واقف تھے، اِس لیے کہ تورات میں اُنھیں نہایت واضح الفاظ میں اِس طرح کے فتنوں میں پڑنے سے روکا گیا تھا۔ استثنا میں ہے:

> ”جب تو اُس ملک میں جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے، پہنچ جائے تو وہاں کی قوموں کی طرح مکروہ کام کرنے نہ سیکھنا۔ تجھ میں ہرگز کوئی ایسا نہ ہو جو اپنے بیٹے یا بیٹی کو آگ میں چلوائے یا فال گیر یا شگون نکالنے والا یا افسون گر یا جادوگر یا منتری یا جنات کا آشنا یا رمال یا ساحر ہو، کیونکہ وہ سب جو ایسے کام کرتے ہیں، خداوند کے نزدیک مکروہ ہیں اور اِن ہی مکروہات کے سبب سے خداوند تیرا خدا اُن کو تیرے سامنے سے نکالنے پر ہے۔“ (۱۸: ۹-۱۲)

[۲۵۳] یعنی پیغمبر کو ضرر پہنچانے کے لیے اِن علوم کے ماہرین کی اتباع کرنے کے بجائے اگر یہ پیغمبر پر ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو اِنھیں اندازہ نہیں ہو سکتا کہ اِس کا کیا اجر و ثواب اِنھیں اللہ تعالیٰ کے ہاں ملتا۔

[۲۵۴] یہ اب مسلمانوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے خلاف یہود کی اُن شرارتوں اور اعتراضات سے متنبہ کیا جا رہا ہے جو وہ قرآن کی طرف سے اُن پر اتمام حجت کے ردعمل میں اپنے

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ

تو) 'رَاعِنَا'[۲۵۵] نہ کہا کرو، 'اُنْظُرْنَا'[۲۵۶] کہا کرو اور جو کچھ کہا جائے، اُسے توجہ سے سنو،[۲۵۷] اور اِس بات کو یاد رکھو کہ اِن کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔[۲۵۸] اہل کتاب ہوں یا مشرکین، اِن میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے، وہ نہیں چاہتے کہ تمھارے

دل کی بھڑاس نکالنے، حضور کی توہین کرنے اور مسلمانوں کی نگاہوں میں آپ کو گرانے کے لیے کرتے تھے۔

[۲۵۵] 'رَاعِنَا'، 'مراعاة' سے امر کا صیغہ ہے۔ اِس کے لغوی معنی، ذرا ہماری رعایت فرمایئے، کے ہیں۔ بات اگر اچھی طرح سنی یا سمجھی نہ گئی ہو تو متکلم کو متوجہ کرنے کے لیے عربی زبان میں یہ لفظ بالکل اُسی موقع پر بولا جاتا ہے، جس موقع پر ہم اردو میں کہتے ہیں: ذرا پھر ارشاد فرمایئے۔ قرآن نے دوسری جگہ تصریح کی ہے کہ یہود اِس لفظ کو زبان ذرا نیچے کی طرف دبا کر اِس طرح ادا کرتے تھے کہ اِس کے معنی بالکل تبدیل ہو جاتے اور اِس سے اُن کا مقصود خدا کے دین اور اُس کے پیغمبر پر طنز کرنا اور پھبتی چست کرنا ہوتا۔ قرآن نے یہاں اِسی بنا پر اِس لفظ کو مسلمانوں کے مجلسی آداب سے یک قلم خارج کر دیا اور اِس کی جگہ ایک دوسرا لفظ 'اُنْظُرْنَا' استعمال کرنے کی ہدایت فرمائی جو عربی زبان میں اِس موقع و محل کے لیے معروف تھا اور جس میں اِس طرح کی تحریف کا بھی کوئی امکان نہ تھا۔

[۲۵۶] اِس کے لغوی معنی دیکھنے، مہلت دینے اور انتظار کرنے کے ہیں۔

[۲۵۷] اصل میں لفظ 'اِسْمَعُوْا' استعمال ہوا ہے۔ یہ اِس آیت میں اپنے حقیقی مفہوم میں ہے، یعنی غور سے سنو اور سمجھو تاکہ تمھیں بار بار پیغمبر کو متوجہ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔

[۲۵۸] یعنی اُن یہودیوں کے لیے جو پیغمبر کو جھٹلانے پر مصر ہیں اور مجلس نبوی میں نہ سننے کے

يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۱۰۵
مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۭ اَلَمْ
تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۰۶ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ

پروردگار کی طرف سے کوئی خیر تم پر نازل کیا جائے[۲۵۹]۔ (یہ احمق نہیں جانتے کہ) اللہ جس کو چاہتا ہے، اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیتا ہے، اور (نہیں جانتے کہ) اللہ بڑی عنایت فرمانے والا ہے۔ ۱۰۴-۱۰۵

(اِنھیں اعتراض ہے کہ تورات کی شریعت میں ہم کوئی تبدیلی کیوں کرتے ہیں؟ اِنھیں بتادو کہ) ہم (اِس کتاب کی) جو آیت بھی منسوخ کرتے ہیں[۲۶۰] یا اُسے بھلا دیتے ہیں[۲۶۱]، (قرآن میں) اُس کی جگہ اُس سے بہتر یا اُس جیسی کوئی دوسری لے آتے ہیں[۲۶۲]۔ کیا تم نہیں جانتے، (لوگو) کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے؟ کیا تم نہیں جانتے کہ

لیے آتے ہیں اور نہ سمجھنے کے لیے، بلکہ صرف اِس لیے آتے ہیں کہ پیغمبر کی توہین کا کوئی موقع پیدا کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالیں۔

[۲۵۹] مطلب یہ ہے کہ مسئلہ صرف ایک لفظ کے استعمال کرنے اور نہ کرنے کا نہیں ہے، بلکہ یہودی اور مشرکین، دونوں اِس غصے اور حسد میں جل رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی صورت میں یہ خیر عظیم تمھیں کیوں عطا فرمایا ہے۔

[۲۶۰] یعنی شریعت کے ایک ضابطے کو ہٹا کر کوئی دوسرا ضابطہ مقرر کرتے ہیں۔

[۲۶۱] اصل میں لفظ 'اِنْسَاء' استعمال ہوا ہے، یعنی فراموش کرا دینا۔ اِس سے قرآن نے تورات کے اُن احکام کی طرف اشارہ کیا ہے جن سے یہود نے بے پروائی برتی اور اُن کے اِس جرم کی پاداش میں وہ اُن کے ذہنوں سے محو کر دیے گئے۔

مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ
وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۱۰۷)

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ
قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ (۱۰۸)

زمین اور آسمانوں کی پادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے؟ (وہ جس کو چاہے گا، اپنی شریعت کا حامل بنائے گا)، اور (تم اگر اُس کا یہ فیصلہ نہیں مانتے تو) اللہ کے سوا تمھارے لیے (اِس دنیا میں پھر) کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مدد کرنے والا۔ ۱۰۶-۱۰۷

(اِن کی پیروی میں، ایمان والو)، کیا تم بھی اپنے رسول سے اُسی طرح کی باتیں پوچھنا چاہتے ہو، جس طرح کی باتیں اِس سے پہلے موسیٰ سے پوچھی گئی تھیں؟[۲۶۳] (تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ایمان کا طریقہ نہیں ہے) اور (معلوم ہونا چاہیے کہ) جس نے ایمان کے بدلے میں کفر کو لے لیا، وہ پھر سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔[۲۶۴] ۱۰۸

---

[۲۶۲] اصل الفاظ ہیں: 'نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا'۔ اِن میں 'اَوْ' تقسیم کے لیے ہے، یعنی تورات کے وہ ضابطے جو منسوخ کر دیے گئے، تمدن کے ارتقا اور حالات کی تبدیلی کے پیش نظر اُن سے بہتر ضابطے دیتے ہیں، اور جو بھلا دیے گئے، اُن کی جگہ اُنھی جیسے بعض دوسرے ضوابط نازل کر دیتے ہیں۔ اِن دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو قابل اعتراض قرار دی جا سکے۔ پہلی چیز حالات کے تغیر کا لازمی تقاضا ہے اور دوسری دین کی دولت کے اُس ضیاع کا لازمی نتیجہ جو تمھارے ہاتھوں سے ہوا اور جس کے باعث ضروری تھا کہ اب دین کے خزانے کو نئی دولت سے معمور کیا جائے۔

[۲۶۳] اصل میں لفظ 'سُؤَال' استعمال ہوا ہے۔ عربی زبان میں یہ کئی معنوں میں آتا ہے۔

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ
كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ
فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ ﴿١٠٩﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ

بہت سے اہل کتاب محض اپنے جی کے حسد کی وجہ سے یہ چاہتے ہیں کہ تمھارے ایمان لانے کے بعد وہ پھر تمھیں کفر کی طرف پلٹا دیں، اِس کے باوجود کہ حق اُن پر اچھی طرح واضح ہو چکا ہے۔ سو اُن سے درگذر کرو[۲۶۵] اور نظر انداز کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کر دے[۲۶۶]۔ بے شک، اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اور (اُن کے

یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ یہ معترضانہ سوال کے مفہوم میں ہے۔

۲۶۴ اِس سے اوپر والی آیت میں جس طرح یہود کو تنبیہ کی گئی ہے، اُسی طرح یہ مسلمانوں میں اُن کی نمائندگی کرنے والوں کو تنبیہ ہے۔ تاہم اِن سوالات کے پس پردہ بھی چونکہ یہود ہی کا ذہن کارفرما تھا، اِس وجہ سے قرآن نے یہ کہہ کر کہ اِس طرح کی باتیں اِس سے پہلے موسیٰ سے پوچھی گئیں، بڑی بلاغت کے ساتھ اُنھیں بھی توجہ دلا دی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی سازشوں اور وسوسہ اندازیوں سے بے خبر نہیں ہے۔

۲۶۵ اصل میں لفظ 'عَفْو' استعمال ہوا ہے۔ یہ جس طرح دل سے معاف کر دینے کے معنی میں آتا ہے، اُسی طرح درگذر کرنے، چشم پوشی کرنے اور نظر انداز کر دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں اِس معنی کی نظیر سورۂ مائدہ (۵) کی آیت ۱۵ میں دیکھ لی جا سکتی ہے۔

۲۶۶ یہی فیصلہ ہے جو یہود پر اتمام حجت کے بعد اُن کے قتل، جلاوطنی، اور اُن سے جزیہ لینے اور اُنھیں مسلمانوں کا زیر دست بنا کر رکھنے کی صورت میں صادر ہوا۔

مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾
وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ
اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۗ مَنْ
اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ

فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے) نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو[۲۶۷] اور (یاد رکھو کہ) جو نیکی بھی تم اپنے لیے آگے بھیجو گے، اُسے تم اللہ کے ہاں پا لو گے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔ ۱۰۹-۱۱۰

یہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص جنت میں داخل نہ ہو سکے گا، جب تک وہ یہودی یا نصرانی نہ ہو[۲۶۸]۔ یہ اِنھوں نے محض آرزوئیں باندھ لی ہیں۔ اِن سے کہو، تم سچے ہو تو (اِس کے لیے) اپنی کوئی دلیل پیش کرو۔ (اِن کی اِس بات میں کوئی حقیقت نہیں)۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ اپنی ہستی جن لوگوں نے اللہ کے سپرد کر دی[۲۶۹]، اور وہ اچھی طرح سے عمل کرنے والے ہیں[۲۷۰]، اُن کے لیے اُن کا اجر اُن کے پروردگار کے

---

[۲۶۷] تمام دین کی بنیاد اور تمام اصلاح و تربیت کی اساس، قرآن کی رو سے یہ نماز اور زکوٰۃ ہی ہیں۔ چنانچہ اِس طرح کے سب مواقع پر وہ معاندین اسلام کے فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بالعموم اِنھی کی تاکید کرتا ہے۔

[۲۶۸] یعنی یہودی کہتے ہیں کہ جب تک یہودی نہ ہو اور نصرانی کہتے ہیں کہ جب تک نصرانی نہ ہو۔ یہ لف کا اسلوب ہے جس میں کلام کے بعض حصے سامع کی ذہانت پر اعتماد کرتے ہوئے حذف کر دیے جاتے ہیں۔

[۲۶۹] یعنی اپنی پوری زندگی کو خدا کی شریعت کے تابع کر دیا۔

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى
عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ
الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ

ہاں محفوظ ہے، اور اُن کے لیے نہ وہاں کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ کبھی غم زدہ ہوں گے۔[۲۷۱] (اپنے گروہ سے باہر یہ کسی حق کو نہیں مانتے، لہٰذا) یہودی کہتے ہیں کہ نصاریٰ کی کوئی بنیاد نہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہودیوں کی کوئی بنیاد نہیں، دراں حالیکہ دونوں کتابِ الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں۔[۲۷۲] اِسی طرح[۲۷۳] بالکل اِنھی کی سی بات اُن لوگوں نے بھی

---

[۲۷۰] اصل میں لفظ 'مُحْسِنٌ' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی کسی کام کو اُس کے بہترین طریقے پر کرنے کے ہیں۔ دین میں جب کوئی عمل اِس طرح کیا جائے کہ اُس کی روح اور قالب پورے توازن کے ساتھ پیشِ نظر ہوں۔ اُس کا ہر جزبہ تمام و کمال ملحوظ رہے تو اُسے احسان کہا جاتا ہے۔ لفظ 'مُحْسِنٌ' اِسی احسان سے بنا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کی وضاحت میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی جب اِس احساس کے ساتھ کی جائے گویا ہم اُسے دیکھ رہے ہیں تو یہ احسان ہے۔*

[۲۷۱] یعنی یہودی اور نصرانی نہیں، بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو جنت کے مستحق قرار پائیں گے۔

[۲۷۲] مطلب یہ ہے کہ فرقہ دارانہ تعصّبات نے اِن کے اندر حق و باطل میں امتیاز کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہنے دی۔ یہ اب حق کو حق کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اپنے فرقوں اور گروہوں کے حوالے سے پہچانتے ہیں۔ چنانچہ تمھاری مخالفت سے الگ اِن کی باہمی تکفیر و تفسیق کی حالت بھی یہ ہے کہ دونوں ایک ہی کتاب پڑھتے ہیں، مگر ایک دوسرے کی کوئی جڑ بنیاد تسلیم نہیں کرتے۔

---

* مسلم، رقم ۹۳۔

يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾
وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ
وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ۵ؕ

کہی جو (خدا کی کتاب کا) کوئی علم نہیں رکھتے[۲۷۴]۔ چنانچہ اب اللہ اِن کے درمیان قیامت کے دن ہی اِس معاملے کا فیصلہ کرے گا جس میں یہ جھگڑ رہے ہیں[۲۷۵]۔ ۱۱۱-۱۱۳

(اپنے اِنھی اختلافات کی وجہ سے یہ ایک دوسرے کی عبادت گاہوں کو ویران کرتے رہے ہیں[۲۷۶])۔ اور اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کے معبدوں میں اِس بات سے منع کرے کہ وہاں اُس کا نام لیا جائے اور اُن کی ویرانی کے درپے ہو۔ اِن کے لیے اِس کے سوا کچھ زیبا نہ تھا کہ اِن (معبدوں) میں جائیں تو اللہ سے

---

[۲۷۳] یعنی اِس نیت کے ساتھ اور اِنھی محرکات کے تحت جو یہود کے اِس طرح کی بات کہنے کا باعث بنے ہیں۔

[۲۷۴] اِس سے مراد مشرکینِ عرب ہیں۔ یہ چونکہ صدیوں سے کتاب اور نبوت، دونوں سے نا آشنا تھے، اِس لیے اِن کا ذکر اِن الفاظ میں ہوا ہے۔

[۲۷۵] اِس میں اگر غور کیجیے تو مخاطبین کے لیے وعید کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ تسلی بھی ہے کہ تم اِس نزاع میں صرف حق پہنچا دینے ہی کے ذمہ دار ہو۔ اِس سے زیادہ تمھارے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

[۲۷۶] اشارہ ہے اُس جنگ و جدال کی طرف جو یہود و نصاریٰ کے درمیان بیت المقدس میں بھی ایک دوسرے کو خدا کی یاد اور اُس کی عبادت سے روکنے کے لیے ہوا اور اُس سے باہر بھی جہاں جہاں اُنھیں اِس کا موقع ملا۔

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ
الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۗ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

ڈرتے ہوئے جائیں۔[۲۷۷] (لیکن اِنھوں نے سرکشی اختیار کی تو اب) اِن کے لیے دنیا میں بھی ذلت ہے اور قیامت میں بھی ایک بڑا عذاب اِن کا منتظر ہے۔ (یہ اِس لیے ہوا کہ اِن میں سے کسی نے مشرق کو قبلہ ٹھیرایا اور کسی نے مغرب[۲۷۸] کو)، اور حق یہ ہے کہ مشرق و مغرب، سب اللہ ہی کے لیے ہیں۔ لہٰذا (اللہ کے حکم پر) تم جدھر رخ کرو گے، وہیں اللہ کا رخ ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ بڑی گنجایش والا ہے، وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔[۲۷۹] ۱۱۴-۱۱۵

---

[۲۷۷] یعنی انبیا علیہم السلام کے ذریعے سے ہدایت پانے کے بعد اِن لوگوں کے لیے تو کسی طرح موزوں نہ تھا کہ خدا کی عبادت گاہوں کو ویران کریں۔ اِنھیں تو اُن میں ہمیشہ اللہ سے ڈرتے اور لرزتے ہوئے داخل ہونا چاہیے تھا۔

[۲۷۸] یہود و نصاریٰ، دونوں کا قبلہ بیت المقدس تھا، لیکن نصاریٰ نے غالباً اُس میں سیدہ مریم کے مقام اعتکاف کی رعایت سے مشرق کو قبلہ بنا لیا اور یہود نے اُن کی ضد میں مغرب کی سمت اختیار کر لی۔ پھر اِس اختلاف کے باعث اُن کے مابین خوب خوب لڑائی ہوئی اور دونوں نے ایک دوسرے کے معبدوں کی حرمت پوری بے دردی کے ساتھ پامال کی۔

[۲۷۹] یعنی قبلہ کے معاملے میں اصل چیز اللہ کا حکم ہے۔ وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے۔ لہٰذا اُس کے حکم پر تم جدھر رخ کرو گے، اللہ ہی کی طرف رخ کرو گے۔ یہ تم ہو جو اپنی جہالت اور اپنے تعصّبات کے اسیر ہو جاتے ہو، ورنہ اللہ تو بڑی وسعت والا ہے، وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤی
اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَاۤ اٰيَةٌ ؕ
كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ

(پھر یہی نہیں، اپنی نجات کے یہ مدعی اِس قدر پستی میں گر چکے ہیں کہ) اِنھوں نے کہا ہے کہ اللہ کی اولاد ہے۔ (لاریب)، وہ پاک ہے اِن باتوں سے، بلکہ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، اُسی کا ہے، سب اُس کا حکم مانتے ہیں۔ زمین اور آسمانوں کو وہی عدم سے وجود میں لانے والا ہے اور جب کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اُس کے لیے اِتنا ہی کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے[۲۸۰]۔ ۱۱۶-۱۱۷

اور اِسی طرح اُن لوگوں نے بھی کہا ہے جو (کتاب الٰہی کا) علم نہیں رکھتے[۲۸۱] کہ اللہ ہم سے (براہ راست) کیوں ہم کلام نہیں ہوتا[۲۸۲] یا ہمارے پاس کوئی واضح نشانی

---

۲۸۰ مطلب یہ ہے کہ ایسی بے نیاز، بے ہمہ اور قادر مطلق ہستی کے ساتھ اِس بے ہودہ عقیدے کا کیا تعلق کہ اُس کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں؟

۲۸۱ یعنی مشرکین عرب جو صدیوں سے وحی اور کتاب نام کی کسی چیز سے واقف نہ تھے۔

۲۸۲ یعنی ہم جو قریش کے سردار ہیں اور اثر و اقتدار میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کہیں بڑھ کر ہیں تو اللہ تعالیٰ ہم سے براہ راست کیوں بات نہیں کرتا؟ قریش کے اِس مطالبے کا جواب قرآن نے بعض دوسرے مقامات پر دیا ہے، لیکن یہاں نہیں دیا۔ اِس سے یہ اشارہ کرنا پیش نظر ہے کہ یہ مطالبہ اِس قدر احمقانہ ہے کہ اِس کے جواب میں خاموشی ہی اِس کا جواب ہے۔ سرداران قریش

قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾

کیوں نہیں آتی؟[۲۸۳] بالکل اِسی طرح جو اِن سے پہلے گزرے ہیں، اُنھوں نے بھی اِنھی کی سی بات کہی تھی۔ اِن سب کے دل ایک سے ہیں۔[۲۸۴] ہم نے اپنی نشانیاں اُن لوگوں کے لیے جو یقین کرنا چاہیں، ہر لحاظ سے واضح کر دی ہیں۔[۲۸۵] (لہٰذا تمھاری کوئی ذمہ داری نہیں کہ اِن کی خواہش کے مطابق اِنھیں معجزے اور نشانیاں دکھاؤ)۔ ہم نے تمھیں حق کے ساتھ بھیجا ہے، (اے پیغمبر)، بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر، اور تم

کے پندارِ سیاست پر، ظاہر ہے کہ جو ضرب اِس خاموشی سے لگ سکتی تھی، وہ اِس مطالبے کے کسی جواب سے نہیں لگ سکتی تھی۔

[۲۸۳] نشانی سے اُن کی مراد کوئی ایسی نشانی تھی جسے دیکھ کر ہر شخص پکار اٹھے کہ اِس کا دکھانے والا یقیناً کوئی فرستادۂ خداوندی ہی ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اِس رسول کے ساتھ کوئی فرشتہ آسمان سے اترے اور گلی کوچوں میں اِس کی منادی کرتا پھرے یا کم سے کم اِس کے اشارے پر اُس عذاب ہی کا کوئی نمونہ دکھا دیا جائے جس کی وعید وہ شب و روز اُنھیں سناتا ہے۔

[۲۸۴] یعنی جس طرح کی نشانی کا تقاضا یہ کر رہے ہیں، بالکل اُسی طرح کی نشانی اِن سے پہلی قوموں نے بھی اپنے رسولوں سے طلب کی تھی۔ وہ بھی حق واضح ہو جانے کے بعد محض ہٹ دھرمی کے باعث یہ مطالبہ کر رہے تھے اور یہ بھی حق کو پوری طرح سمجھ لینے کے بعد محض ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں۔ لہٰذا جس طرح کے قفل اُن کے دلوں پر تھے، اُسی طرح کے قفل اِن کے دلوں پر بھی ہیں۔ یہ اب عذاب دیکھ لینے کے بعد ہی مانیں گے۔

[۲۸۵] مطلب یہ ہے کہ جو یقین کرنا چاہیں، اُن کے لیے تو تمھاری رسالت کا اثبات اب کسی نشانی اور معجزے کا محتاج نہیں رہا، اِس لیے کہ انفس و آفاق اور تاریخ و آثار سے اِس کے دلائل ہم

وَلَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ
قُلْ اِنَّ هُدَی اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰی ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ
جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَکَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ (۱۲۰)
اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ
بِهٖ ؕ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۱۲۱)

سے اِن دوزخ والوں[۲۸۶] کے بارے میں ہرگز کوئی پرسش نہ ہوگی۔ ۱۱۸-۱۱۹

یہ یہود و نصاریٰ تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے، جب تک اِن کا مذہب اختیار نہ کرلو۔ (لہٰذا) کہہ دو کہ اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے، اور (جان لو کہ) اگر تم اُس علم کے بعد جو تمھارے پاس آ چکا ہے، اِن کی خواہشوں[۲۸۷] پر چلے تو اللہ کے مقابلے میں تمھارا کوئی دوست اور کوئی مددگار نہ ہوگا۔[۲۸۸] ۱۲۰

(تمھیں مطمئن رہنا چاہیے کہ) وہ لوگ جنھیں ہم نے کتاب عطا فرمائی اور اُن کا معاملہ یہ رہا کہ وہ اُس کی تلاوت کا حق ادا کرتے رہے، وہی اِس (ہدایت) پر ایمان لائیں گے[۲۸۹] اور جو اِس کے منکر ہوں گے تو وہی اصل میں نقصان اٹھانے والے

نے ہر پہلو سے کھول کھول کر قرآن میں بیان کردیے ہیں۔

[۲۸۶] یعنی سرکشی اور ہٹ دھرمی کے باعث دوزخ جن کے لیے مقدر ہو چکی ہے۔

[۲۸۷] یہود و نصاریٰ کے طریقوں کو اِن کی خواہشات سے تعبیر اِس لیے کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم اور ہدایت آجانے کے بعد کسی دوسرے طریقے پر اصرار درحقیقت اپنی خواہشات ہی کی پیروی ہے۔

[۲۸۸] یہاں اگرچہ خطاب بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن صاف واضح ہے کہ

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ

ہیں۔[۲۹۰] ۱۲۱

اے[۲۹۱] بنی اسرائیل، میری اُس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی تھی[۲۹۲] اور اِس بات کو

تنبیہ اور عتاب کا رخ یہود و نصاریٰ ہی کی طرف ہے۔

۲۸۹ اِس مفہوم کے لیے اصل میں جو الفاظ آئے ہیں، اُن میں 'يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ'، 'اٰتَيْنٰهُمُ' کی ضمیر منصوب سے حال واقع ہوا ہے اور 'اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ' 'اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ' کی خبر ہے۔ پھر اِس جملے میں بلاغت کا یہ پہلو بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ یہاں چونکہ ذکر صالحین اہل کتاب کا ہے، اِس لیے 'اوتوا الكتاب' کے بجائے 'اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ' کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ قرآن کے ذوق آشنا اِس فرق کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

۲۹۰ یہ اِس سلسلۂ بیان کے آخر میں واضح کر دیا ہے کہ جو اِس سے پہلے حق کی قدر کرتے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اب بھی اُنھیں ہی اِس کی توفیق عطا فرمائے گا۔ قرآن سے ہدایت بھی وہی پائیں گے، جنھوں نے تورات و انجیل کی تلاوت کا حق ادا کیا ہے۔ ہدایت و ضلالت کے باب میں یہ اللہ کی سنت ہے اور اللہ اپنی سنت کبھی تبدیل نہیں کرتا۔

۲۹۱ سورہ کی پہلی فصل آیت ۱۲۱ پر ختم ہوئی۔ یہاں سے دوسری فصل کم و بیش اُنھی الفاظ سے شروع ہو رہی ہے جو پچھلی فصل کی ابتدا میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ یہ اعادہ سورہ کے مضمون میں اِس وصل و فصل کو بالکل نمایاں کر دیتا ہے کہ آیت ۴۰ سے جس بات کی ابتدا ہوئی تھی، وہ جس طرح یہاں ختم ہوئی ہے، اُسی طرح ایک دوسرے پہلو سے دوبارہ شروع بھی ہو گئی ہے۔ لہٰذا آگے کا مضمون اب پچھلے کسی پیرے سے نہیں، بلکہ پوری فصل سے متعلق ہے۔

پچھلی فصل میں، اگر غور کیجیے تو یہ حقیقت اچھی طرح واضح کر دی گئی ہے کہ اہل کتاب، خاص کر یہود کے لیے دین حق کی طرف آنے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ اُن کا یہ زعم ہے کہ وہ

فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ
عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ

کہ میں نے تمھیں دنیا والوں پر فضیلت دی تھی[۲۹۳] اور اُس دن سے ڈرو،[۲۹۴] جب کوئی کسی

ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہدایت اور نجات اگر حاصل ہوسکتی ہے تو صرف اِسی صورت میں حاصل ہوسکتی ہے کہ آدمی یہود و نصاریٰ میں سے کسی ایک کا دین اختیار کرے۔ اِس دوسری فصل میں اہل کتاب کے اِنھی مزعومات کی تردید کے لیے سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے فرزندوں کی سرگذشت کا وہ حصہ اُن کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے جس سے اُن کی تردید کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کی دعوت کی پوری پوری تائید بھی ہو رہی ہے۔ اہل کتاب کے لیے یہ مضمون گویا اتمام حجت کے اسلوب میں اِس بات کی دعوت ہے کہ یہودیت اور نصرانیت کے تعصّبات کو چھوڑ کر وہ اِس دین ابراہیمی کی پیروی کریں جس کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُنھیں بلا رہے ہیں۔ پچھلی فصل کے پورے مضمون کو اِس لحاظ سے یہ فصل اِس کے نقطۂ عروج پر پہنچا دیتی ہے۔

۲۹۲ یعنی دنیا میں جو کچھ فضیلت بھی تمھیں حاصل رہی ہے، محض اللہ تعالیٰ کی عنایت سے حاصل رہی ہے۔ اِس میں نہ تمھارے استحقاق کو کوئی دخل ہے اور نہ تمھاری خاندانی شرافت کو۔ اِس لیے اِس کے غرور میں مبتلا ہو کر اِس دعوت سے منہ نہ موڑو جو اِس وقت تمھارے سامنے پیش کی جا رہی ہے۔

۲۹۳ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے اور اُس اجمال کی وضاحت ہے جو لفظ نعمت میں موجود ہے۔ فضیلت سے مراد یہاں قوموں پر حق کی شہادت کا وہی منصب ہے جس پر بنی اسرائیل صدیوں سے فائز تھے۔

۲۹۴ یعنی اِس دعوت کو قبول کرو اور اِس کے معاملے میں اُس دن سے ڈرو جس میں تمھیں اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔

وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ

کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ اُس سے کوئی بدلہ قبول کیا جائے گا، نہ اُسے کوئی سفارش نفع دے گی اور نہ لوگوں کو کوئی مدد ہی ملے گی۔[۲۹۵] ۱۲۲-۱۲۳

اور یاد کرو، جب ابراہیم کو اُس کے پروردگار نے چند باتوں[۲۹۶] میں آزمایا[۲۹۷] تو اُس

---

[۲۹۵] یعنی اِس خیال میں نہ رہو کہ تم چونکہ ابراہیم اور اسحاق و یعقوب جیسے انبیا علیہم السلام کی اولاد ہو، اِس لیے روز قیامت تمھاری نجات کے لیے اِن بزرگوں کی نسبت ہی کافی ہے۔ یاد رکھو، وہاں عمل کے سوا کوئی چیز بھی تمھارے کام نہ آسکے گی۔

[۲۹۶] اصل میں لفظ 'کَلِمٰت' آیا ہے جو 'کلمة' کی جمع ہے۔ یہ مفرد لفظ کے معنی میں بھی آتا ہے اور پوری بات کے لیے بھی۔ یہاں اِس سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ احکام ہیں جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو ایمان و اسلام پر اُن کی استقامت کے امتحان کے لیے دیے گئے اور اُنھوں نے بغیر کسی تردد کے بے چون وچرا اُن کی تعمیل کی۔ مثلاً خاندان اور قوم و وطن سے ہجرت اور دشت غربت میں اکلوتے فرزند کی قربانی۔ اِن احکام کے لیے لفظ 'کلمة'، اگر غور کیجیے تو نہایت موزوں استعمال ہوا ہے۔ اپنے معنی کے لحاظ سے یہ ایک قسم کے ابہام و اجمال کا حامل ہے۔ سیدنا ابراہیم کو اُن کے امتحان کے لیے جو احکام دیے گئے، اُن کی نوعیت بھی یہی تھی کہ حکم تو دیا گیا، لیکن اُس کا صلہ اور فلسفہ بیان نہیں کیا گیا۔ گویا ایک مجمل بات بغیر کسی وضاحت کے سامنے رکھ دی گئی کہ وہ اُسے پورا کر دیں۔

[۲۹۷] اصل میں لفظ 'اِبْتِلَاء' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی جانچنے اور امتحان کرنے کے ہیں۔ بندوں کی اخلاقی تربیت کے لیے یہ اللہ تعالیٰ کی ایک سنت ہے۔ اِسی سے اُن کی چھپی ہوئی صلاحیتیں ابھرتی اور پروان چڑھتی ہیں اور اِسی سے اُن کے کھوٹے اور کھرے کو الگ کیا جاتا ہے۔

جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِىۡ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهۡدِى الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۲۴﴾

نے وہ پوری کر دیں[۲۹۸]، فرمایا: میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمھیں لوگوں کا امام بناؤں گا[۲۹۹]۔ عرض کیا: اور میری اولاد میں سے؟ فرمایا: میرا یہ عہد اُن میں سے ظالموں کو شامل نہیں ہے[۳۰۰]۔ ۱۲۴

---

[۲۹۸] اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو جن امتحانوں میں ڈالا، اُن میں سے ہر امتحان نہایت کٹھن تھا۔ وہ اِن سب میں پورے اترے، لیکن بیٹے کی قربانی کا امتحان اِن سب سے بڑھ کر تھا۔ اِس میں پورا اترنا تو الگ رہا، اِس کا تصور بھی ہما شما کے لیے آسان نہیں ہے۔ تاہم سیدنا ابراہیم اِس میں بھی ہر لحاظ سے پورے اترے اور خدا کے حکم پر اپنے سیزدہ سالہ اکلوتے اور محبوب فرزند کو قربانی کے لیے ماتھے کے بل پچھاڑ دیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ابراہیم تو نے تو خواب کو سچ کر دکھایا۔ یہی موقع تھا، جب اللہ تعالیٰ نے اُن سے وعدہ کیا کہ میں تمھیں لوگوں کا امام بناؤں گا۔

[۲۹۹] یہ ایک ہی وعدہ بیک وقت دو وعدوں پر مشتمل ہے: ایک یہ کہ اُن کی نسل میں ایسی برکت ہو گی کہ اُس کے وسیلے سے اُن کی دعوت دنیا کی تمام قوموں تک پہنچے گی۔ دوسرے یہ کہ اِس کے نتیجے میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام اُن سب کے امام اور پیشوا قرار پائیں گے۔ بائیبل کی کتاب پیدایش میں اِس وعدے کا ذکر اِس طرح ہوا ہے:

> ”اور خداوند کے فرشتے نے آسمان سے دوبارہ ابراہام کو پکارا اور کہا کہ خداوند فرماتا ہے چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے دریغ نہ رکھا، اِس لیے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی ہے کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کنارے کی ریت کی مانند کر دوں گا اور تیری اولاد اپنے دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہو گی اور تیری نسل کے وسیلے سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی، کیونکہ تو نے

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ

اور یاد کرو، جب ہم نے (سرزمین عرب میں) اِس بیت الحرام[۳۰۱] کو لوگوں کا مرجع

میری بات مانی۔“ (۲۲:۱۵-۱۸)

۳۰۰؎ اِس سے مخاطبین کو یہ بتانا مقصود ہے کہ ابراہیم سے تعلق کی بنا پر وہ اگر اپنے آپ کو ایمان و عمل کی ذمہ داری سے سبک دوش سمجھے ہوئے ہیں تو اُن کا یہ خیال بالکل غلط ہے، اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جس دن ابراہیم کو امامت کا یہ منصب دیا تھا، اُسی دن یہ بات بھی اُن پر واضح کر دی تھی کہ تمھاری ذریت میں سے جو لوگ تمھارے طریقے پر قائم اور میری ہدایت کے پیرو رہیں گے، اِس امامت کے وارث بھی وہی ہوں گے۔ اُن میں سے جو میرے ساتھ اپنا عہد توڑ کر شیطان کے راستے پر چل پڑیں گے، اُن کے لیے اِس امامت میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔

۳۰۱؎ اصل میں لفظ ’اَلْبَیْتَ‘ آیا ہے۔ اِس میں لام عہد کا ہے۔ اور اِس سے مراد ام القریٰ مکہ کا بیت الحرام ہے۔ بائیبل میں اِسے بیت ایل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایل کے معنی عبرانی میں اللہ کے ہیں۔ پیدایش میں ہے:

> ”اور ابرام اُس ملک میں سے گزرتا ہوا مقام سکم میں مورہ (مروہ) کے بلوط تک پہنچا۔ اُس وقت ملک میں کنعانی رہتے تھے۔ تب خداوند نے ابرام کو دکھائی دے کر کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا اور اُس نے وہاں خداوند کے لیے جو اُسے دکھائی دیا تھا، ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں سے کوچ کر کے اُس پہاڑ کی طرف گیا جو بیت ایل کے مشرق میں ہے اور اپنا ڈیرا ایسے لگایا کہ بیت ایل مغرب میں اور عی مشرق میں پڑا اور وہاں اُس نے خداوند کے لیے ایک قربان گاہ بنائی اور خداوند سے دعا کی۔“ (۱۲: ۶-۸)

امام فراہی نے اپنے رسالہ ”الرأی الصحیح فی من ہو الذبیح“ میں بعض دوسرے اشارات و قرائن سے بھی یہ بات پوری قطعیت سے ثابت کر دی ہے کہ ابراہیم نے جو معبد بنایا، وہ یہی بیت الحرام ہے۔ ذریت ابراہیم کی عبادت اور قربانی کا قبلہ، عام اِس سے کہ وہ بنی اسمٰعیل ہوں یا بنی اسرائیل،

مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ
طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

اور اُن کے لیے پناہ کی جگہ قرار دیا اور حکم دیا کہ ابراہیم کی اِس قیام گاہ میں نماز کی ایک جگہ بناؤ[۳۰۲] اور ابراہیم و اسمٰعیل کو اِس بات کا پابند کیا[۳۰۳] کہ میرے اِس گھر کو اُن لوگوں کے

ہمیشہ سے ام القریٰ مکہ کا بیت اللہ ہی ہے۔ یہود نے محض تعصب کی وجہ سے اِس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

[۳۰۲] اصل الفاظ ہیں: 'وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى'۔ یہ اوپر والے جملے ہی کی مزید وضاحت ہے۔ اِس کے ساتھ 'قال' یا اِس طرح کا کوئی دوسرا لفظ اِسی وجہ سے نہیں آیا۔ پہلے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو ذریت ابراہیم کا قبلہ ٹھیرایا۔ پھر وضاحت کی ہے کہ اِسی فیصلے کو روبہ عمل کرنے کے لیے ابراہیم اور اُس کی ذریت کو حکم ہوا کہ ابراہیم کی اِس قیام گاہ کے ایک حصے میں نماز کی جگہ بناؤ۔ بیت اللہ کو یہاں 'مُصَلًّى' یعنی نماز کی جگہ سے اِس لیے تعبیر کیا ہے کہ یہود پر یہ حقیقت واضح کی جائے کہ خدا کا یہ گھر درحقیقت ایک مسجد کی حیثیت سے تعمیر کیا گیا تھا اور اب خدا کا آخری پیغمبر اِس کی اِسی حیثیت کی تجدید کے لیے مبعوث ہوا ہے۔ اِسی طرح مکہ کے لیے ابراہیم کی قیام گاہ کی تعبیر اِس لیے اختیار کی گئی ہے کہ یہود نے مروہ کی قربان گاہ اور بیت اللہ سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا تعلق بالکل کاٹ دینے کے لیے اپنی کتابوں کے بیانات میں جگہ جگہ تحریفات کر دی تھیں۔ قرآن نے یہ لفظ استعمال کر کے اِنھی تحریفات کی تردید کی ہے۔ امام فراہی نے اپنے اُسی رسالہ میں جس کا ذکر اوپر ہوا ہے، یہود کی اِن تحریفات کا پردہ خود اُنھی کی کتابوں کے دلائل سے بالکل چاک کر دیا ہے۔ استاذ امام اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں لکھتے ہیں:

> ''...اُنھوں نے تورات ہی کے بیانات سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے وطن سے نکلنے کے بعد حضرت اسحاق کی والدہ کو تو کنعان میں چھوڑا اور خود حضرت اسمٰعیل اور اُن کی

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ

لیے پاک رکھو[۳۰۴] جو (اِس میں) طواف کرنے، اعتکاف کرنے اور رکوع و سجدہ کرنے کے لیے آئیں[۳۰۵]۔ ۱۲۵

اور یاد کرو، جب ابراہیم نے دعا کی کہ اے پروردگار، اِس شہر کو امن کا شہر بنا

> والدہ کے ساتھ بیر سبع کے بیابان میں قیام کیا۔ یہ جگہ ایک غیر آباد جگہ تھی۔ اِس وجہ سے اُنھوں نے یہاں سات کنوئیں کھودے اور درخت لگائے۔ یہیں اُن کو خواب میں اکلوتے بیٹے کی قربانی کا حکم صادر ہوا اور وہ حضرت اسمٰعیل کو لے کر مروہ کی پہاڑی کے پاس آئے اور اِس حکم کی تعمیل کی۔ اِسی پہاڑی کے پاس اُنھوں نے حضرت اسمٰعیل کو آباد کیا۔ پھر یہاں سے لوٹ کر وہ بیر سبع گئے اور اپنے قیام کے لیے ایسی جگہ منتخب کی جو خانۂ کعبہ کے قریب بھی ہو اور جہاں سے وقتاً فوقتاً حضرت اسحٰق کو دیکھنے کے لیے جانا بھی آسانی سے ممکن ہو سکے۔‘‘ (۱/ ۳۳۰)

۳۰۳ اصل میں ’عَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ’اَنْ‘ سے پہلے ’ب‘ عربی قاعدے کے مطابق حذف ہو گئی ہے اور ’عَهِدَ‘ کے ساتھ ’اِلٰى‘ کا صلہ دلیل ہے کہ یہاں یہ ذمہ داری ڈالنے اور پابند کرنے کے معنی میں ہے۔

۳۰۴ یعنی غلاظت، لہو ولعب، اصنام و اوثان اور اِس طرح کی کوئی ظاہری اور باطنی نجاست اِس گھر میں نہیں ہونی چاہیے۔

۳۰۵ طواف نذر کے پھیرے ہیں جو اپنا جان و مال اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کر دینے کی علامت کے طور پر معبد کے ارد گرد لگائے جاتے ہیں۔ اِس کی ابتدا حجر اسود کے استلام سے ہوتی ہے۔ یہ عہد و میثاق کی علامت ہے۔ اعتکاف روزے کا منتہاے کمال ہے اور ذکر و فکر کے لیے کیا جاتا ہے۔ رکوع و سجود نماز کی تعبیر ہے۔ قرآن کے اِس بیان سے واضح ہے کہ یہ دین ابراہیمی کی قدیم عبادات ہیں۔ مسلمان جس طرح اب اِن سے واقف ہیں، قرآن کے مخاطبین بھی اُسی طرح اِن سے واقف تھے، قرآن نے اِن کا ذکر کسی نئے حکم کے طور پر نہیں، بلکہ پہلے سے معلوم اور متعارف

مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ
كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ

دے[۳۰۶] اور اِس کے لوگوں میں سے جو اللہ اور قیامت کو ماننے والے ہوں[۳۰۷]، اُنھیں پیداوار[۳۰۸] کی روزی عطا فرما[۳۰۹]۔ (اللہ نے) فرمایا: اور جو منکر ہیں، (اِن چیزوں سے)

عبادات کی حیثیت سے کیا ہے۔ لہٰذا اِن کا نام ہی اُس کے مخاطبین کو اِن کا مصداق سمجھانے کے لیے کافی ہے، اِس کے لیے کسی تفصیل اور وضاحت کی ہرگز کوئی ضرورت نہ تھی۔

۳۰۶ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنی ذریت کو مکہ میں آباد کیا تو اُس وقت یہ شہر نہ صرف یہ کہ تہذیب و تمدن اور آبادی و زرخیزی سے بالکل محروم تھا، بلکہ وحشی اور خانہ بدوش قبیلوں کی لوٹ مار سے بھی محفوظ نہ تھا۔ ابراہیم علیہ السلام نے اِسی بنا پر یہ دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے اُسے اِس طرح قبول فرمایا کہ اولاً، اِس سرزمین میں لڑنا بھڑنا اور جنگ و جدال یک قلم ممنوع قرار دیا۔ ثانیاً، اِس کی طرف سفر کے لیے چار مہینے حرام قرار دیے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اِس کے گرد و پیش میں خطرناک سے خطرناک علاقے بھی اِن مہینوں میں بالکل پر امن ہو گئے۔ ثالثاً، اِس میں اپنے گھر کو ایسی ہیبت عطا فرمائی کہ اِس پر باہر سے اول تو کسی نے حملہ آور ہونے کی جرأت ہی نہیں کی، لیکن اگر کبھی ایسا ہوا تو اِس کے باشندوں کی اِس طرح مدد کی کہ اُن کی معمولی مزاحمت پر آسمان سے اُن کے لیے اپنے جنود قاہرہ بھیج کر اُس کے دشمنوں کو بالکل پامال کر دیا۔

۳۰۷ اِس سے پہلے بیان ہوا ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جب امامت کے متعلق پوچھا تھا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُنھیں یہ صاف جواب دیا گیا تھا کہ یہ منصب تمھاری اولاد میں سے صرف صالحین کے لیے ہے۔ چنانچہ اِسی کے پیش نظر تسلیم و رضا کے اُس پیکر نے جب رزق کی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اُس میں یہ قید بھی لگا دی کہ میں یہ درخواست صرف اپنی اولاد کے اہل ایمان کے لیے کر رہا ہوں۔

وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

چند روز کے لیے فائدہ اٹھانے کی مہلت تو میں اُنھیں بھی دوں گا،[۳۱۱] پھر اُن کو دوزخ کے عذاب میں پکڑ بلاؤں گا اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ ۱۲۶

۳۰۸؎ اصل میں ’مِنَ الثَّمَرٰتِ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ عربی زبان میں ’ثمرات‘ کا لفظ جس طرح پھلوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، اُسی طرح غلہ، جنس، پھل اور اِس طرح کی دوسری چیزوں کو شامل کر کے اِس سے عام اور وسیع مفہوم میں بھی آتا ہے۔ سیدنا ابراہیم نے یہ دعا چونکہ بدوی زندگی کی بے اطمینانیوں کے مقابلے میں حضری زندگی کے سکون اور اطمینان سے بہرہ مند ہونے کے لیے کی تھی، اِس لیے ہم نے اِسے یہاں اِس کے اِسی وسیع مفہوم میں لیا ہے اور اِس کا ترجمہ پھلوں کے بجاے پیداوار کے لفظ سے کیا ہے۔

۳۰۹؎ یہ دعا بھی اِس طرح پوری ہوئی کہ حج و عمرہ کی وجہ سے لوگوں کا رجوع اِس سرزمین کی طرف بہت بڑھ گیا۔ اِس سے تجارت اور کاروبار کو فروغ ہوا۔ باہر سے ہر قسم کی چیزیں اِس شہر کے بازاروں میں پہنچنے لگیں۔ پھر حرم کی تولیت کے باعث قریش کو ایسی عزت حاصل ہوئی کہ اُن کے قافلے بغیر کسی تعرض کے دوسرے ملکوں میں جانے لگے۔ اِس سے گلہ بانی اور شکار ہی پر گزر بسر کرنے والوں کی معیشت میں غیر معمولی تبدیلی آئی۔ چنانچہ ہر طرح کی اجناس اور پھل وغیرہ اِس شہر میں فراوانی کے ساتھ میسر ہو گئے۔

۳۱۰؎ سیدنا ابراہیم نے روزی کے لیے ایمان کی جو شرط اپنی دعا میں لگا دی تھی، یہ اُس کے متعلق واضح فرمایا ہے کہ امامت اور معیشت کے معاملات کو ایک دوسرے پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ روزی تو اللہ تعالیٰ اِس دنیا میں ماننے والوں کو بھی دیتا ہے اور نہ ماننے والوں کو بھی۔ دینی امامت، البتہ صالحین کے لیے خاص ہے اور وہ جن کو بھی حاصل ہوتی ہے، ہمیشہ ایمان اور عمل صالح کی بنیاد پر حاصل ہوتی ہے۔

وَاِذۡ يَرۡفَعُ اِبۡرٰهٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَيۡتِ وَاِسۡمٰعِيۡلُؕ رَبَّنَا
تَقَبَّلۡ مِنَّاؕ اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۱۲۷﴾
رَبَّنَا وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَيۡنِ لَكَ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسۡلِمَةً

اور یاد کرو، جب ابراہیم اور اسمٰعیل (میرے) اِس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔ (اُس وقت اُن کے لبوں پر التجا تھی کہ) پروردگار، تو ہماری طرف سے یہ دعا قبول فرما۔[۳۱۱] اِس میں شبہ نہیں کہ تو ہی سننے والا ہے، جاننے والا ہے۔[۳۱۲] ۱۲۷

پروردگار، اور ہم دونوں کو تو اپنا فرماں بردار بنا[۳۱۳] اور ہماری اولاد سے بھی اپنی

---

[۳۱۱] اصل میں ’رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ جملہ، ہمارے نزدیک اُس پوری دعا کے لیے بطور تمہید ہے جو آگے آ رہی ہے۔ لہٰذا ”تَقَبَّلۡ“ کا مفعول ہم نے ترجمے میں کھول دیا ہے۔

[۳۱۲] یہ اللہ تعالیٰ کی اُن دو صفتوں کا حوالہ ہے جن پر اعتماد کر کے بندہ اپنے پروردگار سے دعا کرتا ہے۔ اِس میں حصر کا اسلوب بندے کی طرف سے کامل سپردگی اور کامل اعتماد کے اظہار کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔

[۳۱۳] اصل الفاظ ہیں: ’رَبَّنَا وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَيۡنِ لَكَ‘۔ دعا کی ابتدا میں باپ بیٹے، دونوں کی طرف سے اپنے مسلم بنائے جانے کی اِس التجا سے جو حقیقتیں روشنی میں آتی ہیں، وہ استاذ امام نے اپنی تفسیر ”تدبر قرآن“ میں اِس طرح واضح فرمائی ہیں:

> ”...ایک تو یہ کہ ایمان و اسلام اور طلب خشیت و تقویٰ کی دعاؤں میں انسان سب سے پہلے اپنے آپ کو سامنے رکھے۔ یہ چیزیں ایسی نہیں جن سے کوئی بھی مستغنی ہو سکے، اگرچہ وہ کتنا ہی عالی مقام ہو۔ دوسری یہ کہ اسلام کے درجات و مراتب کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل جیسے مسلم کامل بھی، جن کے ذریعے سے دنیا اسلام کے نام اور اُس کی روح سے آشنا ہوئی، اپنے مسلم بنائے جانے کے لیے دعا کرتے تھے۔ تیسری حقیقت جو خاص اِس موقع سے تعلق رکھنے والی اور نظم کلام کو کھولنے والی ہے، یہ ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت

لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١٢٨﴾

ایک فرماں بردار امت[۳۱۴] اٹھا اور ہم کو ہماری عبادت کے طریقے بتا[۳۱۵] اور ہم پر عنایت کی نظر فرما[۳۱۶]۔ اِس میں شبہ نہیں کہ تو ہی بڑا عنایت کرنے والا (اور اپنے بندوں پر) رحم

اسمٰعیل نے اپنی زندگی کے سب سے زیادہ تاریخی موقع پر، جب کہ وہ اپنے مشن کا مرکز تعمیر کر رہے تھے، اپنے لیے جس چیز کی دعا کی تھی، مسلم بنائے جانے کی تھی نہ کہ یہودی یا نصرانی بنائے جانے کی۔'' (۳۳۸/۱)

۳۱۴ اِس دعا کے موقع پر سیدنا ابراہیم کے ساتھ اُن کی ذریت میں سے صرف اسمٰعیل علیہ السلام ہی تھے، اِس لیے بالبداہت واضح ہے کہ یہ اُنھی کی اولاد سے متعلق تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ کی دعوت کے نتیجے میں جماعت صحابہ کے ظہور سے یہ دعا حرف بہ حرف پوری ہوگئی۔ بائیبل کی کتاب پیدایش* میں فرزند کی قربانی کے بعد یہ الفاظ کہ ''اور تیری نسل کے وسیلے سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی''، اِسی حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔

۳۱۵ اصل الفاظ ہیں: 'اَرِنَا مَنَاسِكَنَا'۔ اِن میں 'اَرِنَا' کے معنی 'ہمیں دکھا' کے ہیں۔ سیدنا ابراہیم نے یہ لفظ اِس لیے استعمال کیا ہے کہ عبادات سے متعلق جو سنن انبیا علیہم السلام نے قائم کی ہیں، اُن کی تعلیم بالعموم اِس طرح دی گئی کہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُن پر عمل کر کے رویا وغیرہ میں اُنھیں دکھا دیا۔ 'مَنَاسِك' کا لفظ اِس آیت میں جمع ہے جس کا واحد 'منسك' ہے۔ اِس کے معنی قربانی کے طریقہ کے بھی ہیں اور قربان گاہ کے بھی۔ اِسی سے عام ہو کر یہ حج و عمرہ کے تمام مراسم کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

۳۱۶ اصل میں 'تُبْ عَلَيْنَا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'علی' کا صلہ دلیل ہے کہ 'اقبل' کا مفہوم یہاں متضمن ہے جو رحمت کی تعبیر ہے۔ قرآن نے آگے 'اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ' کہہ کر اِسے کھول دیا ہے۔

---

* ۱۸:۲۲۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾

فرمانے والا ہے۔ پروردگار، اور اُنھی میں سے تو اُن کے اندر ایک رسول[۳۱۷] اٹھا جو تیری آیتیں اُنھیں سنائے[۳۱۸] اور اُنھیں قانون اور حکمت[۳۱۹] سکھائے اور اِس طرح اُنھیں پاکیزہ بنائے[۳۲۰]۔ اِس میں شبہ نہیں کہ تو ہی بڑا زبردست ہے، بڑی حکمت والا

۳۱۷۔ اِس دعا میں رسول کا لفظ اہل کتاب، خاص کر یہود کو یہ بتاتا ہے کہ سیدنا ابراہیم نے بنی اسمٰعیل میں جس نبی کی بعثت کے لیے دعا کی تھی، یہ وہی ہیں جن کا تعارف سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے تورات کی کتاب استثنا میں ’میری مانند‘* کے الفاظ سے کرایا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ نبوت کے ساتھ رسالت کے منصب پر بھی فائز تھے، لہٰذا ابراہیم علیہ السلام کی دعا بھی ایک صاحب رسالت نبی کے لیے تھی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اِسی کے مطابق ایک رسول کی حیثیت سے مبعوث ہوئے ہیں۔

۳۱۸۔ آیت عربی زبان میں اُس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز پر دلیل لائی جائے۔ قرآن کا ہر جملہ کسی نہ کسی حقیقت کے لیے دلیل و برہان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس کے لیے آیت کا لفظ اِسی رعایت سے اختیار کیا گیا ہے۔ آیتیں سنانے کے لیے اصل میں ’یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اُس زور و اختیار کو ظاہر کرتے ہیں جس کے ساتھ اللہ کا رسول اُس کے سفیر کی حیثیت سے لوگوں کو اُس کا فرمان پڑھ کر سناتا ہے اور پھر خدا کی عدالت بن کر اُس کا فیصلہ اُن پر نافذ کر دیتا ہے۔

۳۱۹۔ اصل میں ’یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ‘ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ’الکتاب‘ قرآن کی زبان میں جس طرح خط اور کتاب کے معنی میں آتا ہے، اُسی طرح قانون کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ قرآن کے نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور ’الحکمۃ‘ جب اِس طرح عطف

---

* ۱۸: ۱۵۔

وَمَنۡ يَّرۡغَبُ عَنۡ مِّلَّةِ اِبۡرٰهٖمَ اِلَّا مَنۡ سَفِهَ نَفۡسَهٗ ؕ وَلَقَدِ

ہے[۳۲۱]۔ ۱۲۸-۱۲۹

اور ابراہیم کے دین سے کون ہے جو انحراف کرے؟ ہاں، وہی جو اپنے آپ کو

ہو کر آتے ہیں تو ’الکتاب‘ سے شریعت اور ’الحکمة‘ سے دین کی حقیقت اور ایمان و اخلاق کے مباحث مراد ہوتے ہیں۔ یہاں بھی یہی صورت ہے اور اِس سے آنے والے پیغمبر کی یہ خصوصیت واضح ہوتی ہے کہ اُس کی دعوت قانون و حکمت، دونوں کی جامع ہو گی۔ اِس کے لیے ’یُعَلِّمُھُم‘ کا فعل بالکل اُسی طرح آیا ہے، جس طرح ’اَلرَّحۡمٰنُ، عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ‘* میں ہے، یعنی اُن کے اندر وہ رسول اٹھا جو اُنھیں قانون و حکمت کا علم دے۔

۳۲۰ اِس مفہوم کے لیے عربی زبان کا جو لفظ قرآن نے اختیار کیا ہے، وہ تزکیہ ہے۔ اِس کے معنی کسی چیز کو آلایشوں سے پاک کرنے کے بھی ہیں اور نشو و نما دینے کے بھی۔ انبیا علیہم السلام انسانوں کو جس قانون و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں، اُس سے یہ دونوں ہی چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ سیدنا ابراہیم کا مدعا یہ ہے کہ آنے والا اُنھیں وہ قانون اور وہ حکمت سکھائے جس سے اُن کا علم و عمل تمام آلایشوں سے پاک ہو کر صحیح سمت میں نشو و نما پانے لگے۔ اِس لحاظ سے دیکھیے تو تزکیہ قانون و حکمت سے الگ کوئی چیز نہیں، بلکہ اِنھی دونوں کا حاصل ہے جسے قرآن نے عربیت کے اسلوب پر بیان کی واو سے اِن پر عطف کر دیا ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ دین درحقیقت دو ہی چیزوں کا مجموعہ ہے: ایک قانون، دوسرے حکمت، اور اِس کا مقصد انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا تزکیہ ہے۔ انسان جب اِس قانون و حکمت کو پوری طرح اختیار کر لیتا ہے تو تزکیہ اِس کے لازمی نتیجے کے طور پر اُسے حاصل ہو جاتا ہے۔ اِس کے لیے کہیں اور جانے اور کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

۳۲۱ یعنی تو زبردست ہے، اِس لیے تیرا حق ہے کہ تو لوگوں کو اپنا قانون دے اور صاحب حکمت

---

* ۵۵: ۱-۲۔

اصْطَفَيْنٰهُ فِی الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ
قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾

حماقت میں مبتلا کر لے۔[۳۲۲] ہم نے اُس کو دنیا میں بھی اپنے لیے خاص کیا تھا،[۳۲۳] اور قیامت میں بھی وہ صالحین میں سے ہوگا۔ (وہی ابراہیم کہ) جب اُس کے پروردگار نے اُسے حکم دیا کہ اپنے آپ کو حوالے کر دو، اُس نے فوراً کہا: میں نے اپنے آپ کو پروردگار عالم کے حوالے کر دیا۔[۳۲۴] ۱۳۰-۱۳۱

ہے، لہٰذا تیری اِس صفت کا تقاضا ہے کہ تو اُنھیں بھی حکمت عطا فرمائے۔

[۳۲۲] اشارہ یہود کی طرف ہے اور اسلوب میں تعجب بھی ہے اور افسوس بھی۔ مطلب یہ ہے کہ دین ابراہیمی کے تنہا اجارہ دار بنے ہوئے ہیں، لیکن وہی دین جب اُس کی صحیح صورت میں اِن کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو اِس سے گریز اور فرار کے راستے تلاش کرنے لگتے ہیں۔

[۳۲۳] یعنی اپنے دین کی امامت اور پیشوائی کے لیے خاص کیا۔ اِس کا ذکر اِسی سلسلۂ بیان میں اوپر گزر چکا ہے۔

[۳۲۴] اصل میں 'اَسْلِمْ' اور 'اَسْلَمْتُ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن کا صحیح مفہوم حوالے کر دینے ہی سے ادا ہوتا ہے۔ یہاں اِن سے سیدنا اسمٰعیل کی قربانی کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ ابراہیم علیہ السلام اِسی امتحان میں کامیابی کے بعد امامت کی عزت سے نوازے گئے۔ یہ اپنے آپ کو پوری طرح سپرد کرنے کا ایسا تقاضا تھا کہ اِس کے لیے سب سے زیادہ موزوں تعبیر یہی ہو سکتی تھی۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اسلام کے معنی اپنے آپ کو ہر لحاظ سے اپنے پروردگار کے حوالے کر دینے کے ہیں۔ سیدنا ابراہیم کو اللہ تعالیٰ نے اِسی اسلام کا حکم دیا تھا، اُنھوں نے اِسے ہی اختیار کیا اور اُن کو جو امامت حاصل ہوئی، وہ اِسی کے نتیجے میں حاصل ہوئی۔ یہودیت یا نصرانیت سے اُن کا کوئی تعلق نہ تھا اور نہ یہ عزت اُنھیں مفت میں حاصل ہوئی تھی، جس طرح کہ یہود اِسے حاصل کرنا چاہتے تھے۔

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى
لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ ؕ
اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ

اور اِسی دین کی نصیحت ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو کی تھی اور اِسی کی نصیحت یعقوب نے کی تھی۔[۳۲۵] (اُس نے کہا تھا کہ) میرے بچو، اللہ نے یہی دین[۳۲۶] تمھارے لیے منتخب فرمایا ہے، اِس لیے اب موت کے وقت تک تمھیں ہر حال میں مسلمان ہی رہنا ہے۔[۳۲۷] ۱۳۲

پھر کیا تم لوگ اُس وقت موجود تھے،[۳۲۸] جب یعقوب اِس دنیا سے رخصت ہو رہا تھا،[۳۲۹]

---

۳۲۵ اصل الفاظ ہیں: 'وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ'۔ اِن میں 'توصية' کے معنی تلقین و نصیحت کرنے کے ہیں، عام اِس سے کہ یہ تلقین و نصیحت مرتے وقت کی جائے یا زندگی کے کسی دوسرے مرحلے میں، اور 'بِهَا' میں ضمیر کا مرجع وہی 'مِلَّةِ اِبْرٰهٖمَ' ہے جس کا ذکر اوپر کی آیت میں ہوا ہے۔ سیدنا یعقوب کی اِس سے ملتی جلتی ایک وصیت ''تالمود'' میں بیان ہوئی ہے، لیکن ابراہیم علیہ السلام کی وصیت کا ذکر یہود کے صحیفوں میں کہیں نہیں ملتا۔ قرآن نے واضح کیا ہے کہ یہ اصلاً اُنھی کی روایت تھی جسے سیدنا یعقوب نے بھی قائم رکھا۔ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ اُن کا ذکر اِس لیے ہوا ہے کہ بنی اسرائیل براہِ راست اُنھی کی اولاد تھے، اور یہاں اُنھی کو بتانا مقصود ہے کہ تمھارے یہ آبا اسلام ہی کے پیرو تھے۔ اُنھوں نے اپنی اولاد کو کبھی یہودیت یا نصرانیت کی وصیت نہیں کی۔

۳۲۶ اصل میں لفظ 'الدِّيْنَ' استعمال ہوا ہے۔ اِس میں لام عہد کا ہے اور اِس سے مراد وہی دین ابراہیمی یعنی اسلام ہے جس کی وصیت کا ذکر اِس سے پہلے ہوا ہے۔

۳۲۷ یعنی اِس راہ کی ہر آزمایش اور اِس میں شیطان کی ہر در اندازی کے باوجود مہد سے لحد تک تمھیں اِسی دین کے لیے جینا اور اِسی کے لیے مرنا ہے۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ

اُس وقت جب اُس نے اپنے بیٹوں سے پوچھا: تم میرے بعد کس کی پرستش کرو گے؟[۳۳۰]

---

۳۲۸ یہ سوال کا اسلوب اِس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ مخاطبین اُس بات کو سننے کے لیے پوری طرح متنبہ ہو جائیں جو آگے بیان کی جا رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ تمھارے یہ بزرگ یہودی یا نصرانی تھے تو کیا تم اُس وقت موجود تھے، جب یعقوب نے اپنے بیٹوں سے یہ گفتگو کی؟ اِسے یاد کرو اور بتاؤ کہ اُس وقت اُنھوں نے اپنی اولاد سے یہودیت اور نصرانیت کا اقرار لیا تھا یا اسلام کا؟

۳۲۹ وصیت کے وقت سیدنا یعقوب کی موت کے اِس حوالے سے جن باتوں کی طرف اشارہ مقصود ہے، اُن کی وضاحت استاذ امام نے اپنی تفسیر میں اِس طرح فرمائی ہے:

> ”...ایک تو اِس بات کی طرف کہ حضرت یعقوب نے یہ عہد و اقرار اپنی اولاد سے اپنے بالکل آخری لمحات زندگی میں لیا ہے، اِس وجہ سے یہ گمان کرنے کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے کہ اِس کے بعد اُن کے مسلک و مذہب میں کوئی تبدیلی واقع ہو گئی ہو۔ دوسری اِس بات کی طرف کہ ایک شفیق و مہربان باپ جو خدا کا ایک پیغمبر بھی ہے، اپنی اولاد سے جو عہد و اقرار، اپنے بالکل آخری لمحات زندگی میں لیتا ہے، اُس کے اور اُس کی اولاد کے درمیان سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والا واقعہ وہی عہد و اقرار ہو سکتا ہے اور باوفا اولاد کا یہ سب سے بڑا اور سب سے مقدس فرض ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات کے اندر اِس عہد کو نباہے، صرف ناخلف اولاد ہی اِس نوعیت کے عہد و اقرار کی خلاف ورزی کرتی ہے۔ تیسری یہ کہ اللہ سے ڈرنے والے اور اپنی اولاد سے سچی محبت کرنے والے ایک باپ کا زندگی میں اپنی اولاد سے متعلق آخری فریضہ یہ ہے کہ وہ مرتے دم اُن کی دنیا سے زیادہ اُن کی آخرت کی فکر کرے اور اُن کو دین حق پر قائم رہنے اور اُسی دین پر جینے اور مرنے کی تلقین کرے۔“ (تدبر قرآن ۳۴۶/۱)

۳۳۰ اصل الفاظ ہیں: ’مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ‘۔ اِن میں سوال کے لیے ’مَا‘ کا لفظ سیدنا

وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۳۳﴾
تِلۡكَ اُمَّةٌ قَدۡ خَلَتۡ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَلَكُمۡ مَّا كَسَبۡتُمۡ ۚ
وَلَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۳۴﴾

اُنھوں نے جواب دیا: ہم اُسی ایک معبود کی پرستش کریں گے جو تیرا معبود ہے اور تیرے باپ دادوں ـــــ ابراہیم، اسمٰعیل[۳۳۱] اور اسحٰق ـــــ کا معبود ہے اور ہم اُسی کے فرماں بردار ہیں۔[۳۳۲] ۱۳۳

یہ ایک گروہ تھا جو گزر گیا، اُن کا ہے جو اُنھوں نے کیا اور تمھارا ہے جو تم نے کیا، تم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے۔[۳۳۳] ۱۳۴

یعقوب نے اِس لیے استعمال فرمایا کہ مخاطبین کے ذہن میں معبود سے متعلق اگر کوئی تردد ہو گا تو وہ ابہام کے اِس اسلوب سے اُن کے جواب میں ظاہر ہو جائے گا۔

[۳۳۱] یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کی زبان سے اِس اعتماد اور صراحت کے ساتھ یہاں سیدنا اسمٰعیل کے ذکر سے واضح ہے کہ اُن کے زمانے تک اُن کی اولاد میں اسمٰعیل اور اُن کی ذریت کے خلاف اُس طرح کا کوئی تعصب نہ تھا جو بعد میں بد قسمتی سے پیدا ہو گیا۔

[۳۳۲] یعنی ہم توحید کے ماننے والے ہیں اور ہم نے اسلام ہی کو اپنے دین کی حیثیت سے اختیار کیا ہے، اِس کے سوا ہمارا کوئی دین نہیں ہے۔

[۳۳۳] یہ چند لفظوں میں اُس ساری بحث کا خلاصہ ہے جو اوپر سے چلی آ رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اگر یہ سمجھتے ہو کہ تمھارے حصے کا عمل بھی تمھارے بزرگ کر گئے ہیں تو یہ محض وہم و خیال ہے۔ وہ اپنے اعمال کا صلہ خود پائیں گے۔ اِس میں تمھارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں تم سے تمھارے بزرگوں کا عمل نہیں پوچھا جائے گا، بلکہ تمھارا اپنا عمل پوچھا جائے گا۔

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ
حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ
اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ
وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ

(اِن کے بزرگوں کی روایت تو یہ ہے) اور اِدھر اِن کا اصرار ہے کہ یہودی یا نصرانی بنو تو ہدایت پاؤ گے۔[۳۳۴] اِن سے کہہ دو: بلکہ ابراہیم کا دین اختیار کرو جو[۳۳۵] (اپنے پروردگار کے لیے) بالکل یک سو تھا[۳۳۶] اور مشرکوں میں سے نہیں تھا۔ (ایمان والو)، اِن سے کہہ دو کہ ہم نے اللہ کو مانا ہے اور اُس چیز کو مانا ہے جو ہماری طرف نازل کی گئی اور جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق اور یعقوب اور اُن کی اولاد کی طرف نازل کی گئی اور جو موسیٰ

۳۳۴؎ یہاں بھی وہی لف کا اسلوب ہے جس کا ذکر ہم اِس سے پہلے آیت ۱۱۱ کے تحت کر چکے ہیں۔ یعنی یہودی کہتے ہیں کہ یہودی بنو تو ہدایت پاؤ گے اور نصرانی کہتے ہیں کہ نصرانی بنو تو ہدایت پاؤ گے۔

۳۳۵؎ اصل الفاظ ہیں: 'بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا'۔ اِن میں 'مِلَّةَ' کا لفظ منصوب ہے، لہٰذا یہاں لازماً کوئی فعل محذوف مانا جائے گا۔ ہم نے، جیسا کہ ترجمے سے واضح ہے، امر کا صیغہ محذوف مانا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان میں اِس طرح کا نصب، بالعموم ترغیب یا ترہیب کے مواقع پر آتا ہے، اور اِس کے لیے امر کا صیغہ ہی موزوں ہے۔ پھر یہ جملہ یہود و نصاریٰ کی دعوت کے جواب میں آیا ہے اور دعوت کا جواب، اگر غور کیجیے تو اِس موقع پر دعوت ہی ہو سکتی ہے۔

۳۳۶؎ اصل میں 'حَنِيْفًا' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی پوری طرح کسی کی طرف جھک جانے کے ہیں۔ یہاں یہ مضاف الیہ سے حال واقع ہوا ہے۔ اِس پر کوئی تردد نہ ہونا چاہیے، عربی زبان میں مجرور سے حال پڑنے کا یہ طریقہ بالکل عام ہے۔

مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾
فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا
فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾ ط
صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ

اور عیسیٰ اور دوسرے سب نبیوں کو اُن کے پروردگار کی طرف سے دی گئی۔ ہم اِن میں سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔[۳۳۷] (یہ سب اللہ کے پیغمبر ہیں) اور ہم اُسی کے فرماں بردار ہیں۔ ۱۳۵-۱۳۶

پھر اگر وہ اُس طرح مانیں، جس طرح تم نے مانا ہے[۳۳۸] تو راہ یاب ہوئے اور اگر منہ پھیر لیں تو وہی ضد پر ہیں۔ سو اِن کے مقابلے میں، (اے پیغمبر)، اللہ تمھارے لیے کافی ہے، اور وہ سننے والا ہے، ہر چیز سے واقف ہے۔[۳۳۹] ۱۳۷

(اِن سے کہہ دو، تم) اللہ کا یہ رنگ اختیار کرو[۳۴۰] اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ

---

[۳۳۷] یعنی ہم تمھاری طرح یہ نہیں کرتے کہ کسی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں۔ اللہ تعالیٰ کی کسی ہدایت کو بھی ہم نہ جھٹلاتے ہیں اور نہ تردید کرتے ہیں، بلکہ بغیر کسی استثنا کے سب پر ایمان رکھتے ہیں۔

[۳۳۸] یعنی بغیر کسی تفریق اور تعصب کے جس طرح تم نے تمام نبیوں اور تمام رسولوں کو مانا ہے، اُسی طرح وہ بھی مانیں۔

[۳۳۹] اِس سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلانا ہے کہ تمھارا پروردگار سب کچھ سنتا اور جانتا ہے، لہٰذا تم بے خوف ہو کر اپنی ذمہ داری پوری کرتے رہو۔ اِن کے مقابلے میں تمھاری طرف سے وہی کافی ہے۔

[۳۴۰] یعنی یہ رنگ کہ بغیر کسی تفریق اور تعصب کے اللہ کے تمام نبیوں اور تمام رسولوں کو مانا

لَهٗ عٰبِدُوۡنَ ۝۱۳۸ قُلۡ اَتُحَآجُّوۡنَنَا فِى اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمۡۚ وَلَنَآ
اَعۡمَالُنَا وَلَـكُمۡ اَعۡمَالُكُمۡۚ وَنَحۡنُ لَهٗ مُخۡلِصُوۡنَ ۝۱۳۹
اَمۡ تَقُوۡلُوۡنَ اِنَّ اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطَ

بہتر ہے اور (کہہ دو کہ) ہم تو (ہر حال میں) اُسی کی عبادت کرتے ہیں۔ کہہ دو، کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو،[۳۴۱] دراں حالیکہ وہی ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمھارا بھی؟ اور (اگر یہ نہیں، تو پھر) ہمارے لیے ہمارے عمل ہیں اور تمھارے لیے تمھارے عمل، اور ہم تو خالص اُسی کے ہیں۔[۳۴۲] ۱۳۸-۱۳۹

کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب اور اُن کی اولاد کے لوگ

جائے۔ اِس میں، اگر غور کیجیے تو یہود و نصاریٰ کے اصطباغ (بپتسمہ) کی طرف ایک تعریض بھی ہے۔ گویا اُنھیں یہ دعوت دی گئی ہے کہ رنگ چڑھانا ہے تو اللہ کی اِس ہدایت کا رنگ چڑھاؤ۔ یہ پانی سے نہیں چڑھتا، بلکہ اُس کی پرستش اور بغیر کسی تفریق و تعصب کے صرف اُسی کی ہدایت پر ایمان لانے سے چڑھتا ہے۔

[۳۴۱] مطلب یہ ہے کہ اللہ کی نازل کردہ کسی ہدایت کو ماننا اور کسی کو نہ ماننا تو گویا خود اللہ کے بارے میں جھگڑنا ہے۔ پھر کیا تم نے بات یہاں تک بڑھا دی ہے کہ اب ہمارے اور اپنے پروردگار کے بارے میں بھی ہم سے جھگڑو گے؟

[۳۴۲] یعنی اب تم سے بحث بالکل لاحاصل ہے۔ جب تم یہاں تک پہنچ رہے ہو تو ہم کوئی بحث کرنے کے بجاے صرف اتنی بات کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ ہم تو خالص اپنے پروردگار ہی کے لیے ہیں، لہٰذا اُس کی طرف سے جو ہدایت بھی آئے گی، بغیر کسی تردد کے اُس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں گے۔

كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾

یہودی یا نصرانی تھے؟[۳۴۳] اِن سے پوچھو، تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟[۳۴۴] (افسوس)، اُن لوگوں سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جن کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی گواہی ہو اور وہ اُسے چھپائیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ اُن چیزوں سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔ ۱۴۰

یہ ایک گروہ تھا جو گزر گیا، اُن کا ہے جو اُنھوں نے کیا اور تمھارا ہے جو تم نے کیا، تم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے۔[۳۴۵] ۱۴۱

۳۴۳؎ یہ اتمام حجت کے طور پر ایک مرتبہ پھر پوچھا ہے کہ کیا فی الواقع تم اتنی سنگین بات کہنے کی جسارت کر سکتے ہو؟

۳۴۴؎ یہ جملہ سرزنش کے اسلوب میں اور اِس سے اگلا حسرت و افسوس کے انداز میں ہے۔ اِس کے بعد بڑی سخت وعید کے طور پر فرمایا ہے کہ یہ شرارتیں جو جانتے بوجھتے تم کر رہے ہو، اللہ اِن سے بے خبر نہیں ہے، اِن کا نتیجہ اب بہت جلد تمھارے سامنے آ جائے گا۔

۳۴۵؎ یہ خاتمۂ کلام میں ایک مرتبہ پھر وہی بات دہرائی ہے جو اوپر آیت ۱۳۴ میں کہی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تم سے تمھارے بزرگوں کا عمل نہیں پوچھا جائے گا، بلکہ تمھارا اپنا عمل پوچھا جائے گا۔ اِس سارے سلسلۂ بیان کا خلاصہ چونکہ یہی ہے، اِس لیے اِسی کو دہرا کر بات ختم کر دی ہے۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا

(ابراہیم کی بنائی ہوئی مسجد کو، اے پیغمبر، ہم نے تمھارے لیے قبلہ ٹھیرانے کا فیصلہ کیا ہے[۳۴۶] تو) اب اِن لوگوں میں سے جو احمق ہیں[۳۴۷]، وہ کہیں گے: اِنھیں کس چیز نے اِن کے اُس قبلے سے پھیر دیا جس پر یہ پہلے تھے؟[۳۴۸] اِن سے کہہ دو: مشرق اور مغرب، سب اللہ ہی کے ہیں[۳۴۹]، وہ جس کو چاہتا ہے، (اِن تعصبات سے نکال کر) سیدھی راہ دکھا

---

[۳۴۶] سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں جو حقائق اوپر بیان کیے گئے، اُن سے واضح تھا کہ اب تحویل قبلہ کا فیصلہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جلد صادر ہونے والا ہے۔ یہ اُسی کی تمہید ہے۔

[۳۴۷] یہود کو یہاں احمق قرار دینے کی وجہ وہی ہے جو اِس سے پہلے آیت ۱۳۰ میں بیان ہوئی ہے کہ ابراہیم کے دین سے وہی انحراف کر سکتا ہے جو اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کر لے۔ یہود کا دعویٰ تھا کہ وہ دین ابراہیمی کے پیرو ہیں۔ اپنے اِس دعوے کے ساتھ جب وہ ابراہیم علیہ السلام کے بنائے ہوئے گھر کو قبلہ قرار دینے پر اعتراض کریں گے تو اِسے حماقت کے سوا اور کیا قرار دیا جائے گا؟

[۳۴۸] روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اِس سے پہلے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ قرآن نے آگے بتایا ہے کہ یہ ایک عارضی حکم تھا اور بنی اسمٰعیل کی آزمایش کے لیے دیا گیا تھا تاکہ معلوم ہو جائے کہ اُن میں سے کون حقیقت پر نگاہ رکھتا ہے اور کون ظاہری باتوں میں الجھ کر اپنی راہ کھوٹی کر لیتا ہے۔

[۳۴۹] یہود مغرب کو اپنا قبلہ قرار دیتے تھے اور نصاریٰ مشرق کو۔ یہ قرآن نے اِسی پر تعریض کی ہے کہ سمتوں میں سے کوئی سمت بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ وہ ہر سمت میں ہے اور

شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ

دیتا ہے۔ (ہم نے یہی کیا ہے) اور (جس طرح مسجد حرام کو تمھارا قبلہ ٹھیرایا ہے)، اُسی طرح ہم نے تمھیں بھی ایک درمیان[۳۵۰] کی جماعت بنا دیا ہے تاکہ تم دنیا کے سب لوگوں پر (حق کی) شہادت دینے والے بنو اور اللہ کا رسول تم پر یہ شہادت دے[۳۵۱]۔ اور اِس

مشرق و مغرب، سب پر اُسی کی حکومت قائم ہے، اِس لیے قبلہ کی بحث میں اِس چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہو سکتی۔ بیت اللہ ابراہیم اور اسمٰعیل نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے تعمیر کیا تھا۔ ذریت ابراہیم کا قبلہ ابتدا سے وہی تھا اور بیت المقدس کی تعمیر بھی اِسی کو قبلہ قرار دے کر ہوئی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دین ابراہیمی کی تجدید کے بعد یہ اِس کا لازمی نتیجہ تھا کہ قبلے کا فیصلہ بھی کر دیا جائے۔ چنانچہ یہی ہوا ہے اور جس طرح دین کو یہود و نصاریٰ کے پیدا کردہ پیچ و خم سے نکال کر اُس کی اصل پر قائم کیا گیا ہے، اُسی طرح قبلہ بھی اُس کی اصل کی طرف لوٹا دیا گیا ہے۔

۳۵۰۔ اصل میں لفظ 'وَسَط' استعمال ہوا ہے۔ یہ 'وَلَد' کی طرح مذکر، مونث، واحد اور جمع سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اِس کے معنی درمیان کے ہیں اور اِس آیت میں یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم بنی اسمٰعیل کے لیے آیا ہے۔ سورۂ حج (۲۲) کی آیت ۷۸ میں 'هُوَ اجْتَبٰكُمْ' کے الفاظ دلیل ہیں کہ اُنھیں اللہ تعالیٰ نے دین کی اِس شہادت کے لیے اُسی طرح منتخب کیا، جس طرح وہ بنی آدم میں سے بعض جلیل القدر ہستیوں کو نبوت و رسالت کے لیے منتخب کرتا ہے۔ سورۂ بقرہ کی اِس آیت میں قرآن نے اِسی بنا پر اُنھیں درمیان کی ایک جماعت 'اُمَّةً وَّسَطًا' قرار دیا ہے، یعنی وہ جماعت جس کے ایک طرف اللہ و رسول اور دوسری طرف دنیا کی سب اقوام تھیں اور وہ اُن پر حق کی شہادت کے لیے مامور کیے گئے۔

۳۵۱۔ شہادت کے معنی گواہی کے ہیں۔ جس طرح گواہی سے فیصلے کے لیے حجت قائم ہو جاتی

يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى
اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾

سے پہلے، (اے پیغمبر)، جس قبلے پر تم تھے، اُسے تو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لیے ٹھیرایا تھا کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے[۳۵۲]۔ اِس میں شبہ نہیں کہ یہ ایک بھاری بات تھی، مگر اُن کے لیے نہیں، جنھیں اللہ ہدایت سے بہرہ یاب کرے[۳۵۳]۔ اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ (اِس طرح کی آزمایش سے وہ) تم لوگوں کے ایمان کو ضائع

ہے، اُسی طرح حق جب اِس درجے میں واضح کر دیا جائے کہ اُس سے انحراف کی گنجایش باقی نہ رہے تو اُسے شہادت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اِس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی فرد یا جماعت کو اپنی دینونت کے ظہور کے لیے منتخب فرماتے اور پھر قیامت سے پہلے ایک قیامت صغریٰ اُن کے ذریعے سے اِسی دنیا پر برپا کر دیتے ہیں۔ اُنھیں بتا دیا جاتا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ اپنے عہد پر قائم رہیں گے تو اِس کی جزا اور انحراف کریں گے تو اِس کی سزا اُنھیں دنیا ہی میں مل جائے گی۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُن کا وجود لوگوں کے لیے ایک آیت الٰہی بن جاتا ہے اور وہ خدا کو گویا اُن کے ساتھ زمین پر چلتے پھرتے اور عدالت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اِس کے ساتھ اُنھیں حکم دیا جاتا ہے کہ جس حق کو وہ بچشم سر دیکھ چکے ہیں، اُس کی تبلیغ کریں اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت بے کم و کاست اور پوری قطعیت کے ساتھ لوگوں تک پہنچا دیں۔ یہی شہادت ہے۔ یہ جب قائم ہو جاتی ہے تو دنیا اور آخرت، دونوں میں فیصلۂ الٰہی کی بنیاد بن جاتی ہے۔

[۳۵۲] رسولوں کی بعثت سے اللہ تعالیٰ کی جو عدالت زمین پر قائم ہوتی ہے، اُس کا فیصلہ اِس طرح کی آزمایشوں کے ذریعے سے لوگوں کی تطہیر کے بعد ہی صادر ہوتا ہے۔

[۳۵۳] مطلب یہ ہے کہ بنی اسمٰعیل کے لیے مسجد حرام کو چھوڑ کر بیت المقدس کو قبلہ بنانا نہایت سخت امتحان تھا، لیکن تم نے دیکھا کہ یہ اُن لوگوں کے لیے ذرا بھی سخت ثابت نہ ہوا جو اپنی

کرنا چاہتا ہے۔[۳۵۴] اللہ تو لوگوں کے لیے بڑا مہربان ہے، سراسر رحمت ہے۔[۳۵۵] ۱۴۲-۱۴۳

پچھلی روایات کی نہیں، بلکہ خدا کی پرستش کرنے والے تھے، اور اللہ اور اُس کے رسول پر سچا ایمان رکھتے تھے۔

[۳۵۴] استاذ امام اِس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> ’’... یہاں ایک نہایت اہم سوال کا جواب ہے جو از خود پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ جب قبلہ کی تبدیلی خود قرآن کے اپنے بیان کے مطابق بھی ایک سخت امتحان ہے تو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اِس قسم کے سخت امتحان میں کیوں ڈالنا پسند فرمایا، جس کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ بہت سے لوگ اِس امتحان میں ناکام رہ جانے کے سبب سے اپنے ایمان ہی کھو بیٹھیں۔ قرآن نے اِس شبہ کا ازالہ اِس طرح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اِس طرح کے امتحانوں میں اِس لیے نہیں ڈالتا کہ لوگ اپنے ایمان ضائع کر بیٹھیں، بلکہ یہ امتحان اللہ تعالیٰ کی رافت و رحمت کے مظہر ہیں۔ اِنھی امتحانوں سے بندوں کی صلاحیتیں نشو و نما پاتی ہیں۔ اِنھی کے ذریعے سے اُن کی وہ قوتیں اور صلاحیتیں بروے کار آتی ہیں جن کے خزانے قدرت نے اُن کے اندر ودیعت کیے ہیں۔ اِنھی کے ذریعے سے اُن کے کھرے اور کھوٹے، اُن کے مخلص اور منافق اور اُن کے سچے اور جھوٹے میں امتیاز ہوتا ہے۔ یہ امتحان نہ ہو تو اچھے اور برے، خام اور پختہ، گہر اور پشیز میں کوئی فرق ہی نہ رہ جائے۔ ہر مدعی کو اُس کے دعوے میں سچا ماننا پڑے اور ہر کاذب کی باتوں کی تصدیق کرنی پڑے۔ یہاں تک کہ آخرت میں بھی کسی کو انعام یا کسی کو سزا دینے کے لیے کوئی حجت و دلیل باقی نہ رہ جائے۔ مزید غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اِس کارخانۂ کائنات کا سارا حسن و جمال اور اِس کی ساری حکمت و برکت اللہ تعالیٰ کی اِسی سنت ابتلا کے اندر مضمر ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو یہ سارا کارخانہ بالکل بے حکمت اور بے مصلحت، بلکہ کھلنڈرے کا ایک کھیل بن کے رہ جائے۔‘‘ (تدبر قرآن ۱/ ۳۶۷)

[۳۵۵] اصل میں ’لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ ’رَءُوْفٌ‘، ’رأفة‘ سے ہے جس میں دفع شر غالب ہے اور ’رَحِيْمٌ‘، ’رحمة‘ سے، جس میں اثبات خیر کا غلبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں جس امتحان کا ذکر کیا ہے، اُس میں یہ دونوں ہی پہلو ملحوظ تھے، یعنی بندوں کو آلایشوں سے

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّیَنَّكَ قِبْلَةً
تَرْضٰىهَا ۖ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَحَیْثُ مَا كُنْتُمْ

تمھارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھتے رہے ہیں[۳۵۶]، (اے پیغمبر)، سو ہم نے فیصلہ کر لیا[۳۵۷] کہ تمھیں اُس قبلے کی طرف پھیر دیں جو تم کو پسند ہے[۳۵۸]۔ لٰہذا

پاک کرنا اور اُنھیں فضائل و محاسن سے آراستہ کرنا۔

۳۵۶؎ اصل میں 'قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِن میں عربی زبان کے اسلوب کے مطابق مضارع سے پہلے ایک فعل ناقص محذوف ہے، یعنی 'قد کنا نری'۔ اردو میں حذف کا یہ اسلوب چونکہ نہیں ہے، اِس لیے ترجمے میں ہم نے اِسے کھول دیا ہے۔

۳۵۷؎ اِس مفہوم کے لیے اصل میں 'فَلَنُوَلِّیَنَّكَ' کا لفظ آیا ہے۔ عربی زبان میں فعل، اگر قرینہ موجود ہو تو فیصلۂ فعل کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یہاں مضارع پر تاکید کے حروف صاف اشارہ کرتے ہیں کہ یہ درحقیقت اُس فیصلے کا اظہار ہے جو اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ کے بارے میں فرمایا۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۳۵۸؎ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ میں رہے، آپ کے لیے نماز میں دونوں قبلوں کو جمع کر لینا ممکن تھا، لیکن ہجرت مدینہ کے بعد یہ صورت اِس لیے باقی نہیں رہی کہ بیت المقدس مدینے سے شمال میں ہے، اور بیت اللہ بالکل جنوب میں۔ چنانچہ قبلۂ ابراہیمی سے علیحدگی آپ پر شاق گزرنے لگی۔ پھر جب وحی الٰہی سے یہ بات واضح ہو گئی کہ آپ کی بعثت دین ابراہیمی پر ہوئی ہے اور ابراہیم علیہ السلام اور اُن کی ذریت کا قبلہ ہمیشہ سے بیت الحرام ہی رہا ہے تو آپ کو برابر انتظار رہنے لگا کہ تحویل قبلہ کا حکم نازل ہو جائے۔ اِس شوق میں آپ کی نگاہ بار بار آسمان کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ قرآن نے یہ اِسی کا ذکر کیا ہے۔

فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ
اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَلَئِنْ

اب اپنا رخ مسجد حرام کی طرف پھیر دو[۳۵۹] اور تم لوگ جہاں کہیں بھی ہو، (نماز میں) اپنے رخ اُسی کی طرف کرو۔[۳۶۰] یہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی تھی، جانتے ہیں کہ اُن کے پروردگار کی طرف سے یہی حق ہے،[۳۶۱] (لیکن اِس کے باوجود انکار کر رہے ہیں)، اور جو کچھ یہ

---

[۳۵۹] مسجد حرام سے مراد وہ عبادت گاہ ہے جس کے درمیان میں بیت اللہ واقع ہے۔ اِس کی طرف رخ کرنے کے لیے اصل میں 'فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن سے واضح ہے کہ مقصود بیت اللہ کی طرف منہ کرنا ہی ہے، بالکل ناک کی سیدھ میں بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا مطالبہ اِن الفاظ میں نہیں کیا گیا۔ پھر واحد کے صیغے میں حکم سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جس اضطراب کا ذکر اوپر ہوا ہے، اُس کے پیش نظر پہلے خاص طور پر آپ ہی کو مخاطب کر کے اِس تبدیلی کی بشارت دی گئی ہے۔

[۳۶۰] یہ وضاحت اِس لیے کی گئی ہے کہ یہود و نصاریٰ بیت المقدس کے اندر تو اُسے ہی قبلہ بناتے تھے، لیکن اُس سے باہر نکل کر مشرق یا مغرب کو قبلہ بنا لیتے تھے۔ اِس گم راہی سے بچنے کے لیے ہدایت کی گئی کہ مسجد حرام کے اندر یا باہر جہاں کہیں بھی ہو، تمھارا رخ اِسی مسجد کی طرف ہونا چاہیے۔

[۳۶۱] یعنی مسجد حرام کا قبلہ ہونا ہی حق ہے۔ استاذ امام نے لکھا ہے:

> ”...اِس بات کا حق ہونا اور خدا کی طرف سے ہونا اہل کتاب پر بالکل واضح تھا، اِس لیے کہ اوپر جو تفصیلات قرآن نے پیش کی ہیں، اُن سے مندرجہ ذیل باتیں واضح طور پر سامنے آ گئی ہیں:
>
> ایک یہ کہ یہود کو یہ بات معلوم تھی کہ بیت اللہ حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل کی تعمیر ہے اور

اٰتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ بِکُلِّ اٰیَۃٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَکَ ۚ وَمَآ
اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَھُمْ ۚ وَمَا بَعْضُھُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَۃَ بَعْضٍ ۭ وَلَئِنِ
اتَّبَعْتَ اَھْوَآءَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّکَ اِذًا لَّمِنَ

کر رہے ہیں، اللہ اُس سے بے خبر نہیں ہے[٣٦٢]۔ اور اِن اہل کتاب کے سامنے، (اے پیغمبر)، تم اگر ہر طرح کی نشانیاں بھی پیش کر دو تو یہ تمھارے قبلے کی پیروی نہ کریں گے۔ اور (اِس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ جو علم تمھارے پاس آچکا ہے، اِس کی بنا پر) تم بھی اِن کا قبلہ نہیں مان سکتے اور (اِن کی یہ ضد صرف تمھارے ساتھ نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ) اِن میں سے کوئی گروہ بھی دوسرے کا قبلہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ (لہٰذا اِن کو کوئی چیز اگر مطمئن کر سکتی ہے تو یہی کہ تم اِن کا قبلہ مان لو)، لیکن اُس علم کے بعد جو تمھارے پاس آچکا ہے، تم اگر اِن کی خواہشوں کے

یہی بیت اللہ تمام ذریت ابراہیم کا اصلی قبلہ رہا ہے۔

دوسری یہ کہ آخری نبی ذریت اسمٰعیل میں پیدا ہوں گے اور اُن کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ایک امت مسلمہ برپا کرے گا۔

تیسری یہ کہ اِس ذریت اسمٰعیل کا مرکز اور قبلہ شروع سے یہی بیت اللہ رہا ہے۔

اِن تمام باتوں کے اشارات وقرائن تورات میں موجود تھے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور اور آپ کے واقعات زندگی سے ہر قدم پر اِن اشارات وقرائن کی تصدیق ہو رہی تھی، لیکن یہود اُس حسد اور عناد کے سبب سے جو اُن کو بنی اسمٰعیل اور مسلمانوں سے تھا، جانتے بوجھتے اِن ساری باتوں کو چھپاتے تھے۔'' (تدبر قرآن ١/٣٧٠)

[٣٦٢] یہ باندازِ تہدید فرمایا ہے کہ حق کو چھپانے کا جو جرم اُنھوں نے کیا ہے، اللہ اُس سے خوب واقف ہے اور اُس کی قرار واقعی سزا اب اُنھیں مل کر رہے گی۔

الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٤٥﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ
اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٤٦﴾
اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿١٤٧﴾

پیچھے چلتے ہو تو تم بھی یقیناً اِنھی ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔[٣٦٣] (یہ حقیقت ہے کہ) جن کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اِس چیز کو ایسا پہچانتے ہیں، جیسا اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔[٣٦٤] اور اِن میں یہ ایک گروہ ہے جو جانتے بوجھتے حق کو چھپاتا ہے۔ (تم پر واضح ہو کہ) تمھارے پروردگار کی طرف سے یہی حق ہے،[٣٦٥] لہٰذا (اِس کے متعلق) تم کو ہرگز کسی شک میں نہ پڑنا چاہیے۔[٣٦٦] ١٤٤-١٤٧

---

[٣٦٣] یہ بھی ایک نوعیت کی تہدید ہے جس میں خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن غور کیجیے تو اِس کا رخ درحقیقت یہود و نصاریٰ کی طرف ہے۔ خواہشوں سے مراد یہاں اُن کی بدعتیں ہیں جو اُنھوں نے اللہ تعالیٰ کے دین میں پیدا کر رکھی تھیں۔

[٣٦٤] یہ صالحین اہل کتاب کا ذکر ہے۔ چنانچہ قرآن نے اِس کے لیے اسلوب بھی 'الذین اوتوا الکتب' کے بجائے 'اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ' کا اختیار کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک مہجور باپ اپنے یوسف گم گشتہ کو پہچانتا ہے، اُسی طرح یہ صالحین اہل کتاب بھی قرآن مجید اور اُس کے پیش کردہ حقائق کو اپنے صحیفوں کی روشنی میں جانتے، پہچانتے اور اُس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

[٣٦٥] اصل الفاظ ہیں: 'اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ'۔ اِن میں 'اَلْحَقُّ' ہمارے نزدیک خبر ہے جس کا مبتدا محذوف ہے اور 'مِنْ رَّبِّكَ' اِسی خبر سے متعلق ہے۔ مبتدا کو عربی زبان میں بالعموم اُس موقع پر حذف کر دیتے ہیں جب پوری توجہ خبر ہی پر مرکوز کر دینی پیش نظر ہو۔

[٣٦٦] یہاں بھی خطاب اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر تنبیہ اور عتاب کا رخ،

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾

اور اِن میں سے ہر ایک نے (اپنے لیے قبلے کی) ایک سمت مقرر کر رکھی ہے[۳۶۷]، وہ اُسی کا رخ کرتا ہے[۳۶۸]۔ اِس لیے (تم لوگ اِنھیں چھوڑو اور) نیکیوں کی راہ میں آگے بڑھنے کی کوشش کرو[۳۶۹]۔ تم جہاں بھی ہو گے، اللہ تم سب کو (فیصلے کے لیے[۳۷۰]) اکٹھا کرے گا۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ ۱۴۸

صاف واضح ہے کہ اِنھی یہود و نصاریٰ کی طرف ہے۔

۳۶۷؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا'۔ اِن میں 'كُلٍّ' کا لفظ اگرچہ نکرہ ہے، لیکن یہ جب کسی شخص یا گروہ کا ذکر کرنے کے بعد آئے تو اِس سے بالعموم وہی شخص یا گروہ مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی اِس سے مراد یہود و نصاریٰ ہی ہیں جن کے بعض گروہوں کا ذکر اوپر ہوا ہے۔

۳۶۸؎ یعنی اپنے تعصّبات کو آسانی سے نہیں چھوڑتا۔ اِس لیے تم خواہ کتنا ہی زور لگاؤ، یہ اپنی مقرر کردہ سمت کو چھوڑ کر حق کی پیروی کے لیے تیار نہ ہوں گے۔

۳۶۹؎ مطلب یہ ہے کہ اِن ہٹ دھرموں کو اِن کے حال پر چھوڑو اور جو قبلہ تمھارے لیے مقرر کیا گیا ہے، اُسے فلاح و سعادت کی جدوجہد میں خدا کا مقرر کردہ نشان سمجھ کر ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی اِس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> ”قبلہ کے متعلق یہ بات کہ وہ فلاح و سعادت کے حصول کے لیے ایک نشان اور علم کی حیثیت رکھتا ہے، محض کوئی استعارہ نہیں، بلکہ ایک حقیقت ہے۔ اِس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے اُس عظیم تاریخ کو حافظے میں از سر نو تازہ کرنے کی کوشش کیجیے جو اِس گھر کے ایک ایک پتھر پر نقش ہے جس کو قبلہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ گھر وہ گھر ہے جس کی تعمیر ابراہیم خلیل اللہ

اور اسمٰعیل ذبیح اللہ نے اپنے مقدس ہاتھوں سے کی ہے۔ یہ گھر وہ گھر ہے جو اِس دنیا کے بت کدے میں خدائے واحد کی عبادت کا اولین مرکز ہے۔ اِسی گھر کے پہلو میں مروہ پہاڑی ہے جس کے دامن میں چشم فلک نے رضائے الٰہی کے لیے بوڑھے باپ کو محبوب اور اکلوتے فرزند کی گردن پر چھری چلاتے اور اسلام کی حقیقت کا مظاہرہ کرتے دیکھا ہے۔ یہی گھر ہے جس کے اردگرد کے چٹیل میدانوں کو قدرت نے اُس امت مسلمہ کے نشوونما کے لیے منتخب فرمایا جس کے ذریعے سے دنیا کی تمام قوموں کو خدا کی رحمت تقسیم ہونے والی تھی۔ یہی گھر ہے جو حضرت ابراہیم کے وقت سے لے کر برابر تمام قدوسیوں کا قبلہ رہا ہے اور جس میں طواف و اعتکاف اور رکوع و سجود کی سعادت اتنے انسانوں نے حاصل کی ہے کہ جس طرح زمین کے ذروں اور آسمان کے ستاروں کا شمار ناممکن ہے، اُسی طرح اِن نفوس قدسیہ کا شمار بھی ناممکن ہے۔ اِسی کے قرب میں وہ میدان ہے جس کی ریت کا ایک ایک ذرہ توبہ و استغفار کے سجدوں کا گواہ اور خوف خدا سے رونے والوں کے آنسوؤں کا امین ہے۔ اِسی گھر کے ایک کونے میں وہ مقدس پتھر ہے جس کو خدا کے دَہنے ہاتھ سے تشبیہ دی گئی ہے اور جس کو ہاتھ لگا کر یا بوسہ دے کر لاکھوں کروڑوں انبیا و صدیقین اور صلحا و ابرار نے اپنے رب سے عہد بندگی و وفاداری استوار کیا ہے۔ اِسی کے پاس وہ جمرات ہیں جو اِس گھر کے دشمنوں کی ذلت و پامالی کی یادگار ہیں اور جن پر سنگ باری کر کے اہل ایمان اپنے اندر برابر اعدائے دین کے خلاف جہاد کی روح تازہ کرتے رہے ہیں۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اِسی گھر کے سایے میں خدا کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پرورش پائی جن کے لائے ہوئے نور اور جن کی بخشی ہوئی ضیا نے تمام دنیا میں اجالا کر دیا۔

ایک ایسی عظیم روایات کے امین گھر کو قبلہ بنانے کے معنی یقیناً یہی ہیں کہ اُس کو ایک نشان قرار دے کر اُن روحانی خزانوں کے حصول کے لیے جدوجہد کی جائے جو سیدنا ابراہیم سے لے کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک اِس گھر کو ودیعت ہوئے یا دوسرے لفظوں میں اِس کو ایک پاور ہاؤس سمجھیے جس سے پوری امت زندگی، حرارت، روشنی اور قوت حاصل کرتی ہے۔ جن لوگوں پر قبلہ کی عظمت و اہمیت کا یہ پہلو واضح نہیں ہے، وہ اکثر اِس امر میں حیران ہوتے ہیں کہ اینٹ اور پتھر کے بنے ہوئے ایک مکان کو دین میں اِس درجہ اہمیت کیوں دے دی گئی ہے۔ لیکن اوپر کی

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ
وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾

(اِنھیں چھوڑو، اے پیغمبر)، اور (سفر میں بھی ہمیشہ) جہاں سے نکلو، (نماز کے لیے) اپنا رخ مسجد حرام ہی کی طرف کرو۔[۳۷۱] اِس میں شبہ نہیں کہ تمھارے پروردگار کی طرف سے یہی حق ہے، اور (یاد رکھو کہ) جو کچھ تم لوگ کرتے ہو، اللہ اُس سے بے خبر نہیں ہے۔[۳۷۲] ۱۴۹

تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ اصل اہمیت اینٹ پتھر کے مکان کی نہیں، بلکہ اُن عظیم روایات کی ہے جو اِس گھر سے وابستہ ہیں اور جو اِس دنیا کی روحانی و ایمانی زندگی کا واحد ذریعہ ہیں۔ اِن روایات کی وجہ سے ملت کے نظام اجتماعی میں اِس گھر کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ایک جسم کے نظام میں قلب کو حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح قلب کے بغیر جسم کا وجود نہیں، اُسی طرح قبلہ کے بغیر ملت کا کوئی تصور نہیں۔” (تدبر قرآن ۱/ ۳۷۳)

[۳۷۰] یعنی اِس فیصلے کے لیے کہ کون حق کی راہ پر چلنے والا تھا اور کس نے ضد اور ہٹ دھرمی کا رویہ اختیار کیا؟

[۳۷۱] اوپر آیت ۱۴۴ میں یہ بات اگرچہ واضح کر دی گئی تھی کہ آدمی جہاں کہیں بھی ہو، اُسے قبلہ ہی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنی چاہیے، لیکن یہود و نصاریٰ جس گم راہی میں مبتلا ہوئے، اُس کے پیش نظر ضروری ہوا کہ پوری صراحت کے ساتھ یہ بتا دیا جائے کہ حضر کی طرح سفر میں بھی قبلے کا اہتمام لازم ہے تاکہ مسجد حرام سے اِس امت کا تعلق کسی حالت میں منقطع نہ ہونے پائے۔

[۳۷۲] یہ تنبیہ اِس لیے فرمائی ہے کہ عذر سفر کی بنا پر کوئی شخص اِس معاملے میں بے پروائی اور سہل انگاری کا رویہ اختیار نہ کرے۔ واحد کے صیغے سے خطاب کا اسلوب اِس سلسلۂ بیان کی دوسری آیات کی طرح اِس آیت کے شروع میں بھی ہے، لیکن ’عَمَّا تَعْمَلُوْنَ‘ کے الفاظ سے یہاں واضح کر دیا ہے کہ مخاطب سب مسلمان ہیں۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۗ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۗ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۗ

اور (ایک مرتبہ پھر سنو کہ سفر میں بھی ہمیشہ) جہاں سے نکلو، (نماز کے لیے) اپنا رخ مسجد حرام ہی کی طرف کرو، اور (عام حالات میں بھی) تم لوگ جہاں کہیں ہو، اپنے رخ اِسی (مسجد) کی طرف کرو،[۳۷۳] اِس لیے کہ اِن لوگوں کو تمھارے خلاف کوئی حجت نہ ملے[۳۷۴] ـــــ ہاں اِن میں سے جو ظالم ہیں، اُن کی زبان تو کوئی چیز بھی بند نہیں کر سکتی،

---

[۳۷۳] سفر اور حضر، دونوں حالتوں سے متعلق یہ احکام اِس سے متصل پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں اِنھیں اکٹھے اور بعینہٖ اُنھی الفاظ میں دہرانے سے کیا مقصود ہے؟ آیت پر تدبر کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اِس سے مقصود اِن کی وہ تین عظیم حکمتیں بیان کرنا ہے جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ یہ حکمتیں اِن دونوں ہی حکموں سے متعلق ہیں۔ قرآن نے اِن کے بیان سے پہلے تمہید کے طور پر اِن حکموں کو دہرا کر ذہنوں کو اِن کی طرف ایک مرتبہ پھر متوجہ کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِس شد و مد کے ساتھ سفر اور حضر میں، اندر باہر، ہر جگہ اور ہر صورت میں بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا یہ حکم کوئی معمولی حکم نہیں ہے۔ یہ نہایت عظیم حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی حکم ہے۔ اِس وجہ سے اِس کا پورا اہتمام ہونا چاہیے اور اِس کی یہ حکمتیں بھی ہر شخص کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہییں۔

[۳۷۴] یہ پہلی حکمت بیان ہوئی ہے۔ اصل الفاظ ہیں: ’لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ‘۔ اِن میں ’النَّاس‘ سے مراد اہل کتاب ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قبلہ کے بارے میں اِن کی سہل انگاری اور مشرق و مغرب کے اختلافات پر جو کچھ ہم نے کہا ہے، وہی کچھ اِنھیں کہیں تمھارے متعلق کہنے کا موقع نہ مل جائے اور اِس سے حجت پکڑ کر یہ اُس دعوت کے خلاف کوئی وسوسہ اندازی

وَلِاُتِمَّ نِعۡمَتِیۡ عَلَیۡکُمۡ وَلَعَلَّکُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ (۱۵۰) ۙ کَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا فِیۡکُمۡ

سوتم اُن سے نہ ڈرو، بلکہ مجھ سے ڈرو ـــــ اور اِس لیے کہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں،[۳۷۵] اور اِس لیے کہ تم صحیح راستہ پا لو۔[۳۷۶] چنانچہ[۳۷۷] (یہی مقاصد ہیں جن کے لیے) ہم نے

نہ کریں جو اِس وقت برپا ہے۔

۳۷۵ یہ دوسری حکمت ہے اور اِس میں نعمت سے مراد وہی نعمت ہے جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے اُس وقت فرمایا تھا جب وہ اپنے بیٹے کی قربانی کے امتحان میں کامیاب ہوئے تھے۔ اُس وقت اُن سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اُن کے اِس بیٹے کی نسل سے ایک عظیم امت برپا ہوگی جس سے دنیا کی تمام قومیں دین کی برکت پائیں گی۔ مدعا یہ ہے کہ تحویل قبلہ سے جس اتمام نعمت کی ابتدا ہو رہی ہے، اُس کے پیش نظر تمھیں پوری طرح متنبہ رہنا چاہیے کہ تم سے اِس معاملے میں کوئی ایسی غلطی نہ ہو جو تمھارے لیے کسی محرومی کا باعث بن جائے۔

۳۷۶ اِس سے مراد وہ راستہ ہے جسے قرآن میں 'مِلَّةَ اِبۡرٰهٖمَ' سے تعبیر کیا گیا اور جس کے متعلق سورۂ انعام (۶) کی آیت ۱۶۱ میں ارشاد ہوا ہے: 'قُلۡ اِنَّنِیۡ هَدٰىنِیۡ رَبِّیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ، دِیۡنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبۡرٰهِیۡمَ حَنِیۡفًا' (کہہ دو: میرے پروردگار نے میری رہنمائی ایک سیدھی راہ کی طرف فرمائی ہے، وہی دین قیم، یعنی ابراہیم کی ملت جو بالکل یک سو تھا)۔ بیت اللہ اِسی ملت کی طرف رہنمائی کا نشان ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ قبلے کے معاملے میں اِس اہتمام کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ خدا تک پہنچانے والا یہ سیدھا اور فطری راستہ تمھاری نگاہوں سے کبھی اوجھل نہ ہو۔

۳۷۷ اصل میں لفظ 'کَمَا' استعمال ہوا ہے۔ یہ جس طرح تشبیہ کے لیے آتا ہے، اُسی طرح اُس موقع پر بھی استعمال ہوتا ہے جس موقع پر ہم 'چنانچہ' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ یہاں، اگر غور کیجیے تو یہ اِسی مفہوم میں آیا ہے۔

رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٥١﴾ فَاذْكُرُوْنِيْٓ

ایک رسول تم میں سے تمھارے اندر بھیجا ہے جو ہماری آیتیں تمھیں سناتا ہے[۳۷۸] اور تمھارا تزکیہ کرتا ہے[۳۷۹] اور اِس کے لیے تمھیں قانون اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے[۳۸۰] اور اِس طرح

---

۳۷۸ 'آیة' عربی زبان میں اُس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز پر دلیل لائی جائے۔ قرآن کا ہر جملہ کسی نہ کسی حقیقت کے لیے دلیل و برہان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس کے لیے 'آیة' کا لفظ اِسی رعایت سے اختیار کیا گیا ہے۔ آیتیں سنانے کے لیے اصل میں 'یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اُس زور و اختیار کو ظاہر کرتے ہیں جس کے ساتھ اللہ کا رسول اُس کے سفیر کی حیثیت سے لوگوں کو اُس کا فرمان پڑھ کر سناتا ہے اور پھر خدا کی عدالت بن کر اُس کا فیصلہ اُن پر نافذ کرتا ہے۔

۳۷۹ تزکیہ کے معنی کسی چیز کو آلایشوں سے پاک کرنے کے بھی ہیں اور نشوونما دینے کے بھی۔ انبیا علیہم السلام انسانوں کو جس قانون و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں، اُس سے یہ دونوں ہی چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ آیت میں اِس کا ذکر جس طریقے سے ہوا ہے، اُس سے واضح ہے کہ پورے دین کا مقصد درحقیقت یہی ہے۔ چنانچہ تزکیہ کوئی الگ چیز نہیں، بلکہ قانون و حکمت کا حاصل ہے۔ انسان جب اُنھیں پوری طرح اختیار کر لیتا ہے تو تزکیہ اِس کے لازمی نتیجے کے طور پر اُسے حاصل ہو جاتا ہے۔ اِس کے لیے کہیں اور جانے اور کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

۳۸۰ اصل میں 'یُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'الْکِتٰب' قرآن کی زبان میں جس طرح خط اور کتاب کے معنی میں آتا ہے، اُسی طرح قانون کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ قرآن کے نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور 'الْحِکْمَة' جب اِس طرح عطف ہو کر آتے ہیں تو 'الْکِتٰب' سے شریعت اور 'الْحِکْمَة' سے دین کی حقیقت اور ایمان و اخلاق کے

اَذۡكُرۡكُمۡ وَاشۡكُرُوۡا لِىۡ وَلَا تَكۡفُرُوۡنِ ﴿۱۵۲﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ

وہ چیزیں تمھیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔ لہٰذا تم مجھے یاد رکھو، میں تمھیں یاد رکھوں گا[۳۸۱] اور میرے شکر گزار بن کر رہو،[۳۸۲] میری ناشکری نہ کرو۔[۳۸۳] ۱۵۰-۱۵۲

ایمان والو، (یہ نعمت تمھیں عطا ہوئی ہے تو اب تمھارے مخالفین کی طرف سے جو

مباحث مراد ہوتے ہیں۔ یہاں بھی یہی صورت ہے اور اِس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت واضح ہوتی ہے کہ آپ کی دعوت قانون وحکمت، دونوں کی جامع ہے۔ اِس کے لیے 'یُعَلِّمُکُم' کا فعل بالکل اُسی طرح آیا ہے، جس طرح 'اَلرَّحۡمٰنُ، عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ'* میں ہے، یعنی تمھارے اندر وہ رسول بھیجا ہے جو تمھیں قانون وحکمت کا علم دے گا۔

۳۸۱؎ اِس یاددہانی کی نوعیت ایک معاہدے کی ہے۔ اللہ کو یاد رکھنے اور اُس کے جواب میں اللہ کے یاد رکھنے سے مقصود اِس جگہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرائض اور ذمہ داریاں تمھارے سپرد کی ہیں، تم اُنھیں پورا کرو گے تو اِس کے صلے میں دنیا اور آخرت میں کامیابی کے جو وعدے اُس نے تم سے کیے ہیں، وہ اُنھیں پورا کرے گا۔

۳۸۲؎ یعنی دنیا کی امامت اور اُس کے لیے دین وشریعت کی جو نعمت میں نے تمھیں دی ہے، اُس کا صحیح صحیح حق ادا کرو۔ یہی اِس نعمت کا شکر ہے۔

۳۸۳؎ یعنی یہود کی طرح اِس نعمت کی ناشکری نہ کرو، ورنہ جس طرح وہ اِس سے محروم ہوئے ہیں، اُسی طرح تم بھی اِس نعمت سے محروم کر دیے جاؤ گے۔ اللہ کا قانون بالکل بے لاگ ہے، اُس کی زد سے کوئی بھی بچ نہیں سکتا۔

---

* الرحمٰن ۵۵:۱-۲۔

الصّٰبِرِيْنَ ۝١٥٣ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ

مشکلیں بھی پیش آئیں، اُن میں) ثابت قدمی اور نماز سے مدد چاہو۔ اِس میں شبہ نہیں
کہ اللہ اُن کے ساتھ ہے جو (مشکلات کے مقابلے میں) ثابت قدم رہنے والے
ہوں[۳۸۴]۔ اور جو لوگ اللہ کی (اِس) راہ میں مارے جائیں، اُنھیں یہ نہ کہو کہ مردہ ہیں۔ وہ

---

[۳۸۴] تحویل قبلہ کا حکم درحقیقت ملت ابراہیمی کی وراثت کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو منتقل ہو جانے کا اعلان تھا۔ یہود مدینہ اور قریش مکہ، دونوں کی طرف سے اِس پر جس ردعمل کا اندیشہ تھا، یہ اُس کے مقابلے میں صبر اور نماز سے مدد لینے کی ہدایت فرمائی ہے۔ استاذ امام نے اپنی تفسیر میں اِس کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”ایک تو یہ کہ مشکلات و مصائب میں جس نماز کا سہارا حاصل کرنے کا یہاں ذکر ہے، اُس سے مراد صرف پانچ وقتوں کی مقررہ نمازیں ہی نہیں ہیں، بلکہ تہجد اور نفل نمازیں بھی ہیں۔ اِس لیے کہ یہی نمازیں مومن کے اندر وہ روح اور زندگی پیدا کرتی ہیں جو راہ حق میں پیش آنے والی مشکلات پر فتح یاب ہوتی ہے، اِنھی کی مدد سے وہ مضبوط تعلق باللہ پیدا ہوتا ہے جو کسی سخت سے سخت آزمایش میں بھی شکست نہیں کھاتا، اور اِنھی سے وہ مقام قرب حاصل ہوتا ہے جو خدا کی اُس معیت کا ضامن ہے جس کا اِس آیت میں صابرین کے لیے وعدہ فرمایا گیا ہے۔ اِس حقیقت کی پوری وضاحت مکی سورتوں میں آئے گی، اِس وجہ سے یہاں ہم صرف اشارے پر اکتفا کرتے ہیں۔
>
> دوسری یہ کہ نماز تمام عبادات میں ذکر اور شکر کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ قرآن مجید میں مختلف طریقوں سے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ نماز کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی یاد اور اُس کی شکر گزاری ہے۔ اِس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اوپر اِس امت سے یہ عہد جو لیا گیا ہے: ’فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ، وَاشْكُرُوْا لِيْ‘، اِس کے قیام میں نماز سب سے بہتر وسیلہ کی حیثیت رکھتی ہے۔
>
> تیسری یہ کہ یہ نماز دعوت دین اور اقامت حق کی راہ میں عزیمت اور استقامت کے حصول

اَحۡيَآءٌ وَّلٰكِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ ﴿١٥٤﴾ وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَيۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ

مردہ نہیں، بلکہ زندہ ہیں[٣٨٥]، لیکن تم (اُس زندگی کی حقیقت) نہیں سمجھتے[٣٨٦]۔ ہم (اِس راہ[٣٨٧]

کے لیے مطلوب ہے۔ اِس وجہ سے اِس نماز کی اصلی برکت اُس صورت میں ظاہر ہوتی ہے، جب آدمی راہ حق میں باطل سے کشمکش کرتا ہوا اِس کا اہتمام کرے۔ جو شخص سرے سے باطل کے مقابل میں کھڑے ہونے کا ارادہ ہی نہیں کرتا، ظاہر ہے کہ اُس کے لیے یہ ہتھیار کچھ غیر مفید ہی بن کر رہ جاتا ہے۔

چوتھی یہ کہ یہاں صبر اور نماز سے مدد حاصل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ: ''اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے۔'' یہ نہیں فرمایا کہ: ''اللہ نماز پڑھنے والوں اور صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' اِس کی وجہ استاذ امام (حمید الدین فراہی) کے نزدیک یہ ہے کہ نماز میں خدا کی معیت کا حاصل ہونا اِس قدر واضح چیز ہے کہ اُس کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں تھی، واضح کرنے کی بات یہی تھی کہ جو لوگ راہ حق میں ثابت قدم رہتے ہیں اور اِس ثابت قدمی کے حصول کے لیے نماز کو وسیلہ بناتے ہیں، اللہ اُن کے ساتھ ہو جاتا ہے۔

پانچویں یہ کہ اللہ کی معیت جس کا یہاں ثابت قدموں کے لیے وعدہ کیا گیا ہے، کوئی معمولی چیز نہیں ہے، بلکہ موقع کلام گواہ ہے کہ یہاں اِن دو لفظوں کے اندر بشارتوں کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ تمام کائنات کا بادشاہ حقیقی اور تمام امر و اختیار کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے تو جب وہ کسی کی پشت پر ہے تو اُس کو دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی کس طرح شکست دے سکتی ہے؟'' (تدبر قرآن ١/٣٧٩)

[٣٨٥] مطلب یہ ہے کہ راہ عزیمت پر قائم رہنے کے لیے صبر اور نماز سے مدد کے ساتھ زندگی اور موت کے بارے میں یہ حقیقت بھی تم پر واضح رہنی چاہیے کہ جو لوگ حق کی شہادت کے لیے جیتے اور مرتے ہیں، اُن کا معاملہ قیامت تک کے لیے موخر نہیں کیا جاتا، بلکہ عالم برزخ میں ایک نوعیت کی زندگی اُنھیں حاصل ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے انعامات مرنے کے فوراً بعد اُنھیں ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔ سورۂ آل عمران (٣) کی آیت ١٦٩ میں قرآن نے یہ بات 'عِنۡدَ رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُوۡنَ'

وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ (۱۵۵)ۙ

میں) یقیناً تمھیں کچھ[۳۸۸] خوف[۳۸۹]، کچھ بھوک[۳۹۰] اور کچھ جان و مال[۳۹۱] اور کچھ پھلوں[۳۹۲] کے نقصان

(اپنے پروردگار کے پاس روزی پا رہے ہیں) کے الفاظ سے واضح کر دی ہے۔

۳۸۶؎ قیامت کی زندگی چونکہ جسم کے ساتھ ہو گی، اِس لیے اُس کا کچھ تصور ہم یہاں کر سکتے ہیں، لیکن برزخ کی یہ زندگی کیا ہے؟ اِس کا کوئی تصور اِس دنیا میں کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ 'وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ' کے جو الفاظ اصل میں آئے ہیں، اُن میں قرآن نے یہی حقیقت بیان فرمائی ہے۔

۳۸۷؎ یہ اب اُن آزمایشوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو منصب امامت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو پیش آنے والی تھیں۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولوں کی بعثت سے اللہ تعالیٰ کی جو عدالت زمین پر قائم ہوتی ہے، اُس کا فیصلہ اِس طرح کی آزمایشوں کے ذریعے سے لوگوں کی تطہیر کے بعد ہی صادر ہوتا ہے۔

۳۸۸؎ اِن آزمایشوں پر اصل میں 'بِشَيْءٍ' یعنی 'کچھ' یا 'کسی قدر' کی جو قید لگی ہوئی ہے، اُس سے مقصود مسلمانوں کی ہمت افزائی ہے کہ یہ آزمایشیں پیش تو آئیں گی، لیکن اِن کی مقدار اتنی ہی ہو گی جو تمھاری عزیمت اور استقامت کو پرکھنے کے لیے ضروری ہے۔ لہٰذا اِن سے دل شکستہ ہونے کے بجائے تمھیں پوری ہمت اور حوصلے کے ساتھ اِن کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

۳۸۹؎ اِس سے مراد دشمنوں کے حملے اور ہجوم کا اندیشہ ہے۔ بدر سے تبوک تک صحابۂ کرام مسلسل اِس آزمایش میں مبتلا رہے۔

۳۹۰؎ اِس وقت تک ملک کی تمام تجارت اور دوسرے معاشی ذرائع عملاً یہود اور قریش ہی کے ہاتھ میں تھے۔ چنانچہ یہ آزمایش بھی اُن کی طرف سے پیش آئی۔

۳۹۱؎ اشارہ ہے جان و مال کی اُن قربانیوں کی طرف جو مسلمانوں کو جنگوں میں اور زمانۂ جنگ

الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝۱۵۶ۭ
اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰٓئِكَ

سے آزمائیں گے۔ اور (اِس میں) جو لوگ ثابت قدم ہوں گے، (اے پیغمبر)، اُنھیں (دنیا اور آخرت، دونوں میں کامیابی کی) بشارت دو۔ (وہی) جنھیں کوئی مصیبت پہنچے تو کہیں کہ لاریب، ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں (ایک دن) اُسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔[۳۹۳] یہی وہ لوگ ہیں جن پر اُن کے پروردگار کی عنایتیں[۳۹۴] اور

کی جو صورت حال اُنھیں درپیش تھی، اُس کی وجہ سے دینا پڑیں۔

۳۹۲ اصل میں لفظ 'ثَمَرٰت' استعمال ہوا ہے۔ اُس زمانے کے عرب میں 'اَمْوَال' کا لفظ زیادہ تر اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کے لیے استعمال ہوتا تھا اور 'ثَمَرٰت' سے پھل، خاص کر کھجور مراد لی جاتی تھی۔ جنگوں سے امن وامان کا جو فقدان ہوا، اُس کے باعث کھجور کے باغات بھی توجہ اور نگہداشت سے محروم ہوئے اور اِس طرح مسلمانوں کو اُن کی پیداوار میں کمی کا نقصان اٹھانا پڑا۔

۳۹۳ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف تفویض اور سپردگی کا کلمہ اور اہل ایمان کے اُس عقیدے کا اظہار ہے جس پر اُن کے عزم واستقامت کا انحصار ہوتا ہے۔ ہم دنیا میں بھی اللہ ہی کے ہیں اور مرنے کے بعد بھی ہمیں ہر حال میں اُسی کی طرف لوٹنا ہے۔ اِس عقیدے کے یہ دو اجزا ہیں اور غور کیجیے تو جادۂ حق پر قائم رہنے کے لیے دونوں ہی نہایت اہم ہیں۔ بندۂ مومن عقیدے کی اِسی قوت سے دنیا کی ہر طاقت سے لڑ جاتا ہے۔

۳۹۴ اصل میں لفظ 'صَلَوٰت' آیا ہے۔ یہ 'صلوٰۃ' کی جمع ہے جو اصلاً کسی چیز کی طرف بڑھنے اور متوجہ ہونے کے معنی میں آتا ہے۔ چنانچہ اِسی سے یہ نماز کے لیے بھی (جس کی حقیقت نیازمندی ہی ہے) استعمال ہوا اور الطاف وعنایات کے مفہوم میں بھی۔ یہاں چونکہ اِس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، اِس لیے یہ اِس دوسرے معنی میں ہے۔ نسبت کی تبدیلی سے الفاظ کے

هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿١٥٧﴾

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ

اُس کی رحمت ہو گی اور یہی ہیں جو اُس کی ہدایت سے بہرہ یاب ہونے والے ہیں۔ ۱۵۳-۱۵۷

(بیت الحرام ہی کی طرح صفا و مروہ کی حقیقت بھی اِن یہودیوں نے ہمیشہ چھپانے کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا تحویل قبلہ کے اِس موقع پر یہ بات بھی واضح ہونی چاہیے کہ) صفا اور مروہ[۳۹۵] یقیناً اللہ کے شعائر[۳۹۶] میں سے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جو اِس گھر

مفہوم میں اِس طرح کی تبدیلیاں عربی زبان میں بہت ہوتی ہیں۔

[۳۹۵] صفا و مروہ بیت اللہ کے پاس وہ دو پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان حج و عمرہ کے موقع پر سعی کی جاتی ہے۔ اصل قربان گاہ جہاں سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند کو قربانی کے لیے پیش کیا، وہ چونکہ یہی مروہ ہے، اِس لیے یہود نے اپنے صحیفوں میں اِس کا تعلق بھی اُن سے کاٹ دینے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اِس کی تفصیلات امام حمید الدین فراہی کی کتاب ''الرأی الصحیح فی من ہو الذبیح'' میں دیکھ لی جا سکتی ہیں۔

[۳۹۶] یہ شعیرہ کی جمع ہے جس کے معنی علامت کے ہیں۔ اصطلاح میں اِس سے مراد وہ مظاہر ہیں جو اللہ اور رسول کی طرف سے کسی حقیقت کا شعور قائم رکھنے کے لیے بطور ایک نشان کے مقرر کیے گئے ہوں۔ چنانچہ قربانی جس طرح حقیقت اسلام کی علامت ہے، حجر اسود کا استلام اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد و میثاق کی علامت ہے، رمی جمرات شیطان کے خلاف جنگ اور اُس پر لعنت کی علامت ہے، اُسی طرح صفا و مروہ کی سعی اسمٰعیل علیہ السلام کی قربان گاہ کا طواف ہے جو نذر کی علامت کے طور پر کیا جاتا ہے۔ اِن شعائر میں اصل مطمح نظر تو وہ حقیقتیں ہوا کرتی ہیں جن کی یہ علامت ہوتے

اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۭ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ
فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ

کا حج یا عمرہ کرنے کے لیے آئیں، اُن پر کوئی حرج نہیں[۳۹۷] کہ وہ اِن دونوں میں طواف[۳۹۸] بھی کر لیں، (بلکہ یہ ایک نیکی کا کام ہے) اور جس نے اپنے شوق سے نیکی کا کوئی کام کیا[۳۹۹] تو اللہ اُسے قبول کرنے والا ہے،[۴۰۰] اُس سے پوری طرح باخبر ہے۔ (اِس معاملے

ہیں، لیکن اِنھی حقیقتوں کے تعلق سے یہ شعائر بھی دین میں تقدس کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ تاہم یہ بات اِن کے بارے میں ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ جو حقیقتیں اِن میں مضمر ہوتی ہیں، وہ اگر لوگوں کے دل و دماغ میں زندہ نہ رہیں تو اِن شعائر کی حیثیت روح کے بغیر ایک قالب سے زیادہ کی نہیں رہتی۔ اِسی طرح یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ تمام شعائر اللہ اور رسول کے مقرر کردہ ہیں اور اِن کی تعظیم کے حدود بھی اللہ و رسول نے ہمیشہ کے لیے طے کر دیے ہیں۔ لہٰذا اب کوئی شخص نہ اپنی طرف سے اِن میں کوئی اضافہ کر سکتا ہے اور نہ اِن کی تعظیم کے حدود میں کسی نوعیت کی کوئی تبدیلی کر سکتا ہے۔ اِس طرح کی ہر چیز ایک بدعت ہوگی جس کے لیے دین میں ہرگز کوئی گنجایش نہیں ہے۔

۳۹۷ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ یہود نے جب صفا و مروہ کا تعلق سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے کاٹ دینے کی کوشش کی تو اِس کے ساتھ یہ بات بھی لازماً کہی ہوگی کہ اِن پہاڑیوں کے درمیان سعی محض ایک مشرکانہ بدعت ہے، دین ابراہیمی سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ قرآن نے یہ اِسی کی تردید میں واضح کیا ہے کہ اِن کا طواف کر لینے میں ہرگز کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ یہ ایک مشروع عبادت ہے اور اِس لیے یقیناً نیکی اور خیر کا کام ہے جو اگر شوق سے کیا جائے تو اللہ تعالیٰ اُسے قبول فرمائے گا۔

۳۹۸ اِس سے مرادوہ سعی ہے جو اِن پہاڑیوں کے درمیان کی جاتی ہے۔ اِسے طواف کے

وَالْهُدٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ یَلْعَنُهُمُ
اللّٰهُ وَیَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۙ (۱۵۹) اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَیَّنُوْا
فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ (۱۶۰)

میں) جو حقائق ہم نے نازل کیے اور جو ہدایت بھیجی تھی[۴۰۱]، اُسے جو لوگ چھپاتے ہیں، اِس کے باوجود کہ اِن لوگوں کے لیے اپنی کتاب[۴۰۲] میں ہم نے اُسے کھول کھول کر بیان کر دیا تھا، یقیناً وہی ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی جن پر لعنت کریں گے۔ اِن میں سے، البتہ جو توبہ کریں اور (اپنے اِس طرزِ عمل کی) اصلاح کر لیں[۴۰۳] اور (جو کچھ چھپاتے تھے، اُسے) صاف صاف بیان کر دیں[۴۰۴] تو اُن

لفظ سے اِس لیے تعبیر کیا ہے کہ اِس کی صورت، اگر غور کیجیے تو طواف سے کچھ ملتی جلتی ہوتی ہے۔

۳۹۹؎ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ سعی صرف حج و عمرہ کے موقع پر کی جا سکتی ہے اور اِس موقع پر بھی یہ ایک نفل عبادت ہے جو اگر کی جائے تو باعث اجر ہو گی۔ یہ حج و عمرہ کے لازمی مناسک میں سے نہیں ہے۔

۴۰۰؎ اصل میں لفظ 'شَاکِر' استعمال ہوا ہے۔ یہ عربی زبان کے اُن الفاظ میں سے ہے جن کے معنی نسبت کی تبدیلی سے بدل جاتے ہیں۔ نسبت اگر بندے کی طرف ہو تو اِس کے معنی شکر گزاری کے ہوتے ہیں اور اللہ کی طرف ہو تو اِس کے معنی قبول کرنے کے ہو جاتے ہیں۔

۴۰۱؎ یعنی وہ حقائق جو اللہ تعالیٰ نے آخری پیغمبر کی بعثت سے متعلق پرانے صحیفوں میں نازل کیے اور جو ہدایت، خاص کر اُن کے باب میں بھیجی تھی۔

۴۰۲؎ یعنی تورات میں۔

۴۰۳؎ اِس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ توبہ اُس وقت تک معتبر نہیں ہے، جب تک آدمی اُس غلطی کی اصلاح نہ کر لے جس کا ارتکاب اُس نے کیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

کی توبہ میں اپنی شفقت سے قبول کرلوں گا[۴۰۵] اور حقیقت یہ ہے کہ میں بڑا توبہ قبول کرنے والا ہوں، میری شفقت ابدی ہے۔ ۱۵۸-۱۶۰

اِس کے برخلاف جو اپنے انکار پر قائم رہے اور مرے تو اِسی طرح منکر تھے،[۴۰۶] یقیناً وہی ہیں جن پر اللہ اور اُس کے فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔[۴۰۷] وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے،[۴۰۸] نہ اُن پر سے سزا ہی ہلکی کی جائے گی اور نہ اُنھیں کوئی مہلت ملے گی۔ ۱۶۱-۱۶۲

---

[۴۰۴] یعنی آخری نبی کے بارے میں تورات کے جو حقائق یہود نے چھپائے ہیں، اُنھیں ظاہر کردیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے تک کم سے کم یہود کے علما و خواص اُن تحریفات سے بے خبر نہیں تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے متعلق تورات اور دوسرے صحیفوں میں کی گئی تھیں۔

[۴۰۵] اصل میں 'اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'اَتُوْبُ' کے ساتھ 'عَلٰی' کا صلہ دلیل ہے کہ اِس میں 'اقبل' کا مفہوم متضمن ہے جو رحمت کی تعبیر ہے۔ آگے 'اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ' کہہ کر قرآن نے اِسے واضح کردیا ہے۔

[۴۰۶] مطلب یہ ہے کہ اپنی ضد پر اڑے رہے، نہ توبہ و اصلاح کی توفیق ہوئی اور نہ حق کے اعلان و اظہار کی۔ اِس سے محروم ہی دنیا سے اٹھ گئے۔

[۴۰۷] یہ اُس اجمال کو واضح کردیا ہے جو اوپر 'یَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ' کے الفاظ میں موجود تھا۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (۱۶۳) اِنَّ
فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ

(ایمان[۴۰۹] والو، اِنھیں فیصلہ کرنے دو) اور (اِن سے قطعِ نظر کر کے تم یہ حقیقت اب اچھی طرح سمجھ لو کہ) تمھارا الٰہ ایک ہی الٰہ[۴۱۰] ہے، اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ سراسر رحمت ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے[۴۱۱]۔ اِس میں شبہ نہیں کہ آسمانوں اور زمین کے

---

[۴۰۸] یعنی اُس عذاب میں جو اِس لعنت کے نتیجے میں اُنھیں دیا جائے گا۔

[۴۰۹] آیت ۱۶۲ پر اِس سورہ کی دوسری فصل ختم ہوئی۔ اِس فصل میں ذریت ابراہیم ہی کی ایک شاخ بنی اسمٰعیل میں سے امت مسلمہ کی تاسیس کا اعلان ہوا۔ اب یہاں سے تیسری فصل شروع ہو رہی ہے جس میں اِس امت کے لیے دین ابراہیمی کی تجدید کی جا رہی ہے۔ اِس کی ابتدا توحید کے بیان سے ہوئی ہے اور اِس کے بعد ایک مناسب ترتیب کے ساتھ امت کو شریعت کے وہ احکام دیے گئے ہیں جو اِس سورہ کے زمانۂ نزول میں دینا موزوں تھے اور اِن کے تحت اُن بدعات کی تردید کی گئی ہے جو یہود اور مشرکین، دونوں نے دین میں داخل کر دی تھیں۔

[۴۱۰] 'الٰہ' عربی زبان میں اُس ہستی کے لیے آتا ہے جس کی عبادت کی جائے اور اسباب و علل سے ماورا جس سے مدد کی توقع کی جائے۔ لفظ 'اللہ' اِسی پر تعریف کا الف لام داخل کر کے بنا ہے۔

[۴۱۱] اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو مثبت اور منفی، دونوں پہلوؤں سے بیان کرنے کے بعد یہاں اللہ تعالیٰ کے اسماے حسنیٰ میں سے رحمٰن اور رحیم کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ حوالہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی بے ہمگی کے تصور سے جو مایوسی پیدا ہو سکتی ہے، اُسے دور کر کے خلق کے ساتھ اُس کے تعلق کو واضح کرتا ہے تاکہ انسان وسیلے اور واسطے تلاش کرنے کے بجاے خود اپنے پروردگار ہی کی طرف لپکے اور اُسی کے دامن رحمت میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کرے، اور دوسری طرف یہ حوالہ اُس کی صفت رحمت و شفقت کو نمایاں کر کے صفات الٰہی کے باب میں وہ صحیح نقطۂ اعتدال متعین کر دیتا

الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ کُلِّ دَآبَّةٍ ص

بنانے میں[۲۱۲]، اور شب و روز کے بدل کر آنے میں[۲۱۳]، اور لوگوں کے لیے دریا میں نفع کی چیزیں لے کر چلتی ہوئی کشتیوں میں[۲۱۴] اور اُس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا ہے، پھر اُس سے زمین کو اُس کے مرجانے کے بعد زندہ کیا ہے اور اُس میں ہر قسم کے جان دار[۲۱۵]

ہے جہاں انسان خدا کے قہر و جلال سے محفوظ رہنے کے لیے اُس کے مقربین تلاش نہیں کرتا، بلکہ ہر مشکل میں بغیر کسی تردد کے اُسی کے دروازے پر دستک دیتا ہے۔

[۲۱۲] یعنی اِن کی پیدایش، ساخت، نفع رسانی اور مقصدیت میں جو اِن کے بنانے والے کی عظیم قدرت، بے مثل حکمت، بے پایاں رحمت اور ہمہ گیر ربوبیت کو نمایاں کرتی ہے اور اِن کی اُس موافقت اور سازگاری میں جو شہادت دیتی ہے کہ آسمان و زمین، دونوں کا خالق ایک ہی ہے۔ اِن کے اندر کسی دوسرے کے ارادے اور تصرف کو کوئی دخل نہیں ہے۔

[۲۱۳] یعنی جس طرح یکے بعد دیگرے یہ پورے نظم اور پابندی اوقات کے ساتھ اور اپنے مزاج، اپنی فطرت اور اپنے اثرات و نتائج کے حیرت انگیز اختلافات صفحۂ عالم پر بکھیرتے ہوئے آتے اور جاتے ہیں۔

[۲۱۴] اصل میں لفظ 'اَلْفُلْك' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی کشتی کے ہیں اور یہ واحد جمع، مذکر اور مونث، سب کے لیے اِسی صورت میں آتا ہے۔

[۲۱۵] اصل میں لفظ 'دَآبَّة' آیا ہے۔ یہ جس طرح زمین پر چلنے والے جانوروں کے لیے استعمال ہوتا ہے، اُسی طرح اگر قرینہ موجود ہو تو اُس معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جس معنی میں ہم 'جان دار' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اِس صورت میں چرند پرند، بلکہ بنی نوع انسان بھی اِس کے مفہوم میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہاں یہ اِسی دوسرے معنی میں ہے۔

وَّ تَصۡرِيۡفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَيۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾

پھیلائے ہیں ـــــ اور ہواؤں کے پھیرنے میں[۴۱۶] اور آسمان وزمین کے درمیان حکم کے تابع بادلوں میں[۴۱۷] (اِس حقیقت کو سمجھنے کے لیے) بہت سی نشانیاں ہیں[۴۱۸] اُن لوگوں کے لیے جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ ۱۶۳-۱۶۴

---

۴۱۶ یعنی ہواؤں کے اُن عجائب تصرفات میں جو بہار و خزاں، ابر و باراں اور نعمت و نقمت کی صورت میں ہر آن ایک نئی شان کے ساتھ نمودار ہوتے رہتے ہیں۔

۴۱۷ اصل میں 'السَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَيۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'تسخیر' کے معنی ہیں تابع فرمان بنا کر بغیر کسی معاوضے کے کسی کی خدمت میں لگا دینا۔ قرآن میں انسانوں کی نسبت سے جب باد و باراں اور مہ و آفتاب کی تسخیر کا ذکر آتا ہے تو اِس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یہ سب چیزیں انسان کے ہاتھ میں مسخر ہیں یا وہ اُنھیں مسخر کر سکتا ہے، بلکہ صرف یہ ہوتا ہے کہ پروردگار عالم نے اِن چیزوں کو مسخر کر کے اُس کی خدمت میں لگا دیا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں یہ مضمون جگہ جگہ 'سَخَّرَ لَکُمۡ' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اِن کو اپنا تابع فرمان بنا کر تمھاری خدمت میں لگا دیا ہے، یہ نہیں ہیں کہ اِن کو تمھارا تابع فرمان بنا دیا ہے۔

۴۱۸ یعنی اِس بات کی نشانیاں ہیں کہ عالم کا معبود ایک ہی معبود ہے، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ استاذ امام اِس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> ''اِس آیت پر اگر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ اِس میں شروع سے لے کر آخر تک اِس کائنات کے متقابل، بلکہ متضاد اجزا و عناصر کا حوالہ دیا گیا ہے اور ساتھ ہی اِن کے اُس حیرت انگیز اتحاد و توافق اور اِن کی اُس بے مثال باہم آمیزی و سازگاری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اِن کے اندر اِس کائنات کی مجموعی خدمت کے لیے پائی جاتی ہے۔ آسمان کے ساتھ

زمین، رات کے ساتھ دن، کشتی کے ساتھ دریا۔ بظاہر دیکھیے تو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ضدین کی نسبت رکھتے ہیں، لیکن ذرا گہری نگاہ سے دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ اگر یہ ایک طرف ضدین کی نسبت رکھتے ہیں تو دوسری طرف اِس کائنات کی خانہ آبادی کے نقطۂ نظر سے آپس میں زوجین کا سا ربط و اتصال بھی رکھتے ہیں۔ یہ آسمان اور اُس کے چمکتے ہوئے سورج اور چاند نہ ہوں تو ہماری زمین کی ساری رونقیں اور بہاریں ختم ہو جائیں، بلکہ اِس کی ہستی ہی نابود ہو جائے۔ اِسی طرح یہ زمین نہ ہو تو کون بتا سکتا ہے کہ اِس فضاے لامتناہی کے بے شمار ستاروں اور سیاروں میں سے کس کس کا گھر اجڑ کے رہ جائے۔ علیٰ ہٰذا القیاس، ہماری اور ہماری طرح اِس دنیا کے تمام جان داروں کی زندگی جس طرح دن کی حرارت، تمازت، روشنی اور نشاط انگیزی کی محتاج ہے، اُسی طرح شب کی خنکی، لطافت، سکون بخشی اور خواب آوری کی بھی محتاج ہے۔ یہ دونوں مل کر اِس گھر کو آباد کیے ہوئے ہیں۔ اِسی طرح سمندر کو دیکھیے۔ اِس کا پھیلاؤ کتنا ہوش ربا اور ناپیدا کنار ہے اور اِس کی موجیں کتنی مہیب اور ہول ناک ہیں، لیکن دیکھیے، اِس سرکشی و طغیانی کے باوجود کس طرح اِس نے عین اپنے سینہ پر سے ہماری کشتیوں اور ہمارے جہازوں کے لیے نہایت ہموار اور مصفا سڑکیں نکال رکھی ہیں جن پر ہمارے جہاز دن رات دوڑ رہے ہیں اور تجارت و معیشت، تمدن و معاشرت اور علوم و فنون، ہر چیز میں مشرق اور مغرب کے ڈانڈے ملائے ہوئے ہیں۔

آگے آسمان سے بارش اور اِس بارش سے زمین کے ازسرِنو باغ و بہار اور معمور و آباد ہو جانے کا ذکر ہے۔ غور کیجیے، کہاں زمین ہے اور کہاں آسمان، لیکن اِس دوری کے باوجود دونوں میں کس درجہ گہرا ربط و اتصال ہے۔ زمین اپنے اندر روئیدگی اور زندگی کے خزانے چھپائے ہوئے ہے، لیکن یہ سارے خزانے اُس وقت تک مدفون ہی رہتے ہیں، جب تک آسمان سے بارش نازل ہو کر اُن کو ابھار نہیں دیتی۔ اِسی طرح کا رشتہ بادلوں اور ہواؤں کے درمیان ہے۔ بادلوں کے جہاز لدے پھندے اپنے بادبان کھولے کھڑے ہیں، لیکن یہ اپنی جگہ سے ایک انچ سرک نہیں سکتے، جب تک ہوائیں اِن کو دھکے دے کر اِن کی جگہ سے نہ ہلائیں اور اِن کو اِن کی مقرر کی ہوئی سمتوں میں آگے نہ بڑھائیں، یہ ہوائیں ہی ہیں جو اِن کو مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں ہنکائے پھرتی ہیں اور جب چاہتی ہیں، اِن کو غائب کر دیتی ہیں اور جب چاہتی ہیں، اِن کو افق پر نمودار کر دیتی ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ

اور (زمین و آسمان کی اِن نشانیوں کے باوجود) لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو اوروں کو اللہ کے برابر ٹھیراتے ہیں۔[۴۱۹] وہ اُن سے اُسی طرح محبت کرتے ہیں، جس طرح اللہ سے محبت کرتے ہیں، دراں حالیکہ ایمان والوں کو تو سب سے بڑھ کر (اپنے) اللہ سے محبت ہوتی ہے۔[۴۲۰] اور اگر یہ ظالم اُس وقت کو دیکھیں، جب یہ عذاب دیکھیں

اب سوال یہ ہے کہ غور و تدبر کی نگاہ اِس دنیا کے بارے میں کیا فیصلہ کرتی ہے۔ کیا یہ اضداد اور متناقضات کی ایک رزم گاہ ہے جس میں مختلف ارادوں اور قوتوں کی کشمکش برپا ہے یا ایک ہی حکیم و مدبر ارادہ اِن سب پر حاکم و فرماں روا ہے جو اِن تمام عناصر مختلفہ کو اپنی حکمت کے تحت ایک خاص نظام اور ایک مجموعی مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ اِس کائنات کے مشاہدے سے یہ دوسری ہی بات ثابت ہوتی ہے۔ پھر مزید غور کیجیے تو یہیں سے ایک اور بات بھی نکلتی ہے، وہ یہ کہ دنیا آپ سے آپ وجود میں نہیں آئی ہے اور نہ اِس کے اندر جو ارتقا ہوا ہے، وہ آپ سے آپ ہوا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اِس کے عناصر مختلفہ میں ایک بالاتر مقصد کے لیے وہ سازگاری کہاں سے پیدا ہوتی جو اِس کائنات کے ہر گوشے میں موجود ہے۔

غور کیجیے تو یہ ایک ہی حقیقت ایک طرف شرک کے تمام امکانات کا سدّ باب کر رہی ہے اور دوسری طرف یہ ڈارونزم کے بھی تمام وساوس کی جڑ کاٹ رہی ہے۔“ (تدبر قرآن ۱/۴۰۱)

[۴۱۹] یہ انداز کلام اظہار تعجب کا ہے۔ یعنی اِس حماقت کے لیے کوئی گنجایش تو نہیں ہے، لیکن اگر کوئی اپنی عقل استعمال کرنے کے لیے تیار ہی نہ ہو تو اُس کا کیا علاج، اُس کے لیے یہ سب نشانیاں بے معنی ہو جائیں گی۔

[۴۲۰] یعنی جب اُن کے سامنے اللہ اور غیر اللہ کی محبت کے ایک دوسرے سے متضاد مطالبات

شَدِيۡدُ الۡعَذَابِ (۱۶۵)
اِذۡ تَبَرَّاَ الَّذِيۡنَ اتُّبِعُوۡا مِنَ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡا وَرَاَوُا الۡعَذَابَ
وَتَقَطَّعَتۡ بِهِمُ الۡاَسۡبَابُ (۱۶۶) وَقَالَ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡا لَوۡ اَنَّ لَنَا
كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنۡهُمۡ كَمَا تَبَرَّءُوۡا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيۡهِمُ اللّٰهُ اَعۡمَالَهُمۡ

گے (تو اِن پر یہ حقیقت واضح ہو جائے[۴۲۱]) کہ زور و اختیار، سب اللہ ہی کا ہے اور یہ کہ (اِس طرح کے لوگوں کو) اللہ بڑا ہی سخت عذاب دینے والا ہے۔ ۱۶۵

اُس[۴۲۲] وقت جب وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی، اپنے پیرووں سے بے تعلقی ظاہر کر دیں گے اور عذاب سے دوچار ہوں گے اور اُن کے تعلقات[۴۲۳] یک قلم ٹوٹ

آتے ہیں تو اُن پر ہمیشہ اپنے پروردگار کی محبت غلبہ پاتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ محبت دوسروں سے بھی کی جا سکتی ہے، لیکن اُسے ہر حال میں اللہ کی محبت کے تابع ہونا چاہیے، اُس کے برابر یا اُس سے بڑھ کر نہیں ہونا چاہیے۔ اُنھیں معلوم ہے کہ محبت الٰہی کو دوسری محبتوں پر مقدم رکھنا اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے ہے۔ اِس میں کسی دوسرے کو اُس کا شریک نہیں کیا جا سکتا۔

[۴۲۱] اصل میں جو حرف 'لَوۡ' جملے کی ابتدا میں آیا ہے، یہ اُس کا جواب ہے جو عربی قاعدے کے مطابق حذف کر دیا گیا ہے۔ 'اَنَّ الۡقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيۡعًا' اور اِس کے بعد کے الفاظ اِس کی وضاحت کر رہے ہیں۔

[۴۲۲] یہ اُسی عذاب کی مزید وضاحت ہے جس کا ذکر پیچھے ہوا ہے۔ عربیت کی رو سے یہ پچھلے جملے میں 'اِذۡ يَرَوۡنَ الۡعَذَابَ' کے الفاظ سے بدل واقع ہوا ہے۔

[۴۲۳] اصل میں لفظ 'اَسۡبَاب' استعمال ہوا ہے۔ یہ 'سبب' کی جمع ہے جس کے معنی رسی کے ہیں۔ اِس کے اندر یہیں سے توسل کا مفہوم پیدا ہوا اور اِس سے مزید وسیع ہو کر یہ کسی چیز کے متعلقات کے لیے استعمال ہونے لگا۔

حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾
يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖؗ وَّلَا تَتَّبِعُوْا
خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ

جائیں گے اور اُن کے پیرو کہیں گے کہ اے کاش، ہمیں ایک مرتبہ پھر دنیا میں جانے کا موقع ملے تو ہم بھی اِن سے بے تعلقی ظاہر کریں، جس طرح اِنھوں نے ہم سے بے تعلقی ظاہر کی ہے۔ اِس طرح اللہ اُن کے اعمال[۴۲۴] کو اُن کے لیے سراسر حسرت بنا کر اُنھیں دکھائے گا اور دوزخ سے نکلنے کے لیے وہ کوئی راہ نہ پا سکیں گے۔ ۱۶۶-۱۶۷

لوگو، (اپنے اِنھی پیشواؤں کے پیدا کیے ہوئے توہمات کے تحت تم نے جو حلال و حرام ٹھیرائے ہیں، اُن کی کوئی حقیقت نہیں، اِس لیے) زمین کی چیزوں میں سے جو حلال و طیب ہیں، اُنھیں کھاؤ[۴۲۵] اور شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو۔[۴۲۶] وہ تمھارا کھلا دشمن

---

[۴۲۴] اِس سے اُن کی وہ وفاداریاں اور قربانیاں مراد ہیں جو وہ اپنے اِن باطل معبودوں اور گم راہ کرنے والے پیشواؤں کے لیے کرتے رہے۔

[۴۲۵] اِس سے معلوم ہوا کہ شرک اور تحلیل و تحریم، دونوں ایک دوسرے سے متعلق مضمون ہیں۔ چنانچہ اِسی تعلق سے شرک کی تردید کے بعد اب یہ لوگوں کو خطاب کر کے تمام جائز اور پاکیزہ چیزیں کھانے کی تلقین فرمائی ہے۔ سورۂ انعام (۶) کی آیات ۱۳۶ سے ۱۴۵ اور مائدہ (۵) کی آیت ۱۰۳ میں قرآن نے اُن چیزوں کی تفصیل کی ہے جو شیطان کی پیروی میں مشرکین عرب نے اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت حلال یا حرام ٹھیرائی تھیں۔ یہی معاملہ اہل کتاب کا تھا۔ وہ بھی اپنے فقہا و علما کی پیروی میں بہت سی چیزیں اِسی طریقے سے حرام ٹھیرا چکے تھے۔

[۴۲۶] مطلب یہ ہے کہ خدا کی جائز کی ہوئی چیزوں کو حرام ٹھیرانے کی راہ تمھیں شیطان نے

بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

ہے۔[۴۲۷] وہ تو یہی کرے گا کہ تمھیں برائی[۴۲۸] اور بے حیائی کی ترغیب دے[۴۲۹] اور اِس کی ترغیب

سجھائی ہے، اِس کے لیے دین و شریعت میں کوئی سند نہیں ہے۔ لہٰذا اُس کے سجھائے ہوئے اِس راستے پر نہ چلو۔ قرآن میں دوسری جگہ بیان ہوا ہے کہ شیطان نے شروع ہی سے یہ چیز اپنے پروگرام میں شامل کر رکھی ہے کہ وہ اِس طرح کے توہمات پیدا کر کے لوگوں کو توحید کی راہ سے ہٹائے گا۔ ملاحظہ ہو: سورۂ نساء (۴) آیت ۱۱۹۔

۴۲۷ یعنی ایسا دشمن ہے جو ابتدا ہی سے نہایت کھلے ہوئے الفاظ میں تمھارے خلاف اعلان جنگ کر چکا ہے۔ شیطان کا یہ اعلان سورۂ اعراف (۷) کی آیات ۱۶-۱۷ میں نقل ہوا ہے۔

۴۲۸ اصل میں لفظ ’سُوْٓء‘ استعمال ہوا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ یہ جس طرح بدی اور گناہ کے لیے استعمال ہوتا ہے، اُسی طرح مالی، جسمانی اور عقلی نقصانات اور مصائب کے لیے بھی آتا ہے۔ سورۂ آل عمران (۳) کی آیت ۱۷۴ اور سورۂ نمل (۲۷) کی آیت ۱۲ میں اِس کی نظیر موجود ہے، لیکن یہاں اِس پر ’اَلْفَحْشَآء‘ کا عطف اور اِس کے لیے ’یَاْمُرُکُمْ‘ کا فعل دلیل ہے کہ یہ بدی اور گناہ ہی کے معنی میں ہے۔

۴۲۹ اصل میں لفظ ’اَمَر‘ آیا ہے۔ عربی زبان میں یہ حکم دینے کے معنی میں بھی آتا ہے اور کوئی بات سجھانے یا اُس کی ترغیب دینے کے معنی میں بھی۔ یہاں اِس سے مراد شیطان کا اِن باتوں کے لیے دلوں میں وسوسے ڈالنا اور اِنھیں نگاہوں میں کھبانا ہے۔ استاذ امام نے شیطان کی اِن ترغیبات سے متعلق ایک خاص نکتے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”یہاں ایک نکتہ قابل توجہ ہے۔ وہ یہ کہ رحمٰن اور شیطان کے احکام میں ایسا واضح اور محسوس عقلی و فطری امتیاز موجود ہے کہ کسی سلیم الفطرت اور خوش ذوق انسان کو اِن کے درمیان کوئی گھپلا پیش نہیں آسکتا۔ اوپر والی آیت میں گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں کھانے پینے کے لیے جائز ٹھیرائی ہیں، وہ اپنے اثرات، اپنے ظاہر اور اپنے باطن کے لحاظ سے پاکیزہ، خوش گوار،

وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلۡفَيۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ شَيۡـًٔا وَّلَا يَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۷۰﴾

دے کہ تم وہ باتیں اللہ کے نام لگاو[۴۳۰] جو تم نہیں جانتے۔ ۱۶۸-۱۶۹

اور جب اِنھیں دعوت دی جاتی ہے کہ (اپنی اِن باتوں کو چھوڑ کر) اُس چیز کی پیروی کرو جو اللہ نے اتاری ہے تو کہتے ہیں کہ نہیں، بلکہ ہم تو اُسی راہ پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو چلتے پایا ہے۔ کیا اُس صورت میں بھی کہ اگر اِن کے باپ دادوں نے نہ اپنی عقل سے کچھ کام لیا ہو اور نہ راہِ ہدایت پائی ہو؟[۴۳۱] ۱۷۰

معتدل، صحت بخش اور روح پرور ہیں۔ اِس کے بالمقابل شیطان جن باتوں کو اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے، وہ سب کی سب روح، عقل، جسم اور اخلاق کو نقصان پہنچانے والی اور بے حیائی و بدکاری کی راہیں کھولنے والی ہیں۔ اِس واضح فرق کے بعد بھی جو لوگ شیطان کی پیروی اختیار کریں، اُن کی شامت ہی ہے۔‘‘ (تدبر قرآن ۱/۴۱۱)

[۴۳۰] اصل الفاظ ہیں: ’وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ‘۔ اِن میں ’قال‘ ’مفترین‘ یا اِس کے ہم معنی کسی لفظ کے مفہوم پر متضمن ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف کوئی جھوٹی اور من گھڑت بات منسوب کرنا۔ مثلاً یہ کہنا کہ فلاں اور فلاں کو اللہ نے یہ اختیارات دے رکھے ہیں یا بغیر کسی سند کے یہ دعویٰ کرنا کہ فلاں اور فلاں چیز حرام ہے۔

[۴۳۱] مطلب یہ ہے کہ بزرگوں کے ورثہ کو، بے شک احترام کی نظر سے دیکھنا چاہیے، لیکن اُس کی صحت و صداقت ثابت کرنے کے لیے مجرد یہ بات کافی نہیں ہے کہ فلاں اور فلاں چیز باپ دادا سے اِسی طرح چلی آرہی ہے۔ اُس پر اگر کوئی تنقید کی جاتی ہے تو ہر سلیم الطبع انسان کو چاہیے کہ وہ اُسے توجہ سے سنے اور اگر وہ چیز علم و عقل کی میزان پر پوری نہ اترتی ہو تو بغیر کسی تردد کے اُسے چھوڑنے کے لیے تیار ہو جائے۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً
وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ
اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ

اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ جنھوں نے (اللہ کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے سے اِس طرح) انکار کر دیا ہے، اِن کی تمثیل ایسی ہے، جیسے کوئی شخص اُن چیزوں کو پکارے جو پکارنے اور چلانے کے سوا کچھ نہ سنتی ہوں[۴۳۲]۔ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، اِس لیے یہ کچھ نہیں سمجھتے[۴۳۳]۔ ۱۷۱

ایمان والو، (یہ اگر اپنی اِن بدعتوں کو نہیں چھوڑتے تو اِنھیں اِن کے حال پر چھوڑو، اور) جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمھیں عطا فرمائی ہیں، اُنھیں (بغیر کسی تردد کے) کھاؤ اور اللہ ہی کے شکرگزار بنو، اگر تم اُسی کی پرستش کرنے والے ہو[۴۳۴]۔ اُس نے تو تمھارے

---

[۴۳۲] یہ بھیڑ بکریوں کے گلے کی تمثیل ہے جسے چرواہا پکارتا ہے تو اُس کی آواز، بے شک اُس کے کانوں سے ٹکراتی ہے، لیکن اِس سے آگے اُسے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ چرواہا کیا کہہ رہا ہے اور کیا چاہتا ہے۔ اِس طرح کی تمثیلات میں ایک صورت حال کی تمثیل دوسری صورت حال سے دی جاتی ہے۔ اِس کے لیے مثل اور ممثل بہ کے تمام اجزا کی ایک دوسرے سے مطابقت ضروری نہیں ہوتی۔

[۴۳۳] یعنی تمام عقلی اور روحانی خصوصیات سے بالکل محروم ہیں۔ اُن میں اور جانوروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

[۴۳۴] جو چیزیں باپ دادا کے زمانے سے حرام چلی آرہی ہوں، اُنھیں کھانے کے لیے تیار ہو جانا آسان نہیں ہوتا۔ یہ قرآن نے اِسی کے پیش نظر مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی ہے کہ اِس طرح کے

وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾

لیے صرف مردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ حرام ٹھیرایا ہے۔[۴۳۵] اِس پر بھی جو مجبور ہو جائے، اِس طرح کہ نہ چاہنے والا ہو،[۴۳۶] نہ حد سے بڑھنے والا تو

اوہام سے نکل کر جو کچھ اللہ نے حلال ٹھیرایا ہے، اُسے بغیر کسی تردد کے کھاؤ اور پیو۔ اُس کی بندگی اور شکرگزاری کا تقاضا یہی ہے اور تمھیں یہ تقاضا ہر حال میں پورا کرنا چاہیے۔

۴۳۵؎ انسان جن چیزوں کو من جملہ طیبات خیال کر کے کھا سکتا ہے، قرآن نے اُن میں سے یہ چار ہی چیزیں حرام قرار دی ہیں۔ اِن کے علاوہ جو چیزیں کھانے کے لیے موزوں نہیں سمجھی جاتیں، وہ ممنوعاتِ فطرت ہیں۔ انسان ہمیشہ سے جانتا ہے کہ شیر، چیتے، ہاتھی، چیل، کوے، گدھ، عقاب، سانپ، بچھو اور خود انسان کوئی کھانے کی چیز نہیں ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ گھوڑے اور گدھے دستر خوان کی لذت کے لیے نہیں، بلکہ سواری کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ اِن جانوروں کے بول و براز کی نجاست سے بھی وہ پوری طرح واقف ہے۔ نشہ آور چیزوں کی غلاظت کو سمجھنے میں بھی اُس کی عقل عام طور پر صحیح فیصلہ کرتی ہے۔ چنانچہ خدا کی شریعت نے اِس معاملے میں انسان کو اصلاً اُس کی فطرت ہی کی رہنمائی پر چھوڑ دیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کچلی والے درندوں، چنگال والے پرندوں اور جلالہ وغیرہ کا گوشت کھانے کی جو ممانعت روایت ہوئی ہے*، وہ اِسی فطرت کا بیان ہے۔ شراب کی ممانعت سے متعلق قرآن کا حکم بھی اِسی قبیل سے ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ انسان کی یہ فطرت کبھی کبھی مسخ بھی ہو جاتی ہے، لیکن دنیا میں انسانوں کی عادات کا عام مطالعہ بتاتا ہے کہ اُن کی ایک بڑی تعداد اِس معاملے میں بالعموم غلطی نہیں کرتی۔ چنانچہ شریعت نے اِس طرح کی کسی چیز کو اپنا موضوع نہیں بنایا۔ اِس باب میں شریعت کا موضوع صرف وہ جانور اور اُن کے متعلقات ہیں جن کے

---

* مسلم، رقم ۴۹۹۴۔ نسائی، رقم ۴۴۵۲۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ الۡکِتٰبِ وَیَشۡتَرُوۡنَ

اُس پر کوئی گناہ نہیں[۴۳۷]۔ اللہ، یقیناً بخشنے والا ہے، وہ سراسر رحمت ہے۔ ۲-۱۷۲-۱۷۳

(یہ اہل کتاب تو جانتے تھے کہ یہی حق ہے، لیکن اِنھوں نے اِسے چھپایا)۔ حقیقت

طیب یا خبیث ہونے کا فیصلہ تنہا عقل و فطرت کی رہنمائی میں کر لینا انسان کے لیے ممکن نہ تھا۔ سؤر انعام کی قسم کے بہائم میں سے ہے، لیکن وہ درندوں کی طرح گوشت بھی کھاتا ہے۔ پھر اُسے کھانے کا جانور سمجھا جائے یا نہ کھانے کا؟ وہ جانور جنھیں ہم ذبح کر کے کھاتے ہیں، اگر تذکیے کے بغیر مر جائیں تو اُن کا حکم کیا ہونا چاہیے؟ اِنھی جانوروں کا خون کیا اُن کے بول و براز کی طرح نجس ہے یا اُسے حلال و طیب قرار دیا جائے گا؟ یہ اگر اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کر دیے جائیں تو کیا پھر بھی حلال ہی رہیں گے؟ اِن سوالوں کا کوئی واضح اور قطعی جواب چونکہ انسان کے لیے دینا مشکل تھا، اِس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کے ذریعے سے اُسے بتایا کہ سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور بھی کھانے کے لیے پاک نہیں ہیں اور انسان کو اُن سے پرہیز کرنا چاہیے۔

۴۳۶ اصل الفاظ ہیں: 'غَیۡرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ'۔ اِن میں 'بَاغٍ'، 'بغی یبغی' سے اسم فاعل ہے۔ اِس پر 'عَادٍ' کے عطف سے واضح ہے کہ اِس کے معنی یہاں چاہنے اور طلب کرنے ہی کے ہیں۔

۴۳۷ یہ اُس حالت اضطرار کے لیے ایک رخصت ہے جو کھانے کی کوئی چیز میسر نہ آنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اِس میں حرام کے استعمال پر عقوبت اٹھالی گئی ہے، 'فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡہِ، اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ' کے الفاظ سے یہ بات بالکل واضح ہے۔ یہی حکم، ظاہر ہے کہ حالت اکراہ کا بھی ہونا چاہیے۔ اِس معاملے میں صحیح رویہ یہ ہے کہ ضرورت پیش آجانے پر آدمی اِس رخصت سے فائدہ اٹھائے اور عزیمت کے جوش میں خواہ مخواہ اپنی جان کو مشقت میں نہ ڈالے۔ تیمّم، قصر اور جرابوں پر مسح وغیرہ کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جو اسوہ روایتوں میں بیان ہوا ہے، اُس سے بھی

بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا
يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۷۴)

یہ ہے کہ جو لوگ اُس قانون کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے اتارا ہے اور اُس کے بدلے میں (دنیا کی) بہت تھوڑی قیمت قبول کر لیتے ہیں[۴۳۸]، وہ اپنے پیٹ میں صرف دوزخ کی آگ بھرتے ہیں۔ قیامت کے دن اللہ نہ اُن سے بات کرے گا[۴۳۹]، نہ اُنھیں پاکیزہ

یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ تاہم بعض حالات میں آدمی کے ایمان کا تقاضا اِس سے مختلف بھی ہو سکتا ہے۔ استاذ امام اِس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

> ”...لیکن بعض شکلیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں، جب ایک غیرت مند مسلمان کے شایان شان بات یہی ہوتی ہے کہ وہ جان تو دے دے، لیکن حرام کو ہاتھ لگانا گوارا نہ کرے۔ مثلاً، اگر کسی جگہ فساق و فجار کے صاحب اختیار ہونے کی وجہ سے حرام و حلال کی تمیز اٹھ گئی ہو اور آدمی کو کوئی حرام چیز کھانے پر مجبور کیا جائے تو اُس کے ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ وہ عزیمت کی راہ اختیار کرے اور دوسروں کے ایمان کو زندہ کرنے کے لیے اپنی زندگی قربان کر دے۔ یہ بازی کھیل کر وہ گناہ گار نہیں ہوگا، بلکہ ان شاء اللہ اپنی غیرت ایمانی اور احترام حقوق شریعت الٰہی کے صلے میں شہادت کا مقام حاصل کرے گا۔ کم از کم علما و مصلحین کے لیے تو ایسے حالات کے اندر یہی روش بہتر ہے۔ حضرات صحابہ نے مکے کی ابتدائی زندگی میں جو تکلیفیں کلمۂ توحید کی خاطر اٹھائی ہیں، وہ کس سے مخفی ہیں؟ کتنے اصحاب نے اعدائے توحید کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا اور زندگی تو سب ہی حضرات کی خطرے میں رہی، لیکن اِن میں سے کسی ایک صحابی کے متعلق بھی ہمارے علم میں یہ بات نہیں آئی کہ اُنھوں نے جان بچانے کی خاطر کلمۂ کفر زبان سے نکالا ہو، حالاں کہ قرآن میں اِس بات کی صریح اجازت موجود تھی کہ اکراہ کی صورت میں آدمی جان بچانے کے لیے کلمۂ کفر کہہ سکتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۱/۴۲۰)

۴۳۸ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ دین بیچ کر اگر دنیا کے سارے خزانے بھی مل جائیں تو وہ ایک

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿١٧٥﴾

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا

بنائے گا[۴۴۰] اور اُن کے لیے وہاں ایک دردناک عذاب مقرر ہے۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گم راہی اور مغفرت کے بدلے عذاب خریدا ہے۔ سو یہ کتنے جری ہیں دوزخ کو برداشت کر لینے کے معاملے میں[۴۴۱]! ۱۷۴-۱۷۵

یہ اِس لیے ہوگا کہ اللہ نے اپنی یہ کتاب قولِ فیصل کے ساتھ اتاری ہے،[۴۴۲] مگر یہ

متاع حقیر ہی ہیں۔

[۴۳۹] بات نہ کرنے کے معنی لطف وعنایت کی بات نہ کرنے کے ہیں۔ یہود کو یہ شرف حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے نبیوں کے واسطے سے اُنھیں صدیوں تک شرف تکلم سے نوازا۔ اِس کا تقاضا تھا کہ وہ خدا کے کلام کی قدر کرتے اور دنیا کے گوشے گوشے میں اُس کا چرچا پھیلاتے۔ لیکن اِس کے برعکس جو رویہ اُنھوں نے اِس کے ساتھ اختیار کیا، اُس کا نتیجہ یہی نکلنا چاہیے تھا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُنھیں اپنے شرف تکلم سے محروم کر دے۔

[۴۴۰] اِس سے مراد وہ پاکیزگی ہے جو اللہ تعالیٰ ایمان کے صلے میں اپنے بندوں کو اُن کے گناہوں سے درگذر کر کے یا تھوڑی بہت سزا دے کر خاص اپنی رحمت سے عطا فرمائیں گے۔

[۴۴۱] اصل الفاظ ہیں: 'فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ'۔ یہ 'ما احسن' کی طرح اظہار تعجب کا اسلوب ہے۔

[۴۴۲] یعنی دین وشریعت کے بارے میں نہایت واضح اور قطعی ہدایت کے ساتھ اتاری ہے۔ لہٰذا حق وباطل اور حرام وحلال کے باب میں اب کوئی ابہام نہیں رہا۔

فِی الۡکِتٰبِ لَفِیۡ شِقَاقٍۭ بَعِیۡدٍ ﴿۱۷۶﴾

لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡہَکُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَ الۡمَغۡرِبِ وَ لٰکِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ وَ الۡکِتٰبِ وَ النَّبِیّٖنَ ۚ

لوگ جنھوں نے اِس کتاب کے معاملے میں اختلاف کیا ہے، یہ اپنی ضد میں بہت دور نکل گئے ہیں[۴۴۳]۔ ۱۷۶

(یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ سے وفا کا حق مذہب کی کچھ رسمیں پوری کر دینے سے ادا ہو جاتا ہے۔ اِنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) اللہ کے ساتھ وفاداری[۴۴۴] صرف یہ نہیں کہ تم نے (نماز میں) اپنا رخ مشرق یا مغرب کی طرف کر لیا[۴۴۵]، بلکہ وفاداری تو اُن کی وفاداری

---

[۴۴۳] اصل میں 'لَفِیۡ شِقَاقٍۭ بَعِیۡدٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'شِقَاق' کے معنی مخالفت اور عناد کے ہیں۔ اِس کے ساتھ جب 'بَعِیۡد' کی صفت آئے تو اِس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص مخالفت اور ضدم ضدا میں اتنی دور نکل گیا ہے کہ اُسے نہ اپنے نفع و نقصان کا ہوش رہا ہے اور نہ اُس نے وہاں سے پلٹنے اور تلافی مافات کرنے کی کوئی گنجایش اپنے لیے باقی رہنے دی ہے۔

[۴۴۴] اصل میں لفظ 'الۡبِرّ' استعمال ہوا ہے۔ امام فراہی کی تحقیق کے مطابق اِس کا اصل مفہوم کسی کے حق کو پورا کرنا ہے۔ اِس میں وہ حقوق بھی شامل ہیں جو انسان کے وجود ہی سے اُس پر عائد ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اللہ کے، ماں باپ کے اور اُس کے بندوں کے حقوق اور وہ بھی جو معاہدات، قول و قرار اور حلف وولا سے پیدا ہوتے ہیں۔ لفظ کی اِس وسعت کے باعث وہ تمام نیکیاں اِس کے مفہوم میں شامل ہو جاتی ہیں جو عدل یا احسان کے زیرِعنوان بیان کی جا سکتی ہیں۔ اردو زبان میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جو اِس کے اِس پورے مفہوم کو ادا کر دے۔ وفاداری کا لفظ، ہمارے نزدیک لفظ کی اصل روح ایک حد تک ادا کر دیتا ہے۔

[۴۴۵] یہ یہود و نصاریٰ پر تعریض ہے جنھوں نے تورات و انجیل کی اصل تعلیمات تو طاق نسیاں

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ

ہے[۴۴۶] جو پورے دل سے اللہ کو مانیں[۴۴۷] اور قیامت کے دن کو مانیں[۴۴۸] اور اللہ کے فرشتوں کو مانیں[۴۴۹] اور اُس کی کتابوں کو مانیں[۴۵۰] اور اُس کے نبیوں کو مانیں[۴۵۱] اور مال کی محبت کے

پر رکھ دی تھیں، لیکن اِس پر لڑنے مرنے کے لیے تیار تھے کہ قبلہ مشرق کی طرف ہونا چاہیے یا مغرب کی طرف۔ معلوم ہوتا تھا کہ سارے دین کا انحصار اُن کے نزدیک، بس اِسی ایک مسئلے پر ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کے الفاظ میں، گویا مچھروں کو چھانتے اور اونٹوں کو نگلتے تھے۔

۴۴۶ اِس مفہوم کے لیے جو الفاظ اصل میں آئے ہیں، اُن میں ایک مضاف عربیت کی رو سے حذف ہوگیا ہے۔ یعنی 'بر من آمن'۔

۴۴۷ یعنی بغیر کسی شائبۂ شرک کے اپنے آپ کو پورا کا پورا اپنے پروردگار کے حوالے کر دیں۔

۴۴۸ یعنی اِس بات کو تسلیم کریں کہ مرنے کے بعد وہ لازماً اٹھائے جائیں گے، ایمان و عمل صالح کے سوا وہاں کوئی چیز اُن کے کام نہ آئے گی، اپنے ہر قول و فعل کے لیے وہ خدا کے سامنے جواب دہ ہوں گے اور اذن خداوندی کے بغیر وہاں کسی کو یارا نہ ہوگا کہ اُن کے حق میں ایک لفظ بھی کہہ دے۔

۴۴۹ یعنی یہ مانیں کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی ایک معصوم اور قدسی صفت مخلوق ہیں، اُس کی ہدایت انسانوں کو پہنچاتے ہیں، اُس میں پوری طرح امین اور قابل اعتماد ہیں اور قضا و قدر کے فیصلے اُن کے ذریعے سے نافذ کیے جاتے ہیں۔ فرشتوں پر یہ ایمان، اگر غور کیجیے تو بے حد ضروری ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ انسانوں کو خدا کی ہدایت اگر انبیا و رسل کے ذریعے سے ملتی ہے تو اِن انبیا و رسل تک یہ ہدایت بالعموم اِنھی فرشتوں کے ذریعے سے پہنچتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں یہی ایک ایسی مخلوق ہیں جو عالم لاہوت اور عالم ناسوت، دونوں کے ساتھ یکساں ربط رکھ سکتے ہیں۔ اپنی نورانیت کے باعث یہ تجلیات الٰہی کے بھی متحمل ہو جاتے ہیں اور مخلوق ہونے کے لحاظ سے

السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى

باوجود[۴۵۲] اُسے قرابت مندوں[۴۵۳]، یتیموں[۴۵۴]، مسکینوں، مسافروں اور مانگنے والوں[۴۵۵] پر اور

انسانوں کے ساتھ بھی اتصال پیدا کر لیتے ہیں۔ چنانچہ جس طرح نوح، ابراہیم، موسیٰ اور یوحنا و مسیح ہمارے لیے خدا کے رسول ہیں، اُسی طرح فرشتے اِن رسولوں کے لیے خدا کے رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابیں اور صحائف اِنھی فرشتوں کے ذریعے سے انبیا و رسل پر نازل کیے ہیں اور زمین پر اُس کی دینونت بھی ہمیشہ اِنھی کے ذریعے سے برپا ہوئی ہے۔

۴۵۰ یعنی اِس بات پر ایمان لائیں کہ انبیا علیہم السلام جس چیز کو کتاب الٰہی کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کا اتارا ہوا صحیفۂ ہدایت ہے۔ اللہ نے اُسے حق و باطل کے لیے کسوٹی بنا کر نازل کیا ہے، اور اِس لیے نازل کیا ہے کہ دین کے معاملے میں لوگ ٹھیک انصاف پر قائم ہو جائیں۔

۴۵۱ یعنی یہ تسلیم کریں کہ انبیا انسانوں کے لیے خدا کی طرف سے مامور اور واجب الاطاعت ہادی ہیں، اُن کا علم بے خطا ہے، اُن کا عمل زندگی کے لیے اسوہ ہے اور اُن کی اطاعت، اتباع اور محبت ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔

۴۵۲ اصل الفاظ ہیں: 'وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ'۔ اِس کے معنی عربیت کی رو سے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اُس نے اپنا مال خدا کی محبت میں خرچ کیا ہے، لیکن ہمارے نزدیک وہ معنی قابل ترجیح ہیں جو ہم نے ترجمے میں اختیار کیے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے نظائر سے اِسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ سورۂ آل عمران (۳) کی آیت ۹۲ اور سورۂ حشر (۵۹) کی آیت ۹ میں قرآن نے صراحت کے ساتھ بتایا ہے کہ اللہ کی وفاداری کا اعلیٰ مرتبہ انسان کو اُس مال کے خرچ کرنے سے حاصل ہوتا ہے جو اُسے محبوب ہو۔ یہاں بھی یہی بتایا جا رہا ہے کہ یہ مرتبہ انسان کو کس قسم کے انفاق سے حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا موقع کلام کا تقاضا ہے کہ اِسی مفہوم کو ترجیح دی جائے۔

۴۵۳ انفاق کے مصارف میں سب سے پہلے قرابت مندوں کا ذکر ہوا ہے۔ اِس سے معلوم

الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ

لوگوں کی گردنیں چھڑانے میں خرچ کریں[۴۵۶]، اور نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں[۴۵۷]۔
اور وفاداری تو اُن کی وفاداری ہے کہ جب عہد کر بیٹھیں[۴۵۸] تو اپنے اِس عہد کو پورا

ہوا کہ آدمی کے اعزہ واقربا اگر ضرورت مند ہوں تو اُس کی اعانت کے سب سے زیادہ مستحق وہی ہیں۔

۴۵۴ یہ قرابت مندوں کے بعد معاً یتیموں کا ذکر اِس بات کو واضح کرتا ہے کہ اپنے عزیزوں کے بعد آدمی کی پہلی نظر اُن بچوں پر پڑنی چاہیے جو باپ کے سایے سے محروم ہو چکے ہیں اور جن کی کفالت کی ذمہ داری اب شرعاً وعرفاً معاشرے پر عائد ہوتی ہے۔

۴۵۵ یعنی وہ لوگ جو اپنی ضرورت لے کر کسی کے پاس آ جائیں۔ مساکین کے بعد اِن کے مستقل ذکر سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو شخص مانگنے کے لیے آ جائے، اُس کے متعلق زیادہ تحقیق کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ فی الواقع مستحق ہے یا نہیں ہے۔ ہمارا حق صرف یہ ہے کہ مدد کر سکتے ہوں تو مدد کریں، ورنہ شایستہ انداز سے اُس کے سامنے اپنی معذرت پیش کر دیں۔

۴۵۶ اِس سے مراد غلاموں کی گردنیں ہیں اور یہ قرآن کی اُنھی ہدایات میں سے ہے جو اُس نے غلامی کے رواج کو بتدریج ختم کرنے کے لیے دی ہیں۔ اِس زمانے میں کوئی شخص اگر کسی ضرورت مند کو اُس کے قرض، تاوان یا اِس طرح کی کسی دوسری مصیبت سے نجات دلائے تو یہ بھی، ان شاء اللہ اِسی درجے کی نیکی ہوگی۔

۴۵۷ ایمان وانفاق کے بعد یہ نماز اور زکوٰۃ کا ذکر اِن دونوں کے قانونی اور عملی مظاہر کی حیثیت سے ہوا ہے۔ ایمان کی عظیم حقیقت عملاً نماز سے ظاہر ہوتی ہے اور انفاق کی عظیم حقیقت زکوٰۃ سے۔ یہ اِن دونوں کا کم سے کم تقاضا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن کا اصلی حق اٹھتے بیٹھتے خدا کے ذکر اور اُس کی راہ میں فیاضانہ انفاق سے ادا ہوتا ہے۔

۴۵۸ یہ قید اِن وفا پرستوں کے عزم واستقلال کو ظاہر کرتی ہے، یعنی جب کوئی عہد کر بیٹھتے

فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ط اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ط

کرنے والے ہوں[۴۵۹] اور خاص کر اُن کی جو تنگی اور بیماری میں اور جنگ کے موقع پر[۴۶۰]

ہیں تو خواہ کچھ ہو جائے، بڑے سے بڑا نقصان اٹھا کر اور جان کی بازی لگا کر بھی وہ اُسے پورا کرتے ہیں۔

۴۵۹۔ اصل الفاظ ہیں: 'وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ'۔ اِن میں، اگر غور کیجیے تو اسلوب کلام دفعتاً بدل گیا ہے۔ اِس سے پہلے ایمان، انفاق، نماز اور زکوٰۃ کا ذکر فعل کے صیغوں میں تھا۔ یہ اُنھی پر معطوف ہے، لیکن اسم فاعل کی صورت میں ہے۔ پھر آگے 'الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ' میں ایک اور تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ 'الْمُوْفُوْنَ' پر معطوف ہونے کے باوجود وہ 'الصّٰبِرُوْنَ' کے بجائے 'الصّٰبِرِيْنَ'، یعنی حالت نصب میں ہو گیا ہے۔ استاذ امام اِس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

> ''عربی زبان کے طلبہ اِس بات سے واقف ہیں کہ عربی میں فعل کے صیغے تو صرف کسی فعل کے وقوع کو ظاہر کرتے ہیں، لیکن صفت کے صیغے کسی مستقل صفت، کسی خصلت اور کسی کردار کو ظاہر کرتے ہیں۔ بلکہ اِن کے اندر ایک عزم و جزم کی روح بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔ اِسی طرح یہ بات بھی اہل علم سے مخفی نہیں ہے کہ سلسلۂ کلام میں اگر کسی صفت کا ذکر بغیر کسی ظاہری سبب کے حالت نصب میں ہو تو اِس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ متکلم اُس پر خاص طور پر زور دینا چاہتا ہے۔ ہمارے اہل نحو اِس بات کو 'علی سبیل المدح' یا 'علی سبیل الاختصاص' کی اصطلاح میں تعبیر کرتے ہیں۔ مثلاً یہاں 'مُوْفُوْنَ' کے بعد دفعتاً اِس سے بالکل مختلف اسلوب میں 'الصّٰبِرِيْنَ' جو آ گیا تو اِس سے معنی میں یہ اضافہ ہو جائے گا کہ گویا متکلم یہ کہنا چاہتا ہے کہ 'انا اخص بالذکر الصابرین' میں صابرین کا ذکر خاص طور پر کرنا چاہتا ہوں۔''
>
> (تدبر قرآن ۱/۴۲۷)

اِس سے معلوم ہوا کہ دین میں اصل اہمیت کی چیز سیرت و کردار ہے۔ یہی دین کا مغز اور اُس کی روح ہے۔ آزمایش کا اصلی میدان بھی یہی ہے۔ انسان کو انفرادی زندگی میں یہی چیز بر و تقویٰ

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

ثابت قدم رہنے والے ہوں۔ یہی ہیں جو (اللہ کے ساتھ اپنے عہدِ وفا میں) سچے ہیں اور یہی ہیں جو فی الواقع پرہیزگار ہیں۔ ۱۷۷

کے مقام پر فائز کرتی ہے اور اجتماعی زندگی میں بھی یہی اُسے صالحین و ابرار کے زمرے کا آدمی بناتی ہے۔ چنانچہ ضروری ہوا کہ اِسے خاص اہتمام کے ساتھ بیان کیا جائے۔

استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کے متعلق ایک اہم نکتہ اور بھی واضح فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ’’ایک سوال یہاں اور بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ یہاں سیرت و کردار سے متعلق صرف دو ہی چیزوں کا ذکر فرمایا: ایک ایفاے عہد کا، دوسری صبر کا۔ اِس فہرست میں اور بھی چیزیں شامل ہو سکتی تھیں، آخر اُن کا ذکر کیوں نہیں فرمایا؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں درحقیقت سیرت و اخلاق سے متعلق تمام اجزا کے لیے بمنزلۂ شیرازہ ہیں۔ ایفاے عہد کے اندر تمام چھوٹے بڑے حقوق و فرائض آ جاتے ہیں، خواہ وہ خلق سے متعلق ہوں یا خالق سے؛ خواہ وہ کسی تحریری معاہدے سے وجود میں آتے ہوں یا کسی نسبت، تعلق، رشتہ داری اور قرابت سے؛ خواہ اُن کا اظہار و اعلان ہوتا ہو یا وہ ہر اچھی سوسائٹی میں بغیر کہے ہوئے سمجھے اور مانے جاتے ہوں۔ اللہ اور رسول، ماں اور باپ، بیوی اور بچے، خویش و اقارب، کنبہ اور خاندان، پڑوسی اور اہل محلّہ، استاد اور شاگرد، نوکر اور آقا، ملک اور قوم، ہر ایک کے ساتھ ہم کسی نہ کسی ظاہری یا مخفی معاہدے کے تحت بندھے ہوئے ہیں اور یہ بر و تقویٰ کا ایک لازمی تقاضا ہے کہ اِن تمام معاہدوں کے حقوق ادا کرنے والے بنیں۔ گویا ایفاے عہد کی اصل روح ایفاے حقوق ہے اور ایفاے حقوق انسان کے تمام چھوٹے بڑے فرائض کو محیط ہے۔
>
> اِس کے ساتھ صبر کی صفت کو جمع کر کے یہ واضح فرما دیا کہ ہر وہ مزاحمت جو ایفاے حقوق کی اِس راہ میں حائل ہو، مومن عزیمت و استقامت کے ساتھ اُس کا مقابلہ کرے اور کسی حال میں بھی طمع، پست ہمتی یا خوف سے مغلوب نہ ہو۔‘‘ (تدبر قرآن ۱/۴۲۸)

۶۰؎ یہی تین حالتیں ہیں جن میں انسان کے عزم و استقلال کی آزمایش ہوتی ہے۔ اِن

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ

ایمان والو، (تم میں) جو لوگ قتل کر دیے جائیں، اُن کے مقدموں میں قصاص[۴۶۱] تم پر فرض کیا گیا ہے[۴۶۲]۔ اِس طرح کہ قاتل آزاد ہو تو اُس کے بدلے میں وہی آزاد، غلام ہو تو اُس کے بدلے میں وہی غلام، عورت ہو تو اُس کے بدلے میں وہی عورت[۴۶۳]۔ پھر جس

میں اگر کوئی شخص ثابت قدم رہے تو یقیناً بر و تقویٰ کے اعلیٰ مقام پر فائز ہے۔ قرآن نے آگے یہی کہا ہے اور اِس طرح یہ بات واضح کر دی ہے کہ جو لوگ چند ظاہری رسوم سے خدا کی وفاداری کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں، اُن کے پاس نہ تقویٰ ہے اور نہ وہ اپنے عہد وفا میں سچے ہیں۔

۴۶۱؎ قصاص 'قصص' سے ہے جس کے اصل معنی کسی کے پیچھے اُس کے نقش قدم کے ساتھ چلنے کے ہیں۔ اِسی سے یہ اُس سزا کے لیے استعمال ہوا جس میں مجرم کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو اُس نے دوسروں کے ساتھ کیا ہے۔

۴۶۲؎ اِس حکم کا تعلق مسلمانوں کے پورے معاشرے سے ہے۔ 'كُتِبَ عَلَيْكُمْ' کا مخاطب وہی ہے۔ چنانچہ یہ فرض معاشرے کے نظم اجتماعی پر عائد ہوتا ہے کہ اُس کے دائرۂ اختیار میں اگر کوئی قتل ہو جائے تو اُس کے قاتلوں کا سراغ لگائے، اُنھیں گرفتار کرے اور قانون کے مطابق اُن سے قصاص لے۔

۴۶۳؎ یہ اُس بے لاگ انصاف اور کامل مساوات کا بیان ہے جو قصاص میں لازماً ملحوظ رکھی جائے گی۔ قرآن کے اِس حکم نے قدیم و جدید جاہلیت کی تمام ناانصافیوں کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ادنیٰ و اعلیٰ، امیر و غریب، شریف و وضیع اور آقا و غلام، سب کو ایک ہی آدم و حوا کی اولاد مان کر اِس معاملے میں بالکل ایک ہی سطح پر رکھا جائے گا۔ کسی شخص کا معاشرتی اور سماجی مرتبہ ہرگز کسی ترجیح کا باعث نہ بنے گا اور قانون و عدالت ہر ایک کے ساتھ بالکل یکساں معاملہ کریں گے۔

اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ

کے لیے اُس کے بھائی کی طرف سے کچھ رعایت کی جائے (تو اُس کو تم قبول کر سکتے ہو، لیکن یہ قبول کر لی جائے)[۴۶۴] تو دستور کے مطابق اُس کی پیروی کی جائے گی[۴۶۵] اور

---

[۴۶۴] مطلب یہ ہے کہ اِس صورت میں قصاص لینا فرض نہیں رہے گا۔ عدالت چاہے تو اِس پر اصرار کر سکتی ہے، لیکن مقتول کے اولیا اگر جان کے بدلے میں جان کا مطالبہ نہ کریں اور مجرم کے ساتھ نرمی برتنے کے لیے تیار ہو جائیں تو جرم کی نوعیت اور مجرم کے حالات کے پیش نظر وہ اُسے کوئی کم تر سزا بھی دے سکتی ہے۔ اِس کے لیے اصل میں 'فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'عُفِیَ' کے معنی معاف کر دینے کے ہیں اور جملے کی تالیف ہمارے نزدیک یہ ہے: 'فمن عفی له من اخیه شیء من العفو'۔ یعنی اگر مقتول کے وارثوں کی طرف سے قاتل کو کچھ چھوٹ دے دی گئی۔ اِس کی جو صورت یہاں مراد ہے، وہ یہ ہے کہ جان کے بدلے جان کے بجاے وہ خون بہا لینا قبول کر لیں۔ آگے 'اَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ' کے الفاظ سے یہ معنی بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔

یہ رعایت، اگر غور کیجیے تو نہایت حکیمانہ ہے۔ مجرم کے لیے معافی کا فیصلہ کرتے وقت مقتول کے اولیا کی مرضی کو اہمیت دی جائے تو یہ چیز نہ صرف یہ کہ اُن کی آتش انتقام بجھا دیتی ہے، بلکہ قتل جیسے جرائم کے مسموم معاشروں میں اِس زہر کا تریاق بن جاتی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...قاتل کی جان پر مقتول کے وارثوں کو براہ راست اختیار مل جانے سے ایک تو اُن کے بہت بڑے زخم کے اندمال کی ایک شکل پیدا ہوتی ہے، دوسرے اگر اِس صورت میں یہ کوئی نرم رویہ اختیار کریں تو قاتل اور اُس کے خاندان پر یہ اُن کا براہ راست احسان ہوتا ہے جس سے نہایت مفید نتائج کی توقع ہو سکتی ہے۔'' (تدبر قرآن ۱/۴۳۳)

تَخۡفِیۡفٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَرَحۡمَۃٌ ؕ فَمَنِ اعۡتَدٰی بَعۡدَ ذٰلِکَ فَلَہٗ

جو کچھ بھی خون بہا ہو، وہ خوبی کے ساتھ اُسے ادا کر دیا جائے گا۔[۴٦٦] یہ تمھارے پروردگار کی طرف سے ایک قسم کی رعایت اور تم پر اُس کی عنایت ہے۔[۴٦٧] پھر اِس

---

۴٦٥ اصل الفاظ ہیں: 'فَاتِّبَاعٌ بِالۡمَعۡرُوۡفِ'۔ لفظ 'مَعۡرُوۡف' قرآن میں بھلائی اور خیر کے معنی میں بھی آیا ہے اور رواج اور دستور کے معنی میں بھی۔ یہاں 'اَدَآءٌ اِلَیۡہِ بِاِحۡسَانٍ' کے الفاظ اِس کے بعد دلیل ہیں کہ یہ دوسرے معنی میں ہے۔ اِس سے صاف واضح ہے کہ قرآن نے دیت کی کوئی خاص مقدار خود متعین کر دینے کے بجاے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اِس معاملے میں معاشرے کے دستور کی پیروی کریں۔ قرآن کے اِس حکم کے مطابق ہر معاشرہ اپنے ہی دستور کا پابند ہے۔ جس معاشرے میں دیت کا کوئی قانون پہلے سے موجود نہیں ہے، وہاں مسلمانوں کے ارباب حل وعقد کو اختیار ہے کہ چاہیں تو عرب کے اُس دستور کو برقرار رکھیں جس کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں دیت کے فیصلے کیے اور چاہیں تو اُس کی کوئی دوسری صورت تجویز کریں۔ وہ جو صورت بھی اختیار کریں گے، معاشرہ اُسے قبول کر لیتا ہے تو اُس کے لیے وہی دستور قرار پائے گی اور اُس کے مطابق دیت ادا کر دینے سے قرآن کا منشا یقیناً پورا ہو جائے گا۔

۴٦٦ یہ خوبی کے ساتھ دیت ادا کرنے کا حکم جس وجہ سے دیا ہے، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "...حسن وخوبی کے ساتھ ادائیگی کی تاکید اِس لیے فرمائی کہ عرب میں دیت کی ادائیگی بالعموم نقد کی صورت میں نہیں، بلکہ جنس و مال کی شکل میں ہوتی تھی۔ اِس وجہ سے اگر ادائیگی کرنے والوں کی نیت اچھی نہ ہوتی تو وہ اُس میں بہت کچھ چالیں چل سکتے تھے۔ یہ بات بڑی آسانی سے ممکن ہے کہ اونٹوں یا بکریوں کی تعداد یا غلہ اور کھجور کی مقدار و کمیت کے لحاظ سے تو دیت کا مطالبہ پورا کر دیا جائے، لیکن باعتبار حقیقت و کیفیت اِس کی حیثیت محض خانہ پری ہی کی ہو۔ اگر ایسا ہو تو اِس کے معنی یہ ہوئے کہ اُن لوگوں کے احسان کی کوئی قدر نہیں کی گئی جنھوں نے ایک

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

کے بعد جو زیادتی کرے تو اُس کے لیے (قیامت میں) دردناک سزا ہے[۴۶۸] —— اور تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے[۴۶۹]، عقل والو، تاکہ تم حدودِ الٰہی کی پابندی کرتے رہو۔ ۱۷۸-۱۷۹

شخص کی جان پر شرعی اختیار پا کر اُس کو معاف کر دیا اور اُس کی طرف سے مال قبول کر لینے پر راضی ہو گئے۔ اُن کے احسان کا جواب تو احسان ہی ہونا چاہیے۔ یعنی دیت کی ادائیگی اِس خوبی، فیاضی اور کشادہ دلی کے ساتھ کی جائے کہ اُن کو یہ صدمہ نہ اٹھانا پڑے کہ اُنھوں نے اپنے ایک عزیز کے خون کے بدلے میں بھیڑ بکریاں قبول کر کے کوئی غلطی یا بے غیرتی کی۔“

(تدبر قرآن ۱/ ۴۳۴)

۴۶۷ مطلب یہ ہے کہ حرمت جان کا اصل حق تو یہی تھا کہ جان کے بدلے جان لی جاتی، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہے کہ اُس نے اِس معاملے میں رعایت فرما دی ہے۔ لہٰذا اب اِس رعایت سے کسی شخص کو کوئی غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

۴۶۸ اِس کی تفسیر میں استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اِس میں قاتل اور اُس کے خاندان والوں کے لیے بھی تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اِس رعایت سے فائدہ اٹھانے کے بعد یہ انتہائی کفرانِ نعمت ہو گا کہ اِس کے پردے میں مقتول کے خاندان پر کسی نئے ظلم کے لیے اسکیم بنائی جائے۔ مثلاً یہ کہ قاتل اور اُس کے اعزہ یہ منصوبہ بنائیں کہ اِس وقت تو کسی طرح مقتول کے ورثا کو راضی کر کے اپنی جان بچا لو، پھر موقع پیدا کر کے اُس کو مزید نقصان پہنچائیں گے۔ اِسی طرح اِس میں مقتول کے وارثوں کے لیے بھی تنبیہ ہے کہ اُنھیں اپنے دل میں یہ منصوبہ رکھ کے دیت کا راضی نامہ نہیں کرنا چاہیے کہ اِس وقت تو قاتل سے دیت لے لیتے ہیں، بعد میں موقع ملنے پر اُس کی جان بھی ٹھکانے لگا دیں گے۔ خدا کی بخشی ہوئی ایک

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۚۖ

(اِسی طرح مال کے نزاعات سے بچنے کے لیے) تم پر فرض کیا گیا ہے کہ تم میں سے

رعایت کے تحت جو راضی نامہ ہو گیا ہے، دونوں فریقوں کو سچے دل سے اُس کا احترام کرنا چاہیے۔ جو بھی یہ راضی نامہ ہو چکنے کے بعد کوئی زیادتی کرے گا، وہ اللہ کے غضب کا مستحق ٹھیرے گا۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۴۳۴)

۴۶۹؎ یہ قرآن نے خاص طور پر اہل عقل کو مخاطب کر کے اِس قانون کی حکمت بیان فرمائی ہے تا کہ لوگ نہ قصاص کے معاملے میں کسی سہل انگاری، چشم پوشی، جانب داری اور بے جا رحم و مروت کو حائل ہونے دیں اور نہ جذبات سے مغلوب ہو کر جرم و سزا کے معاملے میں اُس طرح کے فلسفے پیش کرنے کی جسارت کریں جو اِس زمانے میں بعض لوگوں نے مجرموں کی وکالت کرتے ہوئے پیش فرمائے ہیں۔ استاذ امام اِس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''... یہ زندگی فرد کے لحاظ سے نہیں، بلکہ معاشرے کے لحاظ سے ہے۔ اگر ایک شخص قتل کے جرم میں قتل کر دیا جاتا ہے تو بظاہر تو ایک جان کے بعد یہ دوسری جان بھی گویا تلف ہی ہوتی ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے اگر دیکھیے تو اُس کے قتل سے پورے معاشرے کے لیے زندگی کی ضمانت پیدا ہوتی ہے۔ اگر اُس سے قصاص نہ لیا جائے تو یہ جس ذہنی خرابی میں مبتلا ہو کر ایک بے گناہ کے قتل کا مرتکب ہوا ہے، وہ خرابی پورے معاشرے میں متعدی ہو جائے۔ بیماری اور بیماری میں فرق ہوتا ہے۔ جو بیماریاں قتل، ڈکیتی، چوری اور زنا وغیرہ جیسے خطرناک جرائم کا سبب بنتی ہیں، اُن کی مثال اُن بیماریوں کی ہے جن میں پورے جسم کو بچانے کے لیے بسا اوقات جسم کے کسی عضو کو کاٹ کر الگ کر دینا پڑتا ہے۔ اگرچہ کسی عضو کو کاٹ پھینکنا ایک سنگ دلی کا کام معلوم ہوتا ہے، لیکن ایک ڈاکٹر کو یہ سنگ دلی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اگر وہ طبیعت پر جبر کر کے یہ سنگ دلی اختیار نہ کرے تو اُس ایک عضو کی ہم دردی میں اُسے مریض کے پورے جسم کو ہلاکت کے حوالے کرنا پڑے گا۔

الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝١٨٠ۭ

جب کسی کی موت کا وقت آ پہنچے اور وہ کچھ مال چھوڑ رہا ہو[۴۷۰] تو والدین اور قرابت مندوں[۴۷۱] کے لیے دستور کے مطابق وصیت کرے[۴۷۲]۔ اللہ سے ڈرنے والوں پر یہ حق ہے[۴۷۳]۔

> معاشرہ اپنی مجموعی حیثیت میں ایک جسم سے مشابہت رکھتا ہے۔ اِس جسم کے بعض اعضا میں بھی بسا اوقات اُسی قسم کا فساد و اختلال پیدا ہو جاتا ہے جس کا علاج مرہم وضماد سے ممکن نہیں ہوتا، بلکہ عضو مریض پر آپریشن کر کے اُس کو جسم کے مجموعے سے الگ کر دینا ضروری ہوتا ہے۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ یہ عضو مریض ہے، اِس وجہ سے نرمی اور ہم دردی کا مستحق ہے تو اِس نرمی کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ ایک دن یہ عضو سارے جسم کو سڑا اور گلا کر رکھ دے۔“
>
> (تدبر قرآن ۱/۴۳۶)

۴۷۰؎ وصیت کے لیے یہ دو شرطیں اِس لیے عائد کی ہیں کہ جو لوگ اپنی چلتی پھرتی زندگی میں وصیت کر دیتے ہیں، اُن کے لیے بسا اوقات بڑی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں اور جو لوگ مال رکھتے ہوئے اِس معاملے میں کوتاہی کرتے ہیں، وہ بارہا اپنے پیچھے بڑے جھگڑے چھوڑ جاتے ہیں۔ پہلی شرط کا ذکر اصل میں ’اِذَا‘ کے ساتھ ہوا ہے، اِس لیے کہ موت سب کو آنی ہے اور دوسری کا ذکر ’اِنْ‘ کے ساتھ ہوا ہے، اِس لیے کہ مال ہر شخص کے پاس نہیں ہوتا۔ ’اِنْ‘ اور ’اِذَا‘ کا یہ فرق عربی زبان کے طلبہ کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ پھر یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ مال کے لیے اِس آیت میں ’خَيْر‘ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے اصلی معنی مرغوب اور مطلوب چیز کے ہیں۔ اِس طرح قرآن نے گویا بالواسطہ طریقے پر بتا دیا ہے کہ مال فی نفسہٖ کوئی بری چیز نہیں ہے، بلکہ علم و دانش کی طرح ایک خیر ہے جس کی تمنا اگر آدمی کے دل میں پیدا ہو اور وہ اِس کے لیے جدوجہد بھی کرے تو اِسے کسی طرح ناپسندیدہ نہیں کہا جا سکتا۔

۴۷۱؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ لوگ بالعموم اولاد ہی کو اپنے ترکے کا وارث سمجھتے تھے۔ والدین اور دوسرے اعزہ کے لیے کوئی حصہ اُس میں نہیں مانتے تھے۔

فَمَنۡۢ بَدَّلَهٗ بَعۡدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثۡمُهٗ عَلَى الَّذِيۡنَ يُبَدِّلُوۡنَهٗ ؕ

پھر جو اِس وصیت کو اِس کے سننے کے بعد بدل ڈالے تو اِس کا گناہ اُن بدلنے والوں

۲۷۴ وصیت کا یہ حکم اُن وارثوں کے لیے باقی نہیں رہا جن کے حصے اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء (۴) میں اِس کے بعد خود متعین فرما دیے ہیں۔ تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وارثوں کی کوئی ضرورت یا اُن میں سے کسی کی کوئی خدمت یا اِس طرح کی کوئی دوسری چیز تقاضا کرے تو اِس صورت میں بھی اُن کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی۔ اِس طرح کی وصیت کی جا سکتی ہے، مگر رشتہ داری کی بنیاد پر کوئی وصیت نہیں کی جا سکتی۔ اولاً، اِس لیے کہ نساء کی اُن آیات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ حصے اُس نے خود اِس لیے متعین فرمائے ہیں کہ لوگ یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ اُن کے وارثوں میں سے کون بہ لحاظ منفعت اُن سے قریب تر ہے۔ لہٰذا اب اگر کوئی شخص اِن وارثوں کے لیے وصیت کرتا ہے تو وہ گویا اپنے عمل سے یہ کہتا ہے کہ میں یہ فیصلہ نہ صرف یہ کہ کر سکتا ہوں، بلکہ اُس فیصلے سے بہتر کر سکتا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ ثانیاً، اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے وہاں اِن حصوں کو اپنی وصیت قرار دیا ہے جس کے بعد اگر وصیت کی جائے تو یہ گویا اللہ کی وصیت کے مقابلے میں اپنی وصیت پیش کرنے کی جسارت ہے۔ ثالثاً، اِس لیے کہ اِسی سورۂ نساء کی آیت ۷ میں اِن حصوں کو 'نَصِیۡبًا مَّفۡرُوۡضًا' کہا گیا ہے جنھیں، ظاہر ہے کہ کوئی وصیت اب کسی طرح باطل نہیں کر سکتی۔ چنانچہ یہ بات تو بالکل قطعی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ وارثوں کی حد تک عام حالات میں وصیت کا یہ حکم سورۂ نساء کی آیات سے منسوخ ہو گیا ہے۔ لیکن یہ جب دیا گیا تو اِس سے کیا چیز پیش نظر تھی؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی اِس سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

> ''اِس آیت میں والدین اور اقربا کے لیے جو وصیت کا حکم دیا گیا، وہ معروف کے تحت تھا اور اُس عبوری دور کے لیے تھا، جب کہ اسلامی معاشرہ ابھی اُس استحکام کو نہیں پہنچا تھا کہ تقسیم وراثت کا وہ آخری حکم دیا جائے جو سورۂ نساء میں نازل ہوا۔ اِس حکم کے نزول کے لیے حالات کے سازگار ہونے سے پہلے یہ عارضی حکم نازل ہوا اور اِس سے دو فائدے پیش نظر تھے: ایک تو فوری

اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ؕ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنۡ خَافَ مِنۡ مُّوۡصٍ جَنَفًا
اَوۡ اِثۡمًا فَاَصۡلَحَ بَيۡنَهُمۡ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۸۲﴾

ہی پر ہوگا۔ (اُنھیں یاد رکھنا چاہیے کہ) یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ جس کو، البتہ کسی وصیت کرنے والے کی طرف سے جانب داری یا حق تلفی[۴۷۴] کا اندیشہ[۴۷۵] ہو اور وہ اُن کے درمیان صلح کرا دے[۴۷۶] تو اُس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ بے شک، اللہ بخشنے والا ہے،

طور پر اُن حصہ داروں کے حقوق کا ایک حد تک تحفظ جن کے حقوق عصبات کے ہاتھوں تلف ہو رہے تھے، اور دوسرے اُس معروف کو از سر نو تازہ کرنا جو شرفاے عرب میں زمانۂ قدیم سے معتبر تھا، لیکن اب وہ آہستہ آہستہ جاہلیت کے گرد و غبار کے نیچے دب چلا تھا تاکہ یہ معروف اُس قانون کے لیے ذہنوں کو ہموار کر سکے جو اِس باب میں نازل ہونے والا تھا۔'' (تدبر قرآن ۱/۴۳۹)

[۴۷۳] اصل الفاظ ہیں: 'حَقًّا عَلَى الۡمُتَّقِيۡنَ'۔ اِن میں 'حَقًّا' مصدر موکد ہے، یعنی 'حق ذلك حقًّا'۔

[۴۷۴] اصل میں 'جَنَفًا اَوۡ اِثۡمًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'جَنَف' کے معنی مائل ہونے کے ہیں، لیکن یہ زیادہ تر نیکی اور حق سے ہٹ کر برائی اور ظلم کی طرف مائل ہونے کے لیے آتا ہے۔ آیت میں یہ ٹھیک اُس مفہوم میں آیا ہے جس مفہوم میں ہم جانب داری کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اِس کے مقابل میں 'اِثۡم' ہے جو اداے حقوق میں پیچھے رہ جانے کے لیے آتا ہے۔ اِس کا مفہوم، ظاہر ہے کہ یہاں حق تلفی کا ہوگا۔

[۴۷۵] اصل میں لفظ 'خَوۡف' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی اِس آیت میں اندیشہ کرنے کے ہیں۔ عربی زبان میں یہ اصلاً گمان کرنے، خیال کرنے، توقع کرنے اور اندیشہ کرنے کے مفہوم ہی میں آتا ہے۔ استاذ امام نے کلام عرب سے بھی اِس کی دلیل اپنی تفسیر میں پیش کر دی ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ﴿۱۸۳﴾ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ
فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ

اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۱۸۰-۱۸۲

(یہ اللہ کے حدود ہیں اور اِن کی پابندی وہی کر سکتے ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہوں، اِس لیے) ایمان والو، تم پر روزہ[۴۷۷] فرض کیا گیا ہے، جس طرح تم سے پہلوں پر فرض کیا گیا تھا[۴۷۸] تاکہ تم اللہ سے ڈرنے والے بن جاؤ[۴۷۹]۔ یہ گنتی کے چند دن

---

۴۷۶ اصل الفاظ ہیں: 'فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ'۔ اِن کا واضح مفہوم صلح کرا دینے کا ہے، بطور خود کوئی اصلاح کر دینے کا نہیں ہے۔ لہٰذا اِس ہدایت کا مقصد یہی تھا کہ اگر کوئی جانب داری یا حق تلفی ہوئی ہے تو وصیت میں مناسب تبدیلی کے لیے وارثوں میں مفاہمت کرا دی جائے۔

۴۷۷ اصل میں لفظ 'الصِّيَامُ' آیا ہے۔ اللہ کی خوشنودی کے لیے کھانے پینے اور زن وشو کے تعلق سے رک جانے کے معنی میں یہ ایک دینی اصطلاح کے طور پر عربی زبان میں ہمیشہ سے اُسی طرح معروف رہا ہے، جس طرح روزے کا لفظ ہماری اردو زبان میں اِس معنی کے لیے معروف ہے۔

۴۷۸ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارے تعلق کا ظہور بالعموم تین ہی صورتوں میں ہوتا ہے: پرستش، اطاعت اور حمیت وحمایت۔ روزہ اِن میں سے اطاعت کا علامتی اظہار ہے۔ اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی نازل کردہ شریعتوں میں یہ تربیت نفس کی خاص عبادت رہا ہے۔

۴۷۹ حدود الٰہی کی پابندی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے اندر جذبات اور خواہشات پر قابو پانے کی صلاحیت پیدا کرے اور یہ صلاحیت، اگر غور کیجیے تو فی الواقع اللہ کے ڈر ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ
خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾
شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ

ہیں۔[۴۸۰] اِس پر بھی جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کر لے۔ اور جو اِس کی طاقت رکھتے ہوں[۴۸۱] کہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں تو اُن پر ہر روزے کا بدلہ ایک مسکین کا کھانا ہے۔[۴۸۲] پھر جو شوق سے کوئی نیکی کرے تو یہ اُس کے لیے بہتر ہے[۴۸۳] اور روزہ رکھ لو تو یہ تمھارے لیے اور بھی اچھا ہے،[۴۸۴] اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ ۱۸۳-۱۸۴

---

[۴۸۰] یہ الفاظ تالیف قلب کے طور پر آئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تربیت نفس کے لیے تیس یا انتیس دنوں کا یہ نصاب حقیقت میں چند روزہ ہی ہے، لہٰذا اِس سے گھبرانا نہیں چاہیے۔

[۴۸۱] اصل الفاظ ہیں: 'وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ'۔ اِن میں ضمیر کا مرجع اگرچہ موخر ہے، لیکن غور کیجیے تو متکلم کی نیت میں وہ بالکل اُسی طرح مقدم ہے، جس طرح، مثال کے طور پر، ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں: تم اِس کی ہمت رکھتے ہو تو سفر کے لیے نکل جاؤ۔

[۴۸۲] قضا روزوں کے بدلے میں مسکین کو کھانا کھلانے کی یہ اجازت، جیسا کہ آگے کی آیت سے واضح ہوگا، بعد میں منسوخ کر دی گئی اور اِس کی جگہ روزہ رکھنا ہی ضروری قرار دیا گیا۔

[۴۸۳] مطلب یہ ہے کہ روزے کا یہ فدیہ کم سے کم مطالبہ ہے جو استطاعت رکھنے والوں کو ہر حال میں پورا کرنا چاہیے، لیکن اگر کوئی شخص ایک سے زیادہ مسکینوں کو کھانا کھلا دے یا اُن کے ساتھ کوئی اور نیکی کر دے تو یہ اُس کے لیے بہتر ہے۔

[۴۸۴] یعنی یہ فدیہ ایک رعایت ہے۔ اللہ کے نزدیک زیادہ بہتر یہی ہے کہ آدمی فدیے کے بجائے دوسرے دنوں میں روزے ہی پورے کر دے۔

وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ
فَلْيَصُمْهُ ؕ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ
يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ز وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ

رمضان[۴۸۵] کا مہینا ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، لوگوں کے لیے سراسر ہدایت بنا کر اور نہایت واضح دلیلوں[۴۸۶] کی صورت میں جو (اپنی نوعیت کے لحاظ سے) رہنمائی بھی ہیں اور حق و باطل کا فیصلہ بھی۔ سو تم میں سے جو شخص اِس مہینے میں موجود ہو، اُسے چاہیے کہ اِس کے روزے رکھے۔[۴۸۷] اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو[۴۸۸] تو وہ دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کر لے۔[۴۸۹] (یہ رُخصت[۴۹۰] اِس لیے دی گئی ہے کہ) اللہ تمھارے لیے

---

۴۸۵ آگے قضا شدہ روزوں کے لیے فدیے کی جو اجازت ختم کی گئی ہے، اُس سے واضح ہے کہ یہ آیت اوپر والی آیت کے کچھ عرصہ بعد نازل ہوئی ہے۔

۴۸۶ اصل میں لفظ 'بَیِّنٰت' استعمال ہوا ہے۔ اِس سے مراد نہایت واضح، دل نشیں اور ہر الجھن کو دور کر دینے والے دلائل و براہین ہیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ قرآن اِن بینات کا ایسا خزانہ ہے جو رہتی دنیا تک عقل انسانی کی رہنمائی کے لیے کافی ہے۔

۴۸۷ اصل الفاظ ہیں: 'فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ'۔ تالیف کلام کے لحاظ سے یہ اوپر کے مبتدا کی خبر ہے اور 'فَلْيَصُمْهُ' کے معنی اِس میں یہ ہیں کہ اِس پورے مہینے کے روزے رکھے جائیں، اِس میں کوئی کمی بیشی نہ کی جائے۔

۴۸۸ یعنی اِس طرح کی حالت ہو کہ آدمی کے لیے روزہ رکھنا غیر معمولی تکلیف کا باعث بن جائے۔ چنانچہ یہی حکم حاملہ، مرضعہ اور پیر فانی کا بھی ہوگا۔

۴۸۹ یہاں اللہ تعالیٰ نے اوپر والی آیت کے الفاظ 'وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ' سے 'اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ' تک حذف فرما دیے ہیں۔ اِس کے صاف معنی یہ ہیں کہ قضا شدہ روزوں کے

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

آسانی چاہتا ہے اور نہیں چاہتا کہ تمھارے ساتھ سختی کرے۔ اور (فدیے کی اجازت) اِس لیے (ختم کر دی گئی ہے) کہ تم روزوں کی تعداد پوری کرو، (اور جو خیر و برکت اُس میں چھپی ہوئی ہے، اُس سے محروم نہ رہو)۔ اور (اِس مقصد کے لیے رمضان کا مہینا) اِس لیے (خاص کیا گیا ہے) کہ (قرآن کی صورت میں) اللہ نے جو ہدایت تمھیں بخشی ہے، اُس پر اُس کی بڑائی کرو اور اِس لیے کہ تم اُس کے شکر گزار بنو[۴۹۱]۔ ۱۸۵

لیے فدیے کی جو اجازت اِس سے پہلے دی گئی تھی، وہ ختم ہو گئی ہے۔ اِس کی وجہ اللہ تعالیٰ نے آگے خود بیان کر دی ہے۔ لیکن اِس سے پہلے یہ اجازت کیوں دی گئی؟ اِس سوال کا جواب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ رمضان کے بعد عام دنوں میں روزہ رکھنا چونکہ مشکل ہوتا ہے، اِس لیے، جب تک طبائع اِس کے لیے پوری طرح تیار نہیں ہو گئیں، اللہ تعالیٰ نے اِسے لازم نہیں فرمایا۔

۴۹۰ اِس سے پہلے، اگر غور کیجیے تو تین باتیں بیان ہوئی ہیں: ایک یہ کہ روزوں کے لیے رمضان کا مہینا خاص کیا گیا۔ دوسری یہ کہ فدیہ کی اجازت منسوخ کر دی گئی۔ تیسری یہ کہ سفر اور مرض کی حالت میں روزے دوسرے دنوں پر ملتوی کیے جا سکتے ہیں۔ یہاں اِن تینوں کی حکمت اللہ تعالیٰ نے ترتیب صعودی کے ساتھ، یعنی نیچے سے شروع کر کے اوپر کی طرف چڑھتے ہوئے بیان فرما دی ہے۔

۴۹۱ مطلب یہ ہے کہ جس مہینے میں دنیا کو قرآن جیسی نعمت ملی، وہ سزاوار تھا کہ خدا کی تکبیر اور شکر گزاری کا خاص مہینا قرار دیا جائے۔ روزہ یہی تکبیر اور شکر گزاری ہے۔ اِس میں انسان جب اپنی جائز خواہشوں سے بھی محض اپنے پروردگار کی خوشنودی اور رضا کی طلب میں دست بردار ہو جاتا ہے تو گویا اپنے قول و فعل، ظاہر و باطن اور اپنے روز و شب، ہر چیز سے اِس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے حکم سے بڑی اُس کے نزدیک کوئی چیز بھی نہیں ہے۔ اللہ کی عظمت،

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیۡ عَنِّیۡ فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ ؕ اُجِیۡبُ دَعۡوَةَ
الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ وَلۡیُؤۡمِنُوۡا بِیۡ لَعَلَّهُمۡ یَرۡشُدُوۡنَ ﴿۱۸۶﴾
اُحِلَّ لَكُمۡ لَیۡلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِكُمۡ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ

اور میرے (کسی حکم کے) بارے میں، (اے پیغمبر)، جب میرے بندے تم سے کوئی سوال کریں تو (اُن سے کہہ دو کہ اِس وقت) میں اُن سے قریب ہی ہوں[۴۹۲]۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اُس کی پکار کا جواب دیتا ہوں[۴۹۳]۔ لہٰذا اُن کو چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں[۴۹۴] تاکہ وہ صحیح راہ پر رہیں۔ ۱۸۶

جلالت اور اُس کی بزرگی و کبریائی کے احساس و اعتراف کی یہی حالت، اگر غور کیجیے تو اُس کی شکرگزاری کا حقیقی اظہار بھی ہے۔

۴۹۲؎ یعنی اِس وقت جب کہ قرآن نازل ہو رہا ہے، تم اُن کے درمیان موجود ہو اور تمھاری وساطت سے وہ جب چاہیں، مجھ سے ہدایت حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ اُن سوالات کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے جو شریعت کی شرح و تبیین کے لیے ضروری تھے۔ اِس سے مراد وہ غیر ضروری سوالات نہیں ہیں جن سے قرآن میں دوسری جگہ لوگوں کو منع کیا گیا ہے۔

۴۹۳؎ یہ اگرچہ عام حالات میں بھی ایک حقیقت ہے، لیکن یہاں اِس سے مراد، خاص کر وہ جواب ہے جو زمانۂ نزول قرآن میں لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے فوراً مل جاتا تھا۔ اِس طرح کے متعدد سوالوں کے جوابات اِس سے آگے اِسی سورہ میں بیان ہوئے ہیں۔

۴۹۴؎ یعنی میں جب اُن کے قریب بھی ہوں اور اُن کی ذہنی الجھنوں کو دور کرنے کے لیے اُن کے سوالوں کا جواب بھی دے رہا ہوں تو میرے ساتھ اُن کو کوئی منافقانہ رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے اور نہ میرے کسی حکم کو شبہات و اعتراضات کا ہدف بنانا چاہیے، بلکہ پورے ایمان و یقین کے ساتھ اُس کی پیروی کرنی چاہیے۔

لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ
اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ

(تم پوچھنا چاہتے ہو تو لو ہم بتائے دیتے ہیں کہ)[۴۹۵] روزوں کی رات میں اپنی بیویوں کے پاس جانا[۴۹۶] تمھارے لیے جائز کیا گیا ہے[۴۹۷]۔ وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم اُن کے لیے لباس ہو[۴۹۸]۔ اللہ نے دیکھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے[۴۹۹]

۴۹۵؎ یہ تبیین کی آیت ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اوپر کی تمہید لوگوں کی اِسی اُلجھن کے پیش نظر اٹھائی گئی تھی جسے اِس آیت میں دور کیا گیا ہے۔ آگے کی آیات سے واضح ہو گا کہ اِس سے حوصلہ پا کر اُنھوں نے پے در پے سوالات کیے اور قرآن نے بار بار سلسلۂ بیان کو روک کر اُن سوالوں کا جواب دیا ہے۔

۴۹۶؎ اصل میں لفظ 'الرَّفَث' آیا ہے۔ اِس کے معنی شہوانی باتوں کے ہیں، لیکن اِس کے ساتھ 'اِلٰی' کے صلے نے اِس کے اندر بیویوں سے اختلاط کا مضمون پیدا کر دیا ہے۔

۴۹۷؎ یعنی یہ اگرچہ پہلے ہی جائز تھا، لیکن تمھارے تردد کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ روزوں کی رات میں تم بیویوں کے پاس جا سکتے ہو۔

۴۹۸؎ مطلب یہ ہے کہ تم دونوں میں ایسا چولی دامن کا رشتہ ہے اور باہم دگر تم فطرت کے ایسے بندھن میں بندھے ہوئے ہو کہ ناگزیر ضرورت کے سوا تمھیں کسی حالت میں بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں رکھا جا سکتا۔ میاں بیوی کے تعلق کو بیان کرنے کے لیے لباس کا یہ استعارہ، اگر غور کیجیے تو نہایت بلیغ استعارہ ہے۔ لباس کے تین پہلو ہیں: پردہ پوشی، حفاظت اور زینت۔ مرد و عورت ان تینوں ہی پہلوؤں سے ایک دوسرے کے لیے لباس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے جنسی جذبات اور داعیات کے لیے باہم دگر پردہ بھی فراہم کرتے ہیں، شیطان کے حملوں سے ایک دوسرے کی حفاظت کا ذریعہ بھی بنتے ہیں اور باہمی ربط و تعلق سے زندگی کو وہ تمام رونقیں اور

وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۖ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ
لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ

تو اُس نے تم پر عنایت فرمائی اور تم سے درگذر کیا[۵۰۰]۔ چنانچہ اب (بغیر کسی تردد کے) اپنی بیویوں کے پاس جاؤ اور (اِس کا) جو (نتیجہ) اللہ نے تمھارے لیے لکھ رکھا ہے، اُسے چاہو[۵۰۱]، اور کھاؤ پیو، یہاں تک کہ رات کی سیاہ دھاری سے فجر کی سفید دھاری

بہاریں بھی عطا کر دیتے ہیں جن سے دنیا میں تہذیب وتمدن کا حسن نمایاں ہوتا ہے۔

۴۹۹ یعنی اپنے خیال کے مطابق یہ سمجھتے ہوئے کہ رمضان کی راتوں میں بیویوں کے پاس جانا جائز نہیں ہے، اُس کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ اِس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہود کے ہاں روزہ افطار کے بعد معاً پھر شروع ہو جاتا تھا اور وہ روزے کی رات میں کھانے پینے اور بیویوں کے پاس جانے کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ مسلمانوں نے اِس سے گمان کیا کہ اُن کے لیے بھی یہی قانون ہوگا، لیکن پھر اُن میں سے بعض لوگ یہ گمان اپنے دلوں میں رکھتے ہوئے اِس کی خلاف ورزی کر بیٹھے۔ قرآن نے اِسے اپنے ضمیر کے ساتھ خیانت سے تعبیر کیا ہے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے۔ آدمی اگر اپنے اجتہاد یا گمان کے مطابق کسی چیز کو دین وشریعت کا تقاضا سمجھتا ہے تو اِس سے قطع نظر کہ وہ فی الواقع شریعت کا حکم ہے یا نہیں، اُس کی خلاف ورزی اُس کے لیے جائز نہیں ہے۔ اِسے ضمیر کے ساتھ خیانت ہی سے تعبیر کیا جائے گا۔

۵۰۰ یعنی اِس خیانت پر گرفت ہو سکتی تھی، لیکن یہ اللہ کا کرم ہے کہ اُس نے تمھیں معاف فرما دیا۔

۵۰۱ اِس طرح کے معاملات میں لوگ چونکہ ہر لحاظ سے واضح ہونا چاہتے ہیں، اِس لیے نہایت بلیغ اسلوب میں بتا دیا کہ اگر چاہو تو اِس تعلق سے اولاد بھی پیدا کرو۔ نتیجہ اور عمل، دونوں کے لحاظ سے اب اِس معاملے میں تمھیں کوئی تردد نہیں ہونا چاہیے۔

اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ
فِي الْمَسٰجِدِ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ
اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝١٨٧

تمھارے لیے بالکل نمایاں ہو جائے۔[۵۰۲] پھر رات تک اپنا روزہ پورا کرو۔ اور ہاں، تم مسجدوں میں اعتکاف[۵۰۳] بیٹھے ہو تو رات کو بھی بیویوں کے پاس نہ جانا۔[۵۰۴] یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں، سو اِن کے قریب نہ جاؤ۔[۵۰۵] اللہ اِسی طرح اپنی آیتیں لوگوں

---

۵۰۲ اِس سے معلوم ہوا کہ کھانے پینے اور بیویوں کے پاس جانے کی یہ اجازت صبح صادق کے اچھی طرح نمایاں ہو جانے تک ہے، اِس وجہ سے معمولی تقدیم و تاخیر پر اپنے یا دوسروں کے روزے مشتبہ قرار دے بیٹھنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

۵۰۳ یہ ایک دینی اصطلاح ہے جس سے مراد ہر چیز سے الگ ہو کر کسی معبد میں یادِ الٰہی کے لیے گوشہ نشین ہو جانا ہے۔ اِس کی حیثیت ایک سنت ثابتہ کی ہے جو انبیا علیہم السلام کے دین میں ہمیشہ جاری رہی ہے۔ قرآن کے مخاطبین اِس سے پوری طرح واقف تھے، لہٰذا اِس بات کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اِس کی تفصیل کی جائے۔ قرآن کے الفاظ سے اتنی بات، البتہ واضح ہے کہ روزوں کے مہینے سے اِس عبادت کو خاص مناسبت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور آپ کے ارشادات سے بھی اِسی کی تائید ہوتی ہے۔

۵۰۴ اِس عبادت سے مقصود چونکہ ’تبتل الی اللّٰہ‘ ہے اور اِس میں آدمی کو پورے دل سے اپنے پروردگار ہی کی طرف متوجہ ہونا چاہیے، پھر یہ بھی ضروری ہے کہ انسانی حاجات کے لیے باہر نکلنے کے سوا وہ مسجد ہی میں قیام کرے، اِس وجہ سے اِس کے دوران میں بیویوں سے ملاقات کی اجازت نہیں دی گئی۔

۵۰۵ یعنی حدودِ الٰہی کی خلاف ورزی سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے کے لیے اِن سے ذرا

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۸۸)

کے لیے واضح کرتا ہے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں[۵۰۶]۔ ۱۸۷

اور (اِسی تقویٰ کا تقاضا ہے کہ) تم آپس میں ناحق[۵۰۷] ایک دوسرے کے مال نہ کھاؤ اور اُسے حاکموں تک پہنچنے[۵۰۸] کا ذریعہ نہ بناؤ، اِس لیے کہ اِس طرح لوگوں کے مال کا کوئی حصہ تمھیں اُن کی حق تلفی کر کے کھانے کا موقع مل جائے[۵۰۹]، دراں حالیکہ تم (اِس حق تلفی کو) دور ہی دور رہنا چاہیے تاکہ بھولے سے بھی قدم کہیں معصیت کی حد میں نہ جا پڑے۔

---

[۵۰۶] یہ الفاظ قرآن میں بالعموم اُن آیات کے بعد آتے ہیں جو کسی حکم کی وضاحت کے لیے نازل ہوئی ہیں۔ قرآن سے متعلق یہ اللہ تعالیٰ کے اُس وعدے کی تکمیل ہے جس کا ذکر سورۂ قیامہ میں ہوا ہے کہ 'ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ' (پھر ہمارے ہی ذمے ہے کہ ہم اُس کی وضاحت کر دیں)۔ اِس طرح کی وضاحت سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ حکم میں کوئی تردد باقی نہ رہے اور بندۂ مومن کا قدم تقویٰ میں مزید راسخ ہو جائے۔

[۵۰۷] اصل میں 'بِالْبَاطِلِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِس سے مراد وہ طریقہ ہے جو سچائی، دیانت، عدل و انصاف اور معروف کے خلاف ہو۔ اسلام میں معاشی معاملات سے متعلق تمام حرمتوں کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہی حکم ہے۔ چوری، غصب، غلط بیانی، تعاون علی الاثم، غبن، خیانت اور لقطہ کی مناسب تشہیر سے گریز کے ذریعے سے دوسروں کا مال لے لینا، یہ سب اِسی کے تحت داخل ہیں۔

[۵۰۸] اصل الفاظ ہیں: 'وَ تُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ'۔ اِن میں 'اِدْلَاء' کے معنی اصلاً کنوئیں میں ڈول ڈالنے کے ہیں۔ یہیں سے اِس کے اندر رسائی حاصل کرنے کا مفہوم پیدا ہوا۔ یہ رشوت کی تعبیر ہے، اور غور کیجیے تو قرآن نے اِس کے ذریعے سے رشوت کی حقیقت بالکل واضح کر دی ہے۔

[۵۰۹] اِس جملے کا عطف پہلے جملے پر ہے اور چونکہ یہ اُسی کی وضاحت کر رہا ہے، اِس لیے اِس

يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡاَهِلَّةِ ؕ قُلۡ هِىَ مَوَاقِيۡتُ لِلنَّاسِ وَالۡحَجِّ ؕ وَلَيۡسَ الۡبِرُّ بِاَنۡ تَاۡتُوا الۡبُيُوۡتَ مِنۡ ظُهُوۡرِهَا وَلٰكِنَّ

جانتے ہو[۵۱۰]۔ ۱۸۸

وہ تم سے حرام مہینوں کے بارے میں پوچھتے ہیں[۵۱۱]۔ کہہ دو: یہ لوگوں کی بہبود اور حج کے اوقات ہیں، (اِس لیے اِن کی یہ حرمت اِسی طرح قائم رکھی جائے گی)[۵۱۲]۔ اور

میں حرف ’لا‘ کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہوئی۔

۵۱۰؎ یعنی اِس کا گناہ اور حق تلفی ہونا تمھیں معلوم ہے، تمھاری عقل اور تمھاری فطرت اِس کی گواہی دیتی ہے، دنیا کا معروف اِس پر حجت ہے اور تمام مذاہب وادیان میں اِس کی حرمت ہمیشہ مانی گئی ہے۔ اِس وجہ سے یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے جسے سب جانتے ہیں، تم میں سے کوئی بھی اِس سے ناواقف نہیں ہے۔

۵۱۱؎ اصل الفاظ ہیں: ’وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ‘۔ اِن میں ’اَهِلَّة‘ ہلال کی جمع ہے۔ ہلال شروع ماہ کے چاند کو بھی کہتے ہیں اور اِس سے مراد مہینا بھی ہوتا ہے۔ جمع کی صورت میں خاص کر، اِس کا استعمال مہینوں ہی کے لیے معروف ہے۔ اِس پر الف لام ہے اور یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ سوال کچھ مخصوص مہینوں کے بارے میں ہے اور جواب سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ حرام مہینوں اور اُن کے آداب سے متعلق تھا۔ قرآن کا عام اسلوب ہے کہ اُس میں سوالات اِسی طرح بالاجمال نقل کیے جاتے ہیں اور اُن کی صحیح نوعیت بالعموم اُن کے جواب سے معلوم ہوتی ہے۔ یہاں اِس سوال کے پیدا ہونے کی وجہ، جیسا کہ آگے کی آیات سے واضح ہوگا، یہ ہوئی کہ بیت اللہ کے قبلہ قرار پا جانے کے بعد لوگ حج کے لیے بے تاب ہوئے اور حج کے راستے میں اُس وقت قریش حائل تھے۔ لوگوں کو خیال ہوا کہ قریش نے مزاحمت کی تو جنگ ہو سکتی ہے اور اُس میں حرام مہینوں کی حرمت حائل ہوگی۔ پھر کیا یہ حرمت قائم رکھی جائے گی یا وہ اِس مزاحمت کو ختم کرنے کے لیے

الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ۚ وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

(تم نے یہ سوال کیا ہے[۵۱۳] تو اب یہ بھی جان لو کہ) یہ ہرگز کوئی نیکی نہیں ہے کہ (احرام کی حالت میں اور حج سے واپسی پر) تم گھروں کے پیچھے سے داخل ہوتے ہو[۵۱۴]، بلکہ نیکی تو اصل میں اُس کی ہے جو تقویٰ اختیار کرے[۵۱۵]۔ اِس لیے اب گھروں میں اُن

قریش کے خلاف تلوار اٹھا سکتے ہیں؟

۵۱۲ مطلب یہ ہے کہ عرب کی بدامنی کے ماحول میں حج کے قافلوں کا نکلنا بھی اِسی حرمت کی وجہ سے ممکن ہوتا ہے اور لوگوں کو تجارتی سرگرمیوں کی مہلت بھی اِسی سے ملتی ہے، لہٰذا یہ حرمت اِسی طرح باقی رہنی چاہیے۔

۵۱۳ یہ سوال سلسلۂ بیان کو روک کر پوچھا گیا تھا۔ قرآن نے اِس کا جواب دیا تو اِسی سے ملا کر جہاد و انفاق اور حج و عمرہ کے وہ احکام بیان کرنا شروع کر دیے جن کا بیان کرنا یہاں اصلاً پیش نظر تھا۔ اِن میں سے جہاد و انفاق کا حکم تو ابتداءً آیا ہے، لیکن حج و عمرہ کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ اِن کی حیثیت پہلے سے جاری ایک سنت کی تھی۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اِن میں کچھ بدعتیں داخل کر دی گئی تھیں اور اِن کی حقیقت بھی لوگوں کے لیے بہت حد تک اجنبی ہو چکی تھی، لیکن اِن کے مناسک اِس کے باوجود لوگوں کے لیے بالکل معلوم اور متعین تھے۔ قرآن نے اِسی بنا پر اِن کی کوئی تفصیل نہیں کی۔ اُس کا بیان اِن سے متعلق بعض ضروری اصلاحات اور بعض فقہی مسائل کی توضیح تک محدود ہے۔

۵۱۴ یہ ایک بدعت تھی جو حج کے سلسلے میں لوگوں نے ایجاد کر لی تھی۔ اِس عجیب و غریب حرکت کا محرک غالباً یہ وہم تھا کہ جن دروازوں سے گناہوں کا بوجھ لادے ہوئے نکلے ہیں، پاک ہو جانے کے بعد اُنھی دروازوں سے گھروں میں داخل ہونا اب خلاف تقویٰ ہے۔

۵۱۵ اِس مفہوم کے لیے اصل میں 'وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ایک مضاف عربیت کے اسلوب پر حذف ہو گیا ہے، یعنی 'بر من اتقی'۔

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾
وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ
اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ
وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ

کے دروازوں ہی سے آؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تمھیں فلاح نصیب ہو جائے۔ ۱۸۹

اور اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو[۵۱۶] جو (حج کی راہ روکنے کے لیے) تم سے لڑیں اور (اِس میں) کوئی زیادتی نہ کرو[۵۱۷]۔ بے شک، اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور اِن لڑنے والوں کو جہاں پاؤ، قتل کرو اور اِنھیں وہاں سے نکالو،

---

[۵۱۶] مطلب یہ ہے کہ جس قتال کا حکم یہاں دیا جا رہا ہے، وہ نہ خواہش نفس کے لیے ہے، نہ مال و دولت کے لیے، نہ ملک کی تسخیر اور زمین کی حکومت کے لیے، نہ شہرت و نام وری کے لیے اور نہ حمیت و حمایت اور عصبیت یا عداوت کے کسی جذبے کی تسکین کے لیے، بلکہ محض اللہ کے لیے ہے۔ انسان کی خود غرضی اور نفسانیت کا اِس جنگ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ اللہ کی جنگ ہے جو اُس کے بندے اُس کے حکم پر اور اُس کی ہدایت کے مطابق اُس کی راہ میں لڑتے ہیں۔ اُن کی حیثیت اِس جنگ میں محض آلات و جوارح کی ہے۔ اِس میں اُن کو اپنا کوئی مقصد نہیں، بلکہ خدا کے مقاصد پورے کرنے ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنی اِس حیثیت سے سر مو انحراف نہیں کر سکتے۔

[۵۱۷] یعنی اللہ کی راہ میں یہ قتال اخلاقی حدود سے بے پروا ہو کر نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاقیات ہر حال میں اور ہر چیز پر مقدم ہیں اور جنگ و جدال کے موقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے اِن سے انحراف کی اجازت کسی شخص کو نہیں دی۔

وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ
فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ

جہاں سے اِنھوں نے تمھیں نکالا ہے[۵۱۸] اور (یاد رکھو کہ) فتنہ قتل سے زیادہ بری چیز ہے[۵۱۹]۔ اور مسجد حرام کے پاس تم اِن سے (خود پہل کر کے) جنگ نہ کرو، جب تک یہ تم سے اُس میں جنگ نہ کریں[۵۲۰]۔ پھر اگر یہ جنگ چھیڑ دیں تو اِنھیں (بغیر کسی تردد کے)

---

[۵۱۸] یعنی تمھیں نکالنا ہی کچھ کم جرم نہ تھا، لیکن اللہ نے اِنھیں مہلت دی، اب اگر یہ حج کی راہ بھی روکتے ہیں تو اِنھیں ام القریٰ مکہ سے اُسی طرح نکال دو، جس طرح اِنھوں نے تمھیں وہاں سے نکالا ہے۔ پھر جہاں پاؤ، قتل کر دو، اِس لیے کہ پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اب یہ کسی رعایت کے مستحق نہیں رہے۔

[۵۱۹] اِن آیات میں قتال کا جو حکم دیا گیا ہے، یہ اُس کی دلیل بیان ہوئی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ہر چند حرم کے پاس اور حرام مہینوں میں قتال ایک بڑی ہی سنگین بات ہے، لیکن فتنہ اِس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ فتنہ کا لفظ یہاں کسی کو ظلم و جبر کے ساتھ اُس کے مذہب سے برگشتہ کرنے یا مذہب پر عمل سے روکنے کی کوشش کے لیے آیا ہے۔ یہی چیز ہے جسے انگریزی زبان میں 'Persecution' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن نے اِسے جگہ جگہ اِس معنی میں استعمال کیا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ یہ فی الواقع قتل سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا آزمایش کے لیے بنائی ہے اور اِس میں انسانوں کو حق دیا ہے کہ وہ اپنے آزادانہ فیصلے سے جو دین اور جو نقطۂ نظر چاہیں، اختیار کریں۔ لہٰذا کوئی شخص یا گروہ اگر دوسروں کو بالجبر اُن کا دین چھوڑنے پر مجبور کرتا ہے تو یہ درحقیقت اِس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی پوری اسکیم کے خلاف اعلان جنگ ہے۔

[۵۲۰] مطلب یہ ہے کہ کسی حرمت کے پامال کرنے میں پہل تمھاری طرف سے نہیں ہونی چاہیے۔ چنانچہ مسجد حرام کے پاس اور حرام مہینوں میں قتال اگر ہو سکتا ہے تو صرف اُسی صورت

انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا

قتل کرو۔ اِس طرح کے منکروں کی یہی سزا ہے۔[۵۲۱] لیکن اگر وہ باز آ جائیں تو اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔[۵۲۲] اور تم یہ جنگ اُن سے برابر کیے جاؤ، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اِس سرزمین میں اللہ ہی کا ہو جائے۔[۵۲۳] تاہم وہ باز آ

میں ہو سکتا ہے جب اِس کی ابتدا اُن کی طرف سے ہو جائے۔ تم اِس معاملے میں اپنی طرف سے ابتدا ہرگز نہیں کر سکتے۔

[۵۲۱] یعنی جو رسول کی طرف سے اتمام حجت کے باوجود اُسے نہ مانیں، بلکہ اُسے اور اُس کے ساتھیوں کو اُن کے گھروں سے نکلنے پر مجبور کر دیں اور حج جیسی عبادت کے لیے بھی وہ اگر واپس آنا چاہیں تو حرام مہینوں میں تلوار اٹھائیں اور اُن کی راہ میں مزاحم ہو کر کھڑے ہو جائیں، اُن کی سزا ایسی ہی سخت ہونی چاہیے۔

[۵۲۲] باز آ جانے سے مراد محض جنگ سے رک جانا نہیں ہے، بلکہ اپنے اُس کفر اور سرکشی سے باز آ جانا ہے جس کی سزا اوپر بیان ہوئی ہے۔ اِس کے بغیر، ظاہر ہے کہ وہ اللہ کی رحمت اور اُس کی مغفرت کے مستحق نہیں ہو سکتے تھے۔

[۵۲۳] اِس کے معنی یہ ہیں کہ جس قتال کا حکم یہاں دیا گیا ہے، اُس کی غایت صرف یہ نہیں ہے کہ حج کی راہ میں قریش کی مزاحمت ختم کر دی جائے، بلکہ اِس سے آگے بڑھ کر یہ بھی ہے کہ فتنہ باقی نہ رہے اور سرزمین عرب میں دین صرف اللہ ہی کا ہو جائے۔ قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو جنگ کا حکم اِنھی دو مقاصد کے لیے دیا گیا ہے۔ پہلے مقصد کے لیے فتنہ کا جو لفظ اصل میں آیا ہے، اُس کے معنی ہم نے اوپر بیان کر دیے ہیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ دوسروں کو بالجبر اُن کے مذہب سے برگشتہ کرنے یا اُس پر عمل کی راہ روکنے کی روایت اب بڑی حد

تک دنیا سے ختم ہو گئی ہے، لیکن انسان جب تک انسان ہے، نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کب اور کس صورت میں پھر زندہ ہو جائے۔ اِس لیے قرآن کا یہ حکم قیامت تک باقی ہے۔ اللہ کی زمین پر اِس طرح کا کوئی فتنہ جب سر اٹھائے، مسلمانوں کی حکومت اگر اتنی قوت رکھتی ہو کہ وہ اُس کا استیصال کر سکے تو اُس پر لازم ہے کہ مظلوموں کی مدد کے لیے اٹھے اور اللہ کی اِس راہ میں جنگ کا اعلان کر دے۔ مسلمانوں کے لیے قرآن کی یہ ہدایت ابدی ہے، اِسے دنیا کا کوئی قانون ختم نہیں کر سکتا۔ رہا دوسرا مقصد تو وہ دو ہی صورتوں میں حاصل ہو سکتا تھا: ایک یہ کہ سرزمین عرب میں دین حق کے سوا تمام ادیان کے ماننے والے قتل کر دیے جائیں۔ دوسرے یہ کہ اُنھیں ہر لحاظ سے زیردست بنا کر رکھا جائے۔ چنانچہ صلح و جنگ کے بہت سے مراحل سے گزر کر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین پوری طرح مغلوب ہو گئے تو بالآخر یہ دونوں ہی طریقے اختیار کیے گئے۔ مشرکین عرب اگر ایمان نہ لائیں تو اُنھیں ختم کر دینے کا حکم دیا گیا اور یہود و نصاریٰ کے بارے میں ہدایت کی گئی کہ اُن سے جزیہ لے کر اور اُنھیں پوری طرح محکوم اور زیردست بنا کر ہی اِس سرزمین پر رہنے کی اجازت دی جائے۔ اِن میں سے، البتہ جو معاندین تھے، اُنھیں جب ممکن ہوا قتل یا جلاوطن کر دیا گیا۔

اِس دوسرے مقصد کے لیے قتال اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس کا تعلق شریعت سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت سے ہے جو اِس دنیا میں ہمیشہ اُس کے براہ راست حکم اور اُنھی ہستیوں کے ذریعے سے روبہ عمل ہوتا ہے جنھیں وہ رسالت کے منصب پر فائز کرتا ہے۔ انسانی تاریخ میں یہ منصب آخری مرتبہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا ہے۔ اِس قانون کی رو سے اللہ کی حجت جب اِن رسولوں کے ذریعے سے کسی قوم پر پوری ہو جاتی ہے تو اِن کے منکرین پر اِسی دنیا میں عذاب آ جاتا ہے۔ یہ عذاب آسمان سے بھی آتا ہے اور بعض حالات میں اہل حق کی تلواروں کے ذریعے سے بھی۔ پھر اِس کے نتیجے میں منکرین لازماً مغلوب ہو جاتے ہیں اور اُن کی سرزمین پر حق کا غلبہ پوری قوت کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت کے بعد یہی دوسری صورت پیش آئی۔ چنانچہ آپ اور آپ کے صحابہ کو جس طرح فتنہ کے خلاف قتال کا حکم دیا گیا، اُسی طرح اِس مقصد کے لیے بھی تلوار اٹھانے کی

عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾

جائیں تو (جان لو کہ) اقدام[۵۲۴] صرف ظالموں کے خلاف ہی جائز ہے[۵۲۵]۔ ۱۹۰-۱۹۳

ہدایت ہوئی۔ یہ خدا کا کام تھا جو انسانوں کے ہاتھ سے انجام پایا۔ اِسے ایک سنت الٰہی کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ انسانی اخلاقیات سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ سورۂ توبہ (۹) کی آیت ۱۴ کے الفاظ 'یُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ' میں یہی حقیقت بیان ہوئی ہے۔

۵۲۴؎ اصل میں لفظ 'عُدْوَان' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی تو زیادتی اور تعدی کے ہیں، لیکن یہاں یہ ٹھیک اُس مفہوم میں آیا ہے جس مفہوم میں ہم ''اقدام'' کا لفظ بولتے ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

> ''... عربی زبان میں کبھی کبھی بعض الفاظ محض مجانست و ہم آہنگی کے لیے استعمال ہو جاتے ہیں۔ اِن کا مفہوم موقع و محل سے متعین ہوتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں: 'دناهم كما دانوا' (ہم نے اُن کو بدلہ دیا، جیسا کہ اُنھوں نے ہمارے ساتھ کیا)۔ ظاہر ہے کہ یہاں 'دانوا' محض 'دنا' کی مشابہت کی وجہ سے لایا گیا ہے، ورنہ موقع 'فعلوا' یا اِس کے ہم معنی کسی لفظ کا ہے۔ یا قرآن میں ہے: 'جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا' (برائی کا بدلہ اُسی کے مانند بدلہ ہے)۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کسی برائی کا بدلہ کوئی برائی نہیں ہے، لیکن محض سابق لفظ کی ہم آہنگی کی وجہ سے جرم کے ساتھ اُس کی سزا کو بھی 'سَيِّئَة' سے تعبیر کر دیا۔ اِسی طرح آگے والی آیت میں ہے: 'فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ' (جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اُس کی زیادتی کے برابر اُس کے خلاف اقدام کرو)۔ اِس آیت میں کسی کی زیادتی کے جواب میں جو اقدام کیا جائے، اُس کو بھی 'اِعْتِدَاء' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، حالاں کہ یہ معنی میں محض اقدام کے ہے۔ صرف اپنے ماسبق کے ساتھ ہم آہنگی کی وجہ سے اِس شکل میں استعمال ہوا۔ عربی زبان کے اِسی معروف اسلوب کے مطابق زیر بحث آیت میں بھی لفظ 'عُدْوَان' استعمال ہوا، لیکن مراد اِس سے مجرد وہ اقدام ہے جو جوابی کارروائی کے طور پر کیا جائے۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۴۷۹)

اَلشَّهۡرُ الۡحَرَامُ بِالشَّهۡرِ الۡحَرَامِ وَالۡحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعۡتَدٰی عَلَیۡکُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَیۡہِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰی عَلَیۡکُمۡ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۱۹۴﴾

ماہِ حرام کا بدلہ ماہِ حرام ہے[۵۲۶] اور اِسی طرح دوسری حرمتوں میں بھی بدلے ہیں۔ لٰہذا جو تم پر زیادتی کریں، اُن کو اپنے اوپر اِس زیادتی کے برابر ہی جواب دو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان لو کہ اللہ اُن کے ساتھ ہے جو اُس کے حدود کی پابندی کرتے ہیں[۵۲۷]۔ ۱۹۴

۵۲۵؎ یعنی اگر یہ اپنی معاندت چھوڑ کر ایمان و اسلام کی راہ اختیار کر لیں تو اِن کے پچھلے جرائم کی بنا پر اِن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہونی چاہیے۔ اِس کے بعد اقدام صرف اُنھی لوگوں کے خلاف جائز ہو گا جو انکار پر قائم رہیں اور اپنے رویے کی اصلاح نہ کریں۔

۵۲۶؎ یعنی ماہ حرام کی حرمت اگر یہ ملحوظ نہیں رکھتے تو اِس کے بدلے میں تمھیں بھی حق ہے کہ اِس کی پروا کیے بغیر اِن کے خلاف جنگ کرو، اِس لیے کہ اِس طرح کی حرمتیں باہمی طور پر ہی قائم رہ سکتی ہیں، اِنھیں کوئی ایک فریق اپنے طور پر قائم نہیں رکھ سکتا۔

۵۲۷؎ یہ اوپر بیان کیے گئے احکام کی دلیل ارشاد ہوئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... مطلب یہ ہے کہ اشہر حرم میں یا حدود حرم میں لڑائی بھڑائی ہے تو بہت بڑا گناہ، لیکن جب کفار تمھارے لیے اُس کی حرمت کا لحاظ نہیں کرتے تو تمھیں بھی یہ حق حاصل ہے کہ قصاص کے طور پر تم بھی اُن کو اِن کی حرمت سے محروم کر دو۔ ہر شخص کی جان شریعت میں محترم ہے، لیکن جب ایک شخص دوسرے کی جان کا احترام نہیں کرتا، اُس کو قتل کر دیتا ہے تو اُس کے قصاص میں وہ بھی حرمت جان کے حق سے محروم کر کے قتل کر دیا جاتا ہے۔ اِسی طرح اشہر حرم اور حدود حرم کا احترام مسلم ہے، بشرطیکہ کفار بھی اِن کا احترام ملحوظ رکھیں اور اِن میں دوسروں کو ظلم و ستم کا ہدف نہ

وَاَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ ۖۚۛ
وَاَحۡسِنُوۡا ۚۛ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۹۵﴾

اور (اِس جہاد کے لیے) اللہ کی راہ میں انفاق کرو، اور (اِس سے گریز کر کے) اپنے ہی ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو[۵۲۸]، اور تم (یہ انفاق) خوبی کے ساتھ کرو[۵۲۹]،

بنائیں۔ لیکن جب اِن کی تلواریں اِن مہینوں میں اور اِس بلد امین میں بے نیام ہوتی ہیں تو وہ سزاوار ہیں کہ اِن کے قصاص میں وہ بھی اِن کے امن و احترام کے حقوق سے محروم کیے جائیں۔ مزید فرمایا کہ جس طرح اشہر حرم کا یہ قصاص ضروری ہے، اُسی طرح دوسری حرمتوں کا قصاص بھی ہے۔ یعنی جس محترم چیز کے حقوق حرمت سے وہ تمھیں محروم کریں، تم بھی اُس کے قصاص میں اُس کے حق حرمت سے اُنھیں محروم کرنے کا حق رکھتے ہو۔ پس جس طرح کے اقدامات حرم اور اشہر حرم کی حرمتوں کو برباد کر کے وہ تمھارے خلاف کریں، تم اُن کے جواب ترکی بہ ترکی دو۔ البتہ تقویٰ کے حدود کا لحاظ رہے۔ کسی حد کے توڑنے میں تمھاری طرف سے پیش قدمی نہ ہو اور نہ کوئی اقدام حد ضروری سے زائد ہو۔ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت اُنھی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو ہر طرح کے حالات میں اُس سے ڈرتے رہتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۱/۴۷۹)

۵۲۸ اصل میں 'وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'اَلتَّہۡلُکَۃ' مصدر ہے اور 'بِاَیۡدِیۡکُمۡ' سے پہلے 'انفسکم' کا لفظ عربیت کے اسلوب پر حذف ہو گیا ہے۔ سورۂ توبہ (۹) کی آیت ۴۲ میں یہی بات 'یُہۡلِکُوۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ' کے الفاظ میں ادا کی گئی ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں اِس سے ایک ایسے شخص کی تصویر نگاہوں کے سامنے آتی ہے جو اوپر سے نیچے کی طرف اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے کسی دریا یا غار میں چھلانگ لگا رہا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اِس طرح کے موقعوں پر جان و مال کی قربانی سے جی چراتے ہیں، وہ درحقیقت اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہوتے ہیں۔ اِس لیے کہ زندگی اور مال کے حریص جس چیز کو کامیابی سمجھتے ہیں، اللہ کی نگاہ میں وہی ہلاکت ہے۔

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ

اِس لیے کہ اللہ خوبی کے ساتھ کام کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ۱۹۵

اور حج و عمرہ[530] (کی راہ اگر تمھارے لیے کھول دی جائے تو اُن کے تمام مناسک کے ساتھ اُن) کو اللہ ہی کے لیے پورا کرو۔[531] پھر اگر راستے میں گھر جاؤ[532] تو ہدیے کی جو

---

۵۲۹ اصل میں لفظ 'اَحْسِنُوْا' آیا ہے۔ اِس کا عطف 'اَنْفِقُوْا' پر ہے، یعنی اللہ کی راہ میں اپنا پسندیدہ مال خرچ کرو اور اُسے پورے جوش و جذبہ اور دل کی آمادگی کے ساتھ خرچ کرو۔ انفاق کا یہی طریقہ اللہ کو پسند ہے۔ قرآن کے بعض دوسرے مقامات پر بھی اِس کے بارے میں اِسی بات کی تاکید کی گئی ہے۔

۵۳۰ اِن عبادات کا ذکر یہاں جس طریقے سے ہوا ہے، اُس سے واضح ہے کہ اہل عرب کے لیے یہ کوئی اجنبی چیزیں نہ تھیں۔ اُن کی تاریخ سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ حج و عمرہ کے مناسک اور حدود و آداب سے وہ پوری طرح واقف تھے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اِن میں بعض بدعات اُنھوں نے داخل کر دی تھیں، لیکن وہ جانتے تھے کہ یہ عبادات کیا ہیں۔ قرآن نے اِسی بنا پر اِن کی تفصیل نہیں کی۔ اُس کا بیان اِس معاملے میں بدعات کی اصلاح اور اُن کے مناسک سے متعلق بعض ضروری توضیحات تک محدود ہے۔

۵۳۱ اصل الفاظ ہیں: 'وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ'۔ یعنی اِس صورت میں کوئی رعایت نہ ہوگی۔ تمام مناسک، جس طرح کہ وہ ہیں، اُسی طرح پورے کیے جائیں گے۔ اِس جملے میں زور لفظ 'لِلّٰهِ' پر ہے، یعنی حج و عمرہ کی یہ عبادات صرف اللہ وحدہ لاشریک کے لیے ہونی چاہییں۔ اِس تنبیہ کی ضرورت اِس لیے پیش آئی کہ اہل عرب کے لیے یہ دونوں عبادت سے زیادہ تجارت کا ذریعہ بن گئی تھیں اور اُن کا حج و عمرہ صرف اللہ پروردگار عالم ہی کے لیے نہیں ہوتا تھا، بلکہ اُن کے وہ

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۟ وقفة فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ

قربانی بھی میسر ہو، اُسے پیش کر دو[۵۳۳] اور اپنے سر اُس وقت تک نہ مونڈو، جب تک قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے[۵۳۴]۔ پھر جو تم میں سے بیمار ہو یا اُس کے سر میں کوئی تکلیف ہو (اور وہ قربانی سے پہلے ہی سر منڈانے پر مجبور ہو جائے) تو اُسے چاہیے کہ روزوں یا صدقے یا قربانی کی صورت میں اُس کا فدیہ دے[۵۳۵]۔ پھر جب تمھارے لیے امن

معبودان باطل بھی اُس میں شریک تھے جن کے بت اُنھوں نے عین بیت الحرام میں بھی اور حج کے دوسرے مقامات پر بھی نصب کر دیے تھے۔

[۵۳۲] اِس سے آگے 'فَاِذَآ اَمِنْتُمْ' کے جو الفاظ آئے ہیں، اُن سے واضح ہے کہ اِس سے مراد یہاں دشمن کی طرف سے گھیر لیا جانا ہے، لیکن یہی صورت بعض دوسرے موانع کی وجہ سے پیش آ جائے تو اِس کا حکم بھی، ظاہر ہے کہ اِس سے مختلف نہیں ہونا چاہیے۔

[۵۳۳] یعنی اِس صورت میں قربانی پیش کرنا ضروری ہوگا اور مجبوری کی اِس حالت میں یہ حج و عمرہ کے تمام مناسک کی قائم مقام ہو جائے گی۔

[۵۳۴] عام حالات میں قربانی کی جگہ اور وقت، دونوں متعین ہیں، لیکن جس صورت کا پیچھے ذکر ہے، اُس میں قربانی کے پہنچنے کی جگہ وہی ہے، جہاں کوئی شخص گھر جائے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی اِسی بات کی تائید ہوتی ہے۔

[۵۳۵] اصل میں 'فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن کا یہ اسلوب دلیل ہے کہ فدیے کی تعداد اور مقدار کا معاملہ لوگوں کی صواب دید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ بخاری، رقم ۱۸۱۴ میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اِس کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: تین روزے رکھ لیے جائیں یا ۶ مسکینوں کو کھانا کھلا دیا جائے یا ایک بکری ذبح کر دی جائے تو کافی

اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ
ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ
ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾
اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا

کی حالت پیدا ہو جائے تو جو کوئی اِس سفر سے یہ فائدہ اٹھائے کہ حج کا زمانہ آنے تک عمرہ بھی کر لے تو اُسے قربانی کرنا ہوگی، جیسی بھی میسر ہو جائے۔ اور اگر قربانی میسر نہ ہو تو روزے رکھنا ہوں گے: تین دن حج کے زمانے میں اور سات، جب (حج سے) واپس آؤ۔ یہ پورے دس دن ہوئے۔ (اِس طریقے سے ایک ہی سفر میں حج کے ساتھ عمرے کی) یہ (رعایت) صرف اُن لوگوں کے لیے ہے جن کے گھر بار مسجد حرام کے پاس نہ ہوں[۵۳۶]۔ (اِس کی پابندی کرو) اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور خوب جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ ۱۹۶

ہو جائے گا۔

[۵۳۶] اِس سے واضح ہے کہ آدمی کے لیے ممکن ہو تو بہتر یہی ہے کہ وہ عمرہ کے لیے الگ اور حج کے لیے الگ سفر کرے۔ ایک ہی سفر میں پہلے عمرہ اور اِس کے بعد احرام کھول کر حج کی تاریخوں میں اُس کے لیے نیا احرام باندھ کر حج کرنا حدود حرم کے باہر سے آئے ہوئے عازمین حج کے لیے محض ایک رخصت ہے جو اللہ تعالیٰ نے دو مرتبہ سفر کی زحمت کے پیش نظر اُنھیں مرحمت فرمائی ہے۔ اِس پر فدیہ اِسی لیے لازم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس رخصت سے فائدہ بھی ہر مسلمان کو اِسے رخصت سمجھ کر ہی اٹھانا چاہیے۔

رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ لا وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ط وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ
يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ط وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ز وَاتَّقُوْنِ

حج[۵۳۷] کے متعین مہینے ہیں[۵۳۸]۔ سو اِن میں جو شخص بھی (احرام باندھ کر) حج کا ارادہ کر لے[۵۳۹]، اُسے پھر حج کے اِس زمانے میں نہ کوئی شہوت کی بات کرنی ہے، نہ خدا کی نافرمانی کی اور نہ لڑائی جھگڑے کی کوئی بات اُس سے سرزد ہونی چاہیے[۵۴۰]۔ اور (یاد رہے کہ)

---

[۵۳۷] حج کا لفظ یہاں حج ہی کے لیے استعمال ہوا ہے، لیکن اِس کے ساتھ اگر عمرہ کیا جائے گا تو علی سبیل التغلیب وہ بھی اِس میں شامل ہو گا۔

[۵۳۸] یعنی یہ کچھ ایسی لامحدود اور غیر متعین مدت نہیں ہے کہ اِس کی پابندیوں سے لوگ ہراساں ہوں۔ زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کی بات ہے۔ بندۂ مومن کو حوصلے کے ساتھ اور خدا سے ڈرتے ہوئے یہ مدت پوری احتیاط کے ساتھ گزارنی چاہیے۔

[۵۳۹] اصل میں 'فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'فَرَضَ فِيْهِنَّ' کا اسلوب دلیل ہے کہ اِس سے مراد وہی وقت ہے، جب آدمی احرام باندھ کر حج کا پختہ عزم کر لیتا ہے۔

[۵۴۰] یہاں جن تین چیزوں سے منع کیا گیا ہے، اُن کی ممانعت کے وجوہ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر میں اِس طرح واضح فرمائے ہیں:

> ''ایک وجہ تو یہ ہے کہ اسلام میں یہ عبادت انسان کو ترک دنیا اور زہد کی اُس آخری حد سے آشنا کرنے والی ہے جس سے آشنا ہونا اسلام میں مطلوب و مرغوب ہے اور جو تربیت و تزکیہ کے لیے ضروری ہے۔ اِس سے آگے رہبانیت کی حدیں شروع ہو جاتی ہیں جن میں داخل ہونے سے اسلام نے روکا ہے۔
>
> دوسری وجہ یہ ہے کہ احرام کی پابندیوں کی وجہ سے اِن چیزوں کے لیے نفس کے اندر اکساہٹ بہت بڑھ جاتی ہے۔ انسان کے اندر یہ کمزوری ہے کہ جس چیز سے وہ روک دیا جائے، اُس کی

يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿١٩٧﴾
لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ
اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ

جو نیکی بھی تم کرو گے، اللہ اُسے جانتا ہے۔ اور (حج کے اِس سفر میں تقویٰ کا) زادراہ لے کر نکلو، اِس لیے کہ بہترین زادراہ یہی تقویٰ کا زادراہ ہے[۵۴۱]۔ اور (اِس کے لیے)، عقل والو، مجھ سے ڈرتے رہو۔ ۱۹۷

(اِس کے ساتھ، البتہ) تم پر کوئی حرج نہیں کہ اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرو[۵۴۲]، لیکن (یاد رہے کہ مزدلفہ کوئی کھیل تماشے اور تجارت کی جگہ نہیں ہے، اِس لیے)

خواہش اُس کے اندر دوچند ہو جاتی ہے اور شیطان اُس کی اِس کم زوری سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ سفر کی حالت ہونے کے سبب سے اِن چیزوں کے مواقع بہت پیش آتے ہیں۔ آدمی اگر چوکنا نہ رہے تو ہر قدم پر فتنہ میں پڑ سکتا ہے۔‘‘ (تدبر قرآن ۱/۴۸۵)

[۵۴۱] اصل الفاظ ہیں: ’تَزَوَّدُوْا، فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى‘۔ عربیت کے اداشناس جانتے ہیں کہ ’فاِنَّ‘ کا لفظ جب اِس طرح آتا ہے تو اپنے ماقبل کی توجیہ و تعلیل کے لیے آتا ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھیے تو ضروری ہے کہ ’تَزَوَّدُوْا‘ کے بعد ’التَّقْوٰى‘ کا لفظ اِس جملے میں حذف مانا جائے۔ اِس جملے کی کوئی دوسری تالیف کسی طرح موزوں نہیں ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

[۵۴۲] اصل میں ’اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ’اَنْ‘ سے پہلے ’فی‘ عربیت کے مطابق حذف ہو گیا ہے اور ’فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ‘ سے مراد معاشی فوائد ہیں۔ یہ تعبیر قرآن میں بالعموم اِسی مفہوم کے لیے آئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حج کے سفر سے اصل مقصود تو حج ہی ہونا چاہیے، لیکن اِس میں کوئی مضایقہ نہیں کہ اِس کے ساتھ کوئی شخص اِس سفر سے اپنے لیے کچھ معاشی فوائد بھی حاصل کر لے۔

كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾
ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾

جب عرفات سے چلو تو مشعر حرام کے پاس اللہ کو یاد کرو اور اُس کو اُسی طرح یاد کرو، جس طرح اُس نے تمھیں ہدایت فرمائی ہے[۵۴۳]۔ اور اِس سے پہلے تو، بلا شبہ تم لوگ گم راہوں میں تھے[۵۴۴]۔ ۱۹۸

پھر (یہ بھی ضروری ہے کہ) جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں، تم بھی، (قریش کے لوگو)، وہیں سے پلٹو[۵۴۵] اور اللہ سے مغفرت چاہو۔ یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۱۹۹

---

[۵۴۳] یعنی پیغمبر کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق شرک اور جاہلیت کی آمیزش سے پاک کر کے خالصتاً اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ جاہلیت میں لوگ مزدلفہ پہنچتے تو وہاں تسبیح و تہلیل اور ذکر و عبادت کے بجائے جگہ جگہ آگ جلاتے اور قصیدہ خوانی، داستان گوئی اور مفاخرت کی مجلسیں منعقد کرتے تھے۔

[۵۴۴] مطلب یہ ہے کہ حج و عمرہ کے بارے میں اُس رہنمائی کی قدر کرو جو قرآن کے ذریعے سے تمھیں دی جا رہی ہے۔ اِس سے پہلے تو اللہ کے مقرر کردہ اِن شعائر کو تم نے کھیل تماشے کی جگہ بنا رکھا تھا۔ یہ خدا کی عنایت ہے کہ علم و معرفت کی اِن جلوہ گاہوں کی حقیقت اُس نے تم پر واضح کر دی ہے۔

[۵۴۵] اِس ہدایت کی ضرورت اِس لیے پیش آئی کہ زمانۂ جاہلیت میں قریش نے یہ امتیاز قائم کر لیا تھا کہ عرفات کی حاضری وہ اپنے لیے ضروری نہیں سمجھتے تھے اور مزدلفہ تک جا کر ہی پلٹ آتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ وہ بیت اللہ کے پروہت اور مجاور ہیں، اِس وجہ سے اُن کے لیے

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ
اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ
فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (۲۰۰) وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا
حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۲۰۱) اُولٰٓئِكَ
لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۲۰۲)

(اور یہ بھی کہ) اِس کے بعد جب اپنے حج کے مناسک پورے کرلو تو جس طرح پہلے اپنے باپ دادا کو یاد کرتے رہے ہو، اُسی طرح اب اللہ کو یاد کرو، بلکہ اُس سے بھی زیادہ۔[۵۴۶] (یہ اللہ سے مانگنے کا موقع ہے)، مگر لوگوں میں ایسے بھی ہیں کہ وہ (اِس موقع پر بھی) یہی کہتے ہیں کہ پروردگار، ہمیں (جو کچھ دینا ہے، اِسی) دنیا میں دے دے[۵۴۷]، اور (اِس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پھر) آخرت میں اُن کا کوئی حصہ نہیں رہتا۔ اور اُن میں ایسے بھی ہیں کہ جن کی دعا یہ ہوتی ہے کہ پروردگار، ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی، اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے[۵۴۸]۔ یہی ہیں جو اپنی

حدود حرم سے باہر نکلنا مناسب نہیں ہے۔

[۵۴۶] یعنی قیام منیٰ کے ایام میں اپنے باپ دادا کے لیے مفاخرت کی جو مجلسیں تم منعقد کرتے رہے ہو، اُن کی جگہ اور اُن سے زیادہ اہتمام اور جوش وخروش کے ساتھ تمھیں اب اپنے پروردگار کی یاد میں مشغول ہونا چاہیے۔

[۵۴۷] حج وعمرہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد غلامی کی تجدید اور ابلیس کے خلاف انسان کی ابدی جنگ کا نہایت روح پرور علامتی اظہار ہیں، لیکن انسان کی بدقسمتی ہے کہ وہ ایسی عظیم عبادات کو بھی بالعموم اپنے دنیوی مفادات کے حوالے ہی سے دیکھتا ہے۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ

کمائی کا حصہ پا لیں گے، اور اللہ کو حساب چکاتے کبھی دیر نہیں لگتی۔[۵۴۹] ۲۰۰-۲۰۲

اور (منیٰ کے) چند متعین دنوں[۵۵۰] میں اللہ کو یاد کرو۔ پھر جس نے جلدی کی اور دو

---

۵۴۸ اِس سے معلوم ہوا کہ دعا کا یہی طریقہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِس دعا سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ بندے کو اپنے رب سے دنیا اور آخرت، دونوں کی بھلائی طلب کرنی چاہیے اور اِس بھلائی کا فیصلہ اور انتخاب اُسی پر چھوڑنا چاہیے۔ وہی سب سے زیادہ بہتر طریقے پر جانتا ہے کہ ہمارے لیے حقیقی خیر کس چیز میں ہے۔ خاص طور پر دنیا کی چیزوں میں سے کسی چیز کا خیر ہونا تو منحصر ہے اِس امر پر کہ وہ چیز ہمارے لیے آخرت کی کامیابی کا وسیلہ وذریعہ بن سکے اور کسی چیز کے اِس پہلو کو جاننا صرف اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے۔ اِس وجہ سے بندے کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ اِس معاملے کو اللہ تعالیٰ ہی پر چھوڑے، اپنی طرف سے کوئی تجویز پیش نہ کرے۔ البتہ، دوزخ کے عذاب سے برابر پناہ مانگتا رہے۔ یہ بڑی سخت چیز ہے۔ بندے کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس کو دوزخ سے پناہ میں رکھے۔“ (تدبر قرآن ۱/۴۸۸)

۵۴۹ موقع کلام دلیل ہے کہ یہاں یہ جملہ تسلی کے سیاق میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مطمئن رہو، خدا کے وعدوں کے پورے ہونے میں دیر نہیں ہوگی۔ تمھارا اجر تمھیں ملے گا تو یہی سمجھو گے کہ تمھاری مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہی تمھیں مل گئی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت میں لکھا ہے:

> ”...یہاں یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ اِن معاملات میں ساری اہمیت اُس احساس کی ہے جو انسان کو جزا وسزا کے وقت ہوگا۔ اگر جزا وسزا کے وقت کا احساس یہی ہوگا کہ عمل اور جزا کے درمیان کا فاصلہ اب بالکل غائب ہو گیا تو پھر یہ فاصلہ بالکل ناقابل لحاظ ہے۔ پھر تو صحیح یہی ہے کہ مجرم اپنی سزا کو سامنے رکھے اور مومن اپنی جزا کو۔ نہ وہ مہلت سے مغرور ہو نہ یہ تاخیر سے بے صبر۔ اور اگر کوئی شخص اپنی نافہمی سے اِس فاصلے کو اہمیت دے بھی تو اُسے یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ ’من مات فقد قامت قیامته‘ کہ جو شخص مرا، اُس کی قیامت کھڑی ہو گئی۔“ (تدبر قرآن ۱/۴۸۹)

فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۲۰۳
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ

ہی دنوں میں چل کھڑا ہوا، اُس پر بھی کوئی گناہ نہیں اور جو دیر سے چلا اُس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔[۵۵۱] (ہاں، مگر) اُن کے لیے جو اللہ سے ڈریں[۵۵۲] اور تم بھی اللہ سے ڈرتے رہو، اور خوب جان لو کہ (ایک دن) تم اُسی کے حضور میں اکٹھے کیے جاؤ گے۔[۵۵۳] ۲۰۳

(یہ عبادت ہے جس کی راہ روکنے والوں سے تم کو لڑنا ہے) اور (اِدھر صورت حال یہ ہے کہ تمھارے) لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں کہ جن کی باتیں تو اِس دنیا کی زندگی

---

[۵۵۰] اصل میں 'فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ' کے الفاظ ہیں، یعنی گنے ہوئے دن۔ یہ اسلوب جس طرح بیان تقلیل کے لیے موزوں ہے، اُسی طرح اگر غور کیجیے تو تعین وتحدید کے لیے بھی بالکل موزوں ہے۔ ہمارے نزدیک، اِس آیت میں یہ اِسی دوسرے مفہوم میں ہے۔

[۵۵۱] یعنی اجازت ہے کہ کوئی شخص ۱۳ ذوالحجہ تک ٹھیرے یا ۱۲ کو واپس چلا آئے، دونوں ہی صورتوں میں اُس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہ اِس لیے فرمایا کہ عبادات میں جو چیز جس طرح متعین کر دی جائے، اُس میں جس طرح کمی جائز نہیں ہے، اُسی طرح اضافہ بھی جائز نہیں ہے۔

[۵۵۲] یعنی اصل اہمیت اِس کی نہیں کہ لوگ کتنے دن ٹھیرے، بلکہ اِس کی ہے کہ جتنے دن بھی ٹھیرے، خدا کی یاد میں اور اُس سے ڈرتے ہوئے ٹھیرے۔ عبادت کی روح تقویٰ ہے۔ رسوم و آداب سے یہی مقصود ہے۔ یہ ہو تو دو دن بھی بہت ہیں اور نہ ہو تو دس دن کے قیام سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

[۵۵۳] یہ آخر میں تنبیہ ہے کہ جس طرح یہاں اکٹھے ہو، روز حشر بھی اِسی طرح خدا کے حضور میں اکٹھے کیے جاؤ گے۔ یہاں سے بھاگ سکتے ہو، لیکن اُس دن کسی کے لیے بھی خدا کے حکم کے

اللّٰہَ عَلٰی مَا فِیْ قَلْبِہٖ ۙ وَ ھُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ (۲۰۴) وَ اِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْھَا وَ یُھْلِکَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ (۲۰۵) وَ اِذَا قِیْلَ لَہُ اتَّقِ اللّٰہَ اَخَذَتْہُ الْعِزَّۃُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُہٗ

میں تمھیں بھلی معلوم ہوتی ہیں[۵۵۴]، اور وہ اپنے دل کے ارادوں پر اللہ کو گواہ بھی بناتے ہیں[۵۵۵]، لیکن ہیں وہ بدترین دشمن[۵۵۶]۔ (تمھارے سامنے وہ یہی کرتے ہیں) اور جب وہاں سے ہٹتے ہیں تو اُن کی ساری تگ و دو اِس لیے ہوتی ہے کہ زمین میں فساد پھیلائیں اور کھیتیوں کو غارت کریں اور نسلیں تباہ و برباد کریں[۵۵۷]، اور (تم جانتے ہو

بغیر اُس کے سامنے سے ہٹنا ممکن نہ ہوگا۔

[۵۵۴] یہ اشارہ ہے مدینہ کے اُن منافقین کی طرف جو اللہ کی راہ میں جہاد و قتال کی باتیں کرتے تو زمین و آسمان کے قلابے ملاتے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ہٹتے تو اُن کی ساری تگ و دو اللہ اور رسول سے لوگوں کو برگشتہ کرنے اور اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے ہوتی تھی۔ فرمایا کہ یہ سب اِس دنیا کی زندگی ہی میں ہے۔ قیامت کے دن پردہ اٹھے گا تو اپنے باطن کو چھپانے کے لیے یہ کچھ بھی نہ کرسکیں گے۔

[۵۵۵] منافق کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو معتبر ثابت کرنے کے لیے وہ بات بات پر قسم کھاتا ہے، اِس لیے کہ اپنی نفسیاتی کم زوری کی وجہ سے وہ سمجھتا ہے کہ لوگ اُس کی بات کو باور نہیں کریں گے۔

[۵۵۶] اصل میں 'اَلَدُّ الْخِصَامِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'خِصَام' ہمارے نزدیک 'خصم' کی جمع ہے، یعنی دشمنوں میں سے بدترین۔

[۵۵۷] یعنی خدا کی جو دینونت اِس سرزمین میں برپا ہے، اُس میں لوگوں کو ایمان کی دعوت دینے اور اِس طرح صلح و امن پر آمادہ کرنے کے بجائے وہ جنگ کی آگ بھڑکانا چاہتے ہیں جس کا

جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئۡسَ الۡمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾
وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡرِىۡ نَفۡسَهُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ ؕ
وَاللّٰهُ رَءُوۡفٌۢ بِالۡعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِى السِّلۡمِ كَآفَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ

کہ) اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو تو گناہ پر آمادگی کے ساتھ اُن کا غرور اُنھیں دامن گیر ہو جاتا ہے[۵۵۸]۔ سو اُن کے لیے جہنم کافی ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے[۵۵۹]۔ ۲۰۴-۲۰۶

اور اِنھی لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں کہ اللہ کی رضا جوئی کے لیے اپنی جان کھپا دینے کے لیے تیار رہیں۔ (یہی ہیں کہ جن سے کوئی غلطی ہو جائے تو اللہ اُسے معاف کر دیتا ہے)، اور اِس طرح کے بندوں پر اللہ بہت مہربان ہے۔ ۲۰۷

ایمان والو[۵۶۰]، (ایمان کے ساتھ یہ دو رویے نہیں ہو سکتے، اِس لیے) تم سب[۵۶۱] (ایک

نتیجہ، ظاہر ہے کہ حرث و نسل کی تباہی کی صورت میں نکلے گا۔

[۵۵۸] اصل الفاظ ہیں: 'اَخَذَتۡهُ الۡعِزَّةُ بِالۡاِثۡمِ'۔ اِن میں 'بِالۡاِثۡمِ' کی 'ب' ہمارے نزدیک مصاحبت کے لیے ہے اور لفظ 'الۡعِزَّةُ' ٹھیک اُس معنی میں آیا ہے جس میں یہ سورۂ ص (۳۸) کی آیت ۲ 'بَلِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فِىۡ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ' میں ہے۔

[۵۵۹] مطلب یہ ہے کہ اِنھیں اگر اِس وقت ڈھیل ملی ہوئی ہے تو یہ کوئی رعایت نہیں ہے۔ اِس طرح کے لوگوں کے لیے دوزخ تیار ہے، وہ کوئی کمی نہ چھوڑے گی۔ اِن کی شرارتوں کی جو سزا اِنھیں ملنی چاہیے، اِس کے لیے بالکل کافی ہو جائے گی۔

[۵۶۰] یہ خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن روے سخن، اگر غور کیجیے تو اُنھی منافقین کی طرف ہے جن

الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾

ہی طریقے سے) اللہ کی اطاعت میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔ اِن کھلی ہوئی تنبیہات کے بعد بھی جو تمھارے پاس آئی ہیں،[۵۶۲] اگر تم لغزش کھاتے ہو تو جان لو کہ اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔[۵۶۳] ۲۰۸-۲۰۹

کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ اُنھیں دعوت دی گئی ہے کہ شیطان کے پیچھے چلنے کے بجائے اُن سچے اہل ایمان کی پیروی کرو جو اپنے پروردگار کی رضا کے لیے اپنا سب کچھ دینے کے لیے تیار ہیں۔

[۵۶۱] اصل میں لفظ 'کَآفَّةً' استعمال ہوا ہے۔ یہ یہاں ضمیر فاعل سے حال پڑا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم سب مسلمان ایک جماعت ہو تو اللہ کی اطاعت کے معاملے میں بھی تمھیں ایک ہی جماعت ہونا چاہیے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تم ایمان کا دعویٰ تو کرو اور پھر تم میں سے کچھ اللہ کا حکم ماننے والے ہوں اور کچھ شیطان کے پیچھے چلنے والے۔ اللہ کو ماننے کے بعد یہ رویہ کسی حال میں بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔

[۵۶۲] اصل میں لفظ 'الْبَيِّنٰتُ' آیا ہے۔ یعنی وہ آیات جو شیطان کے فتنوں سے خبردار کرنے اور ایمان و اسلام کے تقاضوں سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے قرآن میں وارد ہوئی ہیں۔ تنبیہات کے لفظ سے اِس کا ترجمہ ہم نے اِسی مفہوم کے لحاظ سے کیا ہے۔

[۵۶۳] اللہ تعالیٰ کی اِن صفات کا حوالہ یہاں جس پہلو سے آیا ہے، استاذ امام امین احسن اصلاحی اُس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

> ''عزیز کی صفت کے حوالے سے دو حقیقتوں کی طرف اشارہ مقصود ہے: ایک تو اِس حقیقت کی طرف کہ خدا کوئی کم زور و ناتواں ہستی نہیں ہے، بلکہ وہ غالب و توانا ہے تو جو اُس کی تنبیہات کے باوجود شیطان کی پیروی کریں گے، اُن کو وہ اُس عذاب میں ضرور پکڑے گا جو شیطان کے

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۲۱۰) سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۭ بَيِّنَةٍ ؕ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ

(اِس اتمام حجت کے باوجود) کیا یہ اِسی کے منتظر ہیں کہ اللہ اور اُس کے فرشتے بدلیوں کے سایے میں اِن پر نمودار ہو جائیں اور معاملے کا فیصلہ کر دیا جائے؟ (لیکن یہ اللہ کا طریقہ نہیں ہے) اور اِس طرح کے معاملات تو اللہ ہی کے حوالے ہیں۔ بنی اسرائیل سے پوچھو، ہم نے اُن کو کتنی واضح نشانیاں دیں، (مگر اِس سے کیا فائدہ ہوا)[۵۶۴]؟ اور

پیرووں کے لیے اُس نے مقدر کر رکھا ہے اور جس کی اُس نے پہلے سے خبر دے رکھی ہے۔ دوسرا اِس طرف کہ جو لوگ اِن واضح ہدایات کے بعد بھی راہ حق کو چھوڑ کر شیطان ہی کی پیروی اختیار کریں گے، وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑیں گے، بلکہ اپنا ہی بگاڑیں گے۔ اِس لیے کہ خدا عزیز ہے، یعنی ہر نفع ونقصان سے بالاتر۔

اِسی طرح حکیم کی صفت بھی یہاں دو حقیقتوں کو نمایاں کر رہی ہے: ایک تو یہ کہ اِس دنیا کا خالق حکیم ہے اور اُس کے حکیم ہونے کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ وہ اپنی ہدایت پر جمے رہنے والوں اور اُس سے منحرف ہو جانے والوں کے درمیان اُن کے انجام کے لحاظ سے امتیاز کرے۔ اگر وہ اُن میں کوئی امتیاز نہ کرے، بلکہ دونوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دے یا دونوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے تو اِس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ایک حکیم نہیں، بلکہ ایک کھلنڈرا ہے اور یہ دنیا ایک پُر حکمت اور با مقصد کارخانہ نہیں، بلکہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشا ہے۔ دوسری یہ کہ بدی اور نیکی کے نتائج کے ظہور میں جو دیر سویر ہوتی ہے، وہ سب حکمت پر مبنی ہوتی ہے۔ بسا اوقات شیطان کے پیروکاروں کو اللہ تعالیٰ مہلت دیتا ہے اور بسا اوقات اہل حق کسی آزمایش میں ڈالے جاتے ہیں۔ اِس سے نہ تو اہل باطل کو مغرور ہونا چاہیے نہ اہل حق کو مایوس، بلکہ یہ یقین رکھنا چاہیے کہ وہ مہلت اور یہ آزمایش، دونوں خدائے حکیم و دانا کی حکمت پر مبنی ہیں، اور اِس حکمت کے تحت اُس کے قوانین

فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۲۱۱) زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا
وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۲۱۲)

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی (ہدایت جیسی) نعمت کو پا لینے کے بعد اُس کو (گم راہی سے) بدلتے ہیں، وہ اللہ کی گرفت سے نہیں بچ سکتے، اِس لیے کہ اللہ سخت مواخذہ کرنے والا ہے۔ دنیا کی زندگی اِن منکروں کے لیے بڑی دل پسند بنا دی گئی ہے۔ (اِس کے انجام سے اِنھیں آگاہ کیا جائے تو نہیں سنتے) اور ایمان والوں کا مذاق اڑاتے ہیں،[۵۶۵] دراں حالیکہ خدا سے ڈرنے والے قیامت کے دن اِن کے مقابلے میں

اور اُن کے نتائج بالکل قطعی اور اٹل ہیں، اُن میں سرمو فرق ممکن نہیں ہے۔" (تدبر قرآن ۱/۴۹۹)

۵۶۴ یعنی بنی اسرائیل سے پوچھ کر دیکھ لو، اُن کی تاریخ گواہی دیتی ہے کہ جو لوگ عقل اور سمجھ سے کام نہیں لیتے، اُن کی آنکھیں بڑے سے بڑا معجزہ دیکھ لینے کے بعد بھی بند ہی رہتی ہیں۔

۵۶۵ یہ جس فریب نظر کی وجہ سے ہوتا ہے، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُس کی وضاحت اِس طرح فرمائی ہے:

"... اِس دنیا کی زندگی میں حق اور باطل اور کفر و ایمان، دونوں کو مہلت ملی ہوئی ہے۔ کوئی شخص اگر نیکی اور اطاعت کی راہ اختیار کرتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ وہ ابتلا کے قانون سے بالاتر ہو جائے، بلکہ بعض حالات میں اُس کا ابتلا اُس کے ایمان کے اعتبار سے سخت سے سخت تر ہوتا جاتا ہے۔ اِسی طرح اگر کوئی شخص کفر و نافرمانی کی زندگی گزارنا چاہتا ہے تو اُس کے لیے بھی سنت الٰہی یہ نہیں ہے کہ فوراً خدا کے فرشتے اتر کر اُس کی گردن ناپ دیں، بلکہ اکثر حالات میں اُس کو ایسی ڈھیل پر ڈھیل ملتی جاتی ہے کہ اُس کی جسارت دن پر دن بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اِسی فریب نظر کو یہاں 'زُیِّنَ' سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی اِس دنیاوی زندگی کا یہ فریب اِس طرح اُن کی نگاہوں میں کھبا دیا

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً قف فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ صلے
وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط
وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ

عالی مقام ہوں گے۔ (یہ اُن کے لیے اللہ کا فضل ہے) اور اللہ جس کو چاہے گا، اپنا فضل بے حساب عطا فرمائے گا۔[۵۶۶] ۲۱۰-۲۱۲

(اپنی منافقت کے لیے یہ اختلافات کو بہانہ بناتے ہیں۔[۵۶۷] اِنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) لوگ ایک ہی امت تھے۔ پھر (اُن میں اختلاف پیدا ہوا تو) اللہ نے نبی بھیجے، بشارت دیتے اور انذار کرتے ہوئے اور اُن کے ساتھ قول فیصل کی صورت میں اپنی کتاب نازل کی تاکہ لوگوں کے درمیان وہ اُن کے اختلافات کا فیصلہ کر دے۔ یہ

گیا ہے کہ وہ اِس کے اِس پہلو سے نگاہ ہٹا کر کسی اور پہلو سے اِس کو دیکھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے کہ اُن کی نگاہوں میں اِس زندگی کی اِس خاص پہلو سے تزئین شیطان نے کی ہے، جیسا کہ قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں اِس کی تصریح ہے۔ اور یہ امر بھی، ظاہر ہے کہ شیطان کو اِس تزئین کا موقع انسان کی عاجلہ پرستی اور اتباع شہوات نے فراہم کیا ہے۔‘‘

(تدبر قرآن ۱/۵۰۱)

۵۶۶؎ یعنی اِس طرح عطا فرمائے گا کہ توقعات اور اندازوں کے تمام پیمانے اُسے ناپنے سے قاصر رہ جائیں گے۔

۵۶۷؎ یعنی کہتے ہیں کہ حق و باطل کا معاملہ کچھ ایسا واضح نہیں ہے کہ اُس کے لیے ہم بالکل ہی یک سو ہو کر کھڑے ہو جائیں۔ اُس میں اختلافات ہیں اور اُن کا ہونا ہی اِس بات کی دلیل ہے کہ اِس معاملے میں کوئی حتمی بات کہنا کسی شخص کے لیے ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا جو کشمکش اِس وقت برپا ہے، اُس میں غیر جانب داری کا وہی رویہ صحیح ہے جو ہم نے اختیار کر رکھا ہے۔

بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ
الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾
اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا
مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ

جن کو دی گئی، اِس میں اختلاف بھی اُنھی لوگوں نے کیا، نہایت واضح دلائل کے اُن کے سامنے آ جانے کے بعد، محض آپس کے ضدم ضدا کی وجہ سے۔ پھر یہ جو (قرآن کے) ماننے والے ہیں، اللہ نے اپنی توفیق[۵۶۸] سے اُس حق کے بارے میں اِن کی رہنمائی کی جس میں یہ اختلاف کر رہے تھے۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے، (اپنے قانون کے مطابق) سیدھی راہ کی ہدایت عطا فرماتا ہے[۵۶۹]۔ ۲۱۳

(یہ منافق سمجھتے ہیں کہ اِن پر کوئی ذمہ داری ڈالے بغیر ہی اِس راہ کی سب مشکلیں اللہ کی مدد سے دور ہو جانی چاہییں۔ خدا کے بندو)، تمھارا خیال ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، دراں حالیکہ تمھیں وہ حالات ابھی پیش ہی نہیں آئے جو (رسولوں

---

[۵۶۸] اصل میں لفظ 'اِذْن' آیا ہے جس کے معنی اجازت کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اجازت امہال کے لیے بھی ہوتی ہے اور توفیق کے لیے بھی۔ یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ یہ توفیق کے لیے ہے۔

[۵۶۹] مطلب یہ ہے کہ حق تو ہمیشہ سے واضح رہا ہے اور اب بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے ذریعے سے اُسے پوری طرح واضح کر دیا ہے، لیکن اُس کو پانے کے لیے پہلی شرط یہی ہے کہ آدمی ضدم ضدا کا رویہ چھوڑ دے اور حق کا سچا طالب بن کر کتاب الٰہی کی طرف رجوع کرے۔ ہدایت و ضلالت کے باب میں یہ اللہ کا قانون ہے اور اللہ اِسی کے مطابق لوگوں کو سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾
يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ
فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ
وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

کی بعثت کے نتیجے میں) اُن لوگوں کو پیش آئے تھے جو تم سے پہلے گزرے ہیں؟ اُن پر آفتیں آئیں، مصیبتیں گزریں اور وہ ہلا مارے گئے، یہاں تک کہ رسول اور اُس کے ساتھ ایمان لانے والے سب پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ (اُس وقت بشارت دی گئی کہ) سنو، اللہ کی مدد قریب ہی ہے۔[۵۷۰] ۲۱۴

وہ[۵۷۱] تم سے پوچھتے ہیں کہ اچھا، پھر کیا خرچ کریں؟ کہہ دو کہ جتنا مال بھی خرچ کرو گے، وہ تمھارے والدین، اعزہ واقربا، اور (تمھارے ہی معاشرے کے) یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے، (اِس لیے جتنی ہمت ہے، خرچ کرو) اور (مطمئن رہو کہ) جو

---

[۵۷۰] یعنی رسولوں کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی دینونت جب بھی کسی سرزمین میں برپا ہوئی ہے، اُس کا طریقہ یہی رہا ہے کہ سزا بھی اتمام حجت کے بعد دی جاتی ہے اور سرفرازی کا فیصلہ بھی ایمان لانے والوں کے بعض غیر معمولی آزمایشوں سے گزرنے کے بعد ہی کیا جاتا ہے۔ اللہ کی مدد، جس طرح تم چاہتے ہو، اُس طرح نہ اِس سے پہلے کبھی آئی ہے اور نہ اب آئے گی۔ یہ سنت الٰہی ہے اور اللہ کبھی اِس کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

[۵۷۱] یہ اُنھی لوگوں کے سوالات ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے اور اُنھی مسائل سے متعلق ہیں جو جہاد و انفاق کا حکم دینے کے بعد اِس طرح کے منافقین اور کمزور مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے۔ تجدید شریعت کا مضمون اِس فصل میں اب اِنھی سوالوں کے جوابات سے بتدریج آگے

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا
شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ
وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢١٦﴾
يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ

نیکی بھی تم کرو گے، وہ ہرگز ضائع نہ ہوگی، اِس لیے کہ اللہ اُس سے پوری طرح واقف ہے۔[۵۷۲] ۲۱۵

تم پر جنگ فرض کی گئی اور (اللہ کی راہ میں انفاق کی طرح) وہ بھی تمھیں ناگوار ہے، دراں حالیکہ یہ بالکل ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور تمھارے لیے وہی بہتر ہو، اور بالکل ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمھارے لیے بری ہو۔[۵۷۳] اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ جانتا ہے اور (اِس طرح کی بہت سی چیزوں کو) تم نہیں جانتے۔ ۲۱۶

وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ حرام مہینے میں قتال کا کیا حکم ہے؟[۵۷۴] کہہ دو کہ اِس میں قتال

بڑھتے ہوئے اپنے اختتام کو پہنچ جائے گا۔

[۵۷۲] مطلب یہ ہے کہ خدا سے کیا پوچھتے ہو؟ تمھارے لوگ ہیں اور اُن کی ضرورتیں بھی تمھارے سامنے ہیں، اِس لیے جتنی ہمت اور جتنا حوصلہ ہے، اُس کے مطابق زیادہ سے زیادہ خرچ کرو۔ تم جو کچھ بھی کرو گے، خدا اُسے جانتا ہے اور وہ کسی چیز کو فراموش کرنے والا نہیں ہے۔ لہٰذا قیامت میں وہ اِس کا پورا صلہ تمھیں عطا کر دے گا۔

[۵۷۳] یہ ایک بدیہی حقیقت کا بیان ہے۔ انسان کو جو چیزیں اخلاقی لحاظ سے اوپر اٹھانے والی ہیں، وہ بالعموم اُنھیں ناپسند کرتا ہے اور جو اِس لحاظ سے پست کر دینے والی ہیں، اُن کے لیے وہ اپنے اندر بڑی رغبت پاتا اور بے اختیار اُن کی طرف لپکتا ہے۔

كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۤ وَاِخْرَاجُ
اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ وَلَا يَزَالُوْنَ
يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ
مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ
فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا

بڑی ہی سنگین بات ہے، لیکن اللہ کی راہ سے روکنا اور اُس کو نہ ماننا اور بیت الحرام کا راستہ لوگوں پر بند کرنا اور اُس کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اِس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ اور ظلم و جبر کے ذریعے سے لوگوں کو دین سے پھیرنا تو قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔ (تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ جن لوگوں سے قتال کا حکم تمھیں دیا گیا ہے، اُنھوں نے طے کر لیا ہے کہ) وہ تم سے برابر لڑیں گے، یہاں تک کہ اگر اُن کے لیے ممکن ہو تو تمھیں تمھارے دین سے پھیر لے جائیں۔ اور تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھرے گا اور پھر اِسی کفر کی حالت میں مر جائے گا تو اِسی طرح کے لوگ ہیں جن کے عمل دنیا اور آخرت میں ضائع ہوئے[۵۷۵] اور

---

[۵۷۴] اشہر حرم میں جنگ سے متعلق قرآن نے اپنا موقف اگرچہ اوپر آیات ۱۹۰-۱۹۵ میں بیان کر دیا تھا، لیکن اِن لوگوں نے اِس کے باوجود محض اِس خیال سے کہ شاید اِسی طرح جنگ کی ذمہ داری سے بچنے کی کوئی راہ نکل آئے، یہ سوال کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ پوری تفصیل کے ساتھ اُس کا جواب دیا، بلکہ اِس طرح کے حالات میں اِن کے اندر ارتداد کے میلانات کو سامنے رکھ کر بات کو اُس کے آخری نتائج تک بالکل واضح کر دیا ہے۔

[۵۷۵] دنیا اور آخرت، دونوں میں اعمال کے ضائع ہو جانے کا ذکر اِس لیے کیا ہے کہ رسولوں

خٰلِدُوْنَ (۲۱۷) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۱۸)
يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ

یہی دوزخ میں پڑنے والے ہیں، یہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اِس کے برخلاف جو لوگ ایمان پر قائم رہے ہیں[۵۷۶] اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہے، وہی اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں[۵۷۷] اور اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۲۱۷-۲۱۸

وہ تم سے جوے اور شراب کے بارے میں پوچھتے ہیں، (اِس لیے کہ یہ بھی اِن کے ہاں غریبوں کی مدد کا ایک ذریعہ ہیں[۵۷۸])۔ کہہ دو کہ اِن دونوں میں گناہ بہت بڑا ہے

کی بعثت کے نتیجے میں جو دینونت برپا ہوتی ہے، اُس میں کفر و ایمان کے نتائج اِسی دنیا میں سامنے آجاتے ہیں۔

[۵۷۶] اصل میں فعل 'اٰمَنُوْا' آیا ہے۔ موقع کلام دلیل ہے کہ یہ اپنے کامل معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

[۵۷۷] اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد جیسے اعمال کی توفیق پانے کے بعد بھی بندۂ مومن اپنے پروردگار کی رحمت کا امیدوار ہی ہوسکتا ہے، اِس لیے کہ نجات تو بہرحال خدا کی رحمت اور اُس کی مہربانی سے ہوگی۔ چنانچہ آگے فرمادیا ہے کہ اللہ غفور و رحیم ہے۔

[۵۷۸] عرب جاہلی کی روایات میں اِس کی جو صورت بیان ہوئی ہے، وہ یہ تھی کہ جب سرما کا موسم آتا، شمال کی ٹھنڈی ہوائیں چلتیں اور ملک میں قحط کی سی حالت پیدا ہو جاتی تو لوگ مختلف جگہوں پر اکٹھے ہوتے، شراب کے جام لنڈھاتے اور سرور و مستی کے عالم میں کسی کا اونٹ یا اونٹنی پکڑتے اور اُسے ذبح کر دیتے۔ پھر اُس کا مالک جو کچھ اُس کی قیمت مانگتا، اُسے دے دیتے اور اُس

لِلنَّاسِ ز وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ط وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۵ قُلِ الْعَفْوَ ط كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ

اور (اِس میں شبہ نہیں کہ) لوگوں کے لیے اِن میں کچھ فائدے بھی ہیں، لیکن اِن کا گناہ اِن کے اِن فائدوں سے کہیں بڑھ کر ہے[۵۷۹]۔ اور پوچھتے ہیں کہ (اچھا، یہ تو واضح کیجیے کہ) کیا خرچ کریں؟ کہہ دو کہ وہی جو ضرورت سے زیادہ ہے[۵۸۰]۔ اللہ اِسی طرح

کے گوشت پر جوا کھیلتے۔ اِس طرح کے موقعوں پر غربا و فقرا پہلے سے جمع ہو جاتے تھے اور اِن جوا کھیلنے والوں میں سے ہر شخص جتنا گوشت جیتتا جاتا، اُن میں لٹاتا جاتا۔ عرب جاہلی میں یہ بڑی عزت کی چیز تھی اور جو لوگ اِس قسم کی تقریبات منعقد کرتے یا اُن میں شامل ہوتے، وہ بڑے فیاض سمجھے جاتے تھے اور شاعر اُن کے جود و کرم کی داستانیں اپنے قصیدوں میں بیان کرتے تھے۔ اِس کے برعکس جو لوگ اِن تقریبات سے الگ رہتے، اُنھیں برم کہا جاتا جس کے معنی عربی زبان میں بخیل کے ہیں۔ جوے اور شراب کی یہی منفعت تھی جس کی بنا پر یہ سوال پیدا ہوا ہے۔

[۵۷۹] اصل الفاظ ہیں: 'اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا'۔ قرآن کے اِس جواب سے واضح ہے کہ دین میں حرمتوں کی بنیاد اخلاقی مضرت ہے۔ اِسے اشیا یا اعمال کے دوسرے فوائد اور نقصانات سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ اِس آیت میں 'نَفْع' کے بالمقابل 'اِثْم' کا لفظ استعمال کر کے قرآن نے یہی بتایا ہے۔ مادی یا طبی فوائد اور نقصانات کا تقابل پیش نظر ہوتا تو اِس کے بجائے 'ضرر' کا لفظ استعمال کیا جاتا۔

[۵۸۰] یعنی بار بار پوچھتے ہو تو اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ حال اور مستقبل کی ذاتی اور کاروباری ضرورتوں کے علاوہ جو کچھ تمھارے پاس موجود ہے، وہ معاشرے کا حق ہے۔ اللہ کی راہ میں انفاق کے تمام مطالبات اِسی سے متعلق ہیں۔ دین و شریعت کی رو سے انفاق کی جو ذمہ داری ایک مسلمان پر عائد ہوتی ہے، یہ اُس کی آخری حد ہے۔ اِس سے آگے کوئی مطالبہ اللہ تعالیٰ نے

تَتَفَكَّرُوْنَ ۙ﴿٢١٩﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

تمھارے لیے اپنی آیتوں کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم دنیا اور آخرت، دونوں کے معاملات میں غور کرتے رہو۔[۵۸۱] اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ (جنگ ہوئی اور لوگ مارے گئے تو اُن کے) یتیموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ کہہ دو: جس میں اُن کی بہبود ہو، وہی بہتر ہے۔ اور اگر تم (اُن کی ماؤں سے نکاح کر کے) اُنھیں اپنے ساتھ شامل

اُس سے نہیں کیا ہے۔

[۵۸۱] یہ کسی بات کو مجمل چھوڑ کر بعد میں لوگوں کے پوچھنے پر اُس کی وضاحت کا فائدہ بتایا ہے کہ اِس سے لوگوں کو دنیا اور آخرت کے معاملات میں غور و فکر کی تربیت حاصل ہوتی ہے۔ استاذ امام اِس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

> ”...اوپر کے سارے سوالات پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ سوالات جو پیدا ہوئے تو محض اِس وجہ سے پیدا ہوئے کہ لوگوں کی نگاہوں میں عام طور پر وہ توازن نہیں ہوتا جو دین اور دنیا، دونوں کے فوائد و مصالح کو صحیح صحیح تول سکے۔ اِس عدم توازن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر دین داری کی طرف میلان ہوا تو لوگ دین کو نری رہبانیت بنا کے رکھ دیتے ہیں، یہاں تک کہ جنگ و جہاد، خواہ کسی حالت میں بھی ہو، اُن کے ہاں خلاف تقویٰ قرار پا جاتا ہے۔ اور اگر دنیا داری کی طرف میلان ہوگا تو جوے اور شراب جیسی چیزوں کو بھی محض اِس خیال کی بنا پر نیکی قرار دینے کی کوشش کریں گے کہ آخر اِن میں بھی تو کچھ پہلو فائدے کے ہیں۔ قرآن نے فکر انسانی کی تربیت کی جو راہ اختیار کی ہے، وہ اِس عدم توازن کو دور کر کے اُس کو اِس قابل بناتی ہے کہ وہ دنیا اور آخرت، دونوں کا حق صحیح صحیح پہچان سکے۔“ (تدبر قرآن ۱/۵۱۷)

عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ

کرلو تو وہ تمھارے بھائی ہیں[۵۸۲]۔ اور اللہ جانتا ہے کہ کون بگاڑنے والا ہے اور کون اصلاح کرنے والا[۵۸۳]۔ اور اگر اللہ چاہتا تو (اِس کی اجازت نہ دے کر) تمھیں مشقت میں ڈال دیتا۔ بے شک، اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے[۵۸۴]۔ ۲۱۹-۲۲۰

اور (یتیموں کی بہبود کے مقصد سے بھی) مشرک[۵۸۵] عورتوں سے نکاح نہ کرو، جب

---

[۵۸۲] یعنی اِس معاملے میں اصل مقصود یتیموں کی بہبود ہے، اُسے ہر حال میں پیش نظر رہنا چاہیے۔ یہ مقصد اگر اُن کے معاملات کو الگ رکھ کر حاصل ہوتا ہے تو یہی کرو اور اگر اپنے ساتھ شامل کرکے زیادہ بہتر طریقے پر اُسے حاصل کر سکتے ہو تو اِس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ جس چیز میں اُن کی بہتری ہو، وہی بہتر ہے۔

[۵۸۳] یہ تنبیہ کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم میں سے ہر شخص کو معلوم ہونا چاہیے کہ لوگوں کی نیت اور ارادے اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں رہ سکتے۔ وہ جانتا ہے کہ اِس اقدام سے کس کے پیش نظر یتیم کی بہبود ہے اور کون اِس پردے میں کوئی دوسرا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا کوئی اِس اجازت سے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے۔

[۵۸۴] یعنی اگر یتیموں کو ساتھ شامل کیے بغیر اُن کی اور اُن کے معاملات کی دیکھ بھال کا مطالبہ کیا جاتا تو تم ایک بڑی مشقت میں پڑ جاتے، لیکن اللہ تعالیٰ حکیم ہے، اُس نے بڑا کرم فرمایا کہ تمھارے لیے سہولت کے ساتھ نیکی اور خدمت کی ایک راہ کھول دی۔ اِس پر تمھیں اپنے پروردگار کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ اِس سے کوئی غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو گے تو یاد رکھو کہ وہ عزیز بھی ہے۔ اُس کی پکڑ سے کوئی تمھیں بچا نہ سکے گا۔

مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ
مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ

تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ اور (یاد رکھو کہ) ایک مسلمان لونڈی کسی مشرک شریف زادی سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمھیں پسند ہو۔ اور اپنی عورتیں بھی مشرکوں کے نکاح میں نہ دو، جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ اور (یاد رکھو کہ) ایک مسلمان غلام کسی مشرک شریف زادے سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمھیں پسند ہو[۵۸۶]۔ یہ (مشرک

۵۸۵؎ اِس سے مراد مشرکین عرب ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ خاص اُنھی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ دنیا کی کوئی دوسری قوم اگر اُن کی طرح شرک کو بحیثیت دین اختیار کیے ہوئے ہو تو اُس کو بھی اِسی کے تحت سمجھنا چاہیے۔ یہود و نصاریٰ بھی علم و عمل، دونوں میں شرک جیسی نجاست سے آلودہ ہیں، لیکن وہ چونکہ اصلاً توحید کے ماننے والے ہیں اور شرک سے براءت کا اظہار کرتے ہیں، اِس لیے اتنی رعایت اللہ تعالیٰ نے کی ہے کہ آگے سورۂ مائدہ (۵) آیت ۵ میں اُن کی پاک دامن عورتوں سے مسلمانوں کو نکاح کی اجازت دے دی ہے۔

۵۸۶؎ یہ وضاحت اِس لیے فرمائی ہے کہ ایمان لانے کے بعد آدمی کی پسند اور ناپسند کے معیارات میں جو تبدیلی لازماً ہونی چاہیے، وہ لوگوں پر واضح ہو جائے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی تفسیر میں لکھا ہے:

> ”...اسلام میں پسند اور ناپسند کے لیے معیار نہ ظاہری شکل و صورت ہے، نہ نسل و نسب اور نہ آزادی اور غلامی، بلکہ ایمان اور عمل صالح ہے۔ اِس وجہ سے اب تمھارے رشتے ناتے ذاتوں اور برادریوں کے پابند نہیں رہ گئے، بلکہ عقیدے اور عمل کے تابع ہو گئے ہیں۔ قریش کی ایک مہ جبین شہزادی تمھارے لیے دو کوڑی کی ہے، اگر وہ ایمان کے زیور سے آراستہ نہیں ہے اور سواحل افریقہ کی ایک کالی کلوٹی لونڈی تمھارے لیے حور جنت ہے، اگر اُس کا دل جمال ایمان و

وَاللّٰهُ يَدۡعُوۡۤا اِلَى الۡجَنَّةِ وَالۡمَغۡفِرَةِ بِاِذۡنِهٖ‌ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ
لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ ﴿۲۲۱﴾

وَيَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡمَحِيۡضِ‌ ؕ قُلۡ هُوَ اَذًى ۙ فَاعۡتَزِلُوا النِّسَآءَ
فِى الۡمَحِيۡضِ‌ ۙ وَلَا تَقۡرَبُوۡهُنَّ حَتّٰى يَطۡهُرۡنَ‌ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرۡنَ

لوگ تمھیں) دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنی توفیق سے جنت اور مغفرت کی دعوت دیتا ہے،[۵۸۷] اور لوگوں کے لیے اپنی آیتوں کی وضاحت کرتا ہے تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ ۲۲۱

اور (نکاح کا ذکر ہوا ہے تو) وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ (عورتوں کے) حیض کا کیا حکم ہے؟[۵۸۸] کہہ دو: یہ ایک طرح کی نجاست ہے۔ چنانچہ حیض کی حالت میں عورتوں

اسلام سے نورانی ہے۔" (تدبر قرآن ۵۱۹/۱)

[۵۸۷] یہ اِس ممانعت کی حکمت بتائی ہے کہ مشرکوں کے ساتھ اِس طرح کا تعلق پیدا کرو گے تو گویا اپنے گھر کو جہنم کی دعوت کا مخاطب بناؤ گے، اِس لیے کہ شرک پر اصرار کرنے والوں کے لیے نہ خدا کی مغفرت میں کوئی حصہ ہے اور نہ اُن کے لیے اُس کی جنت کے دروازے کبھی کھل سکتے ہیں۔ یہ اپنا گھر جلانے کے لیے آگ خریدنا ہے۔ اِس طرح کی حماقت کوئی شخص ہوش و حواس کے ساتھ نہیں کر سکتا۔

[۵۸۸] دین کا مقصد ہی چونکہ تزکیہ ہے، اِس لیے حیض و نفاس کے دنوں میں عورتوں سے جنسی تعلق کو تمام الہامی مذاہب نے ممنوع ٹھیرایا ہے۔ دین ابراہیمی کے زیر اثر عرب جاہلیت بھی اِسے ناجائز ہی سمجھتے تھے۔ اُن کی شاعری میں اِس کا ذکر کئی پہلوؤں سے ہوا ہے۔ اِس معاملے میں کوئی اختلاف نہ تھا، لیکن عورت اِن ایام سے گزر رہی ہو تو اُس سے اجتناب کے حدود کیا ہیں، اِس

فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ

سے الگ رہو اور جب تک وہ خون سے پاک نہ ہو جائیں، اُن کے قریب نہ جاؤ۔ پھر جب وہ نہا کر پاکیزگی حاصل کر لیں تو اُن سے ملاقات کرو،[۵۸۹] جہاں سے اللہ نے تمھیں (اُس کا) حکم دیا ہے۔[۵۹۰] یقیناً اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو توبہ کرنے والے

میں، البتہ بہت کچھ افراط و تفریط پائی جاتی تھی۔ قرآن کے جواب سے واضح ہے کہ یہ سوال اِنھی حدود کے بارے میں تھا۔

۵۸۹ مدعا یہ ہے کہ اِس زمانے میں عورت سے علیحدگی کا تقاضا صرف زن و شو کے خاص تعلق ہی کے حد تک ہے۔ یہ نہیں کہ عورت کو بالکل اچھوت بنا کر رکھ دیا جائے، جیسا کہ یہود و ہنود اور بعض دوسری قوموں کا طریقہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے بھی یہی بات واضح فرمائی ہے کہ اِن ایام میں صرف مباشرت سے پرہیز کرنا چاہیے، باقی تمام تعلقات بغیر کسی تردد کے قائم رکھے جا سکتے ہیں۔

عورت ایام سے فارغ ہو جائے تو اِس کے بعد قربت کب جائز ہو گی؟ اِس کے لیے 'طُھر' اور 'تَطَھُّر' دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِن سے حکم کی جو صورت متعین ہوتی ہے، وہ استاذ امام کے الفاظ میں یہ ہے:

> ”...طہر کے معنی تو یہ ہیں کہ عورت کی ناپاکی کی حالت ختم ہو جائے اور خون کا آنا بند ہو جائے اور تطہر کے معنی یہ ہیں کہ عورت نہا دھو کر پاکیزگی کی حالت میں آ جائے۔ آیت میں عورت سے قربت کے لیے طہر کو شرط قرار دیا ہے اور ساتھ ہی فرما دیا ہے کہ جب وہ پاکیزگی حاصل کر لیں، تب اُن کے پاس آؤ جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ چونکہ قربت کی ممانعت کی اصلی علت خون ہے، اِس وجہ سے اِس کے انقطاع کے بعد یہ پابندی تو اٹھ جاتی ہے، لیکن صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب عورت نہا دھو کر پاکیزگی حاصل کر لے، تب اُس سے ملاقات کرو۔“ (تدبر قرآن ۱/ ۵۲۶)

۵۹۰ یعنی نہا دھو کر پاکیزگی حاصل کر لینے کے بعد عورت سے ملاقات لازماً اُسی راستے سے

الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿٢٢٢﴾ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ص فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ز

ہوں اور اُن کو جو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہوں۔[۵۹۱] تمھاری یہ عورتیں تمھارے لیے کھیتی ہیں،[۵۹۲] لہٰذا تم اپنی اِس کھیتی میں جس طرح چاہو، آؤ[۵۹۳] اور (اِس کے ذریعے سے دنیا

ہونی چاہیے جو اللہ نے اُس کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔ یہ چیز بدیہیات فطرت میں سے ہے اور اِس پہلو سے لاریب، خدا ہی کا حکم ہے۔ اگر کوئی شخص اِس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ درحقیقت خدا کے ایک واضح، بلکہ واضح تر حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے، اور اِس پر یقیناً اُس کے ہاں سزا کا مستحق ہو گا۔

۵۹۱ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اِن ہدایات کی کیا اہمیت ہے، یہ اُسے بیان فرمایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...توبہ اور تطہر کی حقیقت پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ توبہ اپنے باطن کو گناہوں سے پاک کرنے کا نام ہے اور تطہر اپنے ظاہر کو نجاستوں اور گندگیوں سے پاک کرنا ہے۔ اِس اعتبار سے اِن دونوں کی حقیقت ایک ہوئی اور مومن کی یہ دونوں خصلتیں اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہیں۔ اِس کے برعکس جو لوگ اِن سے محروم ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہیں۔ یہاں جس سیاق میں یہ بات آئی ہے، اُس سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ جو لوگ عورت کی ناپاکی کے زمانے میں قربت سے اجتناب نہیں کرتے یا قضاے شہوت کے معاملے میں فطرت کے حدود سے تجاوز کرتے ہیں، وہ اللہ کے نزدیک نہایت مبغوض ہیں۔“ (تدبر قرآن ۱/۵۲۶)

۵۹۲ اِس سے اوپر جو باتیں بیان ہوئی ہیں، یہ اب اُن کو کھیتی کے استعارے سے واضح فرمایا ہے۔ استاذ امام نے اِس کی وضاحت اِس طرح کی ہے:

> ”عورتوں کے لیے کھیتی کے استعارے میں ایک سیدھا سادہ پہلو تو یہ ہے کہ جس طرح کھیتی کے لیے قدرت کا بنایا ہوا یہ ضابطہ ہے کہ تخم ریزی ٹھیک موسم میں اور مناسب وقت پر کی جاتی ہے، نیز بیج کھیت ہی میں ڈالے جاتے ہیں، کھیت سے باہر نہیں پھینکے جاتے۔ کوئی کسان اِس ضابطے کی خلاف ورزی نہیں کرتا، اِسی طرح عورت کے لیے فطرت کا یہ ضابطہ ہے کہ ایام ماہواری کے

وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ

اور آخرت، دونوں میں) اپنے لیے آگے کی تدبیر کرو[۵۹۴] اور اللہ سے ڈرتے رہو اور

زمانے میں یا کسی غیر محل میں اُس سے قضاے شہوت نہ کی جائے، اِس لیے کہ حیض کا زمانہ عورت کے جمام اور غیر آمادگی کا زمانہ ہوتا ہے، اور غیر محل میں مباشرت باعث اذیت و اضاعت ہے۔ اِس وجہ سے کسی سلیم الفطرت انسان کے لیے اِس کا ارتکاب جائز نہیں۔'' (تدبر قرآن ۱/۵۲۷)

۵۹۳ اِس ہدایت سے کیا مقصود ہے؟ استاذ امام نے لکھا ہے:

''... (اِس) میں بہ یک وقت دو باتوں کی طرف اشارہ ہے: ایک تو اُس آزادی، بے تکلفی، خود مختاری کی طرف جو ایک باغ یا کھیتی کے مالک کو اپنے باغ یا کھیتی کے معاملے میں حاصل ہوتی ہے، اور دوسری اُس پابندی، ذمہ داری اور احتیاط کی طرف جو ایک باغ یا کھیتی والا اپنے باغ یا کھیتی کے معاملے میں ملحوظ رکھتا ہے۔ اِس دوسری چیز کی طرف 'حَرْثٌ' کا لفظ اشارہ کر رہا ہے اور پہلی چیز کی طرف 'اَنّٰى شِئْتُمْ' کے الفاظ۔ وہ آزادی اور یہ پابندی، یہ دونوں چیزیں مل کر اُس رویے کو متعین کرتی ہیں جو ایک شوہر کو بیوی کے معاملہ میں اختیار کرنا چاہیے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ازدواجی زندگی کا سارا سکون و سرور فریقین کے اِس اطمینان میں ہے کہ اُن کی خلوت کی آزادیوں پر فطرت کے چند موٹے موٹے قیود کے سوا کوئی قید، کوئی پابندی اور کوئی نگرانی نہیں ہے۔ آزادی کے اِس احساس میں بڑا کیف اور بڑا نشہ ہے۔ انسان جب اپنے عیش و سرور کے اِس باغ میں داخل ہوتا ہے تو قدرت چاہتی ہے کہ وہ اپنے اِس نشہ سے سرشار ہو، لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اُس کے سامنے قدرت نے رکھ دی ہے کہ یہ کوئی جنگل نہیں، بلکہ اُس کا اپنا باغ ہے اور یہ کوئی ویرانہ نہیں، بلکہ اُس کی اپنی کھیتی ہے۔ اِس وجہ سے وہ اِس میں آنے کو تو سو بار آئے اور جس شان، جس آن، جس سمت اور جس پہلو سے چاہے آئے، لیکن اِس باغ کا باغ ہونا اور کھیتی کا کھیتی ہونا یاد رکھے۔ اُس کے کسی آنے میں بھی اِس حقیقت سے غفلت نہ ہو۔'' (تدبر قرآن ۱/۵۲۷)

۵۹۴ یعنی ایسی اولاد پیدا کرو جو دنیا اور آخرت، دونوں میں تمھارے لیے سرمایہ بنے۔ اِس

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ

خوب جان لو کہ تمھیں (ایک دن) لازماً اُس سے ملنا ہے۔[۵۹۵] اور ایمان والوں کو، (اے پیغمبر، اِس ملاقات کے موقع پر فلاح و سعادت کی) خوش خبری سنا دو۔ ۲۲۲-۲۲۳

(عورتوں سے متعلق بعض دوسرے معاملات بھی ہیں، اِنھیں بھی سمجھ لو) اور اپنی قسموں کے لیے اللہ کے نام کو دوسروں سے حسن سلوک کرنے اور حدود الٰہی کی رعایت کرنے اور لوگوں کے مابین صلح کرانے میں رکاوٹ نہ بناؤ اور (متنبہ رہو کہ) اللہ سمیع و علیم ہے۔[۵۹۶] اللہ تمھاری اُن قسموں پر تو تمھیں نہیں پکڑے گا جو تم بے ارادہ کھا لیتے ہو، لیکن وہ قسمیں جو اپنے دل کے ارادے سے کھاتے ہو، اُن پر لازماً تمھارا مواخذہ

ہدایت کی ضرورت اِس لیے ہوئی کہ لوگ بچوں کی پیدایش کے معاملے میں اپنے اقدام کی ذمہ داری سمجھیں اور جو کچھ کریں، اِس ذمہ داری کو پوری طرح سمجھ کر کریں۔

[۵۹۵] مطلب یہ ہے کہ اِس وقت تو اللہ تعالیٰ نے تمھیں مہلت دے رکھی ہے، اِس لیے خلوت و جلوت میں جو چاہے، کر سکتے ہو، لیکن یاد رکھو کہ ایک دن خدا کے حضور میں پیشی کے لیے کھڑا ہونا ہے۔ لہٰذا جو کچھ کرنا ہے، یہ سوچ کر کرو کہ اُس کی پکڑ سے اُس دن کوئی تمھیں بچا نہ سکے گا۔

[۵۹۶] عورتوں سے نہ ملنے کی قسم کھا لینے کا جو حکم آگے بیان ہوا ہے، یہ اُس کی تمہید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی قسم کھانا چونکہ اُسے گواہ ٹھیرانا ہے، لہٰذا اول تو کوئی ایسی قسم کھانی نہیں چاہیے جس سے اللہ یا اُس کے بندوں کے حقوق تلف ہوتے ہوں، لیکن اِس طرح کی قسم اگر اتفاق سے

حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ج فَاِنْ

کرے گا اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ بخشنے والا ہے، وہ بڑا بردبار ہے۔[۵۹۷] (اِس لیے) جو لوگ اپنی بیویوں سے نہ ملنے کی قسم کھا بیٹھیں،[۵۹۸] اُن کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے۔

کوئی شخص کھا بیٹھے تو اُسے توڑ دینا چاہیے۔ قسم کے حیلے سے دوسروں کی حق تلفی اور نیکی اور تقویٰ اور نصح و خیر خواہی کے کاموں سے گریز کسی شخص کے لیے جائز نہیں ہے۔ اِس مضمون کے لیے 'اَنْ تَبَرُّوْا وَ تَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ' کے جو الفاظ اصل میں آئے ہیں، اُن کی وضاحت استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر میں اِس طرح کی ہے:

> ''بر، تقویٰ اور اصلاح کے تینوں لفظوں نے یہاں خیر اور نیکی کے تمام اقسام کو جمع کر لیا ہے۔
>
> 'بر' اُن تمام نیکیوں پر حاوی ہے جن کا تعلق والدین، رشتہ داروں، مسکینوں، یتیموں اور دوسرے حقوق العباد سے ہے۔ 'تَقْوٰی' اُن نیکیوں پر حاوی ہے جو حقوق اللہ سے متعلق ہیں اور 'اِصْلَاح' سے مراد وہ نیکیاں ہیں جو معاشرے سے تعلق رکھنے والی ہیں۔'' (تدبر قرآن ۱/۵۲۹)

۵۹۷ یعنی اِس طرح کی قسم تو ہر حال میں توڑ دینی چاہیے، لیکن اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اُس پر مواخذہ نہ ہو گا۔ اللہ اُن قسموں پر تو بے شک، نہیں پکڑیں گے جن کا تعلق دل سے نہیں ہوتا اور وہ بغیر کسی ارادے کے محض تکیۂ کلام کے طور پر زبان سے ٹپک پڑتی ہیں، مگر ایسی قسم جو پختہ عزم کے ساتھ اور دل کے ارادے سے کھائی گئی ہے، جس کے ذریعے سے کوئی عہد و پیمان باندھا گیا ہے، جس سے حقوق و فرائض پر کوئی اثر مترتب ہوتا ہے یا وہ خدا کی کسی تحلیل و تحریم پر اثر انداز ہو سکتی ہے، اُس پر لازماً پکڑیں گے۔ عام قاعدے کے مطابق اِس پکڑ سے بچنے کے لیے آدمی کو توبہ و استغفار کرنی چاہیے، لیکن قرآن نے آگے سورۂ مائدہ (۵) کی آیت ۸۹ میں بتایا ہے کہ توبہ کے ساتھ اِس کے لیے کفارہ ادا کرنا بھی ضروری ہے۔

۵۹۸ اِس کے لیے اصل میں 'اِیْلَاء' کا لفظ آیا ہے۔ یہ عرب جاہلیت کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم بیوی سے زن و شو کا تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا لینا ہے۔ اِس کے ساتھ حرف 'مِنْ' اِسی

فَاۤءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٢٦﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ
سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٢٧﴾

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ

پھر وہ رجوع کر لیں تو بے شک، اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔[599] اور اگر طلاق کا فیصلہ کر لیں تو اللہ سے ڈرتے ہوئے کریں، اِس لیے کہ اللہ سمیع و علیم ہے۔[600] ۲۲۶-۲۲۷

اور (یہ دوسری صورت پیدا ہو جائے تو) جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، وہ اپنے

مفہوم کے پیش نظر استعمال ہوا ہے۔ اِس طرح کی قسم اگر کھا لی جائے تو اِس سے بیوی چونکہ معلق ہو کر رہ جاتی ہے اور یہ چیز عدل و انصاف اور بر و تقویٰ کے منافی ہے، اِس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اِس کے لیے چار مہینے کی مدت مقرر کر دی ہے۔ شوہر پابند ہے کہ اِس کے اندر یا تو بیوی سے ازدواجی تعلقات بحال کر لے یا طلاق دینے کا فیصلہ ہے تو اُس کو طلاق دے دے۔

اِس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ عذر معقول کے بغیر بیوی سے ازدواجی تعلق منقطع کر لینا کسی شخص کے لیے جائز نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اِس کے لیے اگر قسم بھی کھا لی گئی ہے تو اُسے توڑ دینا ضروری ہے۔ یہ عورت کا حق ہے اور اِسے ادا نہ کرنے پر دنیا اور آخرت، دونوں میں شوہر کو مجرم قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہی معاملہ، ظاہر ہے کہ بیوی کا بھی ہو گا۔ وہ بھی کسی معقول وجہ کے بغیر شوہر کے ساتھ یہ تعلق قائم کرنے سے انکار نہیں کر سکتی۔

[599] یعنی اگرچہ یہ قسم حق تلفی کے لیے کھائی گئی تھی اور اِس طرح کی قسم کھانا کسی شخص کے لیے جائز نہیں ہے، لیکن اصلاح کر لی جائے تو اللہ تعالیٰ اِسے معاف فرما دیں گے۔

[600] یعنی اگر طلاق کا فیصلہ کر لیا ہے تو اِس میں اللہ کا قانون اور اُس کے حدود و قیود ہر حال میں پیش نظر رہنے چاہییں۔ اللہ ہر چیز کو سنتا اور جانتا ہے۔ کسی کے ساتھ کوئی زیادتی ہو گی تو وہ ہرگز اُس سے چھپی نہ رہے گی۔

لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا
اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ

آپ کو تین حیض[۶۰۱] تک انتظار کرائیں[۶۰۲]۔ اور اگر وہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں تو اُن کے لیے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ اللہ نے اُن کے پیٹ میں پیدا کیا ہے، اُسے چھپائیں[۶۰۳]۔ اور اُن کے شوہر اگر معاملات کی اصلاح چاہیں[۶۰۴] تو اِس (عدت کے)

---

[۶۰۱] اصل میں لفظ 'قُرُوْء' آیا ہے۔ یہ 'قرء' کی جمع ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ جس طرح حیض کے معنی کے لیے آتا ہے، اُسی طرح طہر کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں اِس کی تحقیق یہ بیان فرمائی ہے:

> ''...اِس کے اصل مادہ اور اُس کے مشتقات پر ہم نے جس قدر غور کیا ہے، اُس سے ہمارا رجحان اِسی بات کی طرف ہے کہ اِس کے اصل معنی تو حیض ہی کے ہیں، لیکن چونکہ ہر حیض کے ساتھ طہر بھی لازماً لگا ہوا ہے، اِس وجہ سے عام بول چال میں اِس سے طہر کو بھی تعبیر کر دیتے ہیں، جس طرح رات کے لفظ سے اِس کے ساتھ لگے ہوئے دن کو یا دن کے لفظ سے اِس کے ساتھ لگی ہوئی رات کو۔ اِس قسم کے استعمال کی مثالیں ہر زبان میں مل سکتی ہیں۔'' (۱/۵۳۲)

ہم نے اِسے حیض کے معنی میں لیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اصل مسئلہ ہی یہ متعین کرنے کا ہے کہ عورت حاملہ ہے یا نہیں، اور اِس کا فیصلہ حیض سے ہوتا ہے، نہ کہ طہر سے۔ پھر اِس کے لیے توقف کی مدت مقرر کی گئی ہے اور یہ بھی حیض سے بالکل متعین ہو جاتی ہے، اِس لیے کہ اُس کی ابتدا کے بارے میں کسی کو کوئی شبہ نہیں ہوتا۔

[۶۰۲] سورۂ طلاق میں جس عدت کے لحاظ سے طلاق دینے کا حکم دیا گیا ہے، یہ قرآن نے اُس کی وضاحت فرمائی ہے کہ وہ تین حیض ہے۔ عام حالات میں عدت یہی ہے۔ عورت کی بعض

عَلَيۡهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۲۸﴾

دوران میں زیادہ حق دار ہیں کہ اُنھیں لوٹا لیں اور (یہ اِس لیے ہے کہ اِس میں تو شبہ نہیں کہ) اِن عورتوں کے لیے بھی اُسی طرح حقوق ہیں، جس طرح دستور کے مطابق اُن پر (شوہروں کے) حقوق ہیں۔[۶۰۵] لیکن مردوں کے لیے (شوہر کی حیثیت سے) اُن پر ایک درجہ ترجیح کا ہے۔[۶۰۶] (یہ اللہ کا حکم ہے) اور اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔[۶۰۷] ۲۲۸

دوسری حالتوں کے لحاظ سے اِس کے احکام سورۂ طلاق (۶۵) کی آیات ۱-۷ اور سورۂ احزاب (۳۳) کی آیت ۴۹ میں بیان ہوئے ہیں۔

[۶۰۳] عدت کا حکم دیا ہی اِس لیے گیا ہے کہ عورت کے حاملہ ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ ہو جائے۔ لہٰذا وہ اگر اپنے پیٹ کی حالت چھپائے گی تو اِس سے اُن تمام مصالح کو سخت نقصان پہنچے گا جو اللہ تعالیٰ نے اِس حکم میں ملحوظ رکھے ہیں۔

[۶۰۴] شوہر کے لیے رجوع کا جو حق اِس آیت میں بیان ہوا ہے، اُس پر یہ شرط اِس لیے عائد کی گئی ہے کہ رجوع اِس ارادے سے نہیں ہونا چاہیے کہ بیوی کو اپنی خواہش کے مطابق اذیت دی جا سکے، بلکہ محبت اور سازگاری کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے کے لیے ہونا چاہیے۔

[۶۰۵] عورتوں کے اِن حقوق و فرائض کی تفصیل اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء (۴) کی آیات ۱۹ اور ۳۴ میں فرمائی ہے۔

[۶۰۶] یعنی طلاق سے رجوع کا یہ حق شوہر کو اِس لیے دیا گیا ہے کہ وہ خاندان کا سربراہ ہے۔ چنانچہ خاندان کے نظم کو قائم رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بیوی کے مقابلے میں اُس کے لیے ایک درجہ ترجیح کا رکھا ہے۔

[۶۰۷] اِس طرح کے معاملات چونکہ جذبات پر مبنی اقدامات اور افراط و تفریط کے رویوں کا

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ
وَلَا يَحِلُّ لَكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ شَيۡـًٔا اِلَّاۤ اَنۡ يَّخَافَاۤ
اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ

یہ طلاق (ایک رشتۂ نکاح میں) دو مرتبہ (دی جا سکتی) ہے۔[۶۰۸] اِس کے بعد پھر بھلے طریقے سے روک لینا ہے یا خوبی کے ساتھ رخصت کر دینا ہے۔ اور رخصت کر دینے کا فیصلہ ہو تو تمھارے لیے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم نے اِن عورتوں کو دیا ہے، اُس میں سے کچھ بھی اِس موقع پر واپس لو۔[۶۰۹] یہ صورت، البتہ مستثنیٰ ہے

باعث بن سکتے ہیں اور لوگ اِس میں چند در چند غلطیوں کا ارتکاب کر سکتے ہیں، اِس لیے آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنی دو صفات ـــــ عزیز و حکیم ـــــ کا حوالہ دیا ہے۔ استاذ امام اِن کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

> ”...خدا عزیز ہے، اِس وجہ سے اُسی کو حق ہے کہ وہ حکم دے اور وہ حکیم ہے، اِس وجہ سے جو حکم بھی اُس نے دیا ہے، وہ سراسر حکمت پر مبنی ہے۔ بندوں کا کام یہ ہے کہ اُس کے احکام کی بے چون و چرا اطاعت کریں۔ اگر وہ اُس کے احکام کی مخالفت کریں گے تو اُس کی غیرت و عزت کو چیلنج کریں گے اور اُس کے عذاب کو دعوت دیں گے اور اگر خدا سے زیادہ حکیم اور مصلحت شناس ہونے کے خبط میں مبتلا ہوں گے تو خود اپنے ہاتھوں اپنے قانون اور نظام، سب کا تیا پانچا کر کے رکھ دیں گے۔“ (تدبر قرآن ۱/ ۵۳۳)

۶۰۸؎ یعنی یہ طلاق جس کا ذکر اوپر ہوا ہے اور جس میں شوہر اپنا یہ فیصلہ زمانۂ عدت میں واپس لے سکتا ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ طلاق کے بعد اگر کسی شخص نے رجوع کر لیا ہے اور اُس کے بعد بھی نباہ نہیں ہو سکا تو اِسی رشتۂ نکاح میں اُس کو ایک مرتبہ پھر اِسی طرح طلاق دے کر عدت کے دوران میں رجوع کر لینے کا حق حاصل ہے، لیکن ایک رشتۂ نکاح میں دو مرتبہ اِس طرح طلاق اور طلاق سے رجوع کے بعد یہ حق کسی شخص کے لیے باقی نہیں رہتا۔

عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ حدود الٰہی پر قائم نہ رہ سکیں گے۔ پھر، (لوگو)، اگر تمھیں بھی اندیشہ ہو کہ وہ حدود الٰہی پر قائم نہیں رہ سکتے تو (شوہر کی دی ہوئی) اُن چیزوں کے معاملے میں اُن دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے جو عورت فدیے میں دے کر طلاق حاصل کر لے۔[۶۱۰] یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں، سو اِن سے آگے نہ بڑھو اور (جان لو

---

۶۰۹ اچھے طریقے سے رخصت کر دینے کی جو ہدایت اِس سے پہلے بیان ہوئی ہے، یہ اُس کی وضاحت ہے کہ بیوی کو کوئی مال، جایداد، زیورات اور ملبوسات وغیرہ، خواہ کتنی ہی مالیت کے ہوں، اگر تحفے کے طور پر دیے گئے ہیں تو اِس موقع پر اُن کا واپس لینا شوہر کے لیے جائز نہیں ہے۔ نان و نفقہ اور مہر تو عورت کا حق ہے، اُن کے واپس لینے یا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اِن کے علاوہ جو چیزیں دی گئی ہوں، اُن کے بارے میں بھی قرآن کا حکم ہے کہ وہ ہرگز واپس نہیں لی جا سکتیں۔

۶۱۰ یہ دی ہوئی چیزیں نہ لینے کے حکم سے استثنا ہے کہ میاں بیوی میں اگر حدود الٰہی کے مطابق نباہ ممکن نہ رہے، معاشرے کے ارباب حل و عقد بھی یہی محسوس کریں، لیکن میاں صرف اِس لیے طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو کہ اُس کے دیے ہوئے اموال بھی ساتھ ہی جائیں گے تو بیوی یہ اموال یا اِن کا کچھ حصہ واپس کر کے شوہر سے طلاق لے سکتی ہے۔ اِس طرح کی صورت حال اگر کبھی پیدا ہو جائے تو شوہر کے لیے اُسے لینا ممنوع نہیں ہے۔

آیت کے الفاظ سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ طلاق کا اختیار اللہ تعالیٰ نے مرد کو دیا ہے۔ اِس کی وجہ بھی واضح ہے۔ عورت کی حفاظت اور کفالت کی ذمہ داری ہمیشہ سے مرد پر ہے اور اُس کی اہلیت بھی قدرت نے اُسے ہی دی ہے۔ قرآن نے اِسی بنا پر اُسے قوام قرار دیا اور اِس سے پہلے آیت ۲۲۸ میں بہ صراحت فرمایا ہے کہ 'لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ' (شوہروں کو اُن پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہے)۔ چنانچہ

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَاۤ اَنْ يَّتَرَاجَعَاۤ اِنْ ظَنَّاۤ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾

کہ) جو اللہ کے حدود سے آگے بڑھتے ہیں، وہی ظالم ہیں[۶۱۱]۔ ۲۲۹

پھر اگر (دو مرتبہ طلاق سے رجوع کے بعد) شوہر نے (اِسی رشتۂ نکاح میں) بیوی کو (تیسری مرتبہ) طلاق دے دی تو اب وہ اُس کے لیے جائز نہ ہوگی، جب تک اُس کے سوا کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے۔ لیکن اگر اُس (دوسرے شوہر) نے بھی اُس کو طلاق دے دی تو پہلے میاں بیوی کے لیے ایک دوسرے کی طرف رجوع کر لینے میں کوئی مضایقہ نہیں ہے، اگر یہ توقع رکھتے ہوں کہ اب وہ حدود الٰہی پر قائم رہ سکیں گے[۶۱۲]۔ یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں جنھیں وہ اُن لوگوں کے لیے

ذمہ داری کی نوعیت اور حفظ مراتب، دونوں کا تقاضا ہے کہ طلاق کا اختیار شوہر ہی کو دیا جائے۔ اِس کے صاف معنی یہ ہیں کہ عورت اگر علیحدگی چاہے گی تو طلاق دے گی نہیں، بلکہ شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے گی۔ عام حالات میں توقع یہی ہے کہ ہر شریف النفس آدمی نباہ کی کوئی صورت نہ پا کر یہ مطالبہ مان لے گا، لیکن اگر ایسا نہ ہو تو عورت عدالت سے رجوع کر سکتی ہے۔

[۶۱۱] یہ جملہ اوپر کے تمام احکام و ہدایات سے متعلق ہے۔ استاذ امام اِس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

> ”...فرمایا کہ یہ تمھاری ازدواجی زندگی سے متعلق خدا کی حد بندیاں ہیں، جس طرح تم اپنے رقبوں اور اپنی چراگاہوں کے اردگرد حد بندیاں کرتے ہو اور یہ نہیں چاہتے کہ کوئی اِن حدوں کو توڑے اور اگر کوئی اِن حدود میں مداخلت کرتا ہے تو تم اُس کو اپنی ملکیت میں مداخلت اور اپنی عزت و غیرت کے لیے ایک چیلنج سمجھتے ہو، اُسی طرح خدا نے بھی اپنے محارم کے اردگرد یہ حدیں قائم کر دی ہیں۔ تم اِن سے باہر آزاد ہو، لیکن اِن کے اندر تمھیں مداخلت کی اجازت نہیں ہے۔

> اگر کسی نے اِن حدوں کو توڑنے یا لانگنے کی جسارت کی تو وہ یاد رکھیں کہ وہی لوگ ظالم ہیں۔ یعنی اِس کے نتیجے میں جو کچھ اِس دنیا میں یا آخرت میں اُن کے سامنے آئے گا، اُس کی ساری ذمہ داری خود اُنھیں پر ہے، خدا پر نہیں ہے اور اِس سے وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھائیں گے، خدا کا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ خدا کے قوانین تمام تر فطرت انسانی کے تقاضوں اور بندوں کے اپنے مصالح پر مبنی ہیں۔ اِسی وجہ سے جو لوگ اُن کو توڑتے ہیں، وہ اپنی ہی فطرت اور اپنے ہی مصالح کی دھجیاں خود اپنے ہی ہاتھوں بکھیرتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۵۳۶)

۶۱۲؎ تیسری مرتبہ طلاق کے بعد رجوع کا حق تو باقی نہیں رہتا، لیکن وہی میاں بیوی اگر دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو اِس کے لیے قرآن نے یہاں تین شرطیں بیان فرمائی ہیں:

ایک یہ کہ عورت کسی دوسرے شخص کے ساتھ نکاح کرے۔

دوسری یہ کہ اُس سے بھی نباہ نہ ہو سکے اور وہ اُسے طلاق دے دے۔

تیسری یہ کہ وہ دونوں سمجھیں کہ دوبارہ نکاح کے بعد اب وہ حدود الٰہی پر قائم رہ سکیں گے۔

پہلی اور دوسری شرط میں نکاح سے مراد عقد نکاح اور طلاق سے مراد وہی طلاق ہے جو آدمی نباہ نہ ہونے کی صورت میں علیحدگی کا فیصلہ کر لینے کے بعد اپنی بیوی کو دیتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''اصل یہ ہے کہ لفظ نکاح شریعت اسلامی کی ایک معروف اصطلاح ہے جس کا اطلاق ایک عورت اور مرد کے اُس ازدواجی معاہدے پر ہوتا ہے جو زندگی بھر کے نباہ کے ارادے کے ساتھ زن و شو کی زندگی گزارنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اگر یہ ارادہ کسی نکاح کے اندر نہیں پایا جاتا تو وہ فی الحقیقت نکاح ہی نہیں ہے، بلکہ وہ ایک سازش ہے جو ایک عورت اور ایک مرد نے باہم مل کر کر لی ہے۔ نکاح کے ساتھ شریعت نے طلاق کی جو گنجایش رکھی ہے تو وہ اصل اسکیم کا کوئی جزو نہیں ہے، بلکہ یہ کسی ناگہانی افتاد کے پیش آ جانے کا ایک مجبورانہ مداوا ہے۔ اِس وجہ سے نکاح کی اصل فطرت یہی ہے کہ وہ زندگی بھر کے سنجوگ کے ارادے کے ساتھ عمل میں آئے۔ اگر کوئی نکاح واضح طور پر محض ایک معین و مخصوص مدت تک ہی کے لیے ہو تو اُس کو متعہ کہتے ہیں اور متعہ اسلام میں قطعی حرام ہے۔ اِسی طرح اگر کوئی شخص اِس نیت سے کسی عورت سے نکاح کرے کہ

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ز وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ

واضح کر رہا ہے جو علم حاصل کرنا چاہتے ہوں[۶۱۳]۔ ۲۳۰

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور اُن کی عدت پوری ہونے کو آ جائے تو اُنھیں بھلے طریقے سے روک لو یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو اور اُنھیں نقصان پہنچانے کے ارادے سے ہرگز نہ روکو کہ اِس طرح اُن پر زیادتی کرو۔ اور (جان لو کہ) جو ایسا کرے گا، وہ اپنی ہی جان پر ظلم ڈھائے گا۔ اور اللہ کی آیتوں کو مذاق نہ بناؤ، اور اپنے اوپر اللہ کی عنایت کو یاد رکھو، اور اُس قانون اور حکمت کو یاد رکھو جو اُس نے تم پر

اِس نکاح کے بعد طلاق دے کر وہ اُس عورت کو اُس کے پہلے شوہر کے لیے جائز ہونے کا حیلہ فراہم کرے تو شریعت کی اصطلاح میں یہ حلالہ ہے اور یہ بھی اسلام میں متعہ ہی کی طرح حرام ہے۔ جو شخص کسی کی مقصد برآری کے لیے یہ ذلیل کام کرتا ہے، وہ درحقیقت ایک قرم ساق یا بھڑوے یا جیسا کہ حدیث میں وارد ہے 'کرایے کے سانڈ' کا رول ادا کرتا ہے اور ایسا کرنے والے اور ایسا کروانے والے پر اللہ کی لعنت ہے۔'' (تدبر قرآن ۱/۵۳۷)

تیسری شرط اِس لیے عائد کی گئی ہے کہ نکاح و طلاق کو لوگ بچوں کا کھیل نہ سمجھیں اور متنبہ رہیں کہ کسی عورت کو طلاق دینی ہے تو خدا سے ڈرتے ہوئے اور نباہ کی کوئی صورت نہ پا کر دی جائے، اور اُس سے نکاح کرنا ہے تو یہ لازماً دل کے سچے ارادے اور سازگاری کی مخلصانہ خواہش کے ساتھ کیا جائے۔ اِس سے مختلف کوئی رویہ اختیار کرنا کسی بندۂ مومن کے لیے اِس معاملے میں جائز نہیں ہے۔

[۶۱۳] اصل میں 'لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ عربی زبان میں فعل جس طرح ظاہری

يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۳۱﴾
وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ

اتاری ہے، جس کی وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان رکھو کہ اللہ ہر چیز سے واقف ہے[۶۱۴]۔ ۲۳۱

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو اب اِس میں مانع نہ

یا حقیقی مفہوم کے لیے استعمال ہوتا ہے، اُسی طرح ارادۂ فعل کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں یہ اِسی مفہوم میں ہے اور ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

[۶۱۴] یہ بھلے طریقے سے روکنے کی وضاحت فرمائی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...مثبت پہلو سے بات اوپر کہہ چکنے کے بعد منفی پہلو سے بھی اُس کی وضاحت اِس لیے کر دی گئی کہ ظالم لوگ طلاق اور طلاق کے بعد مراجعت کے شوہری حق کو اِس ظلم کے لیے استعمال کر سکتے تھے۔ حالاں کہ یہ صریح اعتدا، یعنی اللہ کے حدود سے تجاوز اور اُس کی شریعت کو مذاق بنانا ہے۔ فرمایا کہ جو ایسی جسارت کرتے ہیں، بظاہر تو وہ ایک عورت کو نشانۂ ظلم بناتے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ سب سے بڑا ظلم اپنی جان پر کرتے ہیں، کیونکہ اللہ کے حدود کو پھاندنے اور اُس کی شریعت کو مذاق بنانے کی سزا بڑی ہی سخت ہے۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ کے اِس احسان کو یاد رکھو کہ اُس نے تمھیں ایک برگزیدہ امت کے منصب پر سرفراز فرمایا، تمھاری ہدایت کے لیے تمھارے اندر اپنا نبی بھیجا، تمھیں خیر و شر اور نیک و بد سے آگاہ کرنے کے لیے تمھارے اوپر اپنی کتاب اتاری جو قانون اور حکمت، دونوں کا مجموعہ ہے۔ اللہ کی ایسی عظیم نعمتیں پانے کے بعد اگر تم نے اُن کا یہی حق ادا کیا کہ خدا کے حدود کو توڑا اور اُس کی شریعت کو مذاق بنایا تو سوچ لو کہ ایسے لوگوں کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ پھر فرمایا کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان رکھو کہ وہ تمھاری ہر بات سے باخبر ہے، یعنی وہ لوگوں کی شرارتوں کے باوجود اُن کو ڈھیل تو دیتا ہے، لیکن جب وہ پکڑے گا تو اُس کی پکڑ سے کوئی بھی چھوٹ نہ سکے گا۔“ (تدبر قرآن ۱/۵۳۹)

يَنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ
بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ
وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۲۳۲)

ہو کہ وہ اپنے ہونے والے شوہروں سے نکاح کر لیں، جب وہ دستور کے مطابق آپس میں معاملہ کرنے کے لیے راضی ہو جائیں۔ یہ نصیحت تم میں سے اُن لوگوں کو کی جاتی ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہی تمھارے لیے زیادہ شایستہ اور زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔[۶۱۵] **۲۳۲**

---

[۶۱۵] طلاق کے بعد جو چیزیں باعث نزاع ہو سکتی ہیں، یہ اُن کا حکم ہے۔ فرمایا کہ جب ایک عورت کو طلاق دے دی گئی ہے تو اب اُس کے کسی فیصلے میں رکاوٹ بننے کا حق پہلے شوہر کے لیے باقی نہیں رہا، عام اِس سے کہ وہ صریح ممانعت کی صورت میں ہو یا کسی سازش اور جوڑ توڑ کے انداز میں۔ طلاق کے بعد عورت جب چاہے اور جہاں چاہے شادی کر سکتی ہے۔ اُس کا یہ فیصلہ اگر دستور کے مطابق ہے تو اُس پر کسی اعتراض کی گنجایش نہیں ہو سکتی۔ اِس کے لیے اصل میں 'بِالْمَعْرُوْفِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِس سے مقصود یہ ہے کہ عورت اور مرد، دونوں اپنے معاملات طے کرنے میں آزاد ہیں، لیکن اتنی بات بہر حال ضروری ہے کہ اُس میں کوئی ایسی چیز نہیں ہونی چاہیے جو شرفا کی روایات کے خلاف ہو اور جس سے پہلے شوہر یا ہونے والے شوہر یا خود عورت کے خاندان کی عزت اور شہرت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

آیت کے آخری حصے کی وضاحت میں استاذ امام نے لکھا ہے:

> "...یہ نصیحتیں اُن لوگوں کو کی جا رہی ہیں جو اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہیں، یعنی جن لوگوں کے اندر خدا اور آخرت پر ایمان موجود ہے، اُن کے ایمان کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ اِن نصیحتوں پر عمل کریں۔ پھر فرمایا کہ یہ تمھارے لیے زیادہ پاکیزہ اور ستھرا طریقہ ہے۔ یعنی اگر عورت کی

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ
يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ
لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ
بِوَلَدِهٖ ۗ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ
مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا

اور (طلاق کے بعد بھی) مائیں اُن لوگوں کے لیے جو دودھ کی مدت پوری کرنا چاہتے ہوں، اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں گی اور بچے کے باپ کو (اِس صورت میں) دستور کے مطابق اُن کا کھانا کپڑا دینا ہوگا۔ کسی پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ نہ کسی ماں کو اُس کے بچے کی وجہ سے نقصان پہنچایا جائے اور نہ کسی باپ کو اُس کے بچے کے سبب سے ـــــ اور اِسی طرح کی ذمہ داری اُس کے وارث پر بھی ہے ـــــ پھر اگر دونوں باہمی رضامندی اور آپس کے مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور اگر تم اپنے بچوں کو کسی اور

حسب مرضی نکاح کی راہ میں رکاوٹ پیدا کی گئی تو اِس سے خاندان اور پھر معاشرے میں بہت سی برائیاں پھیلنے کے اندیشے ہیں۔ یہیں سے خفیہ روابط، پھر زنا، پھر اغوا اور فرار کے بہت سے چور دروازے پیدا ہوتے ہیں اور ایک دن اُن سب کی ناک کٹ کے رہتی ہے جو ناک ہی اونچی رکھنے کے زعم میں فطری جذبات کے مقابل میں بے ہودہ رسوم کی رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ یعنی تمھارا علم اور تمھاری نظر بہت محدود ہے، تمھارے لیے زندگی کے تمام نشیب و فراز کو سمجھ لینا بڑا مشکل ہے، اِس وجہ سے جو کچھ تمھیں خدا کی طرف سے حکم دیا جا رہا ہے، اُس پر عمل کرو۔'' (تدبر قرآن ۱/۵۴۴)

اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ط
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

سے دودھ پلوانا چاہو تو اِس میں بھی تمھارے لیے کوئی مضایقہ نہیں، بشرطیکہ (بچے کی ماں سے) جو کچھ تم نے دینا طے کیا ہے، وہ دستور کے مطابق اُسے دے دو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔[۶۱۶] ۲۳۳

---

۶۱۶ طلاق کے بعد بچے کی رضاعت کے جو احکام اِس آیت میں بیان ہوئے ہیں، اُن کا خلاصہ استاذ امام امین احسن اصلاحی کے الفاظ میں یہ ہے:

> ”مطلقہ پر اپنے بچے کو پورے دو سال دودھ پلانے کی ذمہ داری ہے، اگر طلاق دینے والا شوہر یہ چاہتا ہے کہ عورت یہ رضاعت کی مدت پوری کرے۔
>
> اِس مدت میں بچے کے باپ پر مطلقہ کے کھانے کپڑے کی ذمہ داری ہے اور اِس معاملے میں دستور کا لحاظ ہو گا، یعنی شوہر کی حیثیت، عورت کی ضروریات اور مقام کے حالات پیش نظر رکھ کر فریقین فیصلہ کریں گے کہ عورت کو نان ونفقہ کے طور پر کیا دیا جائے۔
>
> فریقین میں سے کسی پر بھی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جائے گا، نہ بچے کے بہانے سے ماں کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے گی، اور نہ بچے کی آڑ لے کر باپ پر کوئی ناروا دباؤ ڈالا جائے گا۔
>
> اگر بچے کا باپ وفات پا چکا ہو تو بعینہٖ یہی پوزیشن مذکورہ ذمہ داریوں اور حقوق کے معاملے میں اُس کے وارث کی ہو گی۔
>
> اگر باہمی رضامندی اور مشورے سے دو سال کی مدت کے اندر ہی اندر بچے کا دودھ چھڑا دینے کا عورت مرد فیصلہ کر لیں تو وہ ایسا کر سکتے ہیں۔
>
> اگر باپ یا بچے کے ورثا بچے کی والدہ کی جگہ کسی اور عورت سے دودھ پلوانا چاہتے ہیں تو وہ ایسا کرنے کے مجاز ہیں، بشرطیکہ بچے کی والدہ سے دینے دلانے کی جو قرارداد ہوئی ہے، وہ

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾

اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑیں تو وہ بھی اپنے آپ کو چار مہینے دس دن انتظار کرائیں۔[۶۱۷] پھر جب اُن کی عدت پوری ہو جائے تو اپنے حق میں دستور کے مطابق جو کچھ وہ کریں، اُس کا تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔[۶۱۸] اور

پوری کر دی جائے۔'' (تدبر قرآن ۱/۵۴۵)

۶۱۷ بیوہ کی عدت میں عام مطلقہ کی نسبت سے یہ اضافہ اِس لیے ہوا ہے کہ اُس کو تو ایسے طہر میں طلاق دینے کی ہدایت کی گئی ہے جس میں شوہر سے اُس کی ملاقات نہ ہوئی ہو، لیکن بیوہ کے لیے اِس طرح کا ضابطہ بنانا چونکہ ممکن نہیں ہے، اِس لیے احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ دن بڑھا دیے جاتے۔ قرآن نے یہی کیا ہے اور مطلقہ کی نسبت سے اُس کی مدت ایک ماہ دس دن زیادہ مقرر کر دی ہے۔

مطلقہ اور بیوہ کے لیے عدت کا حکم چونکہ ایک ہی مقصد سے دیا گیا ہے، اِس لیے جو مستثنیات طلاق کے حکم میں بیان ہوئے ہیں، وہ بیوہ کی عدت میں بھی اُسی طرح ملحوظ ہوں گے۔ چنانچہ بیوہ غیر مدخولہ کے لیے کوئی عدت نہیں ہو گی اور حاملہ کی عدت وضع حمل کے بعد ختم ہو جائے گی۔ روایتوں میں ہے کہ ایک حاملہ عورت، سبیعہ رضی اللہ عنہا نے جب اپنا معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے یہی فیصلہ فرمایا۔*

۶۱۸ یعنی عدت گزر جائے تو اِس کے بعد وہ آزاد ہے اور اپنے معاملے میں جو قدم مناسب سمجھے اٹھا سکتی ہے۔ معاشرے کے دستور کی پابندی، البتہ اُسے کرنی چاہیے۔ یعنی ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہیے جس سے متعلق خاندانوں کی عزت، شہرت، وجاہت اور اچھی روایات کو نقصان پہنچنے کا

---

* بخاری، رقم ۵۳۲۰۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ
اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ
وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا
مَّعْرُوْفًا ؕ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا
اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾

جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے خوب جانتا ہے۔ اور تمھارے لیے اِس میں بھی کوئی گناہ نہیں جو تم اشارے کنایے میں نکاح کا پیغام اُن عورتوں کو دو یا اُس کو اپنے دل میں چھپائے رکھو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم اُن سے یہ بات تو کرو گے ہی۔ سو کرو، لیکن (اِس میں) کوئی وعدہ اُن سے چھپ کر نہ کرنا۔ ہاں، دستور کے مطابق کوئی بات، البتہ کہہ سکتے ہو۔ اور نکاح کی گرہ اُس وقت تک نہ باندھو، جب تک قانون اپنی مدت پوری نہ کر لے۔ اور جان رکھو کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے، اِس لیے اُس سے ڈرو اور جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا ہے، وہ بڑا بردبار ہے۔[۶۱۹] ۲۳۴-۲۳۵

اندیشہ ہو۔ یہ ملحوظ رہے تو اُس پر یا اُس کے اولیا پر پھر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...مطلب یہ ہے کہ غیر شرعی رسوم کو شریعت کا درجہ دے کر خواہ مخواہ ایک دوسرے کو موردِ طعن و الزام نہیں بنانا چاہیے۔ نہ شوہر کے وارثوں اور عورت کے اولیا کو یہ طعنہ دینا چاہیے کہ عورت اپنے شوہر کا پورا سوگ بھی نہ منا چکی کہ وہ اُس سے تنگ آ گئے اور نہ عورت کو یہ طعنہ دینا چاہیے کہ ابھی شوہر کا کفن بھی میلا نہ ہونے پایا تھا کہ یہ شادی رچانے اٹھ کھڑی ہوئی۔ خدا نے جو حدود مقرر کر دیے ہیں، بس اُنھی کی پابندی کرنی چاہیے اور اِس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ بندوں کے ہر عمل سے باخبر ہے۔“ (تدبر قرآن ۱/۵۴۶)

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖۚ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ

اور اگر تم عورتوں کو اِس صورت میں طلاق دو کہ تم نے اُنھیں ہاتھ نہیں لگایا یا اُن کا مہر مقرر نہیں کیا تو مہر کے معاملے میں[۶۲۰] تم پر کچھ گناہ نہیں ہے، مگر یہ تو لازماً ہونا

۶۱۹؎ یعنی اگر کوئی شخص بیوہ سے نکاح کرنا چاہتا ہو تو عدت کے دوران میں وہ یہ تو کر سکتا ہے کہ اپنے دل میں اُس کا ارادہ کر لے یا اشارے کنایے میں کوئی بات زبان سے نکال دے، لیکن اُس کے لیے ہرگز جائز نہیں ہے کہ ایک غم زدہ خاندان کے جذبات کا لحاظ کیے بغیر عورت کو نکاح کا پیغام بھیجے یا کوئی خفیہ عہد و پیمان کرے۔ اِس طرح کے موقعوں پر جو بات بھی کی جائے، اُسے ہم دردی اور تعزیت کے اظہار تک ہی محدود رہنا چاہیے۔ چنانچہ تنبیہ فرمائی ہے کہ اللہ خوب جانتا ہے کہ تم اپنا یہ ارادہ ظاہر کرو گے، مگر اِس طرح نہیں کہ نکاح کی پینگیں بڑھانا شروع کر دو، قول و قرار کرو یا چھپ کر کوئی عہد باندھ لو۔ اِس کا انداز وہی ہونا چاہیے جو ایسے حالات میں پسندیدہ اور دستور کے موافق سمجھا جاتا ہے۔ عدت گزر جائے تو اِن عورتوں سے نکاح کا فیصلہ، البتہ کر سکتے ہو۔ اِس کے بعد تم پر کوئی الزام نہیں ہے۔

اِس سے یہ بات نکلتی ہے کہ زمانۂ عدت میں عورت کا رویہ بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی بنا پر عورتوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ اگر اپنے مرحوم شوہر کے گھر میں اُس کے لیے عدت گزار رہی ہیں تو سوگ کی کیفیت میں گزاریں اور زیب و زینت کی کوئی چیز استعمال نہ کریں۔ روایتوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا: بیوہ عورت رنگین کپڑے نہیں پہنے گی، نہ زرد، نہ گیرو سے رنگے ہوئے۔ وہ زیورات استعمال نہیں کرے گی اور نہ مہندی اور سرمہ لگائے گی۔*

۶۲۰؎ 'لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ' کے ساتھ یہ الفاظ اصل میں عربیت کے اسلوب پر اِس جملے میں حذف ہیں۔ ہم نے ترجمے میں اِنھیں کھول دیا ہے۔

---

* ابوداؤد، رقم ۱۹۶۰۔

قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾ وَاِنْ
طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً
فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ
النِّكَاحِ ؕ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ

چاہیے کہ دستور کے مطابق اُنھیں کچھ سامان زندگی دے کر رخصت کرو، اچھی حالت والے اپنی حالت کے مطابق اور غریب اپنی حالت کے مطابق۔ یہ حق ہے اُن پر جو احسان کا رویہ اختیار کرنے والے ہوں۔[۶۲۱] لیکن تم نے اگر طلاق تو اُنھیں ہاتھ لگانے سے پہلے دی، مگر اُن کا مہر مقرر کر چکے ہو تو مقررہ مہر کا نصف اُنھیں دینا ہوگا، الّا یہ کہ وہ اپنا حق چھوڑ دیں یا وہ چھوڑ دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔[۶۲۲]

---

[۶۲۱] یعنی اُن عورتوں کو بھی سوسائٹی کے دستور اور اپنے معاشی حالات کے لحاظ سے کچھ سامان زندگی دے کر رخصت کرو جن سے خلوت نہ ہوئی ہو یا جنھیں مہر مقرر کیے بغیر طلاق دے دی جائے۔

[۶۲۲] یعنی مہر مقرر ہو اور ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق کی نوبت پہنچ جائے تو مقررہ مہر کا نصف ادا کرنا ہوگا، الّا یہ کہ عورت اپنی مرضی سے پورا چھوڑ دے یا مرد پورا ادا کر دے۔ اِس کے لیے اصل میں 'اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ مجانست کا اسلوب ہے اور 'الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ' سے مراد ہمارے نزدیک شوہر ہے، اِس لیے کہ نکاح کی گرہ بندھ جائے تو اُس کو کھولنے کا اختیار پھر اُسی کے پاس ہوتا ہے۔ عورت علیحدگی چاہے تو وہ بھی اِس گرہ کو خود نہیں کھول سکتی، بلکہ اُسی سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اِس کو کھول دے۔ اِس میں غائب کے اسلوب پر کوئی تردد نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بالکل اُسی طرح آ گیا ہے، جس طرح آیت ۲۲۹ کے الفاظ 'اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ' میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ﴿۲۳۷﴾
حٰفِظُوۡا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الۡوُسۡطٰى ۚ وَقُوۡمُوۡا لِلّٰهِ قٰنِتِيۡنَ ﴿۲۳۸﴾

اور یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے کہ تم مرد اپنا حق چھوڑ دو اور اپنے درمیان کی فضیلت نہ بھولو۔ بے شک اللہ دیکھ رہا ہے اُس کو جو تم کر رہے ہو۔[۶۲۳] ۲۳۶-۲۳۷

(یہ خدا کی شریعت ہے۔ اِس پر قائم رہنا چاہتے ہو تو) اپنی نمازوں کی حفاظت کرو،[۶۲۴] خاص کر اُس نماز کی جو (دن اور رات کی نمازوں کے) بیچ میں آتی ہے،[۶۲۵]

---

[۶۲۳] استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

> ”...اگرچہ ایک محرک عورت کے لیے بھی مہر چھوڑنے کا موجود ہے کہ شوہر نے ملاقات سے پہلے ہی طلاق دی ہے، لیکن قرآن نے مرد کو اکسایا ہے کہ اُس کی فتوت اور مردانہ بلند حوصلگی اور اُس کے درجے مرتبے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ عورت سے اپنے حق کی دست برداری کا خواہش مند نہ ہو، بلکہ اِس میدان ایثار میں خود آگے بڑھے۔ اِس ایثار کے لیے قرآن نے یہاں مرد کو تین پہلوؤں سے ابھارا ہے: ایک تو یہ کہ مرد کو خدا نے یہ فضیلت بخشی ہے کہ وہ نکاح کی گرہ کو جس طرح باندھنے کا اختیار رکھتا ہے، اُسی طرح اُس کو کھولنے کا بھی مجاز ہے۔ دوسرا یہ کہ ایثار و قربانی جو تقویٰ کے اعلیٰ ترین اوصاف میں سے ہے، وہ جنس ضعیف کے مقابل میں جنس قوی کے شایان شان زیادہ ہے۔ تیسرا یہ کہ مرد کو خدا نے اُس کی صلاحیتوں کے اعتبار سے عورت پر جو ایک درجہ ترجیح کا بخشا ہے اور جس کے سبب سے اُس کو عورت کا قوام اور سربراہ بنایا ہے، یہ ایک بہت بڑی فضیلت ہے جس کو عورت کے ساتھ کوئی معاملہ کرتے وقت مرد کو بھولنا نہیں چاہیے۔ اِس فضیلت کا فطری تقاضا یہ ہے کہ مرد عورت سے لینے والا نہیں، بلکہ اُس کو دینے والا بنے۔“
>
> (تدبر قرآن ۱/۵۴۸)

[۶۲۴] یعنی ہر طرح کی مشکلات اور پر خطر حالات میں بھی اُن کی حفاظت کی جائے۔ اِس میں، ظاہر ہے کہ اُن تمام چیزوں کی نگہداشت اور اُن کا اہتمام بھی شامل ہے جو نماز کے شرائط و

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ
مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾

(جب تمھارے لیے اپنی مصروفیتوں سے نکلنا آسان نہیں ہوتا)، اور (سب کچھ چھوڑ کر) اللہ کے حضور میں نہایت ادب کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ پھر اگر خطرے کا موقع ہو تو پیدل یا سواری پر، جس طرح چاہے پڑھ لو۔ لیکن جب امن ہو جائے تو اللہ کو اُسی طریقے[۶۲۶] سے یاد کرو،[۶۲۷] جو اُس نے تمھیں سکھایا ہے، جسے تم نہیں جانتے

ارکان یا اُس کے آداب سے تعلق رکھتی ہیں اور اِس طرح کی صورت حال میں لوگ بالعموم اُن سے بے پروا ہو جاتے ہیں۔

۶۲۵ اِس سے مراد عصر کی نماز ہے۔ یہ اُن حالات کی رعایت سے فرمایا ہے جن میں قرآن نازل ہوا۔ تمدن کی تبدیلی یا حالات کے تغیر سے یہی صورت اگر کسی اور نماز کی ہو جائے تو اُس کا حکم بھی یہی ہو گا۔

۶۲۶ یعنی نماز کا وہ طریقہ جو انبیا علیہم السلام کی تعلیم سے انسان نے سیکھا ہے۔ دین ابراہیمی کے پیرو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی اِس طریقے سے واقف تھے اور اُن کے صالحین اِس کے مطابق نماز ادا کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کی اصلاح و تجدید فرمائی اور اِسے ایک سنت کی حیثیت سے پورے اہتمام کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں جاری کر دیا۔ یہاں امی عربوں کو خاص طور پر توجہ دلائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کے ذریعے سے اِس نوعیت کی جو تعلیم اُنھیں دی ہے، یہ اُس کا اُن پر بہت بڑا کرم ہے۔ اِس کا جواب اُن کی طرف سے یہی زیبا ہے کہ وہ اِس کی قدر کریں، بنی اسرائیل کی طرح اِس کی ناقدری نہ کریں۔

۶۲۷ نماز کی اصل حقیقت اللہ کی یاد ہی ہے۔ یہ قرآن نے نہایت خوبی کے ساتھ اِس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ

تھے۔[۶۲۸] ۲۳۸-۲۳۹

اور ہاں،[۶۲۹] (بیوہ اور مطلقہ کے بارے میں جو ہدایات تمھیں دی گئی ہیں، اُن سے متعلق یہ وضاحت ضروری ہے کہ) تم میں سے جو لوگ وفات پائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ رہے ہوں، وہ اپنی اُن بیویوں کے لیے سال بھر کے نان ونفقہ کی وصیت کر جائیں اور یہ بھی کہ (اِس عرصے میں) اُنھیں گھر سے نہ نکالا جائے۔[۶۳۰] لیکن

---

۶۲۸ سورہ کی تیسری فصل یہاں ختم ہو رہی ہے۔ یہ احکام شریعت کی فصل تھی جسے اللہ تعالیٰ نے نماز کی تاکید پر ختم کیا ہے۔ اِس سے جس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ دین میں جو اہمیت نماز کی ہے، وہ کسی دوسری چیز کی نہیں ہے۔ انسان کے علم و عمل میں دین کی حفاظت اِسی سے ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص اِسے ضائع کر دیتا ہے تو گویا سارے دین کو ضائع کر دیتا ہے۔

۶۲۹ یہ دونوں آیتیں خاتمۂ فصل کے ساتھ بطور تتمہ ملحق کر دی گئی ہیں تاکہ سورہ میں اِن کے مقام ہی سے واضح ہو جائے کہ اصل احکام کے بعد یہ اُن کی وضاحت کے لیے نازل ہوئی ہیں۔ چنانچہ آخر میں 'كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ' کے الفاظ سے اِس طرف اشارہ بھی فرما دیا ہے۔

۶۳۰ اصل الفاظ ہیں: 'وَصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ'۔ اِن میں 'وَصِيَّةً' فعل محذوف کا مفعول ہے۔ 'مَتَاعًا' 'وَصِيَّةً' کا مفعول ہے اور 'غَيْرَ اِخْرَاجٍ' 'لِاَزْوَاجِهِمْ' سے حال واقع ہوا ہے۔ اِس جملے کی یہی تالیف ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ عام طور پر لوگ اِس حکم کو سورۂ نساء میں تقسیم وراثت کی آیات سے منسوخ مانتے ہیں، لیکن صاف واضح ہے کہ عورت کو نان و نفقہ اور سکونت فراہم کرنے کی جو ذمہ داری شوہر پر اُس کی زندگی میں عائد ہوتی ہے، یہ اُسی کی توسیع ہے۔ عدت کی پابندی وہ شوہر ہی کے لیے قبول کرتی ہے۔ پھر اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے

مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ط وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (٢٤٠)
وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ط حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (٢٤١)
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (٢٤٢)

وہ خود گھر چھوڑ دیں تو جو کچھ دستور کی بات وہ اپنے معاملے میں کریں، اُس کا تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ (یہ اللہ کا قانون ہے) اور اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے[٦٣١]۔ ٢٤٠

اور (اِسی طرح یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ) مطلقہ عورتوں کو ہر حال میں دستور کے مطابق کچھ سامانِ زندگی دے کر رخصت کرنا چاہیے۔ یہ حق ہے اُن پر جو خدا سے ڈرنے والے ہوں[٦٣٢]۔ ٢٤١

اللہ اِسی طرح تمھارے لیے اپنی آیتوں کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم سمجھنے والے بنو[٦٣٣]۔ ٢٤٢

کے لیے بھی اُسے کچھ مہلت لازماً ملنی چاہیے۔ یہ حکم اِن مصلحتوں کے پیش نظر دیا گیا ہے۔ تقسیم وراثت سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

[٦٣١] اِس لیے ہر شخص کو سمجھنا چاہیے کہ اُس نے جو احکام بھی دیے ہیں، اُن میں اُنھی کے مصالح پیش نظر ہیں۔

[٦٣٢] اِس سے واضح ہے کہ یہ ایک حق واجب ہے۔ اگر کوئی شخص اِسے ادا نہیں کرتا تو اللہ کے ہاں یقیناً اِس پر ماخوذ ہو گا اور آخرت میں اُس کے ایمان و احسان کا وزن اِسی کے لحاظ سے متعین کیا جائے گا۔

[٦٣٣] یہاں اجمال کے بعد تفصیل اور توضیح کے بعد توضیح مزید کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے،

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ
الْمَوْتِ ۖ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا قف ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ

(یہ مباحث[۶۳۴] جہاد و انفاق کے بارے میں تمھارے سوالوں سے پیدا ہوئے تھے۔ ایمان والو، اِن کا حکم تم پر شاق نہ ہونا چاہیے)۔ کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا[۶۳۵] جو ہزاروں کی تعداد میں تھے اور موت کے ڈر سے اپنے گھر چھوڑ کر اُن سے نکل کھڑے ہوئے؟[۶۳۶] اِس پر اللہ نے اُن سے فرمایا کہ مردے ہو کر جیو۔[۶۳۷] (وہ برسوں اِسی حالت میں رہے[۶۳۸])،

استاذ امام اِس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ”... اِس سے دین میں غور و فکر اور اُس کے فوائد و مصالح اور اُس کے اسرار و حکم تک پہنچنے کے لیے ہماری عقل کی تربیت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اِس تدریج کو نمایاں کر کے اِس حقیقت کی طرف ہماری رہنمائی فرماتا ہے کہ ہم دین میں عقل کو کس طرح استعمال کر سکتے ہیں اور پیش آنے والے حالات و معاملات میں اِن کلیات سے کس طرح جزئیات مستنبط کر سکتے ہیں۔ اِسی حقیقت کی طرف 'لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ' کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۱/۵۵۷)

[۶۳۴] سورہ کی چوتھی اور آخری فصل یہاں سے شروع ہو رہی ہے۔ اِس میں جہاد و انفاق کے اُسی مضمون کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے جو پچھلی فصل میں برسرِ موقع بعض سوالات کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔

[۶۳۵] اصل میں 'اَلَمْ تَرَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ واحد سے جمع کو خطاب کرنے کا یہ اسلوب اُس وقت اختیار کیا جاتا ہے، جب کسی گروہ کے ہر شخص کو فرداً فرداً مخاطب کرنا پیش نظر ہوتا ہے۔ اِس میں 'اَلَمْ تَرَ' کے معنی لازماً یہ نہیں ہوتے کہ مخاطبین نے واقعہ آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کسی واقعہ کی شہرت عام ہو یا متکلم یہ سمجھتا ہو کہ اُس کی صداقت ایسی مسلم ہے کہ اُس میں شبہ کی کوئی گنجایش نہیں ہو سکتی تو وہ یہ اسلوب اختیار کر سکتا ہے۔

[۶۳۶] یہ اُس واقعہ کی طرف اشارہ ہے، جب فلستیوں نے بنی اسرائیل پر چڑھائی کر کے اُن

عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾

پھر اللہ نے اُنھیں دوبارہ زندگی عطا فرمائی۔[۶۳۹] اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے، مگر لوگوں میں زیادہ ہیں جو (اُس کے) شکر گزار نہیں ہوتے۔[۶۴۰] ۲۴۳

کا قتل عام کیا اور اُن سے عہد کا وہ صندوق چھین لیا جس کی حیثیت اُن کے ہاں بالکل قبلہ کی تھی۔ بائیبل میں ہے:

> ”اور فلستی لڑے اور بنی اسرائیل نے شکست کھائی اور ہر ایک اپنے ڈیرے کو بھاگا اور وہاں نہایت بڑی خون ریزی ہوئی کیونکہ تیس ہزار اسرائیلی پیادے وہاں کھیت آئے اور خدا کا صندوق چھن گیا۔“ (۱-سموئیل ۴: ۱۰-۱۱)

اِس واقعے کی جو تفصیلات سموئیل باب ۷ اور ۱۱ میں بیان ہوئی ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل اگرچہ تین لاکھ سے زیادہ تھے، مگر اپنی مذہبی و اخلاقی حالت کی خرابی اور سیاسی ابتری کے باعث فلستیوں کا مقابلہ نہیں کر سکے اور عقرون سے لے کر جات تک اپنے شہر خالی کر کے اُن کے حوالے کرنے پر مجبور ہو گئے۔

۶۳۷ اصل میں لفظ ’مُوْتُوْا‘ آیا ہے، یعنی مر جاؤ۔ یہ قومی حیثیت سے ذلت اور نامرادی کی تعبیر ہے۔ ذریت ابراہیم کے معاملے میں اللہ کا قانون یہی تھا کہ اُن کے جرائم کی سزا اُنھیں دنیا ہی میں دی جائے گی۔ چنانچہ جب ایمان اور عمل صالح کے بجائے اُنھوں نے اخلاقی بے راہ روی اور خوف و بزدلی کی زندگی اختیار کی اور اِس طرح اللہ کے ساتھ نقض عہد کے مرتکب ہوئے تو اِس کی سزا کے طور پر اللہ نے بھی اُنھیں ذلت و نامرادی کے حوالے کر دیا۔

۶۳۸ سموئیل (۱) میں ہے کہ بنی اسرائیل پر یہ حالت پورے بیس سال تک طاری رہی:

> ”اور جس دن سے صندوق قریت یعریم میں رہا، تب سے ایک مدت ہو گئی، یعنی بیس برس گزرے اور اسرائیل کا سارا گھرانا خداوند کے پیچھے نوحہ کرتا رہا۔“ (۱/۷: ۲)

۶۳۹ یہ زندگی اُسی قانون کے مطابق دی گئی جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ بنی اسرائیل نے توبہ و

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٤٤﴾
مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا

(ایمان والو، اِس سے سبق لو) اور اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور خوب جان رکھو کہ اللہ سمیع و علیم ہے[٦٤١]۔ کون ہے جو (اِس جنگ کے لیے) اللہ کو قرض دے گا، اچھا قرض

استغفار کر کے ازسرنو ایمان و اسلام کی راہ اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی اِس کے صلے میں اُنھیں قومی حیثیت سے ازسرنو زندہ کر دیا اور دشمنوں کے مقابلے میں عزت اور سربلندی عطا فرمائی۔ سموئیل (۱) میں ہے:

> ”اور سموئیل نے اسرائیل کے سارے گھرانے سے کہا کہ اگر تم اپنے سارے دل سے خداوند کی طرف رجوع لاتے ہو تو اجنبی دیوتاؤں اور عستارات کو اپنے بیچ سے دور کرو اور خداوند کے لیے اپنے دلوں کو مستعد کر کے فقط اُسی کی عبادت کرو، اور وہ فلستیوں کے ہاتھ سے تمھیں رہائی دے گا۔ تب بنی اسرائیل نے بعلیم اور عستارات کو دور کیا اور فقط خداوند کی عبادت کرنے لگے“۔ (۱/۷: ۳-۴)
>
> ”سو فلستی مغلوب ہوئے اور اسرائیل کی سرحد میں پھر نہ آئے اور سموئیل کی زندگی بھر خداوند کا ہاتھ فلستیوں کے خلاف رہا اور عقرون سے جات تک کے شہر جن کو فلستیوں نے اسرائیلیوں سے لے لیا تھا، وہ پھر اسرائیلیوں کے قبضے میں آئے اور اسرائیلیوں نے اُن کی نواحی بھی فلستیوں کے ہاتھ سے چھڑا لی“۔ (۱/۷: ۱۳-۱۴)

٦٤٠ اِس میں بنی اسمٰعیل کے لیے تشویق ہے کہ اگر وہ بھی جہاد و انفاق کی دعوت قبول کریں گے تو اللہ ذریت ابراہیم کے ساتھ اپنے وعدے کے مطابق اُن پر فضل فرمائے گا اور اُنھیں عروج و سربلندی سے سرفراز کرے گا۔ اِسی طرح تنبیہ بھی ہے کہ اگر وہ موت سے ڈر گئے اور اُنھوں نے اپنے لیے ذلت و نامرادی کو پسند کیا تو اِسی وعدے کے مطابق اُن پر بھی یہی موت طاری ہو کر رہے گی۔

كَثِيْرَةً ؕ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۖ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

کہ اللہ اُس کے لیے اُسے کئی گنا بڑھا دے[۶۴۲]۔ اور (جو گریز کرے تو اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ) اللہ ہی ہے جو تنگی بھی کرتا ہے اور فراخی بھی، اور تم کو (ایک دن) اُسی کی

---

۶۴۱ اِن صفات کا حوالہ دینے سے مقصود، استاذ امام کے الفاظ میں یہاں اِس کا لازم ہے۔ یعنی جب اللہ سنتا اور جانتا ہے تو اِس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمھاری پکار پر تمھاری مدد بھی فرمائے گا اور تمھاری جاں بازیوں کا بھرپور صلہ بھی دے گا۔

۶۴۲ یہ اللہ کی راہ میں جنگ کے لیے غایت درجہ موثر اور نہایت شوق انگیز اسلوب میں مالی قربانی کی دعوت ہے۔ استاذ امام اِس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> ”...قرض قرض دار کے ذمے واجب ہوتا ہے اور یہ رب کریم کا کتنا بڑا احسان ہے کہ جو مال اُس نے خود بندوں کو عنایت فرمایا ہے، وہی مال وہ جب اُن سے اپنی راہ میں خرچ کرنے کے لیے کہتا ہے تو اُس کو اپنے ذمے قرض ٹھیراتا ہے، یعنی اُس کی واپسی از خود اپنے ذمے واجب قرار دیتا ہے۔ پھر اِس سے زیادہ روح و دل کو بے خود کر دینے والی بات یہ ارشاد ہوئی کہ رب کریم یہ قرض اِس لیے مانگتا ہے کہ وہ بندوں کو دیے ہوئے خزف ریزوں کو خوب بڑھائے اور اُن کو بڑھا کر ایک لازوال خزانے کی شکل میں اُن کو واپس کرے۔ یعنی اِس قرض کی ضرورت اِس لیے نہیں پیش آئی ہے کہ خدا کے خزانے میں کوئی کمی واقع ہو گئی ہے، اُس کا خزانہ بھرپور اور وہ بالکل بے نیاز و بے پروا ہے، البتہ اُس کی کریمی نے اپنے بندوں کے لیے نفع کمانے کی یہ راہ کھولی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو ایک خرچ کر کے دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک اُس کا اجر حاصل کر لیں۔“ (تدبر قرآن ۱/ ۵۶۷)

اِس قرض کے متعلق اچھا قرض ہونے کی جو شرط لگائی ہے، اُس کی وضاحت میں اُنھوں نے لکھا ہے:

> ”...قرض حسن کا مفہوم قرآن کے دوسرے مواقع سے جو نکلتا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ دل کی تنگی

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ۖ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ

طرف لوٹنا بھی ہے[۶۴۳]۔ ۲۴۴-۲۴۵

تم[۶۴۴] نے موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے سرداروں کو نہیں دیکھا، جب اُنھوں نے اپنے ایک نبی[۶۴۵] سے کہا: آپ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیں[۶۴۶] تاکہ ہم (اُس

کے ساتھ محض چھدا اتارنے کے لیے نہ دیا جائے، بلکہ پوری فراخ دلی اور حوصلے کے ساتھ دیا جائے، ریا اور نمایش کے لیے نہ دیا جائے، بلکہ صرف خدا کی خوشنودی کے لیے دیا جائے، کسی دنیوی طمع کے حصول کی غرض سامنے رکھ کر نہ دیا جائے، بلکہ صرف آخرت کے اجر کی خاطر دیا جائے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ حقیر، کم وقعت اور ناجائز ذرائع سے حاصل کیے ہوئے مال میں سے نہ دیا جائے، بلکہ محبوب، عزیز اور پاکیزہ کمائی میں سے دیا جائے۔''

(تدبر قرآن ۱/۵۶۷)

[۶۴۳] مطلب یہ ہے کہ تم اگر اپنا مال خدا کی راہ میں نہیں دیتے تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ اُسی کو نہیں دیتے جو بخشنے کے بعد، جب چاہے چھین بھی سکتا ہے اور جس کا معاملہ اِسی دنیا تک نہیں رہ جانا، بلکہ کل آخرت میں جسے منہ بھی دکھانا ہے۔

[۶۴۴] یہ اُسی واقعے کی تفصیل فرمائی ہے جس کا ذکر اوپر بالاجمال ہوا ہے کہ برسوں کی مردنی کے بعد اللہ تعالیٰ نے کس طرح بنی اسرائیل کو اُن کی طرف سے توبہ اور رجوع کے بعد دوبارہ ایک زندہ قوم بنا دیا۔

[۶۴۵] بائیبل میں وضاحت ہے کہ یہ اُن کے نبی سموئیل علیہ السلام تھے۔

[۶۴۶] یہاں موقع کلام دوسرا ہے، اِس لیے ذکر نہیں ہوا، لیکن بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ مقرر کرنے کے اِس مطالبے کو اللہ تعالیٰ نے پسند نہیں فرمایا اور اُنھیں توجہ دلائی کہ وہ اپنے

اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ

کے حکم پر) اللہ کی راہ میں جنگ کریں؟ اِس پر نبی نے کہا: ایسا نہ ہو[۶۴۷] کہ تم پر جہاد فرض کیا جائے اور پھر تم جہاد نہ کرو؟ وہ بولے: ہم کیوں اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں

ہاتھوں محکومی کا یہ طوق اپنی گردن میں نہ ڈالیں۔ سموئیل (۱) میں ہے:

> ”... یہ بات سموئیل کو بری لگی اور سموئیل نے خداوند سے دعا کی اور خداوند نے سموئیل سے کہا کہ جو کچھ یہ لوگ تجھ سے کہتے ہیں، تو اُس کو مان کیونکہ اِنھوں نے تیری نہیں، بلکہ میری حقارت کی ہے کہ میں اِن کا بادشاہ نہ رہوں... اور سموئیل نے اُن لوگوں کو جو اُس سے بادشاہ کے طالب تھے، خداوند کی سب باتیں کہہ سنائیں اور اُس نے کہا کہ جو بادشاہ تم پر سلطنت کرے گا، اُس کا طریقہ یہ ہوگا کہ وہ تمھارے بیٹوں کو لے کر اپنے رتھوں کے لیے اور اپنے رسالے میں نوکر رکھے گا اور وہ اُس کے رتھوں کے آگے آگے دوڑیں گے اور وہ اُن کو ہزار ہزار کے سردار اور پچاس پچاس کے جمعدار بنائے گا اور بعض سے ہل جتوائے گا اور فصل کٹوائے گا اور اپنے لیے جنگ کے ہتھیار اور اپنے رتھوں کے ساز بنوائے گا اور تمھاری بیٹیوں کو لے کر گندھن اور باورچن اور نان پز بنائے گا اور تمھارے کھیتوں اور تاکستانوں اور زیتون کے باغوں کو، جو اچھے سے اچھے ہوں گے، لے کر اپنے خدمت گاروں کو عطا کرے گا اور تمھارے کھیتوں اور تاکستانوں کا دسواں حصہ لے کر اپنے خوجوں اور خادموں کو دے گا اور تمھارے نوکر چاکروں اور لونڈیوں اور تمھارے شکیل جوانوں اور تمھارے گدھوں کو لے کر اپنے کام پر لگائے گا اور وہ تمھاری بھیڑ بکریوں کا بھی دسواں حصہ لے گا۔ سو تم اُس کے غلام بن جاؤ گے اور تم اُس دن اُس بادشاہ کے سبب سے، جسے تم نے اپنے لیے چنا ہوگا، فریاد کرو گے، پر اُس دن خداوند تم کو جواب نہ دے گا۔
> تو بھی لوگوں نے سموئیل کی بات نہ سنی اور کہنے لگے: نہیں، ہم تو بادشاہ چاہتے ہیں جو ہمارے اوپر ہو تا کہ ہم بھی اور سب قوموں کی مانند ہوں اور ہمارا بادشاہ ہماری عدالت کرے اور ہمارے آگے آگے چلے اور ہماری طرف سے لڑائی کرے۔“ (۱/۸:۶-۲۰)

الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿٢٤٦﴾
وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْٓا
اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ

گے، جب کہ ہمیں ہمارے گھروں اور ہمارے بچوں سے دور نکال دیا گیا ہے؟ لیکن (ہوا یہی کہ) جب اُن پر جہاد فرض کیا گیا[٦٤٨] تو اُن میں سے تھوڑے سے لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب پھر گئے، اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ اِن ظالموں سے خوب واقف تھا۔ ٢٤٦

اور (اُن کے اِس مطالبے پر) اُن کے نبی نے اُنھیں بتایا کہ اللہ نے طالوت[٦٤٩] کو تمھارے لیے بادشاہ مقرر کر دیا ہے[٦٥٠]۔ بولے: اُس کی بادشاہی ہم پر کس طرح ہو سکتی

٦٤٧۔ اصل میں 'ھَلْ عَسَیْتُمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی کیا اِس بات کا اندیشہ نہیں ہے؟ اردو زبان میں 'ایسا نہ ہو' کی تعبیر اِسی مفہوم کے لیے اختیار کی جاتی ہے۔

٦٤٨۔ یہ جہاد فلستیوں کی جارحیت کے مقابلے کے لیے فرض کیا گیا تا کہ بنی اسرائیل اُن کے ظلم و عدوان سے اپنے دین و مذہب اور عزت و ناموس کی حفاظت کریں اور اپنے وہ شہر اُن سے واپس لے لیں جن پر اُنھوں نے قبضہ کر لیا تھا۔

٦٤٩۔ بائیبل میں اِن کا نام ساؤل آیا ہے۔ یہ طالوت غالباً اُن کا لقب ہے جس سے وہ اپنے غیر معمولی قد و قامت کی وجہ سے لوگوں میں مشہور رہے ہوں گے۔ سموئیل (۱) میں ہے:

> ''...اور جب وہ لوگوں کے درمیان کھڑا ہوا تو ایسا قد آور تھا کہ لوگ اُس کے کندھے تک آتے تھے۔'' (۱/۱۰:۲۳)

٦٥٠۔ اصل میں لفظ 'بَعَثَ' استعمال ہوا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ بائیبل اور قرآن کی تصریحات کے مطابق سموئیل علیہ السلام نے اِس بادشاہ کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق منتخب کیا تھا اور اِس لحاظ سے اُن کی حیثیت گویا خدا کے مبعوث کی تھی۔

سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً
فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ
عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ

ہے، جب کہ ہم اِس بادشاہی کے اُس سے زیادہ حق دار ہیں اور وہ کوئی دولت مند آدمی بھی نہیں ہے؟[۶۵۱] نبی نے جواب دیا: اللہ نے اُسی کو تم پر (حکومت کے لیے) منتخب کیا ہے اور اِس مقصد کے لیے اُسے علم اور جسم، دونوں میں بڑی کشادگی عطا فرمائی ہے۔[۶۵۲] (یہ سلطنت اللہ کی ہے) اور اللہ اپنی یہ سلطنت، (اپنی حکمت کے مطابق)، جس کو چاہے، بخش دیتا ہے۔ (تم معاملات کو اپنی تنگ نظروں سے دیکھتے ہو) اور اللہ بڑی وسعت رکھنے والا ہے، وہ ہر چیز سے واقف ہے۔ اور اُن کے نبی نے اُن کے لیے مزید وضاحت کی کہ (اللہ کی طرف سے) اُس کے بادشاہ مقرر کیے جانے کی نشانی یہ ہے کہ (تمھارا) وہ

---

۶۵۱ بنی اسرائیل کے بعض شریروں نے یہ اعتراض اپنی عادت کے مطابق کیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہوئی کہ طالوت بنیامین کے قبیلہ سے تھے۔ بنی اسرائیل کے قبیلوں میں یہ سب سے چھوٹا قبیلہ تھا اور طالوت اُس کے سب سے چھوٹے گھرانے سے تھے۔ پھر، جیسا کہ بیان ہوا، وہ کوئی مال دار آدمی بھی نہیں تھے۔ سموئیل میں ہے:

> ”پر شریروں میں سے بعض کہنے لگے کہ یہ شخص ہم کو کس طرح بچائے گا؟ سو اُنھوں نے اُس کی تحقیر کی اور اُس کے لیے نذرانے نہ لائے۔ پر وہ ان سنی کر گیا۔“ (۱۰:۲۷)

۶۵۲ یعنی یہ خدا کا انتخاب ہے اور اہلیت کی بنیاد پر ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے علم میں بھی وسعت دی ہے اور عمل کی قوت بھی عطا فرمائی ہے۔ لہٰذا جس طرح کی قیادت اِس وقت تمھیں چاہیے، اُس کے لیے یہ شخص نہایت موزوں ہے۔

فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ
تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾

صندوق[۶۵۳] (تمھارے دشمنوں کے ہاتھ سے نکل کر) تمھارے پاس آ جائے گا جس میں تمھارے پروردگار کی طرف سے (تمھارے لیے ہمیشہ) بڑی سکینت رہی ہے[۶۵۴] اور جس میں وہ یادگاریں بھی ہیں جو موسیٰ اور ہارون کی ذریت نے (تمھارے لیے) چھوڑی ہیں۔ اُسے فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔[۶۵۵] اِس میں، یقیناً ایک بڑی نشانی ہے

۶۵۳؎ اصل میں لفظ 'التَّابُوْتُ' استعمال ہوا ہے۔ یہاں اِس سے مراد بنی اسرائیل کا وہ صندوق ہے جسے بائیبل میں 'خدا کا صندوق' یا 'خدا کے عہد کا صندوق' کہا گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> "...بنی اسرائیل کے مصر سے خروج کے زمانے سے لے کر بیت المقدس کی تعمیر تک اِسی صندوق کو بنی اسرائیل کے قبلہ کی حیثیت حاصل رہی۔ وہ اِس کو اپنے خیمۂ عبادت میں ایک مخصوص مقام پر نہایت مخصوص اہتمام کے ساتھ پردوں کے بیچ میں رکھتے اور تمام دعا و عبادت میں اِسی کی طرف متوجہ ہوتے۔ اُن کے ربی اور کاہن غیبی رہنمائی کے لیے بھی اِسی کو مرجع بناتے۔ مشکل حالات، قومی مصائب اور جنگ کے میدانوں میں بھی بنی اسرائیل کا حوصلہ قائم رکھنے میں اِس صندوق کو سب سے بڑے عامل کی حیثیت حاصل رہی۔ حضرت موسیٰ کے زمانے تک تو اِس میں تورات اور صحرا کی زندگی کے دور کی بعض یادگاریں محفوظ کی گئیں، لیکن پھر اُس میں حضرت موسیٰ، حضرت ہارون اور اُن کے خاندان کے بعض اور تبرکات بھی محفوظ کر دیے گئے۔"
>
> (تدبر قرآن ۱/۵۷۱)

۶۵۴؎ اِس صندوق کے ساتھ بنی اسرائیل کو غیر معمولی عقیدت تھی۔ چنانچہ، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، مشکل کے وقت اور جہاد و قتال کے موقع پر اُن کے حوصلے کو قائم رکھنے میں اِس کو بڑا دخل تھا۔ 'فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ' کے الفاظ سے قرآن نے اِسی طرف اشارہ کیا ہے۔

تمھارے لیے، اگر تم ماننے والے ہو[۶۵۶]۔ ۲۴۷-۲۴۸

۶۵۵ یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی اور فلستیوں نے غالباً طالوت کے بعض جنگی اقدامات اور اُن میں کامیابی سے مرعوب ہو کر اپنے آپ کو جنگ کے خطرے سے بچانے کے لیے اِس صندوق کو ایک گاڑی پر رکھ کر بنی اسرائیل کے علاقے کی طرف ہانک دیا۔ یہ گاڑی بغیر کسی گاڑی بان اور بغیر کسی محافظ کے دو ایسی گایوں کے ذریعے سے جن کے دودھ پیتے بچے گھروں پر روک لیے گئے تھے، دہنے بائیں مڑے بغیر اپنی منزل پر پہنچ گئی۔ یہ سب، ظاہر ہے کہ فرشتوں کی مدد ہی سے ہو سکتا ہے۔ سموئیل (۱) میں اِس کی تفصیلات یہ ہیں:

> ’’اب تم ایک نئی گاڑی بناؤ اور دو دودھ والی گائیں جن کے جوا نہ لگا ہو، لو اور اُن گایوں کو گاڑی میں جوتو اور اُن کے بچوں کو گھر لوٹا لاؤ اور خداوند کا صندوق لے کر اِس گاڑی پر رکھو اور سونے کی چیزوں کو جن کو تم جرم کی قربانی کے طور پر ساتھ کرو گے، ایک صندوقچہ میں کر کے اُس کے پہلو میں رکھ دو اور اُسے روانہ کر دو کہ چلا جائے اور دیکھتے رہنا... سو اُن لوگوں نے ایسا ہی کیا اور دو دودھ والی گائیں لے کر اُن کو گاڑی میں جوتا اور اُن کے بچوں کو گھر میں بند کر دیا اور خداوند کے صندوق اور سونے کی چُہیوں اور اپنی گلٹیوں کی مورتوں کے صندوقچہ کو گاڑی پر رکھ دیا۔ اِن گایوں نے بیت شمس کا سیدھا راستہ لیا۔ وہ سڑک ہی سڑک ڈکارتی گئیں اور دہنے یا بائیں ہاتھ نہ مڑیں اور فلستی سردار اُن کے پیچھے پیچھے بیت شمس کی سرحد تک گئے اور بیت شمس کے لوگ وادی میں گیہوں کی فصل کاٹ رہے تھے۔ اُنھوں نے جو آنکھیں اٹھائیں تو صندوق کو دیکھا اور دیکھتے ہی خوش ہو گئے۔‘‘ (۱/۶: ۷-۱۳)

۶۵۶ یہ صندوق جب فلستیوں نے چھینا تو بنی اسرائیل کے بزرگوں نے اِسے اسرائیل کی ساری حشمت کے چھن جانے سے تعبیر کیا اور پوری قوم کم و بیش بیس سال تک اِس حادثے کا ماتم کرتی رہی۔ لہٰذا طالوت کے انتخاب کے خدائی انتخاب ہونے کی اِس سے بہتر کوئی علامت نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر اِس میں یہ بشارت بھی مضمر تھی کہ بنی اسرائیل نے خدا کی طرف رجوع کیا ہے تو اُن کی حشمت بھی اب اللہ کی مدد سے اُسی طرح واپس آ جائے گی، جس طرح صندوق واپس آ گیا ہے۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ

(بنی اسرائیل کی حکومت سنبھالنے کے بعد) پھر جب طالوت فوجیں لے کر نکلے[٦٥٧] تو

بائیبل کا بیان اِس معاملے میں قرآن سے مختلف ہے۔ اُس میں یہ بتایا گیا ہے کہ فلستیوں نے طالوت کے انتخاب سے بہت پہلے ہی صندوق کو گاڑی میں رکھ کر بنی اسرائیل کے علاقے کی طرف ہانک دیا تھا۔ لیکن اِس بیان کی خود بائیبل ہی کے دوسرے بیانات سے تردید ہوتی ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، اگر واقعہ یہی ہے کہ فلستیوں نے سات مہینے کے بعد ہی صندوق کو اُس کی کرامات اور اُس کے خوارق سے ڈر کر واپس کر دیا تھا تو بائیبل کے اِس بیان کے کوئی معنی نہیں رہتے:

> ”اور جس دن سے صندوق قریت یعریم میں رہا، تب سے ایک مدت ہوگئی، یعنی بیس برس گزرے اور اسرائیل کا سارا گھرانا خداوند کے پیچھے نوحہ کرتا رہا۔“ (ا-سموئیل ۷:۲)

وہ لکھتے ہیں:

> ”سوال یہ ہے کہ قریت یعریم اگر بنی اسرائیل ہی کے علاقے میں شامل تھا اور تابوت اُنھی کی حفاظت میں تھا تو بیس برس تک اسرائیل کا سارا گھرانا خداوند کے پیچھے نوحہ کیوں کرتا رہا؟ اور اِس ”خداوند کے پیچھے“ کے الفاظ کا کیا مطلب ہے؟
>
> اصل یہ ہے کہ سموئیل میں یہود نے متضاد روایات کا اتنا انبار لگا دیا ہے کہ اُس کے اندر حق و باطل کا امتیاز ناممکن ہے۔ یہ قرآن کا احسان ہے کہ اُس نے بعض واقعات کے صحیح پہلو نمایاں کیے۔“ (تدبر قرآن ا/۵۷۶)

٦٥٧۔ بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مہم فلستیوں کے مقابلے میں تھی جن کا سردار اُس زمانے میں جاتی جولیت تھا۔ قرآن نے اُس کا ذکر جالوت کے نام سے کیا ہے۔ سموئیل (ا) میں یہ واقعہ اِس طرح بیان ہوا ہے:

> ”پھر فلستیوں نے جنگ کے لیے اپنی فوجیں جمع کیں اور یہوداہ کے شہر شوکہ میں فراہم ہوئے

فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا
مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۗ فَلَمَّا
جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ

اُنھوں نے لوگوں کو بتایا کہ اللہ نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ایک ندی کے ذریعے سے تمھیں آزمائے گا[۶۵۸]۔ اِس کی صورت یہ ہوگی کہ جو اِس کا پانی پیے گا، وہ میرا ساتھی نہیں ہے اور جس نے اِس ندی سے کچھ نہیں چکھا[۶۵۹]، وہ میرا ساتھی ہے۔ ہاں، مگر اپنے ہاتھ سے[۶۶۰] ایک چلو کوئی پی لے تو پی لے۔ لیکن ہوا یہ کہ اُن میں سے تھوڑے لوگوں کے سوا باقی سب نے اُس ندی کا پانی پی لیا[۶۶۱]۔ پھر جب طالوت اُس کے پار اترے

اور شوکہ اور عزیقہ کے درمیان افسدمیم میں خیمہ زن ہوئے۔ اور ساؤل اور اسرائیل کے لوگوں نے جمع ہو کر ایلا کی وادی میں ڈیرے ڈالے اور لڑائی کے لیے فلستیوں کے مقابل صف آرائی کی۔ اور ایک طرف کے پہاڑ پر فلستی اور دوسری طرف کے پہاڑ پر بنی اسرائیل کھڑے ہوئے اور اُن دونوں کے درمیان وادی تھی۔” (۱/۱۷:۱-۳)

۶۵۸ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ، ظاہر ہے کہ طالوت کو سموئیل علیہ السلام کی وساطت سے معلوم ہوا اور اِسی بنا پر اِسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا۔

۶۵۹ اصل میں ’مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ اِس سے واضح ہے کہ اِس امتحان میں سو فی صدی کامیابی کے لیے ضروری تھا کہ ندی کا پانی سرے سے کوئی چکھے ہی نہیں۔

۶۶۰ ’اپنے ہاتھ سے‘ کی یہ قید اِس لیے لگا دی ہے کہ معاملہ گلاس اور کٹورے تک نہ پہنچ جائے۔

۶۶۱ بائیبل میں اِس امتحان کا ذکر نہیں ہے، لیکن اِسی سے ملتے جلتے ایک دوسرے امتحان کا ذکر ہے۔ اِن دونوں کو دیکھنے کے بعد ہر صاحب ذوق خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ اِس معاملے میں

وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ
قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾ وَلَمَّا
بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ

اور اُن کے وہ ساتھی بھی جو اپنے ایمان پر قائم رہے[٦٦٢] (اور فوجیں دیکھیں) تو (جو لوگ آزمایش میں پورے نہیں اترے تھے)، اُنھوں نے کہہ دیا کہ ہم تو آج جالوت اور اُس کے لشکروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اِس پر وہ لوگ جنھیں خیال تھا کہ اُن کو اللہ سے ملنا ہے[٦٦٣]، بول اُٹھے کہ (حوصلہ کرو، اِس لیے کہ) بہت جگہ ایسا ہوا ہے کہ اللہ کے حکم سے چھوٹے گروہ بڑے گروہوں پر غالب آئے ہیں، اور اللہ تو ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے[٦٦٤]۔ اور (یہی سچے مسلمان تھے کہ) جب جالوت اور اُس کی فوجوں کا سامنا ہوا تو اُنھوں نے دعا کی کہ پروردگار، ہم پر صبر کا فیضان فرما اور ہمارے

قرآن کا بیان ہی ہر پہلو سے قرین عقل بھی ہے اور بامقصد اور نتیجہ خیز بھی۔

[٦٦٢] اصل الفاظ ہیں: 'وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ'۔ قرینہ دلیل ہے کہ اِن میں 'اٰمَنُوْا' کا فعل اپنے کامل معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اِس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ جو لوگ اِس امتحان میں پورے نہیں اترے، وہ اپنے ایمان کے دعووں میں بھی پورے نہیں تھے۔

[٦٦٣] یہ اِس لیے فرمایا کہ خدا کی راہ میں موت اگر بندۂ مومن کو اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہوتی ہے تو اُس کے اِسی عقیدے کی بنا پر ہوتی ہے کہ وہ اِس موت سے مرے گا نہیں، بلکہ حقیقی زندگی پا کر اپنے پروردگار کی ملاقات سے مشرف ہوگا۔

[٦٦٤] طالوت کے بیٹے یونتن نے یہ فقرہ غالباً اِسی موقع پر کہا ہے:

> ”سو یونتن نے اُس جوان سے جو اُس کا سلاح بردار تھا، کہا: آ ہم ادھر اِن نامختونوں کی چوکی کو چلیں۔ ممکن ہے کہ خداوند ہمارا کام بنا دے، کیونکہ خداوند کے لیے بہتوں یا تھوڑوں کے

اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿٢٥٠﴾ فَهَزَمُوۡهُمۡ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ۙ
وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوۡتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الۡمُلۡكَ وَالۡحِكۡمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا

پاؤں جما دے اور اِن منکر لوگوں پر ہمیں غلبہ عطا کر دے۔ چنانچہ (اُن کی دعا قبول ہوئی اور) اللہ کے حکم سے اُنھوں نے اپنے اُن دشمنوں کو شکست دے دی[٦٦٥] اور جالوت کو داؤد[٦٦٦] نے قتل کر دیا اور اللہ نے اُسے بادشاہی دی اور حکمت عطا فرمائی اور

ذریعے سے بچانے کی قید نہیں۔'' (۱-سموئیل ۱۴:۶)

٦٦٥ یعنی اسباب و وسائل تو یقیناً اختیار کیے گئے، لیکن فتح اصلاً اللہ کے حکم ہی سے ہوئی۔ سموئیل میں ہے کہ سیدنا داؤد نے یہی بات اُس وقت کہی تھی، جب وہ میدان جنگ میں جالوت کے مقابل ہوئے:

> ''اور یہ ساری جماعت جان لے کہ خداوند تلوار اور بھالے کے ذریعے سے نہیں بچاتا، اِس لیے کہ جنگ تو خداوند کی ہے اور وہی تم کو ہمارے ہاتھ میں کر دے گا۔'' (۱-سموئیل ۱۷:۴۷)

٦٦٦ یہ وہی حضرت داؤد ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا فرمائی اور جن کے فرزند بنی اسرائیل کے جلیل القدر بادشاہ اور نبی سیدنا سلیمان علیہ السلام ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے جالوت کو قتل کرنے کے اِس واقعے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے اُن کے بارے میں لکھا ہے:

> ''... اِن کی ابتدا غریبانہ، لیکن انتہا نہایت شان دار ہوئی۔ اِنھوں نے اپنے بارے میں خود فرمایا ہے کہ خداوند نے مجھے بھیڑ سالے سے نکالا اور اسرائیل کے تخت پر لا بٹھایا۔ یہ طالوت کی اُس فوج میں شامل تھے جس کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ اِس شمولیت کے متعلق تورات میں دو مختلف روایتیں ہیں۔ ایک سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ اِس جنگ کے پیش آنے سے پہلے ہی طالوت کے سلاح بردار کی حیثیت سے اُن کے لشکر میں داخل ہو چکے تھے اور درپردہ یہ سموئیل کے ممسوح اور مستقبل کے بادشاہ بھی تھے۔ دوسری روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بالکل وقت کے وقت اپنی بکریاں چراگاہ میں چھوڑ کر اپنے بڑے بھائیوں کو، جو جنگ میں شریک تھے، اپنے باپ کے

يَشَآءُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ

اُسے اُس علم میں سے سکھایا جو اللہ چاہتا ہے کہ اپنے اِس طرح کے بندوں کو سکھائے[٦٦٧] ـــــ اور حقیقت یہ کہ اگر اللہ ایک کو دوسرے سے نہ ہٹاتا تو زمین فساد

حکم سے کچھ کھانے کی چیزیں دینے آئے۔ یہاں اِنھوں نے دیکھا کہ جالوت مقابلے کے لیے چیلنج دے رہا ہے، لیکن کوئی اُس کے مقابلے کے لیے آگے نہیں بڑھ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر اِن کی غیرت کو جوش آیا۔ اِنھوں نے طالوت سے اُس کے مقابلے کی اجازت مانگی۔ یہ اُس وقت ایک نوخیز، سرخ رو اور خوش قامت نوجوان تھے۔ طالوت کو اِن کی کم عمری اور ناتجربہ کاری کی بنا پر اجازت دینے میں تردد ہوا۔ لیکن جب اِنھوں نے کہا کہ میں اپنی بکریوں پر حملہ کرنے والے شیروں اور ریچھوں کے جبڑے توڑ دیا کرتا ہوں، بھلا اِس نامختون فلسطینی کی کیا حیثیت ہے کہ یہ زندہ خداوند کی فوجوں کو رسوا کرے، تو طالوت نے اِن کے عزم و ہمت کو دیکھ کر اِن کو اجازت دے دی اور خود اپنا جنگی لباس پہنا کر اپنے مخصوص اسلحہ سے اِن کو لیس کیا۔ اُس وقت تک اِن کا زمانہ بھیڑوں بکریوں کی چرواہی میں گزرا تھا، اِس جنگی لباس اور اِن جنگی اسلحہ کا اِن کو کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہ اِن کو پہن کر کچھ بندھا بندھا سا محسوس کرنے لگے۔ آخر طالوت کی اجازت سے اِس قید سے رہائی حاصل کی اور چرواہوں کی طرح اپنی فلاخن اٹھائی، چادر کے ایک کونے میں کچھ پتھر رکھے اور وقت کے سب سے بڑے دیو کے مقابل میں جا کے ڈٹ گئے۔ پہلے تو اُس نے اِن کا مذاق اڑایا۔ لیکن جب اِن کی طرف سے اُس کو ترکی بہ ترکی جواب ملا تو اُس نے کہا کہ ''اچھا آ، آج تیرا گوشت چیلوں اور کووں کو کھلاتا ہوں۔'' اتنے میں حضرت داؤد نے فلاخن میں پتھر رکھ کر جو اُس کو مارا تو پتھر اُس کے سر سے چپک کر رہ گیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اتنے بڑے سپہ سالار کا ایک الھڑ چرواہے کی فلاخن سے اِس طرح مارا جانا، ظاہر ہے کہ ایک عظیم واقعہ تھا۔ چنانچہ فلسطینی فوج میں بھگدڑ مچ گئی اور اِدھر بنی اسرائیل کی عورتوں کی زبان پر یہ گیت جاری ہو گیا:

''ساؤل نے تو ہزاروں کو مارا، پر داؤد نے لاکھوں کو مارا''۔ (تدبر قرآن ۱/ ۵۸۰)

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۲۵۱)
تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۲۵۲)
تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ
وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ

سے بھر جاتی، لیکن (اُس نے اِسی طرح ہٹایا ہے، اِس لیے کہ) اللہ دنیا والوں پر بڑی عنایت فرمانے والا ہے۔[۶۶۸] ۲۴۹-۲۵۱

یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمھیں حق کے ساتھ سنا رہے ہیں، اور اِس میں کوئی شک نہیں کہ تم اللہ کے رسولوں میں سے ہو۔ (بنی اسرائیل بھی اِس بات کو جانتے ہیں، لیکن مانتے اِس لیے نہیں کہ) یہ جو رسول ہیں، ہم نے اِن میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی، (اِس طرح کہ) اِن میں سے کسی سے اللہ خود ہم کلام ہوا[۶۶۹] اور کسی کے درجے اُس نے

۶۶۷۔ اصل الفاظ ہیں: 'عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ'۔ یہاں بظاہر 'مماشاء' کا موقع تھا، مگر اِس کے بجاے یہ اسلوب اللہ تعالیٰ کے جس طریقے کو بیان کرنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے، اُسے ہم نے اپنے ترجمے میں واضح کر دیا ہے۔

۶۶۸۔ یہ آخر میں جنگ کا مقصد بیان کر کے بات ختم کر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر ظلم و عدوان کے مقابلے میں اِس کا حکم نہ دیتے تو زمین میں ایسا فساد برپا ہو جاتا کہ وہ نیکی، تقویٰ اور صلاح و فلاح کے تمام آثار سے خالی ہو جاتی۔ اِس میں، ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لیے ترغیب و تشویق ہے کہ اُنھیں بھی اب بغیر کسی تردد کے خدا کے اِس مقصد کو حاصل کرنے کی جدوجہد کے لیے تیار ہو جانا چاہیے اور بنی اسرائیل کی تاریخ کے اِن واقعات کی روشنی میں مطمئن رہنا چاہیے کہ وہ ثابت قدم رہے تو اللہ اُن کے دشمنوں پر اُنھیں اِسی طرح غلبہ عطا فرمائے گا۔

بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقۡتَتَلَ الَّذِيۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ مِّنۡۢ
بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخۡتَلَفُوۡا فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ
وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ كَفَرَ ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقۡتَتَلُوۡا قف وَلٰكِنَّ اللّٰهَ

(بعض دوسری حیثیتوں سے) بلند کیے اور (آخر میں) مریم کے بیٹے عیسیٰ کو ہم نے نہایت واضح نشانیاں دیں اور روح القدس سے اُس کی تائید کی[٦٧٠]۔ (چنانچہ یہی چیز اِن رسولوں کے ماننے والوں میں ایک دوسرے کو جھٹلانے کا باعث بن گئی[٦٧١])۔ اور اگر اللہ چاہتا تو جو نہایت واضح دلائل اُن کے سامنے آ گئے تھے، اُن کے بعد یہ رسولوں کے بعد والے ایک دوسرے سے نہ لڑتے، لیکن (اللہ نے یہ نہیں چاہا کہ لوگوں پر جبر کرے، اِس لیے) اُنھوں نے اختلاف کیا۔ سو اُن میں سے کوئی (اِن رسولوں پر) ایمان لایا اور کسی نے ماننے

---

[٦٦٩] اِس سے مراد وہ مخاطبۂ الٰہی ہے جس سے سیدنا موسیٰ علیہ السلام براہ راست مشرف ہوئے۔ یہ اُن کی فضیلت کا خاص پہلو ہے۔

[٦٧٠] پرانے صحیفوں میں 'رُوۡحُ الۡقُدُس' سے جبریل امین مراد لیے جاتے ہیں۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کے لیے روح القدس کی تائید کا ذکر اِس لیے کیا جاتا ہے کہ اُن سے جو کھلے کھلے معجزے صادر ہوئے، یہود نے اپنی بدبختی کے باعث اُنھیں بدروحوں کے سردار بعلزبول کی تائید کا نتیجہ قرار دیا۔

[٦٧١] یعنی جس نے جس نبی اور رسول کو مانا، 'آں چہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری' کا مصداق بنا کر مانا۔ چنانچہ دوسرے کسی نبی یا رسول کے لیے کوئی فضیلت ماننا اُس کے نزدیک ایمان کے منافی قرار پایا، یہاں تک کہ نوبت اللہ کے نبیوں اور رسولوں کو جھٹلانے تک پہنچ گئی۔ بنی اسرائیل کا معاملہ بھی یہی تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے کے نتیجے میں خدا کی آخری ہدایت کا ماخذ آپ قرار پائیں گے اور یہ اُن کے پیغمبروں پر آپ کی فضیلت ماننے کے مترادف ہو گا۔

يَفۡعَلُ مَا يُرِيۡدُ ﴿۲۵۳﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِىَ يَوۡمٌ لَّا بَيۡعٌ فِيۡهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالۡكٰفِرُوۡنَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۵۴﴾

سے انکار کر دیا۔ (تم کو نہ ماننے کی وجہ بھی یہی ہے، اے پیغمبر)، اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ہرگز آپس میں نہ لڑتے، مگر اللہ (اپنی حکمت کے مطابق) جو چاہے کرتا ہے[۶۷۲]۔ ۲۵۲-۲۵۳

ایمان والو، (تم اِنھیں اِن کے حال پر چھوڑ و اور) جو کچھ ہم نے تمھیں دیا ہے، اُس میں سے (اللہ کی راہ میں) اُس دن کے آنے سے پہلے خرچ کر لو، جس میں نہ خرید و فروخت ہو گی، نہ (کسی کی) دوستی کام آئے گی اور نہ کوئی سفارش نفع دے گی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اُس دن کے منکر ہی اپنی جان پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔ ۲۵۴

---

[۶۷۲] یعنی اپنے علم اور اپنی حکمت کے مطابق جس چیز کو درست سمجھتا ہے، کرتا ہے۔ تمھاری خواہشوں سے اُس کا کوئی ارادہ تبدیل نہیں ہو سکتا۔ سو اُس نے یہی درست سمجھا کہ اِس معاملے میں بندوں کو آزادی دے کہ اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ وہ کفر و ایمان میں سے جو چاہیں اختیار کر لیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...(یہ) اللہ تعالیٰ نے اُس سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ہدایت وضلالت کے باب میں اُس نے پسند فرمائی ہے اور جس کا قرآن میں جگہ جگہ مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے۔ وہ سنت اللہ یہ ہے کہ اُس نے ہدایت وضلالت کے معاملے میں جبر کا طریقہ نہیں اختیار فرمایا ہے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اِس میں شبہ نہیں کہ کسی کے لیے بھی ایمان کو چھوڑ کر کفر کی راہ اختیار کرنے کی کوئی گنجایش باقی نہ رہتی۔ لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ بندوں کو آزادی دی کہ وہ اپنی سوچ سمجھ اور اپنے اختیار و ارادہ کی آزادی کے ساتھ چاہیں کفر کی راہ اختیار کریں، چاہیں ایمان کی راہ اختیار کریں۔ اگر وہ ایمان کی راہ اختیار کریں گے تو اُس کا صلہ پائیں گے اور اگر کفر کی راہ

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۵ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ

(اُس دن معاملہ صرف اللہ سے ہوگا)۔ اللہ، جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، زندہ اور سب کو قائم رکھنے والا۔[۶۷۳] نہ اُس کو اونگھ لاحق ہوتی ہے نہ نیند۔[۶۷۴] زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، سب اُسی کا ہے۔ کون ہے جو اُس کی اجازت کے بغیر اُس کے حضور میں کسی کی سفارش کرے۔[۶۷۵] لوگوں کے آگے اور پیچھے کی ہر چیز سے واقف ہے اور وہ اُس کے علم میں سے کسی چیز کو بھی اپنی گرفت میں نہیں لے سکتے، مگر جتنا وہ چاہے۔[۶۷۶] اُس کی

اختیار کریں گے تو اُس کا انجام دیکھیں گے۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۵۸۳)

[۶۷۳] اصل میں لفظ 'اَلْقَیُّوْمُ' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی ہیں وہ ہستی جو خود اپنے بل پر قائم اور دوسروں کو قائم رکھنے والی ہو۔ اِس سے اور اِس سے پہلے 'حَیّ' کی صفت سے قرآن نے اُن تمام معبودوں کی نفی کر دی ہے جو نہ زندہ ہیں نہ دوسروں کو زندگی دے سکتے ہیں، اور نہ اپنے بل پر قائم ہیں، نہ دوسروں کو قائم رکھنے والے ہیں، بلکہ خود اپنی زندگی اور بقا کے لیے ایک حی و قیوم کے محتاج ہیں۔

[۶۷۴] اِس نفی سے نیند کی ابتدا اور انتہا، دونوں کی نفی کی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غفلت کے اثرات سے بالکل آخری درجے میں پاک ہے۔

[۶۷۵] یعنی جب اُس کی خدائی میں کسی کا کوئی حصہ نہیں ہے تو پھر کس کی مجال ہے کہ اُس کی اجازت کے بغیر اُس کے حضور میں سفارش کی جسارت کرے۔

[۶۷۶] یعنی جب لوگوں کے ماضی اور مستقبل کی ہر چیز سے وہ خود واقف ہے اور کوئی دوسرا اُس

وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۲۵۵﴾
لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ
يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ

بادشاہی[۶۷۷] زمین اور آسمانوں پر چھائی ہوئی ہے اور اُن کی حفاظت اُس پر ذرا بھی گراں نہیں ہوتی[۶۷۸]، اور وہ بلند ہے، بڑی عظمت والا ہے[۶۷۹]۔ ۲۵۵

(یہ جو رویہ چاہیں، اختیار کریں)، دین کے معاملے میں (اللہ کی طرف سے) کوئی جبر نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہدایت (اِس قرآن کے بعد اب) گم راہی سے بالکل الگ ہو چکی ہے۔ لہٰذا جس نے شیطان[۶۸۰] کا انکار کیا اور اللہ کو مانا تو اُس نے گویا

کے علم کے کسی حصے کو اُس کی مرضی کے بغیر اپنی گرفت ادراک میں بھی نہیں لے سکتا تو سفارش کس بنا پر کی جائے گی؟ کیا کوئی شخص اِس لیے سفارش کرے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معلومات میں اضافہ کر سکتا ہے؟

[۶۷۷] اصل میں لفظ 'کُرْسِیّ' آیا ہے۔ عربی زبان میں یہ اقتدار کی تعبیر ہے۔ ہماری اردو میں بھی یہ لفظ اِس مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔

[۶۷۸] چنانچہ اُن کو سنبھالنے کے لیے اُسے کسی سہارے کی ضرورت پیش نہیں آتی کہ اِس بنا پر کوئی اُس کا شریک و سہیم سمجھا جائے۔

[۶۷۹] لہٰذا اُس کے علم اور اُس کی قدرت کو اپنے محدود پیمانوں سے ناپنے کی کوشش نہ کرو۔ اپنی صفات کے بارے میں جو کچھ وہ خود بتائے، صرف اُسی کو ماننا کافی ہے۔ اِس معاملے میں اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کرنی چاہیے۔ دین میں بے روح فلسفیانہ مباحث اور شرک و بدعت کی راہیں اِسی سے کھلتی ہیں۔

[۶۸۰] اصل میں لفظ 'الطَّاغُوْت' آیا ہے، یعنی وہ جو خدا کے سامنے سرکشی، تمرد اور استکبار

الْوُثْقٰى ق لَا انْفِصَامَ لَهَا ط وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾
اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ط
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ لا يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى
الظُّلُمٰتِ ط اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ج هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾

نہایت مضبوط رسی پکڑ لی جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتی۔ اور (یہ اِس لیے کہ) اللہ سمیع و علیم ہے۔ ۲۵۶

(یہ ہدایت پانا چاہیں تو) اللہ ماننے والوں کا مددگار ہے۔ وہ اُنھیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لے جاتا ہے۔[۶۸۱] اِس کے برخلاف نہ ماننے والوں کے مددگار اُن کے شیاطین ہیں، وہ اُنھیں روشنی سے اندھیروں کی طرف نکال لے جاتے ہیں۔ یہی دوزخ کے لوگ ہیں، یہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔[۶۸۲] ۲۵۷

اختیار کرے۔ اِس میں اور 'الشَّیْطٰن' میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قرآن میں یہ دونوں بالکل ہم معنی استعمال ہوئے ہیں۔

۶۸۱؎ اصل الفاظ ہیں: 'یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ'۔ اِن میں 'النُّوْر' واحد اور 'الظُّلُمٰت' جمع استعمال ہوا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ جس نور کا یہاں ذکر ہے، اُس سے مراد علم و عقل اور ایمان و اخلاق کا نور ہے۔ اِس کے بارے میں بالبداہت واضح ہے کہ اِس کا منبع بھی ایک ہی ہے، یعنی پروردگار عالم اور اِس میں انتشار و اختلاف بھی نہیں ہوتا۔ اِس کے برخلاف علم و عقل اور ایمان و اخلاق سے محرومی کی ظلمتیں مختلف راستوں سے آتی ہیں اور اِن میں انتشار و اختلاف بھی لازماً ہوتا ہے۔

۶۸۲؎ ہدایت و ضلالت کا جو قانون اِس آیت میں بیان ہوا ہے، اُس کی وضاحت استاذ امام

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡ حَآجَّ اِبۡرٰهٖمَ فِیۡ رَبِّهٖۤ اَنۡ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الۡمُلۡكَ

(اِس بات کو سمجھنا چاہتے ہو تو اِس کی مثالیں بہت ہیں)۔ کیا[۶۸۳] تم نے اُس شخص کو

امین احسن اصلاحی نے اِس طرح فرمائی ہے:

”... ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اصل اہمیت رکھنے والی شے یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کا دامن پکڑتا ہے یا کسی غیر کا۔ اگر خدا کا دامن پکڑتا ہے تو خدا اپنے بندے کا کارساز و مددگار بن جاتا ہے اور اپنی توفیق بخشی سے درجہ بہ درجہ اُسے نفس و شہوات کی تمام تاریکیوں اور کفر، شرک اور نفاق کی تمام ظلمات سے نکال کر ایمان کامل و توحید خالص کی شاہراہ پر لا کھڑا کرتا ہے۔ اور اگر بندہ اپنے رب سے منہ موڑ کر کسی اور راہ پر جا نکلتا ہے تو پھر وہ شیطان اور اُس کی ذریات کے ہتھے چڑھ جاتا ہے اور وہ اُس کی نکیل اپنے ہاتھ میں لے کر عقل و فطرت کی ہر روشنی سے دور کر کے اُس کو ضلالت کے کھڈ میں گرا دیتے ہیں۔ مشہور مثل ہے: ”خانۂ خالی را دیو می گیرد“، جس گھر میں آدمی نہیں رہتا، وہ شیطان کا مسکن بن جاتا ہے۔ اِسی طرح جو دل ایمان سے خالی ہوتا ہے، وہ شیطان کا اڈا بن جاتا ہے، اور پھر شیاطین ایسے شخص کو گم راہی کی وادیوں میں سرگشتہ و حیران رکھتے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۱/۵۹۸)

۶۸۳؎ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا یہ مناظرہ ”تالمود“ میں بھی نقل ہوا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کے ہم عصر بادشاہ نمرود کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اِس مناظرے کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ اُس زمانے کے بادشاہ اپنے آپ کو اوتار بادشاہ سمجھتے تھے۔ قدیم صحیفوں میں ذکر ہے کہ نمرود کی قوم جن دیوتاؤں کو پوجتی تھی، اُن میں سب سے بڑے دیوتا کا درجہ سورج کو حاصل تھا۔ نمرود کو بھی لازماً اِسی کا اوتار مانا جاتا رہا ہوگا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے دعوت توحید کے بعد یہ مناظرہ اِسی پس منظر میں ہوا ہے۔ نمرود نے کہا ہوگا کہ سورج دیوتا کے اوتار کی حیثیت سے تمھارا رب تو میں ہوں۔ مجھے چھوڑ کر یہ تم کس رب کو ماننے کی دعوت دے رہے ہو؟

اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ؕ
قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا
مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۚ﴿۲۵۸﴾

نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اُس کے پروردگار کے معاملے میں حجت کرنا چاہی، اِس لیے کہ اللہ نے اُسے اقتدار عطا فرمایا تھا؟[۶۸۴] اُس وقت، جب ابراہیم نے اُس سے کہا کہ میرا پروردگار تو وہ ہے جو مارتا اور جلاتا ہے[۶۸۵]۔ اُس نے جواب دیا کہ میں بھی مارتا اور جلاتا ہوں[۶۸۶]۔ ابراہیم نے فوراً کہا: اچھا تو یوں ہے کہ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تم ذرا اُسے مغرب سے نکال لاؤ[۶۸۷]۔ سو (یہ سن کر) وہ منکر حق بالکل حیران رہ گیا۔

---

[۶۸۴] اصل میں 'اَنْ اٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'اَنْ' سے پہلے 'ب' عربی قاعدے کے مطابق حذف ہوگئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جو اقتدار اُسے عطا فرمایا تھا، وہی اُس کے لیے فتنہ بن گیا اور اُس پر خدا کا شکر ادا کرنے کے بجاے اُس نے اپنے آپ کو خدا کے اوتار کی حیثیت سے پیش کرنا شروع کر دیا۔

[۶۸۵] اللہ تعالیٰ کی تعریف میں سب سے زیادہ واضح بات یہی ہو سکتی تھی جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمائی ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ آدمی کے دماغ میں خلل نہ ہو تو زندگی اور موت کے سوال پر ادنیٰ تامل بھی اُسے خدا کے ماننے پر مجبور کر دیتا ہے۔

[۶۸۶] یعنی جس کا چاہوں، سر قلم کر دیتا ہوں اور جس کو چاہوں، بخش دیتا ہوں۔

[۶۸۷] نمرود کا معارضہ سراسر احمقانہ تھا، لیکن انبیا علیہم السلام چونکہ مناظر نہیں، بلکہ داعی ہوتے ہیں، اِس لیے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اُس کو مزید کٹ حجتی کا موقع دینے کے بجاے اپنے پروردگار کی ایک ایسی صفت بیان کر دی جس میں وہ بحث کے لیے کوئی راہ نہیں پا سکتا تھا۔

استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس حجت ابراہیمی کے ایک دوسرے پہلو کی وضاحت میں

اَوۡ كَالَّذِيۡ مَرَّ عَلٰى قَرۡيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوۡشِهَا ۚ قَالَ

اور حقیقت یہ ہے کہ اِس طرح کے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی ہدایت نہیں دیتا۔[۶۸۸] ۲۵۸

یا اُس شخص[۶۸۹] کی مثال ہے[۶۹۰] جس کا گزر ایک بستی پر ہوا جو اپنی چھتوں پر گری پڑی

لکھا ہے:

> ”... یہاں بلاغت کا یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ حضرت ابراہیم نے خاص طور پر سورج کی تسخیر کا ذکر فرمایا جس کو نمرود کی نظر میں معبود اعظم کی حیثیت حاصل تھی اور وہ اپنے آپ کو اِسی معبود اعظم کا مظہر بنائے ہوئے بیٹھا تھا۔ بہترین استدلال اور لطیف ترین طنز کی یہ ایک نہایت خوب صورت مثال ہے۔“ (تدبر قرآن ۱/۶۰۰)

۶۸۸۔ یہ اُس مدعا کا بیان ہے جسے واضح کرنے کے لیے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا یہ واقعہ سنایا گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... اِس میں ظالم کا لفظ خاص طور پر قابل غور ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں ظالم سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کی نعمتوں اور اُس کی بخشی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کو بے جا استعمال کرتے ہیں، جو اللہ کے انعامات کو اُس کا فضل قرار دینے کے بجائے اُن کو اپنا حق سمجھتے ہیں، جو نعمتوں پر خداے منعم کے شکر گزار ہونے کے بجائے غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہوتے اور ابلیس کی طرح اکڑتے ہیں، جو خدا کی بندگی اور فرماں برداری کی روش اختیار کرنے کے بجائے خود اپنی خدائی کے تخت بچھاتے اور اپنے کو رب ٹھیراتے ہیں۔ فرمایا کہ جو لوگ اِس ظلم میں مبتلا ہوتے ہیں، اُن پر ہدایت کی راہ نہیں کھلا کرتی۔ ایسے لوگوں کے سامنے حق کتنے ہی واضح طریقے پر آئے، وہ اُس کو قبول کرنے کے بجائے بحث اور کٹ حجتی کی کوئی نہ کوئی راہ ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر اُن کو اِس کی کوئی راہ ملتی نظر نہیں آتی تو وہ نمرود کی طرح ہکے بکے اور ششدر ہو کر تو رہ جاتے ہیں، لیکن حق کو قبول پھر بھی نہیں کرتے۔“ (تدبر قرآن ۱/۶۰۰)

۶۸۹۔ پہلی مثال شیاطین کے اندھیروں کی طرف نکال لے جانے کی تھی۔ اب یہ اُن لوگوں

اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ

تھی[٦٩١]۔ اُس نے حیرت سے کہا: اِس کے اِس طرح فنا ہو جانے کے بعد اللہ اِسے کس طرح

کی مثال بیان ہو رہی ہے جنھیں اُن کا پروردگار اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا ہے۔

٦٩٠ یہ غالباً حزقی ایل نبی کے اُن مشاہدات میں سے ہے جو بنی اسرائیل میں دعوت و اصلاح اور اُن کے احیا کی جدوجہد کے لیے اٹھنے سے پہلے اُنھیں کرائے گئے۔ بائیبل میں اُن کا اِسی نوعیت کا ایک مشاہدہ اِس طرح بیان ہوا ہے:

> ”خداوند کا ہاتھ مجھ پر تھا اور اُس نے مجھے اپنی روح میں اٹھا لیا اور اُس وادی میں جو ہڈیوں سے پر تھی مجھے اتار دیا اور مجھے اُن کے آس پاس چوگرد پھرایا، اور دیکھ وہ وادی کے میدان میں بکثرت اور نہایت سوکھی تھیں، اور اُس نے مجھے فرمایا: اے آدم زاد، کیا یہ ہڈیاں زندہ ہو سکتی ہیں؟ میں نے جواب دیا: اے خداوند خدا، تو ہی جانتا ہے۔ پھر اُس نے مجھے فرمایا: تو اِن ہڈیوں پر نبوت کر اور اُن سے کہہ: اے سوکھی ہڈیو، خداوند کا کلام سنو: خداوند خدا اِن ہڈیوں کو یوں فرماتا ہے کہ میں تمھارے اندر روح ڈالوں گا اور تم زندہ ہو جاؤ گی، اور تم پر نسیں پھیلاؤں گا اور گوشت چڑھاؤں گا اور تم کو چمڑا پہناؤں گا اور تم میں دم پھونکوں گا اور تم زندہ ہو گی اور جانو گی کہ میں خداوند ہوں۔ پس میں نے حکم کے مطابق نبوت کی، اور جب میں نبوت کر رہا تھا تو ایک شور ہوا اور دیکھ، زلزلہ آیا اور ہڈیاں آپس میں مل گئیں، ہر ایک ہڈی اپنی ہڈی سے۔ اور میں نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ نسیں اور گوشت اُن پر چڑھ آئے اور اُن پر چمڑے کی پوشش ہو گئی، پر اُن میں دم نہ تھا۔ تب اُس نے مجھے فرمایا کہ نبوت کر۔ تو ہوا سے نبوت کر، اے آدم زاد، اور ہوا سے کہہ کہ خداوند خدا یوں فرماتا ہے کہ اے دم، تو چاروں طرف سے آ اور اِن مقتولوں پر پھونک کہ زندہ ہو جائیں۔ پس میں نے حکم کے مطابق نبوت کی اور اُن میں دم آیا اور وہ زندہ ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئیں، ایک نہایت بڑا لشکر۔“ (حزقی ایل ٣٧: ١-١٠)

٦٩١ اصل الفاظ ہیں: ’وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا‘۔ یہ گری ہوئی بستی کی تصویر ہے جس میں چھتوں کے زمین بوس ہو جانے کے بعد دیواریں اُن پر اوندھی پڑی ہوتی ہیں۔

قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ

دوبارہ زندہ کرے گا؟[٦٩٢] اِس پر اللہ نے اُسے سو سال کی موت دی، پھر اُس کو اُٹھایا (اور) پوچھا: کتنی مدت پڑے رہے؟ اُس نے جواب دیا: ایک دن یا اُس سے کچھ کم رہا ہوں گا۔ فرمایا: نہیں، بلکہ سو سال اِسی حالت میں تم پر گزر گئے۔ اب ذرا اپنے کھانے اور پینے کی چیزوں کو دیکھو، اِن میں سے کوئی چیز سڑی نہیں۔ دوسری طرف ذرا اپنے گدھے کو دیکھو کہ ہم اُس کو کس طرح زندہ کرتے ہیں، اِس لیے کہ تمھیں اِس بستی

---

[٦٩٢] یہ کس نوعیت کا سوال ہے؟ استاذ امام اِس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”...اُس کا یہ سوال...انکار کی نوعیت کا نہیں، بلکہ اظہار حیرت کی نوعیت کا ہے۔ انسان بسا اوقات ایک چیز کو مانتا ہے، اِس لیے کہ عقل و فطرت اُس کی گواہی دے رہی ہوتی ہے، لیکن وہ بات بجائے خود ایسی حیران کن ہوتی ہے کہ اُس سے متعلق دل میں بار بار یہ سوال ابھرتا رہتا ہے کہ یہ کیسے واقع ہو گی؟ یہ سوال انکار کے جذبے سے نہیں، بلکہ جستجوے حقیقت کے جوش سے ابھرتا ہے اور خاص طور پر اُن مواقع پر زیادہ زور سے ابھرتا ہے، جب سامنے کوئی ایسا منظر آ جائے جو باطن کو جھنجھوڑ دینے والا ہو۔ یہ حالت ایمان کے منافی نہیں، بلکہ اُس ایمان کے مقتضیات میں سے ہے جس کی بنیاد عقل و بصیرت پر ہو۔ یہ سلوک باطن کی ایک ریاضت ہے جس سے ہر طالب حقیقت کو گزرنا پڑتا ہے، اور یہ سفر برابر اُس وقت تک جاری رہتا ہے، جب تک ’حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ‘ کے انوار سے قلب و نظر جگمگا نہ جائیں۔ اِس سفر میں ہر منزل اگرچہ خوب سے خوب تر کی طرف اقدام کی نوعیت کی ہوتی ہے، لیکن عارف کی نظر میں اُس کا ہر آج اُس کے گذشتہ کل سے اتنا زیادہ روشن ہوتا ہے کہ وہ کل اُس کو آج کے مقابل میں شب نظر آتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۱/۶۰۱)

نَكۡسُوۡهَا لَحۡمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعۡلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۲۵۹﴾

کے اٹھائے جانے پر یقین ہو اور اِس لیے کہ ہم لوگوں کے لیے تمھیں (امید کی) ایک نشانی بنا دیں[۶۹۳]۔ اور ہڈیوں کی طرف دیکھو، ہم کس طریقے سے اُن کو اٹھاتے اور پھر اُن پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ اِس طرح جب حقیقت اُس پر واضح ہو گئی تو وہ پکار اٹھا کہ (اب کوئی تردد نہیں رہا)، میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے[۶۹۴]۔ ۲۵۹

---

[۶۹۳] اصل میں 'وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَ لِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'اُنْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ' کے بعد 'کیف نحییه' یا اِس کے ہم معنی الفاظ حذف ہو گئے ہیں۔ اِسی طرح 'وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ' سے پہلے اِس کا معطوف علیہ حذف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اِسے جس طرح کھولا ہے، اُس سے پوری بات یہ سامنے آتی ہے کہ حزقی ایل نبی کو یہ مشاہدہ کرانے سے مقصود جہاں یہ تھا کہ خود اُنھیں موت کے بعد زندگی کے مسئلے میں شرح صدر حاصل ہو، وہاں یہ بھی تھا کہ اُن کا مشاہدہ بنی اسرائیل کے لیے اللہ تعالیٰ کی نشانی بنے اور اِس کے نتیجے میں اُن کے اندر حوصلہ پیدا ہو کہ اللہ اُنھیں بھی دوبارہ ایک زندہ قوم بنا دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ چنانچہ صحیفۂ حزقی ایل کی جو عبارت اوپر نقل ہوئی ہے، اُس کا خاتمہ اِن الفاظ پر ہوا ہے:

> ''تب اُس نے مجھے فرمایا: اے آدم زاد، یہ ہڈیاں تمام بنی اسرائیل ہیں۔ دیکھ، یہ کہتے ہیں: ہماری ہڈیاں سوکھ گئیں اور ہماری امید جاتی رہی، ہم تو بالکل فنا ہو گئے۔ اِس لیے تو نبوت کر اور اِن سے کہہ: خداوند خدا یوں فرماتا ہے کہ اے میرے لوگو، دیکھو میں تمھاری قبروں کو کھولوں گا اور تم کو اُن سے باہر نکالوں گا اور اسرائیل کے ملک میں لاؤں گا۔ اور اے میرے لوگو، جب میں تمھاری قبروں کو کھولوں گا اور تم کو اُن سے باہر نکالوں گا، تب تم جانو گے کہ خداوند میں ہوں۔ اور میں اپنی روح تم میں ڈالوں گا اور تم زندہ ہو جاؤ گے اور میں تم کو تمھارے ملک میں بساؤں گا، تب تم جانو گے کہ میں خداوند نے فرمایا اور پورا کیا، خداوند فرماتا ہے۔'' (۳۷:۱۱-۱۴)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۭ قَالَ بَلٰي وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِىْ ۭ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰي كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا

اور (اِس سلسلے میں) وہ واقعہ بھی پیش نظر رہے[۶۹۵]، جب ابراہیم نے کہا تھا کہ پروردگار، مجھے دکھا دیں کہ آپ مردوں کو کس طرح زندہ کریں گے؟ فرمایا: کیا تم ایمان نہیں رکھتے؟ عرض کیا: ایمان تو رکھتا ہوں، لیکن خواہش ہے کہ میرا دل پوری طرح مطمئن ہو جائے۔ فرمایا: اچھا، تو چار پرندے لو[۶۹۶]، پھر اُن کو اپنے ساتھ ہلا لو، پھر[۶۹۷] (اُن کو ذبح

---

[۶۹۴] یعنی اِس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ کھانے اور پینے کی چیزیں سو سال پڑی رہیں اور اُن میں کوئی تغیر نہ ہو اور اِس پر بھی کہ گدھے کی ہڈیاں تک سڑ کر بوسیدہ ہو جائیں اور وہ چشم زدن میں اُنھیں اٹھا کر دوبارہ زندگی بخش دے۔

[۶۹۵] یہ اِس بات کی دوسری مثال ہے کہ اللہ تعالیٰ ماننے والوں کا مددگار ہے اور وہ اپنے اُن بندوں کو شرح صدر اور اطمینان قلب سے محروم نہیں رکھتا جو سچے دل سے اِس کی خواہش رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر اُس کی حکمت کے خلاف نہ ہو تو اپنے خاص بندوں کے باطن کی کوئی خلش دور کرنے کے لیے وہ اُنھیں اِس طرح کے غیر معمولی مشاہدات بھی کرا دیتا ہے۔

[۶۹۶] یہ ہدایت غالباً اِس لیے ہوئی کہ چار پرندے چاروں سمتوں سے دوڑتے ہوئے آئیں گے تو ابراہیم علیہ السلام کے سامنے گویا صور پھونکنے کے بعد تمام مخلوق کے اِسی طرح ہر سمت سے اپنے پروردگار کی طرف دوڑنے کی تصویر آ جائے گی۔

[۶۹۷] اِس ہدایت کا مقصد یہ تھا کہ پرندے زندہ ہو کر آئیں تو سیدنا ابراہیم کو کوئی اشتباہ نہ ہو کہ یہ وہی پرندے ہیں جو اُنھوں نے ذبح کر کے پہاڑی پر رکھے تھے۔ نیز یہ بات بھی واضح ہو جائے کہ قیامت میں اٹھتے ہی دنیوی زندگی کی تمام یادداشتیں آپ سے آپ زندہ ہو جائیں گی۔

ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶۰﴾
مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ
حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ
لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ

کر کے) ہر پہاڑی پر اُن میں سے ایک ایک کو رکھ دو، پھر اُنھیں پکارو، وہ (زندہ ہو کر) دوڑتے ہوئے تمھارے پاس آجائیں گے، اور (آیندہ کے لیے) خوب سمجھ لو کہ اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔[۶۹۸] ۲۶۰

(ہدایت وضلالت کے معاملے میں اللہ کا طریقہ یہی ہے۔ اِس لیے یہ نہیں مانتے تو اِنھیں چھوڑو اور تم اچھی طرح سمجھ لو کہ) اللہ کی راہ میں[۶۹۹] اپنے مال خرچ کرنے والوں کے اِس عمل کی مثال اُس دانے کی ہے جس سے سات بالیں نکلیں، اِس طرح کہ ہر بال میں سو دانے ہوں۔ اللہ (اپنی حکمت کے مطابق) جس کے لیے چاہتا ہے، اِسی طرح بڑھا دیتا ہے۔[۷۰۰] اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑی وسعت والا ہے، وہ ہر چیز سے

یہاں تک کہ مانوس پرندے اپنے مالکوں کی آوازیں بھی اُسی طرح پہچان لیں گے، جس طرح دنیا میں پہچانتے تھے۔

[۶۹۸] چنانچہ وہ جب چاہے گا، لوگوں کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا اور وہ لازماً ایسا کرے گا، اِس لیے کہ یہی اُس کی حکمت کا تقاضا بھی ہے۔

[۶۹۹] اصل میں 'فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ قرآن کی ایک اصطلاح ہے جس کے تحت وہ سب کام آتے ہیں جو دین کی خدمت اور لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کیے جائیں۔

[۷۰۰] اِس مضمون کی وضاحت مسلم کی ایک حدیث میں بھی ہوئی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ
عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ
وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾

واقف ہے[۱۰۱]۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، پھر جو کچھ خرچ کیا ہے، اُس کے پیچھے نہ احسان جتاتے ہیں، نہ دل آزاری کرتے ہیں[۱۰۲]، اُن کے لیے اُن کے پروردگار کے ہاں اُن کا اجر ہے اور اُن کے لیے نہ وہاں کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ کبھی غم زدہ ہوں گے[۱۰۳]۔ ایک اچھا بول اور (ناگواری کا موقع ہو تو) ذرا سی چشم پوشی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نیکی کا بدلہ دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک ہے*۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... یہ فرق، ظاہر ہے کہ عمل کی نوعیت، عمل کے زمانے اور عمل کرنے والے کے ظاہری و باطنی حالات پر مبنی ہو گا۔ اگر ایک نیکی مشکل حالات اور تنگ وسائل کے ساتھ کی گئی ہے تو اُس کا اجر زیادہ ہو گا اور اگر ایک نیکی آسان حالات اور کشادہ وسائل کے ساتھ کی گئی ہے تو اُس کا اجر کم ہو گا۔ پھر نیکی کرنے والے کے احساسات کا بھی اُس پر اثر پڑے گا۔ ایک نیکی پوری خوش دلی اور پورے جوش و خروش کے ساتھ کی گئی ہے اور دوسری سرد مہری اور نیم دلی کے ساتھ۔ ظاہر ہے کہ دونوں کے اجر و ثواب میں بھی فرق ہو گا۔“ (تدبر قرآن ۱/ ۶۱۳)

۱۰۱ے لہٰذا اللہ کے وعدوں کو اپنی تنگ دامانی پر قیاس نہ کرو اور اپنے اجر پر مطمئن رہو۔ اللہ کے خزانے لامحدود ہیں۔ وہ جس کو جتنا چاہے کسی نیکی کا اجر دے سکتا ہے۔ تمھارا کوئی عمل بھی اُس سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ چھوٹی، بڑی اور پوشیدہ یا علانیہ جو نیکی تم کرو گے، وہ اُس کے علم میں رہے گی۔

۱۰۲ے یعنی کم ظرفوں کی طرح کسی کو کچھ دے کر طعن و تشنیع اور توہین و تحقیر کا نشانہ نہیں بناتے۔

---

* مسلم، رقم ۱۱۵۲

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ
كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ
فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ
صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي

اُس خیرات سے بہتر ہے جس کے ساتھ اذیت لگی ہوئی ہو۔ اور (تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) اِس طرح کی خیرات سے اللہ بے نیاز ہے، (اِس رویے پر وہ تمھیں محروم کر دیتا، لیکن اُس کا معاملہ یہ ہے کہ) اِس کے ساتھ وہ بڑا بردبار بھی ہے۔ ایمان والو، احسان جتا کر اور (دوسروں کی) دل آزاری کر کے اپنی خیرات کو اُن لوگوں کی طرح ضائع نہ کرو جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور وہ نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ قیامت کے دن کو مانتے ہیں۔ سو اُن کی مثال ایسی ہے کہ ایک چٹان ہو جس پر کچھ مٹی ہو، پھر اُس پر زور کا مینہ پڑے اور اُس کو بالکل چٹان کی چٹان چھوڑ جائے[۷۰۴]۔ (قیامت کے دن) اُن کی کمائی میں سے کچھ بھی اُن کے ہاتھ نہ

۷۰۳۔ یہ جنت کی تعبیر ہے اور استاذ امام کے الفاظ میں یہاں اِس تعبیر میں ایک لطیف اشارہ اِس بات کی طرف بھی ہے کہ انفاق کرنے والے اِس جنت کے سزاوار اِس لیے ٹھیریں گے کہ نہ تو خدا کی راہ میں خرچ کر کے اُنھوں نے کبھی اِس بات کا غم کیا کہ کیوں خرچ کر دیا اور نہ کبھی شیطان کے ڈراووں سے متاثر ہو کر مستقبل کے اندیشوں میں مبتلا ہوئے کہ کل کیا کھائیں گے۔ اُن کے اِس حوصلے کے صلے میں خدا اُن کو سات سو گنے تک اجر بھی دے گا اور وہ بہشت بھی جو ماضی اور مستقبل، دونوں طرف سے اُنھیں مطمئن کر دے گی۔

۷۰۴۔ یہ اُس کسان کی مثال ہے جس نے کسی چٹان پر مٹی دیکھی اور اُس کو زرخیز پا کر کھیتی

الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ

آئے گا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اِس طرح کے ناشکرے لوگوں کو اللہ کبھی راہ یاب نہیں کرتا[۷۰۵]۔ ۲۶۱-۲۶۴

اللہ کی خوشنودی چاہنے کے لیے اور اپنے آپ کو حق پر قائم رکھنے کی غرض[۷۰۶] سے اپنا مال خرچ کرنے والوں کی مثال اُس باغ کی ہے جو بلند اور ہموار زمین پر واقع ہو[۷۰۷]۔ اُس پر زور

شروع کر دی، لیکن بارش پڑی اور اُس کے ایک ہی دونگڑے سے ساری مٹی فصل سمیت وادی میں بہ گئی اور نیچے سے بالکل سپاٹ پتھر نکل آیا۔ فرمایا ہے کہ خیرات کے بعد احسان جتانے اور دل آزاری کرنے والوں کی خیرات بھی اِس طرح برباد ہو جائے گی اور آخرت میں اُن کو اُس کا کوئی اجر نہ ملے گا۔ ایمان پر ہونے کے باوجود اُن کا یہ عمل اُسی طرح ضائع ہو جائے گا، جس طرح دکھانے کے لیے خرچ کرنے والے منکروں کے اعمال ضائع ہوں گے۔

۷۰۵۔ یعنی اُن کے اعمال کے ثمرات و نتائج تک نہیں پہنچنے دیتا اور دنیا میں بہت کچھ کرنے کے باوجود انجام کے لحاظ سے وہ بالکل نامراد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

۷۰۶۔ اصل میں 'تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'مِنْ' گویا 'تَثْبِيْتًا' کے مفعول پر داخل ہے، یعنی اللہ کی خوشنودی کے ساتھ وہ اِس لیے بھی خرچ کرتے ہیں کہ اِس سے اُنھیں نفس کی خواہشات پر قابو پانے اور اُسے حق پر جمائے رکھنے کی تربیت حاصل ہو۔

۷۰۷۔ اصل میں لفظ 'رَبْوَة' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی بلند اور مرتفع زمین کے ہیں۔ یہ لفظ یہاں جس مقصد سے آیا ہے، استاذ امام نے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"... بلند اور ہموار زمین کے لیے آب و ہوا کی خوش گواری ایک مسلم شے ہے۔ اگر ایسی زمین

فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾
اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ
ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ

کی بارش ہو جائے تو اپنا پھل دونا لائے اور زور کی بارش نہ ہو تو پھوار بھی کافی ہو جائے۔ (یہ مثال سامنے رکھو) اور (مطمئن رہو کہ) جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔ ۲۶۵

کیا تم میں کوئی یہ پسند کرے گا کہ اُس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں۔ اُس میں اُس کے لیے ہر قسم کے پھل ہوں[۷۰۸] اور وہ بوڑھا ہو جائے اور اُس کے بچے ابھی ناتواں ہوں اور باغ پر سموم کا بگولا پھر جائے

پر باغ ہو تو اُس کی بلندی ایک طرف تو اُس کی خوش منظری کا باعث ہوتی ہے، دوسری طرف اُس کو سیلاب وغیرہ سے محفوظ کرتی ہے۔ نیز ہموار زمین پر ہونے کے سبب سے اُس کے لیے اُس طرح پھسل کر فنا ہو جانے کا اندیشہ بھی نہیں ہوتا جو ڈھلوان زمینوں کے باغوں اور فصلوں کے لیے ہوتا ہے۔ پھر آب و ہوا کی خوبی اُس کی بارآوری کی ضامن ہوتی ہے۔ اگر موسم سازگار رہا تو پوچھنا ہی کیا ہے، اگر سازگار نہ ہوا، جب بھی وہ پھل دے جاتا ہے۔‘‘ (تدبر قرآن ۱/۶۱۷)

[۷۰۸] یہ عربوں کے تصور کے مطابق ایک اچھے باغ کی تصویر ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

’’...اُن کے ہاں اچھے باغ کا تصور یہ ہے کہ اُس کے کنارے کنارے کھجوروں کے درخت ہوں، بیچ میں انگور کی بیلیں ہوں، مناسب مواقع سے مختلف فصلوں کی کاشت کے لیے قطعات ہوں، باغ بلندی پر ہو، اُس کے نیچے نہر بہ رہی ہو جس کی نالیاں باغ کے اندر دوڑا دی گئی ہوں۔‘‘

(تدبر قرآن ۱/۶۱۸)

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ
اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ
وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ
غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾
اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ

اور وہ جل کر خاک ہو جائے۔ (احسان جتا کر اور دوسروں کی دل آزاری کر کے اپنا انفاق برباد کر لینے والوں کی حالت قیامت میں یہی ہو گی)۔ اللہ اِسی طرح اپنی آیتیں تمھارے لیے واضح کرتا ہے تاکہ تم غور کرو۔ ۲۶۶

ایمان والو، اپنی پاکیزہ کمائی میں سے خرچ کرو[۷۰۹] اور اُس میں سے بھی جو ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالا ہے[۷۱۰]، اور کوئی بری چیز تو اُس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے کا خیال بھی نہ کرو۔ تم اِس طرح کی چیزوں میں سے خرچ کرتے ہو، لیکن اپنا حال یہ ہے کہ اُس کی قیمت گھٹا نہ لو تو اُسے لینے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور جان رکھو کہ (تمھاری اِس خیرات سے) اللہ بے نیاز ہے، وہ ستودہ صفات ہے۔ ۲۶۷

---

[۷۰۹] یعنی اپنے اُس مال میں سے خرچ کرو جو اچھا ہو، بے وقعت اور گھٹیا نہ ہو اور تم نے اُسے کسی غلط اور مشتبہ طریقے سے نہیں، بلکہ جائز طریقے سے کمایا ہو۔

[۷۱۰] اِس سے واضح ہے کہ پہلے اُس کمائی کا ذکر ہے جو تجارت وغیرہ کے طریقوں سے حاصل ہوتی ہے۔ زراعت اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک الگ قسم ہے۔ چنانچہ اُس کے لیے زکوٰۃ کی شرح بھی اِسی بنا پر الگ رکھی گئی ہے۔

مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۖ (۲۶۸) يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ
مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۗ وَمَا
يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۲۶۹)

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ
يَعْلَمُهٗ ۗ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (۲۷۰)

شیطان تمھیں تنگ دستی سے ڈراتا اور (خرچ کے لیے) بے حیائی کی راہ سجھاتا ہے[۱۱] اور اللہ اپنی طرف سے تمھارے ساتھ مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے، اور اللہ بڑی وسعت اور بڑا علم رکھنے والا ہے۔ وہ (اپنے قانون کے مطابق) جس کو چاہتا ہے، اِس وعدے کا فہم عطا کر دیتا ہے[۱۲]، اور جسے یہ فہم دیا گیا، اُسے تو درحقیقت خیر کثیر کا ایک خزانہ دے دیا گیا۔ لیکن (اِس طرح کی باتوں سے) یاددہانی صرف دانش مند ہی حاصل کرتے ہیں۔ ۲۶۸-۲۶۹

(اِس بات کو سمجھ لو) اور (مطمئن رہو کہ) جو خرچ بھی تم کرو گے یا جو نذر بھی تم

---

[۱۱] اصل میں 'امر' کا لفظ آیا ہے۔ یہ جس طرح حکم دینے کے معنی میں آتا ہے، اُسی طرح ترغیب دینے اور سجھانے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان ایک تو مستقبل کے موہوم خطرات سے ڈرا کر تمھیں اللہ کی راہ میں انفاق سے روکتا ہے اور دوسرے نفس کی راہ میں فضول خرچی اور عیاشی کی ترغیب دیتا ہے تاکہ کسی بڑے مقصد کے لیے خرچ کرنے کی گنجایش ہی باقی نہ رہ جائے۔

[۱۲] چنانچہ وہ دنیا اور اُس کی نقد لذتوں کو چھوڑ کر خدا کے فضل اور اُس کی بخشش کی امید میں اور ایک نادیدہ عالم کی کامیابیوں کے لیے اپنی کمائی لٹانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ
فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾
لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا

مانو گے،[۷۱۳] اُس کا صلہ لازماً پاؤ گے، اِس لیے کہ اللہ اُسے جانتا ہے اور (اللہ کی اِس ہدایت سے منہ موڑ کر) اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کا (اللہ کے ہاں) کوئی مددگار نہ ہوگا۔ ۲۷۰

تم اپنی خیرات علانیہ دو تو یہ بھی کیا اچھی بات ہے[۷۱۴] اور اُسے چھپاؤ اور غریبوں کو دے دو تو یہ تمھارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔[۷۱۵] (اللہ تم کو اِس کا صلہ دے گا) اور تمھارے بہت سے گناہ تم سے جھاڑ دے گا اور حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے پوری طرح باخبر ہے۔[۷۱۶] ۲۷۱

(بنی اسرائیل نہیں مانتے تو اے پیغمبر)، اِن کو ہدایت پر لے آنا تمھاری ذمہ داری

---

[۷۱۳] نذر منت کو کہتے ہیں۔ یعنی اللہ سے عہد کیا جائے کہ میری فلاں مراد پوری ہو گئی تو میں فلاں اور فلاں عبادت یا ریاضت کروں گا یا اتنا صدقہ دوں گا۔ یہ اگرچہ کوئی پسندیدہ چیز نہیں ہے، لیکن اِس طرح کا عہد کر لیا جائے تو صاف واضح ہے کہ اُسے ہر حال میں پورا ہونا چاہیے۔

[۷۱۴] اِس لیے کہ اِس سے دوسروں کو انفاق کی ترغیب ہوتی ہے۔

[۷۱۵] اِس لیے کہ اِس سے حاجت مندوں کی عزت نفس بھی مجروح نہیں ہوتی اور خود دینے والا بھی ریا اور نمایش کے فتنے سے محفوظ رہتا ہے۔

[۷۱۶] مطلب یہ ہے کہ چھپا کر دو گے تو یہ اللہ سے چھپا نہیں رہے گا۔ علانیہ اور پوشیدہ، سب تمھارے لحاظ سے ہے۔ اللہ سے کوئی چیز بھی پوشیدہ نہیں رہتی۔ تم جو کچھ بھی کرو گے اور جہاں بھی

مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ
وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾
لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا

نہیں ہے، بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے، (اپنے قانون کے مطابق) ہدایت دیتا ہے[۱۷۱]۔ (ایمان والو، تم البتہ سمجھ لو کہ) جو مال بھی تم خرچ کرو گے، اُس کا نفع تمھیں ہی ملنا ہے، اور تم اِسی لیے تو خرچ کر رہے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو، اور (اِس مقصد سے) جو مال بھی تم خرچ کرو گے، وہ (قیامت میں) تمھیں پورا کر دیا جائے گا اور تمھارے حق میں ذرا بھی کمی نہ ہو گی۔ ۲۷۲

یہ[۱۷۸] خاص کر اُن غریبوں کے لیے ہے[۱۷۹] جو اللہ کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں، (اپنے

کرو گے، وہ اُس سے باخبر ہے۔

[۱۷۱] یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ پیغمبر کی حیثیت سے آپ کی ذمہ داری اِس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اپنے مخاطبین کو اتمام حجت کے درجے میں اللہ کی ہدایت سے آگاہ کر دیں۔ اِس کے بعد یہ اُن کا کام ہے کہ اُسے قبول کریں یا رد کر دیں۔ آپ کو اِس کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اگر اُسے قبول نہیں کرتے تو اِس کا خمیازہ بھی خود ہی بھگتیں گے۔

[۱۷۸] اصل میں 'لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'لِلْفُقَرَآءِ' سے پہلے مبتدا بربناے قرینہ حذف ہو گیا ہے۔

[۱۷۹] یہ اُن مہاجرین کی طرف اشارہ ہے جو مدینہ آنے کے بعد کئی برس کے لیے اِس طرح گھر گئے تھے کہ تجارت کے لیے باہر نکلنا بھی اُن کے لیے ممکن نہ تھا، اور انصار کے ساتھ مواخات کا معاملہ بھی ایک حد سے زیادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر ایک چھوٹے سے گاؤں میں معاش کے دوسرے ذرائع تلاش کر لینا بھی آسان نہ تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی بنا پر اُنھیں مسجد میں ٹھیرا لیا تھا۔

فِی الْاَرْضِ ز یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ج تَعْرِفُهُمْ
بِسِیْمٰهُمْ ج لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ط وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ
فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ﴿٢٧٣﴾ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ
سِرًّا وَّعَلَانِیَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ج وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ
وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿٢٧٤﴾
اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ

کاروبار کے لیے) زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے، اُن کی خودداری کے باعث ناواقف اُن کو غنی خیال کرتا ہے، اُن کے چہروں سے تم اُنھیں پہچان سکتے ہو، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔[۲۰؎] (اُن کی مدد کرو) اور (سمجھ لو کہ اِس مقصد کے لیے) جو مال بھی تم خرچ کرو گے، اُس کا صلہ تمھیں لازماً ملے گا، اِس لیے کہ اللہ اُسے خوب جانتا ہے۔ جو لوگ شب و روز، علانیہ اور چھپا کر اپنا مال (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں، اُن کے لیے اُن کا اجر اُن کے پروردگار کے پاس ہے اور وہاں اُن کے لیے کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ کبھی غم زدہ ہوں گے۔ ۲۷۳-۲۷۴

اِس کے برخلاف جو لوگ سود کھاتے ہیں[۲۱؎] وہ قیامت میں اٹھیں گے تو بالکل

تاریخ میں یہ لوگ اصحاب صفہ کے نام سے مشہور ہیں۔

[۲۰؎] اِس سے مقصود اُن کے مانگنے کی نفی ہے۔ 'لپٹ کر' کے الفاظ مانگنے والوں کی عام حالت کو ظاہر کرنے کے لیے آئے ہیں۔ کسی چیز کے گھنونے پن کو واضح کرنے کے لیے یہ اسلوب قرآن میں جگہ جگہ اختیار کیا گیا ہے۔ اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ مانگتے تو ہیں، مگر لپٹ کر نہیں مانگتے۔

الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ

اُس شخص کی طرح اٹھیں گے جسے شیطان نے اپنی چھوت سے پاگل بنا دیا ہو۔[۲۲] یہ

۲۱؎ اصل میں لفظ ’رِبٰوا‘ استعمال ہوا ہے۔ اردو زبان میں اِس کے لیے سود کا لفظ مستعمل ہے اور اِس سے مراد وہ اضافہ ہے جو ایک قرض دینے والا مقروض سے اپنی اصل رقم پر محض اِس لیے وصول کرتا ہے کہ اُس نے ایک خاص مدت کے لیے اُس کو یہ رقم استعمال کرنے کی اجازت دی ہے۔ یہ قرض کسی غریب اور نادار کو دیا گیا ہو یا کسی کاروباری اور رفاہی اسکیم کے لیے، اِس چیز کو ربا کی حقیقت کے تعین میں کوئی دخل نہیں ہے۔ عربی زبان میں ربا کا اطلاق قرض دینے والے کے مقصد اور مقروض کی نوعیت وحیثیت سے قطع نظر محض اُس اضافے ہی پر ہوتا ہے جو کسی قرض کی رقم پر لیا جائے۔ چنانچہ یہ بات سورۂ روم (۳۰) کی آیت ۳۹ میں خود قرآن نے واضح کر دی ہے کہ اُس کے زمانۂ نزول میں سودی قرض زیادہ تر کاروباری لوگوں کے مال میں جا کر بڑھنے کے لیے دیے جاتے تھے۔ اِس کے لیے آیت میں ’لِيَرْبُوَا فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ‘ (اِس لیے کہ وہ دوسروں کے مال میں پروان چڑھے) کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ تعبیر، ظاہر ہے کہ غریبوں کو دیے جانے والے سودی قرضوں کے لیے کسی طرح موزوں نہیں ہے، بلکہ صاف بتاتی ہے کہ اُس زمانے میں سودی قرض بالعموم تجارتی مقاصد کے لیے دیا جاتا تھا اور اِس طرح قرآن کی اِس تعبیر کے مطابق گویا دوسروں کے مال میں پروان چڑھتا تھا۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ سود کا تعلق صرف اُنھی چیزوں سے ہے جن کا استعمال اُن کی اپنی حیثیت میں اُنھیں فنا کر دیتا اور اِس طرح مقروض کو اُنھیں دوبارہ پیدا کر کے اُن کے مالک کو لوٹانے کی مشقت میں مبتلا کرتا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اِس پر اگر کسی اضافے کا مطالبہ کیا جائے تو یہ عقل ونقل، دونوں کی رو سے ظلم ہے۔ لیکن اِس کے برخلاف وہ چیزیں جن کے وجود کو قائم رکھ کر اُن سے استفادہ کیا جاتا ہے اور استعمال کے بعد وہ جس حالت میں بھی ہوں، اپنی اصل حیثیت ہی میں اُن کے مالک کو لوٹا دی جاتی ہیں، اُن کے استعمال کا معاوضہ کرایہ ہے اور اُس پر، ظاہر ہے کہ

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ

اِس لیے کہ اُنھوں نے کہا ہے کہ بیع بھی تو آخر سود ہی کی طرح ہے اور تعجب ہے کہ اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام ٹھیرایا ہے[۲۳]۔ (اِس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ نے

کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔

۲۲ے اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیاطین کی چھوت بھی اُن اسباب میں سے ہے جن سے آدمی بعض اوقات پاگل ہو جاتا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت میں لکھا ہے:

> ”...نیک بندوں پر تو ارواح خبیثہ کا اثر اِس سے زیادہ نہیں ہوتا کہ اُن کو کوئی اذیت یا آزمایش پیش آجائے، لیکن جن کی روحیں خود خبیث ہوتی ہیں، جس طرح اُن کا قلب شیطان کی مٹھی میں ہوتا ہے، اُسی طرح کبھی کبھی اُن کے عقل و دماغ، سب پر شیطان کا تسلط ہو جاتا ہے اور وہ ظاہر میں بھی بالکل پاگل ہو کر کپڑے پھاڑتے، گریبان چاک کرتے، منہ پر جھاگ لاتے اور پریشان حال، پراگندہ بال، جدھر سینگ سمائے، اُدھر آوارہ گردی اور خاک بازی کرتے پھرتے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۱/۶۳۱)

۲۳ے یہ قرآن نے سود خواروں کے قیامت میں پاگلوں کی طرح اٹھنے کی وجہ بتائی ہے کہ وہ اِس بات پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں کہ اللہ نے بیع و شرا کو حلال اور سود کو حرام ٹھیرا دیا ہے، دراں حالیکہ اِن دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جب ایک تاجر اپنے سرمایے پر نفع لے سکتا ہے تو ایک سرمایہ دار اگر اپنے سرمایے پر نفع کا مطالبہ کرے تو وہ آخر مجرم کس طرح قرار پاتا ہے؟ قرآن کے نزدیک یہ ایسی پاگل پن کی بات ہے کہ اِس کے کہنے والوں کو جزا اور عمل میں مشابہت کے قانون کے تحت قیامت میں پاگلوں اور دیوانوں کی طرح اٹھنا چاہیے۔

استاذ امام سود خواروں کے اِس اظہار تعجب پر تبصرہ کرتے ہوئے اِن آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

فَانۡتَھٰی فَلَہٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمۡرُہٗۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ وَ مَنۡ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ

اُسے حرام ٹھیرایا ہے)، لہٰذا جسے اُس کے پروردگار کی تنبیہ پہنچی[۲۴] اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ وہ لے چکا، سو لے چکا، (اُس کے خلاف کوئی اقدام نہ ہوگا) اور اُس کا معاملہ

> ”اِس اعتراض سے یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آ گئی کہ سود کو بیع پر قیاس کرنے والے پاگلوں کی نسل دنیا میں نئی نہیں ہے، بلکہ بڑی پرانی ہے۔ قرآن نے اِس قیاس کو... لائق توجہ نہیں قرار دیا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بداہتاً باطل اور قیاس کرنے والے کی دماغی خرابی کی دلیل ہے۔ ایک تاجر اپنا سرمایہ ایک ایسے مال کی تجارت پر لگاتا ہے جس کی لوگوں کو طلب ہوتی ہے۔ وہ محنت، زحمت اور خطرات مول لے کر اُس مال کو اُن لوگوں کے لیے قابل حصول بناتا ہے جو اپنی ذاتی کوشش سے اول تو آسانی سے اُس کو حاصل نہیں کر سکتے تھے اور اگر حاصل کر سکتے تھے تو اُس سے کہیں زیادہ قیمت پر، جس قیمت پر تاجر نے اُن کے لیے مہیا کر دیا۔ پھر تاجر اپنے سرمایہ اور مال کو کھلے بازار میں مقابلے کے لیے پیش کرتا ہے اور اُس کے لیے منافع کی شرح بازار کا اتار چڑھاؤ مقرر کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اِس اتار چڑھاؤ کے ہاتھوں بالکل دیوالیہ ہو کر رہ جائے اور ہوسکتا ہے کہ کچھ نفع حاصل کر لے۔ اِسی طرح اِس معاملے میں بھی اُس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں کہ وہ ایک بار ایک روپے کی چیز ایک روپے دو آنے یا چار آنے میں بیچ کر پھر اُس روپے سے ایک دھیلے کا بھی کوئی نفع اُس وقت تک نہیں کما سکتا، جب تک اُس کا وہ روپیہ تمام خطرات اور سارے اتار چڑھاؤ سے گزر کر پھر میدان میں نہ اترے اور معاشرے کی خدمت کر کے اپنے لیے استحقاق نہ پیدا کرے۔
>
> بھلا بتائیے، کیا نسبت ہے ایک تاجر کے اِس جاں باز، غیور اور خدمت گزار سرمایے سے ایک سود خوار کے اُس سنگ دل، بزدل، بے غیرت اور دشمن انسانیت سرمایے کو جو جوکھم تو ایک بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں، لیکن منافع بٹانے کے لیے سر پر سوار ہو جاتا ہے؟“
>
> (تدبر قرآن ۱/۶۳۲)

[۲۴] اصل میں ’فَمَنۡ جَآءَہٗ مَوۡعِظَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ‘ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِن میں

النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ
وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

اللہ کے حوالے ہے۔[۲۵] اور جو (اِس تنبیہ کے بعد بھی) اِس کا اعادہ کریں گے تو وہ دوزخ کے لوگ ہیں، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔[۲۶] (اُس دن) اللہ سود کو مٹا دے گا[۲۷] اور خیرات کو بڑھائے گا[۲۸] اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی ناشکرے اور کسی حق تلفی کرنے والے کو

’مَوْعِظَةٌ‘ کے لیے فعل مذکر آیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس کی تانیث غیر حقیقی ہے اور غیر حقیقی تانیث کے لیے فعل بعض اوقات لفظ کے مفہوم کے لحاظ سے آجاتے ہیں۔

۲۵ے یعنی دنیا میں کوئی اقدام نہیں کیا جائے گا، لیکن آخرت کے حوالے سے معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ آخرت کی پکڑ سے بچنے کے لیے اتنی بات کافی نہیں ہے کہ آدمی نے سود لینا چھوڑ دیا۔ وہاں تو اللہ تعالیٰ یہ بھی دیکھیں گے کہ اِس موقع پر دل کی حالت کیا رہی اور پچھلے مظالم کی تلافی کے لیے کیا کچھ کیا گیا۔

۲۶ے اِس سزا کی وجہ یہ ہے کہ اُن کا یہ رویہ اِس بات کا واضح ثبوت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اِس حکم کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ صریح کفر ہے اور اِس کی سزا وہی ہونی چاہیے جو کافروں کے لیے مقرر ہے۔

۲۷ے یعنی سود خواروں کے لیے قیامت میں صرف حسرت و ندامت ہوگی۔ وہ دیکھیں گے کہ دنیا میں اُن کے لاکھوں وہاں ایک کوڑی بھی نہیں رہے۔

۲۸ے ترمذی، رقم ۶۶۲ کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کی وضاحت اِس طرح فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ صدقے کو قبول کرتا اور اُسے اپنے داہنے ہاتھ سے لیتا ہے۔ پھر وہ تمھارے لیے اِس طرح اُس کی پرورش کرتا ہے، جس طرح تم میں سے کوئی اپنے بچھڑے کی پرورش کرتا ہے، یہاں تک کہ تمھارا دیا ہوا ایک لقمہ اللہ کے ہاں احد پہاڑ بن

وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ
وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾
وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ
لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى

پسند نہیں کرتا۔ ہاں، جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے اور نماز کا اہتمام کیا اور زکوٰۃ ادا کی، اُن کے لیے اُن کا اجر اُن کے پروردگار کے پاس ہے اور وہاں اُن کے لیے کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ وہ کوئی غم کبھی کھائیں گے۔ ۲۷۵-۲۷۷

ایمان والو، اگر تم سچے مومن ہو تو اللہ سے ڈرو اور جتنا سود باقی رہ گیا ہے، اُسے چھوڑ دو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے جنگ کے لیے خبردار ہو جاؤ[۲۹]۔ اور اگر توبہ کر لو تو تمھاری اصل رقم کا تمھیں حق ہے۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو گے، نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔ اور مقروض کبھی تنگ دست ہو تو ہاتھ کھلنے تک

جاتا ہے۔

[۲۹] اِس کی نوعیت بالکل الٹی میٹم کی ہے، یعنی جو لوگ اب بھی اِس حکم کو نہیں مانیں گے، اُن کے خلاف بغاوت کے جرم میں فوجی کارروائی کی جائے گی۔ اِس سے معلوم ہوا کہ سودخواری پر اصرار ایسا جرم ہے کہ اِس کا ارتکاب کرنے والوں کو محاربین قرار دے کر اُن کے خلاف کارروائی کی جاسکتی ہے۔

اللّٰهِ قف ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾

اُسے مہلت دو اور اگر تم بخش دو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم سمجھتے ہو[۳۰ے]۔ اور اُس دن سے ڈرو، جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ پھر ہر شخص کو اُس کی کمائی وہاں پوری مل جائے گی اور لوگوں پر کوئی ظلم نہ ہو گا۔ ۲۷۸-۲۸۱

[۳۰ے] یہ آیت اِس بات کی مزید دلیل ہے کہ قرآن کے زمانۂ نزول میں قرض زیادہ تر تجارتی اور کاروباری مقاصد کے لیے دیا جاتا تھا۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی تفسیر میں لکھا ہے:

> ”اِس زمانے میں بعض کم سواد یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عرب میں زمانۂ نزول قرآن سے پہلے جو سود رائج تھا، یہ صرف مہاجنی سود تھا۔ غریب اور نادار لوگ اپنی ناگزیر ضروریات زندگی حاصل کرنے کے لیے مہاجنوں سے قرض لینے پر مجبور ہوتے تھے اور یہ مہاجن اُن مظلوموں سے بھاری بھاری سود وصول کرتے تھے۔ اِسی سود کو قرآن نے ربا قرار دیا ہے اور اِسی کو یہاں حرام ٹھیرایا ہے۔ رہے یہ تجارتی کاروباری قرضے جن کا اِس زمانے میں رواج ہے تو اِن کا اُس زمانے میں نہ دستور تھا، نہ اِن کی حرمت و کراہت سے قرآن نے کوئی بحث کی ہے۔
>
> اِن لوگوں کا نہایت واضح جواب خود اِس آیت کے اندر ہی موجود ہے۔ جب قرآن یہ حکم دیتا ہے کہ اگر قرض دار تنگ دست (ذُوْ عُسْرَةٍ) ہو تو اُس کو کشادگی (مَيْسَرَةٍ) حاصل ہونے تک مہلت دو تو اِس آیت نے گویا پکار کر یہ خبر دے دی کہ اُس زمانے میں قرض لینے والے امیر اور مال دار لوگ بھی ہوتے تھے۔ بلکہ یہاں اگر اسلوب بیان کا صحیح صحیح حق ادا کیجیے تو یہ بات نکلتی ہے کہ قرض کے لین دین کی معاملت زیادہ تر مال داروں ہی میں ہوتی تھی، البتہ امکان اِس کا بھی تھا کہ کوئی قرض دار تنگ حالی میں مبتلا ہو کہ اُس کے لیے مہاجن کی اصل رقم کی واپسی بھی ناممکن ہو رہی ہو تو اُس کے متعلق یہ ہدایت ہوئی کہ مہاجن اُس کو اُس کی مالی حالت سنبھلنے تک مہلت دے اور اگر اصل بھی معاف کر دے تو یہ بہتر ہے۔ اِس معنی کا اشارہ آیت کے الفاظ سے نکلتا ہے، اِس لیے کہ فرمایا ہے کہ: 'اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ' (اگر قرض دار

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا تَدَايَنۡتُمۡ بِدَيۡنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى
فَاكۡتُبُوۡهُ ؕ وَلۡيَكۡتُبْ بَّيۡنَكُمۡ كَاتِبٌۢ بِالۡعَدۡلِ ۖ وَلَا يَاۡبَ كَاتِبٌ اَنۡ
يَّكۡتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلۡيَكۡتُبۡ ۚ وَلۡيُمۡلِلِ الَّذِىۡ عَلَيۡهِ الۡحَقُّ
وَلۡيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبۡخَسۡ مِنۡهُ شَيۡـًٔا ؕ فَاِنۡ كَانَ الَّذِىۡ عَلَيۡهِ

ایمان والو، (قرض کے معاملات، البتہ ہوں گے۔ لہٰذا) تم کسی مقرر مدت کے لیے ادھار کا لین دین کرو تو اُسے لکھ لو اور چاہیے کہ اُس کو تمھارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے۔ اور جسے لکھنا آتا ہو، وہ لکھنے سے انکار نہ کرے، بلکہ جس طرح اللہ نے اُسے سکھایا ہے، وہ بھی دوسروں کے لیے لکھ دے۔ اور یہ

تنگ حال ہو تو اُس کو کشادگی حاصل ہونے تک مہلت دی جائے)۔ عربی زبان میں 'اِنْ' کا استعمال عام اور عادی حالات کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ بالعموم نادر اور شاذ حالات کے بیان کے لیے ہوتا ہے۔ عام حالات کے بیان کے لیے عربی میں 'اِذَا' ہے۔ اِس روشنی میں غور کیجیے تو آیت کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اُس زمانے میں عام طور پر قرض دار 'ذُوْ مَیْسَرَةٍ' (خوش حال) ہوتے تھے، لیکن گاہ گاہ ایسی صورت بھی پیدا ہو جاتی تھی کہ قرض دار غریب ہو یا قرض لینے کے بعد غریب ہو گیا ہو تو اُس کے ساتھ اِس رعایت کی ہدایت فرمائی۔''

(تدبر قرآن ۱/۶۳۸)

اِس کے بعد اُنھوں نے اپنی اِس بحث کا نتیجہ اِس طرح بیان کیا ہے:

''ظاہر ہے کہ مال دار لوگ اپنی ناگزیر ضروریات زندگی کے لیے مہاجنوں کی طرف رجوع نہیں کرتے رہے ہوں گے، بلکہ وہ اپنے تجارتی مقاصد ہی کے لیے قرض لیتے رہے ہوں گے۔ پھر اُن کے قرض اور اِس زمانے کے اِن قرضوں میں جو تجارتی اور کاروباری مقاصد سے لیے جاتے ہیں، کیا فرق ہوا؟'' (تدبر قرآن ۱/۶۳۹)

الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ
وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ
لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ
اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ

دستاویز اُسے لکھوانی چاہیے[۳۱] جس پر حق عائد ہوتا ہو۔ اور وہ اللہ، اپنے پروردگار سے ڈرے اور اُس میں کوئی کمی نہ کرے۔ پھر اگر وہ شخص جس پر حق عائد ہوتا ہے، نادان یا ضعیف ہو یا لکھوا نہ سکتا ہو تو اُس کے ولی کو چاہیے کہ وہ انصاف کے ساتھ لکھوا دے۔ اور تم اِس پر اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کی گواہی کرا لو، لیکن اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں، تمھارے پسندیدہ گواہوں میں سے۔ دو عورتیں اِس لیے کہ اگر ایک الجھے گی تو دوسری اُس کو یاد دلا دے گی۔[۳۲] اور یہ گواہ جب

---

[۳۱] اصل میں لفظ 'فَلْیُمْلِلْ' استعمال ہوا ہے، اِس کی ایک صورت 'املاء' بھی ہے۔ عربی زبان میں تضعیف کے دو حرفوں میں سے ایک کو 'ی' میں تبدیل کر کے لفظ کو ہلکا کر لینے کی یہ صورت عام ہے۔ قرآن مجید میں 'یَتَسَنّٰی' اور 'یَتَصَدّٰی' اِسی کی مثالیں ہیں۔

[۳۲] اِس آیت میں گواہی کا جو ضابطہ بیان ہوا ہے، اُس کے بارے میں دو باتیں واضح رہنی چاہییں:

ایک یہ کہ واقعاتی شہادت کے ساتھ اِس ضابطے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ صرف دستاویزی شہادت سے متعلق ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دستاویزی شہادت کے لیے گواہ کا انتخاب ہم کرتے ہیں اور واقعاتی شہادت میں گواہ کا موقع پر موجود ہونا ایک اتفاقی معاملہ ہوتا ہے۔ ہم اگر کوئی دستاویز لکھتے ہیں یا کسی معاملے میں کوئی اقرار کرتے ہیں تو ہمیں اختیار ہے کہ اُس پر جسے چاہیں،

اِذَا مَا دُعُوْا ط وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ط

بلائے جائیں تو اُنھیں انکار نہیں کرنا چاہیے۔ اور معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا، اُس کے وعدے

گواہ بنائیں۔ لیکن زنا، چوری، قتل، ڈاکا اور اِس طرح کے دوسرے جرائم میں جو شخص بھی موقع پر موجود ہوتا ہے، وہی گواہ قرار پاتا ہے۔ چنانچہ شہادت کی اِن دونوں صورتوں کا فرق اِس قدر واضح ہے کہ اِن میں سے ایک کو دوسری کے لیے قیاس کا مبنیٰ نہیں بنایا جاسکتا۔

دوسری یہ کہ آیت کے موقع و محل اور اسلوب بیان میں اِس بات کی کوئی گنجایش نہیں ہے کہ اِسے قانون و عدالت سے متعلق قرار دیا جائے۔ اِس میں عدالت کو مخاطب کر کے یہ بات نہیں کہی گئی کہ اِس طرح کا کوئی مقدمہ اگر پیش کیا جائے تو مدعی سے اِس نصاب کے مطابق گواہ طلب کرو۔ اِس کے مخاطب ادھار کا لین دین کرنے والے ہیں اور اِس میں اُنھیں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اگر ایک خاص مدت کے لیے اِس طرح کا کوئی معاملہ کریں تو اُس کی دستاویز لکھ لیں اور نزاع اور نقصان سے بچنے کے لیے اُن گواہوں کا انتخاب کریں جو پسندیدہ اخلاق کے حامل، ثقہ، معتبر اور ایمان دار بھی ہوں اور اپنے حالات و مشاغل کے لحاظ سے اِس ذمہ داری کو بہتر طریقے پر پورا بھی کر سکتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اِس میں اصلاً مردوں ہی کو گواہ بنانے اور دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کو گواہ بنانے کی ہدایت کی گئی ہے تاکہ گھر میں رہنے والی یہ بی بی اگر عدالت کے ماحول میں کسی گھبراہٹ میں مبتلا ہو تو گواہی کو ابہام و اضطراب سے بچانے کے لیے ایک دوسری بی بی اُس کے لیے سہارا بن جائے۔ اِس کے یہ معنی، ظاہر ہے کہ نہیں ہیں اور نہیں ہو سکتے کہ عدالت میں مقدمہ اُسی وقت ثابت ہو گا، جب کم سے کم دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں اُس کے بارے میں گواہی دینے کے لیے آئیں۔ یہ ایک معاشرتی ہدایت ہے جس کی پابندی اگر لوگ کریں گے تو اُن کے لیے یہ نزاعات سے حفاظت کا باعث بنے گی۔ لوگوں کو اپنی صلاح و فلاح کے لیے اِس کا اہتمام کرنا چاہیے، لیکن مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے یہ کوئی نصاب شہادت نہیں ہے جس کی پابندی عدالت کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ اِس سلسلہ کی تمام ہدایات کے بارے میں فرمایا ہے

ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ
اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ
اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ۬ؕ
وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ
وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾

تک اُسے لکھنے میں کاہلی نہ کرو۔ اللہ کے نزدیک یہ طریقہ زیادہ مبنی بر انصاف ہے، گواہی کو زیادہ درست رکھنے والا ہے اور اِس سے تمھارے شبہوں میں پڑنے کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ ہاں، اگر لین دین روبرو اور دست گرداں نوعیت کا ہو، تب اُس کے نہ لکھنے میں تم پر کوئی حرج نہیں ہے۔ اور سودا کرتے وقت بھی گواہ بنا لیا کرو، اور (متنبہ رہو کہ) لکھنے والے یا گواہی دینے والے کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے، اور اگر تم ایسا کرو گے تو یہ وہ گناہ ہے جو تمھارے ساتھ چپک جائے گا۔[۳۳] اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور (اِس بات کو سمجھو کہ) اللہ تمھیں تعلیم دے رہا ہے، اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔[۳۴] ۲۸۲

کہ یہ طریقہ اللہ کے نزدیک زیادہ مبنی بر انصاف ہے، گواہی کو زیادہ درست رکھنے والا ہے، اور اِس سے شبہوں میں پڑنے کا امکان کم ہو جاتا ہے۔

[۳۳] اصل الفاظ ہیں: ’فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌ بِكُمْ‘۔ اِن میں ساتھ لگ جانے یا چپک جانے کا مفہوم عربیت کی رو سے متضمن ہے اور ’فُسُوْقٌ‘ کے بعد ’ب‘ اِس پر دلالت کرتی ہے۔

[۳۴] اِس آیت کے احکام کا خلاصہ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر میں اِس طرح بیان فرمایا ہے:

”جب کوئی قرض لین دین ایک خاص مدت تک کے لیے ہو تو اُس کی دستاویز لکھ لی جائے۔ یہ دستاویز دونوں پارٹیوں کی موجودگی میں کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے، اِس میں کوئی دغل فشل نہ کرے اور جس کو لکھنے کا سلیقہ ہو، اُس کو چاہیے کہ وہ اِس خدمت سے انکار نہ کرے۔ لکھنے کا سلیقہ اللہ کی ایک نعمت ہے، اِس نعمت کا شکر یہ ہے کہ آدمی ضرورت پڑنے پر لوگوں کے کام آئے۔ اِس نصیحت کی ضرورت اِس وجہ سے پیش آئی کہ اُس زمانے میں لکھے پڑھے لوگ کم تھے۔ دستاویزوں کی تحریر اور اُن کی رجسٹری کا سرکاری اہتمام اُس وقت تک نہ عمل میں آیا تھا اور نہ اُس کا عمل میں آنا ایسا آسان تھا۔

دستاویز کے لکھوانے کی ذمہ داری قرض لینے والے پر ہو گی۔ وہ دستاویز میں اعتراف کرے گا کہ میں فلاں بن فلاں کا اتنے کا قرض دار ہوں اور لکھنے والے کی طرح اُس پر بھی یہ ذمہ داری ہے کہ اِس اعتراف میں تقویٰ کو ملحوظ رکھے اور ہرگز صاحب حق کے حق میں کسی قسم کی کمی کرنے کی کوشش نہ کرے۔

اگر یہ شخص کم عقل ہو یا ضعیف ہو یا دستاویز وغیرہ لکھنے لکھانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو جو اُس کا ولی یا وکیل ہو، وہ اُس کا قائم مقام ہو کر انصاف اور سچائی کے ساتھ دستاویز لکھوائے۔

اِس پر دو مردوں کی گواہی ثبت ہو گی جن کے متعلق ایک ہدایت یہ ہے کہ وہ ’مِنْ رِّجَالِکُمْ‘ یعنی اپنے مردوں میں سے ہوں۔ جس سے بیک وقت دو باتیں نکلتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مسلمان ہوں۔ دوسری یہ کہ وہ اپنے میل جول اور تعلق کے لوگوں میں سے ہوں کہ فریقین اُن کو جانتے پہچانتے ہوں۔ دوسری (ہدایت) یہ کہ وہ ’مِمَّنْ تَرْضَوْنَ‘ یعنی پسندیدہ اخلاق و عمل کے، ثقہ، معتبر اور ایمان دار ہوں۔

اگر مذکورہ صفات کے دو مرد میسر نہ آ سکیں تو اِس کے لیے ایک مرد اور دو عورتوں کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ دو عورتوں کی شرط اِس لیے ہے کہ اگر ایک سے کسی لغزش کا صدور ہو گا تو دوسری کی تذکیر و تنبیہ سے اُس کا سد باب ہو سکے گا۔ یہ فرق عورت کی تحقیر کے پہلو سے نہیں ہے، بلکہ اُس کی مزاجی خصوصیات اور اُس کے حالات و مشاغل کے لحاظ سے یہ ذمہ داری اُس کے لیے ایک بھاری ذمہ داری ہے، اِس وجہ سے شریعت نے اِس کے اٹھانے میں اُس کے لیے سہارے کا بھی انتظام فرما دیا ہے۔

جو لوگ کسی دستاویز کے گواہوں میں شامل ہو چکے ہوں، عند الطلب اُن کو گواہی سے گریز کی اجازت نہیں ہے۔ اِس لیے کہ حق کی شہادت ایک عظیم معاشرتی خدمت بھی ہے اور شہداء اللہ ہونے کے پہلو سے اِس امت کے فریضۂ منصبی کا ایک جزو بھی۔

قرض لین دین کا معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا، اگر وہ کسی مدت کے لیے ہے، دست گرداں نوعیت کا نہیں ہے تو اُس کو قید تحریر میں لانے سے گرانی نہیں محسوس کرنی چاہیے۔ جو لوگ اِس کو زحمت سمجھ کر ٹال جاتے ہیں، وہ سہل انگاری کی وجہ سے بسا اوقات ایسے جھگڑوں میں پھنس جاتے ہیں جن کے نتائج بڑے دوررس نکلتے ہیں۔

مذکورہ بالا ہدایات اللہ تعالیٰ کے نزدیک حق وعدالت سے قرین، گواہی کو درست رکھنے والی اور شک ونزاع سے بچانے والی ہیں، اِس لیے معاشرتی صلاح وفلاح کے لیے اِن کا اہتمام ضروری ہے۔

دست گرداں لین دین کے لیے تحریر و کتابت کی پابندی نہیں ہے۔

ہاں، اگر کوئی اہمیت رکھنے والی خرید وفروخت ہوئی ہے تو اُس پر گواہ بنا لینا چاہیے تاکہ کوئی نزاع پیدا ہو تو اُس کا تصفیہ ہو سکے۔

نزاع پیدا ہو جانے کی صورت میں کاتب یا گواہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کسی فریق کے لیے جائز نہیں ہے۔ کاتب اور گواہ ایک اہم اجتماعی وتمدنی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اِس وجہ سے اُن کو بلا وجہ نقصان پہنچانے کی کوشش کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ثقہ اور محتاط لوگ گواہی اور تحریر وغیرہ کی ذمہ داریوں سے گریز کرنے لگیں گے اور لوگوں کو پیشہ ور گواہوں کے سوا کوئی معقول گواہ ملنا مشکل ہو جائے گا۔ اِس زمانے میں ثقہ اور سنجیدہ لوگ گواہی وغیرہ کی ذمہ داریوں سے جو بھاگتے ہیں، اُس کی وجہ یہی ہے کہ کوئی معاملہ نزاعی صورت اختیار کر لیتا ہے تو اُس کے گواہوں کی شامت آ جاتی ہے۔ یہ بے چارے ہتک، اغوا، نقصان مال وجایداد، بلکہ قتل تک کی تعدیوں کے نشانہ بن جاتے ہیں۔ قرآن نے اِس قسم کی شرارتوں سے روکا کہ جو لوگ اِس قسم کی حرکتیں کریں گے، وہ یاد رکھیں کہ یہ کوئی چھوٹی موٹی نافرمانی نہیں ہے جو آسانی سے معاف ہو جائے گی، بلکہ یہ ایک ایسا فسق ہے جو اُن کے ساتھ چمٹ کے رہ جائے گا اور اِس کے برے نتائج سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔” (تدبر قرآن ۱/ ۶۴۰)

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ
فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ
اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ

اور اگر تم سفر میں ہو اور تمھیں کوئی لکھنے والا نہ ملے تو قرض کا معاملہ رہن قبضہ کرانے کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے۔[۳۵ے] پھر اگر ایک دوسرے پر بھروسے کی صورت نکل آئے تو جس کے پاس (رہن کی وہ چیز) امانت رکھی گئی ہے، وہ یہ امانت واپس کر دے اور اللہ، اپنے پروردگار سے ڈرتا رہے[۳۶ے] (اور اِس معاملے پر گواہی کرا لے)، اور گواہی (جس صورت میں بھی ہو، اُس) کو ہرگز نہ چھپاؤ اور (یاد رکھو کہ) جو اُسے چھپائے گا، اُس

۳۵ے اصل میں 'فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِن کی خبر کو بھی محذوف قرار دیا جا سکتا ہے اور اِن کو خبر مان کر اِن کا مبتدا بھی محذوف قرار دے سکتے ہیں۔ ہم نے دوسری صورت کو ترجیح دی ہے اور ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۳۶ے اِس سے واضح ہے کہ رہن کی اجازت صرف اُسی وقت تک ہے، جب تک قرض دینے والے کے لیے اطمینان کی صورت پیدا نہیں ہو جاتی۔ اللہ کا حکم ہے کہ یہ صورت پیدا ہو جائے تو رہن رکھی ہوئی چیز لازماً واپس کر دینی چاہیے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...جب ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ایک دوسرے پر اعتماد کے لیے جو باتیں مطلوب ہیں، وہ فراہم ہو جائیں۔ مثلاً سفر ختم کر کے حضر میں آ گئے، دستاویز کی تحریر کے لیے کاتب اور گواہ مل گئے، اپنوں کی موجودگی میں قرض معاملت کی تصدیق ہو گئی اور اِس امر کے لیے کوئی معقول وجہ باقی نہیں رہ گئی کہ قرض دینے والا رہن کے بغیر اعتماد نہ کر سکے تو پھر اُس کو چاہیے کہ وہ رہن کردہ چیز اُس کو واپس کر دے اور اپنے اطمینان کے لیے چاہے تو وہ شکل اختیار کرے جس کی اوپر ہدایت کی گئی ہے۔ یہاں رہن کردہ مال کو امانت سے تعبیر فرمایا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ

البقرة
۲

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ
اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ

کا دل گناہ گار ہوگا،[۳۷ے] اور (یاد رکھو کہ) جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے جانتا ہے۔ ۲۸۳

زمین[۳۸ے] اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، سب اللہ ہی کا ہے، (اِس لیے تم بھی اے بنی اسرائیل، ایک دن اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے) اور جو کچھ تمھارے دلوں میں

قرض دینے والے کے پاس رہن بطور امانت ہوتا ہے، جس کی حفاظت ضروری اور جس سے کسی قسم کا انتفاع ناجائز ہے۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۶۴۳)

۳۷ے یعنی یہ ایسا گناہ نہیں ہے جس کا اثر انسان کے محض ظاہری وجود تک ہی رہے۔ یہ لازماً دل میں اترے گا اور اُسے آلودۂ گناہ کرے گا، اِس لیے اِس کو کوئی معمولی چیز سمجھ کر نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔

۳۸ے یہ اِس عظیم سورہ کا خاتمہ ہے جس میں بنی اسرائیل سے اظہار براءت کے بعد ایک بے مثل دعا اِس نئی امت کی زبان پر جاری ہوگئی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد بنی اسمٰعیل میں سے اٹھائی گئی۔ سورۂ فاتحہ کی طرح خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِس کا نزول اِس بات کی بشارت ہے کہ یہ حرف بہ حرف قبول بھی ہو جائے گی۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی اِس دعا کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''...اِس کے لفظ لفظ سے اُس بھاری ذمہ داری کا احساس بھی ٹپک رہا ہے جو اِس امت پر ڈالی گئی ہے، وہ اعتراف بھی نمایاں ہو رہا ہے جو روحِ ایمان ہے، اُن باتوں سے بچائے جانے کی التجا بھی جھلک رہی ہے جو پچھلی امتوں کے لیے ٹھوکر کا باعث ہوئیں اور اداے فرض کی راہ میں جن مشکلات کے اندیشے ہیں، اُن میں استعانت اور جن لغزشوں کے خطرے ہیں، اُن سے درگذر کی درخواست بھی ہے۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۶۴۵)

مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۸۴﴾
اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ
كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ قف لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ
رُّسُلِهٖ قف وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا قف غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ ﴿۲۸۵﴾

ہے، اُسے تم ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ اُس کا حساب تم سے لے گا۔ پھر جس کو چاہے گا، (اپنے قانون کے مطابق) بخش دے گا اور جس کو چاہے گا، سزا دے گا، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ ۲۸۴

([۳۹]تم نہیں مانتے تو اِس کا نتیجہ بھی تمھیں ہی دیکھنا ہے)۔ ہمارے پیغمبر نے تو اُس چیز کو مان لیا[۴۰] جو اُس کے پروردگار کی طرف سے اُس پر نازل کی گئی ہے، اور اُس کے ماننے والوں نے بھی۔ یہ سب اللہ پر ایمان لائے، اور اُس کے فرشتوں اور اُس کی کتابوں اور اُس کے پیغمبروں پر ایمان لائے[۴۱]۔ (اِن کا اقرار ہے کہ) ہم اللہ

---

[۳۹] اِس مضمون کے ساتھ، اگر غور کیجیے تو یہود پر اتمام حجت اور ایک نئی امت کی تاسیس کے بعد بات وہیں پہنچ گئی، جہاں سے شروع ہوئی تھی کہ اِس کتاب سے ہدایت وہی لوگ پائیں گے جو خدا سے ڈرنے والے ہوں۔ یہی اِس سورہ کا اصل پیغام ہے اور عود علی البدء کے اسلوب پر قرآن نے خاتمۂ کلام میں ایک مرتبہ پھر اِسے نہایت خوبی کے ساتھ نمایاں کر دیا ہے۔

[۴۰] اِس سے واضح ہے کہ پیغمبر جس چیز کو لے کر آتا ہے، 'اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ' کہتے ہوئے سب سے پہلے اور سب سے آگے بڑھ کر اُسے مانتا بھی ہے۔

[۴۱] یہ تمام ایمانیات اِس سے پہلے آیت ۱۷۷ کے تحت زیر بحث آ چکے ہیں۔ یہاں اِن کا ذکر جس بات کو واضح کرنے کے لیے ہوا ہے، وہ آگے بیان ہو گئی ہے کہ یہ نئی امت خدا کی پوری ہدایت پر ایمان لائی ہے۔ یہود کی طرح اِس کے ایک حصے کو مان کر دوسرے کا انکار نہیں کر رہی ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ
رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ

کے پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے[۷۴۲] اور اِنھوں نے کہہ دیا ہے کہ ہم نے سنا اور سر اطاعت جھکا دیا[۷۴۳]۔ پروردگار، ہم تیری مغفرت چاہتے ہیں[۷۴۴] اور (جانتے ہیں کہ) ہمیں لوٹ کر تیرے ہی حضور میں پہنچنا ہے ـــــ یہ حقیقت ہے کہ اللہ کسی پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ (اُس کا قانون ہے کہ) اُسی کو ملے گا جو اُس نے کمایا ہے اور وہی بھرے گا جو اُس نے کیا ہے[۷۴۵] ـــــ پروردگار، ہم

---

[۷۴۲] اِس جملے میں غائب کے صیغے سے یکایک متکلم کی طرف اسلوب کی جو تبدیلی ہوئی ہے، اُس کا مقصد یہ ہے کہ بات کو محض خبر کی جگہ سے اٹھا کر اُس میں اعتراف و اقرار کا مضمون نمایاں کر دیا جائے۔

[۷۴۳] اِس جملے میں، اگر غور کیجیے تو یہود کے 'سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا' پر ایک لطیف تعریض بھی ہے۔

[۷۴۴] اصل میں لفظ 'غُفْرَانَكَ' آیا ہے۔ یہ فعل محذوف کا مفعول ہے۔ اِس موقع پر حذف کا یہ اسلوب دعا کرنے والے کے اضطراب کو نمایاں کرتا ہے اور سمع و طاعت کے اقرار کے معاً بعد یہ دعا بتاتی ہے کہ خدا کی مغفرت کا سہارا نہ ہو تو بندہ اِس دنیا میں اپنے پروردگار کی طرف سے کوئی ذمہ داری بھی اٹھانے کا حوصلہ نہیں کر سکتا۔

[۷۴۵] دعا کے بیچ میں یہ جملۂ معترضہ تسلی اور بشارت کے لیے ہے کہ جو ذمہ داری اِس نئی امت پر ڈالی جا رہی ہے، وہ اِس کی طاقت سے زیادہ نہیں ہے اور اِس میں ہر شخص کی جزا و سزا اُس کے اپنے ایمان و عمل کے لحاظ سے ہو گی۔ نہ کسی کے اختیار و امکان سے باہر کی چیزوں پر اُس کا مواخذہ کیا جائے گا اور نہ کسی کا ایمان و عمل دوسرے کے لیے نفع و ضرر کا باعث بنے گا۔ ہر شخص جو

اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ج رَبَّنَا وَلَا
تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ج وَاعْفُ عَنَّا وقفة وَاغْفِرْ لَنَا وقفة
وَارْحَمْنَا وقفة اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٨٦﴾

بھول جائیں یا غلطی کر جائیں تو اُس پر ہماری گرفت نہ کر[۴۶؎]۔ اور پروردگار، تو ہم پر کوئی ایسا بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلوں پر ڈالا تھا[۴۷؎]۔ اور پروردگار، کوئی ایسا بوجھ جس کو ہم اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے، تو ہم سے نہ اٹھوا[۴۸؎]، اور ہم سے درگذر کر اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔ تو ہمارا آقا ہے، سو اِن منکروں[۴۹؎] کے مقابلے میں (جو ہمارے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں)، تو ہماری مدد کر۔ ۲۸۵-۲۸۶

بوئے گا، وہی کاٹے گا اور جو کرے گا، وہی بھرے گا۔

۴۶؎ اِس طرح کی بھول چوک اگرچہ معاف ہی ہونی چاہیے، لیکن اِس کے باوجود اِس کے لیے معافی کی درخواست بندوں کی طرف سے غایت درجہ خشیت کو ظاہر کرتی ہے جس سے توقع ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مزید رحمت وعنایت کے مستحق ہوں گے۔

۴۷؎ یہ اُن اصر واغلال کی طرف اشارہ ہے جو یہود کی شریعت میں اُن کی سرکشی کے باعث موجود تھے اور جب وہ اُن کو نہیں اٹھا سکے تو بالآخر اُن کے لیے خدا کا عذاب بن گئے۔

۴۸؎ یہ استطاعت سے باہر اُن آزمایشوں سے محفوظ رہنے کی درخواست ہے جو بنی اسمٰعیل کو منصب شہادت کی ذمہ داری ادا کرنے کی راہ میں پیش آ سکتی تھیں۔

۴۹؎ اِس سے مراد وہ منکرین یہود ہیں جو اتمام حجت کے باوجود اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری طرح پہچان لینے کے بعد بھی نہ صرف یہ کہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے، بلکہ الٹا آپ کی دعوت کے دشمن بن کر مقابلے پر آ گئے۔

سورۃ آل عمران

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓـمّٓ ① اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ؕ② نَزَّلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ وَ اَنۡزَلَ التَّوۡرٰىۃَ وَالۡاِنۡجِیۡلَ ۙ③ مِنۡ قَبۡلُ ہُدًی لِّلنَّاسِ وَ اَنۡزَلَ الۡفُرۡقَانَ ؕ۵ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ لَہُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ؕ وَاللّٰہُ عَزِیۡزٌ

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورۂ 'الم' ہے۔[۵۰] اللہ وہ ہستی ہے کہ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، زندہ اور سب کو قائم رکھنے والا ہے۔[۵۱] (لوگوں کو امتحان میں ڈال کر وہ اُن کی ہدایت سے بے پروا نہیں ہو سکتا تھا، لہٰذا) اُس نے یہ کتاب تم پر قولِ فیصل کے ساتھ اتاری ہے، اُن پیشین گوئیوں کی تصدیق میں جو اِس سے پہلے موجود ہیں، اور تورات و انجیل کو بھی اِس سے پہلے اُسی نے لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اتارا تھا، اور اب یہ فرقان بھی اُسی نے اتارا

---

[۵۰] سورۂ بقرہ کی طرح اِس سورہ کا نام بھی الم ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے مضمون کے لحاظ سے یہ دونوں سورتیں توام ہیں۔ اِس نام کے معنی کیا ہیں؟ اِس کے متعلق اپنا نقطۂ نظر ہم نے سورۂ بقرہ کی آیت ۱ کے تحت تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

[۵۱] اصل میں لفظ 'اَلْقَیُّوْم' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی ہیں: وہ ہستی جو خود اپنے بل پر قائم اور دوسروں کو قائم رکھنے والی ہو۔ اِس سے اور اِس سے پہلے 'حَیّ' کی صفت سے قرآن نے اُن تمام معبودوں کی نفی کر دی ہے جو نہ زندہ ہیں، نہ دوسروں کو زندگی دے سکتے ہیں، اور نہ اپنے بل پر قائم

ذُوانْتِقَامٍ ④ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا
فِي السَّمَآءِ ؕ ⑤ هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ⑥

ہے۔[۵۲] (یہ اللہ کی آیتیں ہیں، اور) جو لوگ (جانتے بوجھتے) اللہ کی آیتوں کے منکر ہوں، اُن کے لیے بڑا سخت عذاب ہے، اور اللہ زبردست ہے، وہ (اِس طرح کے لوگوں سے) انتقام لینے والا ہے۔ اِس لیے کہ اللہ سے نہ زمین میں کوئی چیز چھپی ہوئی ہے، نہ آسمان میں۔ وہی تو ہے جو ماؤں کے پیٹ میں تمھاری صورتیں، جس طرح چاہتا ہے، بنا دیتا ہے۔ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔[۵۳] ۱-۶

ہیں، نہ دوسروں کو قائم رکھنے والے ہیں، بلکہ خود اپنی زندگی اور بقا کے لیے ایک حی و قیوم کے محتاج ہیں۔

۵۲ے یعنی جب وہ لوگوں کا معبود بھی ہے اور حی و قیوم بھی تو کس طرح ممکن ہے کہ وہ اُنھیں امتحان کے لیے دنیا میں بھیجے اور پھر حق و باطل کے معاملے میں اُن کی رہنمائی نہ فرمائے۔ چنانچہ لوگوں کو اختلافات کی تاریکی سے نکالنے کے لیے اپنی کتابوں کی صورت میں یہ روشنی اُس نے نازل کر دی ہے۔

۵۳ے یعنی وہ جب اُن کی سرکشی کو دیکھ بھی رہا ہے، اُن کا معبود بھی وہی ہے، اُن سے انتقام کی قدرت بھی رکھتا ہے اور ایک حکیم کی حیثیت سے اُس کی حکمت کا تقاضا بھی ہے کہ اِس طرح کے مجرموں کو اُن کے انجام تک پہنچا دے تو ضروری تھا کہ وہ بدلہ لینے والا ہو۔ وہ اگر ایسا نہ کرے تو اِس کے معنی یہ ہوں گے کہ یا تو وہ اُنھیں دیکھ نہیں رہا یا تنہا وہی معبود نہیں ہے یا دنیا کے بعض معاملات اُس نے دوسروں کے سپرد کر دیے ہیں یا بے بس ہے کہ اِس طرح کے مجرموں کو پکڑنے

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ
هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ

وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب اتاری ہے[۵۴] جس میں آیتیں محکم بھی ہیں جو اِس کتاب کی اصل بنیاد ہیں[۵۵] اور (اِن کے علاوہ) کچھ دوسری متشابہات بھی ہیں[۵۶]۔ سو جن

کی قدرت نہیں رکھتا یا کھلنڈرا ہے کہ خیر و شر کو ایک ہی جگہ رکھ کر اُن کا تماشا دیکھ رہا ہے۔

۵۴ے یعنی وہی عزیز و حکیم اور حی و قیوم جس کی اِن صفات کا تقاضا تھا کہ وہ یہ کتاب اتارے اور اِس کے ذریعے سے اتمام حجت کے بعد اِس کے منکروں کو سزا دے۔

۵۵ے لفظ محکم یہاں متشابہ کے مقابل میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی وہ آیتیں جن میں ایسے حقائق بیان کیے گئے جنھیں سمجھنا انسان کے لیے ممکن ہے، جو اُس کے علم و عقل سے ماورا نہیں ہیں اور جن کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت اُس کی فطرت میں ودیعت ہے۔ قرآن کی زیادہ تر آیتیں یہی ہیں اور اِنھی پر اُس کی ہدایت کا مدار ہے۔ قرآن نے اِسی بنا پر اُنھیں ام الکتاب، یعنی کتاب کی اصل بنیاد قرار دیا ہے۔

۵۶ے اِس سے مراد وہ آیتیں ہیں جن میں آخرت کی نعمتوں اور نقمتوں میں سے کسی نعمت یا نقمت کا بیان تمثیل اور تشبیہ کے انداز میں ہوا ہے یا اللہ تعالیٰ کے صفات و افعال اور ہمارے علم اور مشاہدے سے ماورا اُس کے کسی عالم کی کوئی بات تمثیلی اسلوب میں بیان کی گئی ہے، مثلاً آدم میں اللہ تعالیٰ کا اپنی روح پھونکنا یا سیدنا مسیح علیہ السلام کا بن باپ کے پیدا کرنا یا جنت اور جہنم کے احوال و مقامات وغیرہ۔ وہ سب چیزیں جن کے لیے ابھی الفاظ وجود میں نہ آئے ہوں، اُنھیں تمثیل اور تشبیہ کے اسلوب ہی میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ کسی نادیدہ عالم کے حقائق دنیا کی سب زبانوں کے ادب میں اِسی طرح بیان کیے جاتے ہیں۔ آج سے دو صدی پہلے ہم میں سے کوئی شخص اگر مستقبل کا علم پا کر بجلی کے قمقموں کا ذکر کرتا تو غالباً اِسی طرح کرتا کہ دنیا میں ایسے چراغ جلیں گے جن میں نہ تیل ڈالا جائے گا اور نہ اُنھیں آگ دکھانے کی ضرورت ہوگی۔ متشابہ آیات کی نوعیت

زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ج

کے دل پھرے ہوئے ہیں[۵۷]، وہ اِس میں سے ہمیشہ متشابہات کے درپے ہوتے ہیں،

بالکل یہی ہے۔ وہ نہ غیر متعین ہیں اور نہ اُن کے مفہوم میں کوئی ابہام ہے۔ اُن کے الفاظ عربی مبین ہی کے الفاظ ہیں اور اُن کے معنی بھی ہم بغیر کسی تردد کے سمجھتے ہیں۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ اُن کی حقیقت ہم اِس دنیا میں نہیں جان سکتے، لیکن اِس جاننے یا نہ جاننے کا قرآن کے فہم سے چونکہ کوئی تعلق نہیں ہے، اِس لیے کسی صاحب ایمان کو اِس کے درپے بھی نہیں ہونا چاہیے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی اِس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

> ”... یہ باتیں جس بنیادی حقیقت سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہیں وہ بجائے خود واضح اور مبرہن ہوتی ہے، عقل اُس کے اتنے حصے کو سمجھ سکتی ہے جتنا سمجھنا اُس کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ البتہ چونکہ اُس کا تعلق ایک نادیدہ عالم سے ہوتا ہے، اِس وجہ سے قرآن اِن کو تمثیل و تشبیہ کے انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ علم کے طالب بقدر استعداد اِن سے فائدہ اٹھالیں اور اِن کی اصل صورت و حقیقت کو علم الٰہی کے حوالہ کریں۔ یہ باتیں خدا کی صفات و افعال یا آخرت کی نعمتوں اور اُس کے آلام سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہیں۔ اِن کا جس حد تک ہمارے لیے سمجھنا ضروری ہے، اتنا ہماری سمجھ میں آجاتا ہے اور اِس سے ہمارے علم و یقین میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن اگر ہم اپنی حد سے آگے بڑھ کر اِن کی اصل حقیقت اور صورت کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کریں تو یہ چیز فتنہ بن جاتی ہے اور اِس کا نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ انسان اپنے ذہن سے شک کا ایک کانٹا نکالنا چاہتا ہے اور اِس کے نتیجے میں بے شمار کانٹے اُس کے اندر چبھالیتا ہے۔ یہاں تک کہ اِس نایافتہ کی طلب میں اپنی یافتہ دولت کو بھی ضائع کر بیٹھتا ہے اور نہایت واضح حقائق کی اِس لیے تکذیب کر دیتا ہے کہ اُن کی شکل و صورت ابھی اُس کے سامنے نمایاں نہیں ہوئی۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۲۵)

[۵۷] اصل میں لفظ ’زَیْغٌ‘ استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی جھکنے اور مائل ہونے کے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... یہ لفظ بیک وقت دو مفہوموں کا حامل ہے: ایک کجی اور دوسرے سقوط۔ کوئی چیز جو کھڑی ہو

وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ

اِس لیے کہ فتنہ پیدا کریں اور اِس لیے کہ اُن کی حقیقت معلوم کریں[۵۸]، دراں حالیکہ اُن کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔[۵۹] اِس کے برخلاف جنھیں اِس علم میں

> جب جھک جاتی ہے تو گرنے سے قریب ہو جاتی ہے۔ یہ حالت اُس رسوخ کے برعکس حالت ہے جو اِس آیت میں 'رَاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ' کی بیان ہوئی ہے۔
>
> یہ زیغ یوں تو اہل ضلالت کی عام بیماری ہے، لیکن اہل کتاب اِس مرض میں سب سے زیادہ شدت کے ساتھ مبتلا رہے ہیں۔ یہود کی تاریخ گواہ ہے کہ وہ شروع ہی سے اِس بیماری میں مبتلا رہے، اور اُن کے زیغ کا یہ پہلو خاص طور پر نہایت سنگین ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کی موجودگی میں اِس میں مبتلا رہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ اِس کے سبب سے خدا کے غضب میں مبتلا ہوئے۔“
>
> (تدبر قرآن ۲/ ۳۰)

۵۸ے یہود و نصاریٰ کی گم راہی کی طرف اشارہ ہے۔ اُن کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود فتنہ پیدا کرنے سے زیادہ دل چسپی رکھتے تھے اور نصاریٰ متشابہ آیات کی حقیقت جاننے سے۔ استاذ امام کے الفاظ میں یہ گم راہیاں چونکہ دنیا کے تمام گم راہوں میں مشترک ہیں، اِس وجہ سے قرآن نے اسلوب بیان عام ہی رکھا ہے تاکہ کلام میں وسعت پیدا ہو سکے، یہود و نصاریٰ کی تخصیص نہیں کی۔ لیکن قرآن کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ اشارہ اُنھی کی طرف ہے۔

۵۹ے اِس آیت کے بارے میں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اِس میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ متشابہات کے معنی اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اُن کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اِس کے لیے اصل میں 'تَاْوِيْل' کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بالکل اُسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے جس مفہوم میں یہ سورۂ یوسف (۱۲) کی آیت ۱۰۰ میں آیا ہے: 'قَالَ: يٰٓاَبَتِ، هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ، قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا' (اُس نے کہا: ابا جان، یہ ہے میرے اُس خواب کی حقیقت جو میں نے اِس سے پہلے دیکھا تھا، میرے پروردگار نے اُسے سچ کر دکھایا ہے)۔ یہ

اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ⑦
رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ
رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ⑧ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ

رسوخ ہے[۶۰]، وہ کہتے ہیں کہ ہم اِنھیں مانتے ہیں، یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اِس طرح کی چیزوں کو وہی سمجھتے ہیں جنھیں اللہ نے عقل عطا فرمائی ہے[۶۱]۔ (وہ کہتے ہیں): پروردگار، تو نے ہمیں ہدایت بخشی ہے تو اِس کے بعد اب تو ہمارے دل نہ پھیر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما۔ لاریب، تو ہی

خواب جن لفظوں میں قرآن نے بیان کیا ہے، اُن کے معنی ہر شخص پر واضح ہیں۔ عربی زبان کا ایک عام طالب علم بھی سورۂ یوسف کی اِس آیت کا مفہوم، جس میں یہ خواب بیان ہوا ہے، بغیر کسی دقت کے سمجھ لیتا ہے۔ لیکن سورج اور چاند اور اُن گیارہ ستاروں کا مصداق کیا تھا جنھیں یوسف علیہ السلام نے اپنے آپ کو سجدہ کرتے دیکھا، اُس سے پوری قطعیت کے ساتھ کوئی شخص اُس وقت تک واقف نہیں ہو سکتا تھا، جب تک یہ مصداق اپنی اصل صورت میں لوگوں کے سامنے نہ آ جاتا۔ متشابہ قرآن نے اِنھی چیزوں کو کہا ہے۔ اِس کے معنی، جس طرح کہ لوگ بالعموم سمجھتے ہیں، مشتبہ اور مبہم کے نہیں ہیں کہ اِس سے قرآن کی یہ حیثیت کہ وہ حق و باطل میں امتیاز کے لیے فرقان ہے، کسی حیثیت سے مجروح ہو۔

[۶۰] یعنی جن کے دلوں میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے، جو انسان کے حدود کو سمجھتے اور اُسی کے مطابق اپنے علم کے حدود متعین کرتے ہیں۔

[۶۱] یعنی جو لوگ علم میں رسوخ کے حامل ہیں، وہ محکمات اور متشابہات، دونوں کو اپنے پروردگار کا عطیہ سمجھتے اور دونوں پر یکساں ایمان رکھتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل رکھتے ہیں اور اِس عقل سے صحیح طور پر کام بھی لیتے ہیں۔

لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۹﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ
اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۙ﴿۱۰﴾ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ
وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ
وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۱﴾

عطا فرمانے والا ہے۔ پروردگار، تو یقیناً سب لوگوں کو ایک ایسے دن کی پیشی کے لیے جمع کر کے رہے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ اپنے وعدوں کی خلاف ورزی نہیں کرتا[۶۲]۔ ۷-۹

اِس کتاب کے منکروں کو، (جن پر حجت پوری ہو گئی)، اللہ کے حضور میں اُن کا مال کچھ کام دے گا اور نہ اُن کی اولاد[۶۳]، اور یہی ہیں جو دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔ اِن کا معاملہ بھی وہی ہے جو فرعونیوں اور اُن سے پہلے کے لوگوں کا تھا[۶۴]۔ اُنھوں نے

---

[۶۲] درحقیقت یہی یقین ہے جو اُنھیں ہرزہ گردی سے بچا کر ہمیشہ جادۂ مستقیم پر پابرجا رکھتا ہے اور اِس کے نتیجے میں اُن کے رسوخ فی العلم کا باعث بنتا ہے۔

[۶۳] یہ اِن منکروں کی اصلی بیماری کی طرف اشارہ کیا ہے کہ درحقیقت مال و اولاد کی محبت ہی ہے جو اِنھیں قرآن کے پیش کردہ حقائق کے سامنے سرافگندہ ہونے سے روک رہی ہے، لیکن اِس کو چھپانے کے لیے وہ متشابہات کے درپے ہوتے اور اُن کے اندر سے کچھ اعتراضات ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اِن کی یہ کم زوری بے نقاب نہ ہونے پائے۔

[۶۴] اصل میں 'كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِس جملے کی تالیف ہمارے نزدیک یہ ہے: 'دَاْبُهُمْ كَدَاْبِ آلِ فِرْعَوْنَ'۔ چنانچہ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٢﴾ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ

ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا تو اللہ نے اُن کے گناہوں کی پاداش میں اُنھیں پکڑ لیا اور حق یہ ہے کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔[۶۵] ۱۰-۱۱

اِن منکروں سے کہہ دو کہ عنقریب تم بھی (اِسی طرح) مغلوب ہو جاؤ گے اور (اِس کے بعد) دوزخ کی طرف ہانکے جاؤ گے، اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔ اور (تمھیں اگر ہماری اِس بات میں کوئی تردد ہے تو) جن دو گروہوں میں مڈبھیڑ ہوئی، اُن کی سرگذشت میں تمھارے لیے ایک بڑی نشانی ہے۔[۶۶] ایک ماننے والوں

---

[۶۵] اصل میں 'شَدِیْدُ الْعِقَابِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں دو مفہوم موجود ہیں: ایک یہ کہ سزا عمل کا بدلہ ہے۔ دوسرا یہ کہ قانون طبیعی کی طرح اللہ تعالیٰ کے اخلاقی قانون کا نتیجہ بھی لازماً سامنے آتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اُس کے ظہور کا ایک دن مقرر ہے اور طبیعی قانون کے نتائج اِسی دنیا میں اور بالعموم فوراً ظاہر ہو جاتے ہیں۔

[۶۶] یعنی اِس بات کی نشانی کہ حق کو غلبہ حاصل ہو گا اور قرآن کے منکرین سرزمین عرب میں لازماً مغلوب ہو جائیں گے۔ بدر میں اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت جس شان کے ساتھ ظاہر ہوئی، اُس سے یہ بات قرآن کے تمام مخاطبین پر واضح ہو گئی۔ اِس لیے کہ یہود اپنے ہاں طالوت کی جنگ میں تائید الٰہی کا یہ منظر صدیوں پہلے دیکھ چکے تھے، نصاریٰ یوحنا عارف کے مکاشفے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق پیشین گوئی میں اِسے پڑھ چکے تھے اور قریش خود اِس جنگ کو حق و باطل کا فیصلہ قرار دے کر میدان میں اترے تھے۔

الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِى الْاَبْصَارِ ⑬

کا گروہ جو اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا نہ ماننے والوں کا جو شیطان کی راہ میں لڑ رہا تھا[٦٧]۔ وہ (بدر کے میدان میں) ماننے والوں کو کھلم کھلا اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے[٦٨]۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ جس کی چاہتا ہے (اِسی طرح) اپنی تائید سے مدد فرماتا ہے۔ اِس میں اُن کے لیے یقیناً بڑی بصیرت ہے جو آنکھوں والے ہوں[٦٩]۔ ۱۲-۱۳

٦٧ے اِس جملے میں مقابل کے الفاظ عربیت کے اسلوب پر حذف ہو گئے ہیں۔ اُنھیں کھول دیجیے تو پوری بات اِس طرح ہے: ’فِئَةٌ مُؤْمِنَةٌ تُقَاتِلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ تُقَاتِلُ فِىْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ‘۔ جملے کے پہلے حصے میں لفظ ’مؤمنة‘ محذوف ہے جس کا پتا دوسرے میں ’كَافِرَةٌ‘ کی صفت دے رہی ہے اور دوسرے میں ’تقاتل فی سبیل الطاغوت‘ جس پر ’تُقَاتِلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ‘ کے الفاظ دلالت کرتے ہیں۔

٦٨ے چنانچہ یہی چیز قریش کی مرعوبیت اور اِس کے نتیجے میں اُن کی شکست کا باعث بن گئی۔ یہ واقعہ، ظاہر ہے کہ اُس وقت پیش آیا، جب جنگ شروع ہونے کے بعد فرشتوں کی کمک پہنچ گئی اور اُن کی شرکت سے تین سو تیرہ کا لشکر دفعتاً حملہ آوروں کی تعداد سے دوگنا، یعنی کم و بیش دو ہزار نظر آنے لگا۔ قرآن نے اِسی بنا پر اِسے اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی قرار دیا ہے اور خاص طور پر صراحت فرمائی ہے کہ کافروں نے اِس نشانی کو اپنے سر کی آنکھوں سے بالکل اُسی طرح دیکھا، جس طرح وہ میدان بدر کو دیکھ رہے تھے۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ سورۂ انفال میں جس واقعے کا ذکر ہوا ہے کہ دونوں لشکر ایک دوسرے کی نگاہ میں کم کر کے دکھائے گئے تھے، وہ جنگ شروع ہونے سے پہلے کا ہے اور اُس کی مصلحت اللہ تعالیٰ نے وہاں بیان کر دی ہے۔ لہٰذا قرآن کے اِن دونوں بیانات میں کوئی تضاد نہیں

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ

اُن لوگوں کے لیے (جو اِس بصیرت سے محروم ہیں) دنیا کے مرغوبات ـــــ عورتوں، بیٹوں، سونے چاندی کے ڈھیروں[۷۰]، نشان زدہ گھوڑوں[۷۱]، چوپایوں اور کھیتی کی محبت بہت لبھانے کی چیز بنا دی گئی ہے[۷۲]۔ یہ سب دنیا کی زندگی کا سروسامان ہے[۷۳] اور اچھا ٹھکانا تو

ہے۔

۶۹؎ استاذ امام اِس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> ”...ایک صاحب بصیرت اور ایک بلید میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ ایک اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھتا، لیکن دوسرے کے لیے ایک معمولی سی نشانی، ایک ادنیٰ سی تنبیہ اور ایک سرسری سا اشارہ حقائق کا ایک دفتر کھول دیتا ہے۔ ایک دروازہ اُس کے لیے کھل جائے تو دوسرے دروازے کھولنے کے لیے کلید ہاتھ آ جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کو قرآن ’اُولُوا الْاَبْصَارِ‘ کہتا ہے، کیونکہ اُن کی آنکھوں میں بصارت کے ساتھ بصیرت کا نور بھی ہوتا ہے جو جزو میں کل اور قطرے میں دجلہ کے مشاہدے کی صلاحیت رکھتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۴۰)

۷۰؎ اصل الفاظ ہیں: ’اَلْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ‘۔ یہ اُسی طرح کی ترکیب ہے، جس طرح عربی زبان میں ’الف مولفة‘ اور ’بدرة مبدرة‘ وغیرہ کی تراکیب استعمال ہوتی ہیں۔

۷۱؎ اِس سے مراد ہیں اصیل گھوڑے۔ یہ تعبیر اِس لیے اختیار کی گئی ہے کہ عمدہ اور اصیل گھوڑوں پر بالعموم نشان لگایا جاتا ہے۔

۷۲؎ اصل میں ’زُيِّنَ لِلنَّاسِ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں مال و اولاد اور زن و فرزند کی محض رغبت پر کوئی تبصرہ نہیں ہے، اِس لیے کہ یہ رغبت تو انسان کی فطرت کا تقاضا ہے، بلکہ اُن کی تزیین

کا ذکر ہے۔ استاذ امام اِس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

> ”...’تزیین‘ کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی چیز اِس طرح آنکھوں میں کھب جائے کہ آدمی اُس کے اثر سے ہر چیز اُسی کے رنگ میں دیکھنے لگ جائے، یہاں تک کہ اُس سے الگ ہو کر اُس کے لیے کسی چیز کو دیکھنا ممکن ہی نہ رہ جائے۔ وہ ہر چیز کو تولنے اور پرکھنے کے لیے اُسی کو پیمانہ اور کسوٹی قرار دے لے۔ کسی چیز کی رغبت کا اِس درجہ غلبہ، ظاہر ہے، فاطر فطرت کے منشا کے خلاف ہے۔ اِسی سے زندگی میں وہ بے اعتدالیاں ظہور میں آتی ہیں جو انسان کو فطرت اور شریعت کے جادۂ مستقیم سے ہٹا دیتی ہیں۔ یہ ایک بیماری کی حالت ہے جو بے بصیرتی اور حدود الٰہی کے عدم احترام یا بالفاظ دیگر عدم تقویٰ سے پیدا ہوتی ہے اور اِس میں اصل دخل نفس اور شیطان کا ہوتا ہے۔ نفس اپنی چاہتوں میں فطری حدود سے آگے نکل جاتا ہے، پھر شیطان اُن چاہتوں پر ایسا دل فریب ملمع کر دیتا ہے کہ آدمی کی نظر اُن سے ہٹ کر کسی اور طرف کا رخ ہی نہیں کرتی۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۴۰)

اِسی طرح مرغوبات نفس کے بیان میں یہاں جو ترتیب ملحوظ ہے، اُس کی وضاحت میں اُنھوں نے لکھا ہے:

> ”... پہلے اہل و عیال کا ذکر کیا ہے، اِس لیے کہ محبت کے لحاظ سے سب سے اونچا مقام اُنھی کا ہے، دوسری چیزوں کی محبت اصلاً اُن کے تابع ہے، بلکہ زیادہ تر اُنھی کے لیے ہے۔ اِس کے بعد مال کا ذکر ہے اور مال میں سونے کا ذکر اُس کی گراں قیمتی کی وجہ سے دوسرے نقود پر مقدم ہے۔ سروسامان میں سب سے پہلے گھوڑوں کا ذکر ہے، اِس لیے کہ اہل عرب زینت، فخر اور دفاع، تینوں کے نقطۂ نظر سے گھوڑے کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اِس کے بعد چوپایوں کا ذکر ہے، اِس لیے کہ تمدن کے ظہور سے پہلے بدویت کے دور میں معاش کا انحصار بیش تر اُنھی پر تھا۔ آخر میں کھیتی اور باغ کا ذکر ہے، اِس لیے کہ اِن کی اہمیت تمدن کے دور میں داخل ہونے کے بعد شروع ہوئی ہے، جب انسان نے شہروں اور دیہاتوں کی رہایش اختیار کی ہے۔“
>
> (تدبر قرآن ۲/ ۴۱)

۳۷؎ یعنی اِس دنیا کی زندگی کا سروسامان ہے جو خود بھی ناپایدار ہے، جس کی سب چیزیں

الْمَاٰبِ ⑭ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ⑮ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اِنَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ⑯ اَلصّٰبِرِيْنَ

صرف اللہ کے پاس ہے۔ اِن سے کہیے کہ میں تمھیں بتاؤں کہ اِن چیزوں سے بہتر کیا ہے؟[۷۷۴] اللہ سے ڈر کر رہنے والوں کے لیے اُن کے پروردگار کے ہاں باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ بیویاں ہیں اور سب سے بڑھ کر اللہ کی خوشنودی ہے۔[۷۷۵] اور اللہ اپنے اِن بندوں کو دیکھ رہا ہے۔[۷۷۶] یہ جو دعائیں کرتے ہیں کہ پروردگار، ہم ایمان لے آئے ہیں، سو تو ہمارے گناہ بخش دے اور ہمیں

بھی بالکل بے حقیقت ہیں اور قیامت کے بعد جو خدا کی ابدی بادشاہی قائم ہونے والی ہے، اُس کے مقابلے میں جس کی لذتوں پر ریجھنا بھی سراسر حماقت ہے۔ یہ تمام معانی، اگر غور کیجیے تو اِس چھوٹے سے فقرے میں بیان ہو گئے ہیں۔

۷۷۴ یہ مخاطبین کو زاویۂ نظر بدلنے کی دعوت ہے کہ اِس دنیا کی چند روزہ زندگی کو اصل زندگی سمجھ کر گزارنے کے بجاے وہ آخرت کی طرف دیکھیں، جہاں ایک ابدی اور لازوال زندگی اور اُس کی نعمتیں اُن کی منتظر ہیں۔

۷۷۵ یہ جنت کی نعمتوں کے لیے ایک جامع تعبیر ہے۔ چنانچہ جب اِس کا ذکر ہو گیا تو استاذ امام کے الفاظ میں گویا ہر نعمت کا ذکر ہو گیا، اُس کا بھی جس کے لیے تعبیر کا کوئی جامہ موجود ہے اور اُس کا بھی جو خیال و گمان اور وہم و قیاس، ہر چیز سے بالاتر ہے۔

۷۷۶ یہ جملہ تسلی کے محل میں ہے۔ یعنی دیکھ رہا ہے تو اُن کے ایمان و عمل اور اُس پر اُن کی استقامت کا صلہ بھی اُنھیں لازماً دے گا، اُن کی کوئی قربانی بھی اللہ کے حضور میں ضائع نہیں ہو گی۔

وَالصّٰدِقِيۡنَ وَالۡقٰنِتِيۡنَ وَالۡمُنۡفِقِيۡنَ وَالۡمُسۡتَغۡفِرِيۡنَ بِالۡاَسۡحَارِ ﴿۱۷﴾
شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالۡمَلٰٓٮِٕكَةُ وَاُولُوا الۡعِلۡمِ قَآٮِٕمًۢا
بِالۡقِسۡطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۱۸﴾ ؕ

دوزخ کے عذاب سے بچالے۔[۷۷] یہ[۷۸] صبر کرنے والے،[۷۹] سچے، فرماں بردار، اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے اور پچھلی رات کی گھڑیوں میں اٹھ کر اپنے گناہوں کی مغفرت چاہنے والے۔ ۱۴-۱۷

اللہ نے، اُس کے فرشتوں نے، اور (اِس دنیا میں) علم حقیقی کے سب حاملین نے گواہی دی[۸۰] ہے کہ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ انصاف پر قائم[۸۱] ہے، اُس کے سوا کوئی

---

[۷۷] یہ پچھلی آیت میں ’لِلَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا‘ سے بدل ہے۔ مدعا یہ ہے کہ خدا کے اِن بندوں کو دیکھو اور تم بھی دنیا کے مرغوبات ہی کے پیچھے بھاگتے رہنے کے بجاے اِنھیں چھوڑ کر اِس راہ پر آجاؤ۔

[۷۸] یہ دوسرا بدل ہے جس سے قرآن نے اُن اخلاقی اوصاف کو نمایاں کر دیا ہے جو اُس کے حاملین میں ہونے چاہییں۔

[۷۹] غربت، بیماری، جنگ اور اِس نوعیت کے نرم و گرم حالات میں آدمی عزم و ہمت کے ساتھ اپنے اوپر آنے والی مصیبتوں کا مقابلہ کرے اور جس موقف کو وہ صحیح سمجھتا ہے، بغیر کسی مایوسی، گھبراہٹ اور جزع فزع کے اُس پر قائم رہے تو یہ صبر ہے۔ قرآن نے یہاں اپنے حاملین کی صفات میں سب سے پہلے اِسی کو نمایاں کیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو دعوت دی جارہی ہے، اُن کے لیے قبول حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو صبر کا خوگر نہیں بنا سکے۔

[۸۰] یعنی اللہ کی وحدانیت اور اُس کا قائم بالقسط ہونا ایک ایسی حقیقت ہے کہ اللہ جو اِس عالم

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ قف وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ

الٰہ نہیں، زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔[۸۲] ۱۸

(یہ حقیقت ہے تو پھر اِس میں بھی کوئی شک نہیں کہ) اللہ کے نزدیک دین صرف

کے تمام حقائق کا علم رکھتا ہے، جس کے سامنے تمام موجودات بے حجاب ہیں، جس کی نگاہوں سے زمین و آسمان کی کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے، وہ خود بھی اِسی کی شہادت دیتا ہے؛ اُس کے فرشتے بھی جو اُس کی سلطنت کو دیکھتے اور اُس میں اُس کے احکام کی تنفیذ کرتے ہیں، یہی کہتے ہیں؛ اور انسانوں میں سے وہ سب لوگ بھی اِسی کی گواہی دیتے ہیں جنھیں حقائق کا علم دیا گیا اور اُنھوں نے اِس علم کو اپنی خواہشات، جذبات اور تعصّبات کی آلایشوں سے پاک رکھنے کا اہتمام کیا ہے۔

۸۱؎ اصل میں ‘قَآئِمًا بِالْقِسْطِ’ کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ‘قَآئِمًا’، ہمارے نزدیک ‘لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ’ میں ‘هُوَ’ سے حال موکدہ ہے اور اِس میں عامل جملے کا مفہوم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے ساتھ یہ اُس کے قائم بالقسط ہونے کی شہادت، اسلام کے ایمانیات میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ ہم جس طرح یہ مانتے ہیں کہ اللہ یکتا اور یگانہ ہے، اُس کی ذات و صفات میں کوئی اُس کا شریک نہیں ہے اور تمام اختیار اور تصرف اصلاً اُسی کے ہاتھ میں ہے، اُسی طرح یہ بھی مانتے ہیں کہ اپنے اِس اختیار و تصرف کو وہ ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ استعمال کر رہا ہے اور ہمیشہ انصاف کے ساتھ ہی استعمال کرے گا۔ یہ دنیا چونکہ امتحان کے لیے بنائی گئی ہے، اِس لیے اِس کے تقاضے سے ظلم و عدوان اور عدم توازن کو اِس میں بڑی حد تک گوارا کیا جاتا ہے۔ تاہم اِس سے کسی کو غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے طبعی قوانین جس طرح اٹل ہیں، اُس کے اخلاقی قوانین بھی اُسی طرح اٹل اور بے لاگ ہیں۔ اِس حقیقت پر لوگوں کو متنبہ رکھنے کے لیے، اللہ تعالیٰ اپنی دینونت اِس دنیا میں وقتاً فوقتاً برپا کرتا رہتا ہے۔ پہلے یہ رسولوں کے ذریعے سے برپا ہوتی تھی، پھر ذریت ابراہیم کے ذریعے سے برپا ہوئی اور اب گذشتہ کئی صدیوں سے اُنھی کے ذریعے سے برپا ہے۔ اِس کو دیکھ کر کوئی صاحب بصیرت

اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ؕ وَمَنْ
يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ⑲ فَاِنْ حَآجُّوْكَ
فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا

اسلام ہے، (اِس لیے کہ وہی اللہ کو اِس طرح ماننے کی دعوت دیتا ہے)، اور جنھیں کتاب دی گئی، اُنھوں نے تو (اللہ کی طرف سے) اِس حقیقت کا علم اُن کے پاس آ جانے کے بعد محض آپس کے ضدم ضدا کی وجہ سے اِس میں اختلاف کیا ہے۔[۸۳] (یہ صریح انکار ہے)، اور جو اللہ کی آیتوں کے اِس طرح منکر ہوں، وہ اُس سے بے خوف نہ رہیں، اِس لیے کہ اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ چنانچہ وہ اگر تم سے جھگڑیں تو کہہ دو کہ میں نے اور میرے پیرووں نے تو اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا ہے۔[۸۴] اور اہل کتاب سے

اِس بات میں شک نہیں کر سکتا کہ فرداً فرداً تمام انسانوں کے لیے بھی یہ ایک دن اِسی طرح برپا ہو جائے گی۔

۸۲؎ لہٰذا وہ اپنی دینونت لازماً برپا کرے گا۔ یہ اُس کی عزت اور حکمت، دونوں کا تقاضا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اِس کے معنی یہ ہوں گے کہ یا تو وہ بے بس ہے یا محض ایک کھلنڈرا ہے جس نے یہ دنیا کھیل تماشے کے لیے بنا دی ہے۔

۸۳؎ مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کا دین بھی یہی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں اور رسولوں پر ابتدا سے یہی دین اتارا۔ اِس سے الگ کوئی دین اُس نے کسی کو نہیں دیا۔ یہودیت اور نصرانیت کے نام سے جو دین اِس وقت موجود ہیں، یہ اُن کے ماننے والوں نے اصل دین میں محض ضدم ضدا کی وجہ سے بہت سے اختلاف پیدا کر کے کھڑے کر لیے ہیں۔

۸۴؎ اصل میں 'اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں چہرہ حوالے کرنا، درحقیقت اپنی ذات کو اللہ کے حوالے کرنے کی تعبیر ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی

الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ

اور (بنی اسمٰعیل کے) اِن امیوں[85] سے پوچھو کہ کیا تم بھی اِسی طرح اپنے آپ کو اللہ کے

وضاحت اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں اِس طرح فرمائی ہے:

> ''... چہرہ انسان کی ذات کا سب سے اعلیٰ و اشرف حصہ ہے۔ جب سب سے اعلیٰ و اشرف حصہ حوالے کر دیا تو گویا سب کچھ حوالے کر دیا۔ یہ اُسی طرح کی تعبیر ہے، جس طرح ہم کسی کی اطاعت کی تعبیر کے لیے سر جھکا دینا بولتے ہیں۔ اِس تعبیر میں غایت درجہ تذلل و نیازمندی اور سپردگی پائی جاتی ہے۔ موقع دلیل ہے کہ یہاں یہ اسلوب اصلاً تو اسلام لانے کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے، لیکن ساتھ ہی اِس نے اسلام کی اصل روح بھی واضح ہو گئی ہے تا کہ دین داری کے اِن مدعیوں کو، جو اسلام کی مخالفت میں بحث و جدال کے لیے آستینیں چڑھائے ہوئے تھے، تنبیہ ہو کہ وہ کس چیز کے خلاف یہ زور دکھا رہے ہیں۔'' (۲/۵۳)

[85] امی اُس شخص کو کہتے ہیں جو مدرسی اور کتابی تعلیم و تعلم سے ناواقف ہو۔ یہ لفظ بنی اسمٰعیل کے لیے اُن کے لقب کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''... اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مدرسی اور رسمی تعلیم و کتابت سے ناآشنا اپنی بدویانہ سادگی پر قائم تھے اور اِس طرح بنی اسرائیل کے بالمقابل، جو حامل کتاب تھے، امیت اُن کے لیے ایک امتیازی علامت تھی۔ ہو سکتا ہے کہ عربوں کے لیے اِس کے استعمال کا آغاز اہل کتاب سے ہی ہوا ہو، اِس لیے کہ حضرت اسمٰعیل اور اُن کی ذریت کی بدویت و امیت کا ذکر تورات میں بھی ہے، لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ اِس لفظ کے استعمال میں عربوں کے لیے تحقیر کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ چنانچہ قرآن نے اِس لفظ کو عربوں کے لیے اُن کو اہل کتاب سے محض ممیز کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ اِسی پہلو سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے 'نبی امی' کا لقب استعمال ہوا ہے۔ اِس میں تورات کی پیشین گوئیوں کی ایک تلمیح بھی ہے۔ عرب خود بھی اِس لفظ کو اپنے لیے استعمال کرتے تھے، جو اِس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ وہ اِس میں اپنے لیے تحقیر کا کوئی پہلو نہیں پاتے تھے۔ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ⑳
اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ
حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ

حوالے کرتے ہو؟ پھر اگر کریں تو راستہ پا گئے اور اگر منہ موڑیں تو تم پر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ اپنے بندوں کو تو اللہ خود دیکھنے والا ہے[۸۶]۔ ۱۹-۲۰

رہے یہ لوگ جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے رہے ہیں اور اُس کے پیغمبروں کو ناحق[۸۷] قتل کرتے رہے ہیں، نیز خدا کے اُن بندوں کو قتل کرتے رہے ہیں جو لوگوں میں سے انصاف پر قائم رہنے کی دعوت دیتے تھے تو اِنھیں ایک دردناک عذاب کی

وسلم نے بھی اپنی قوم کے لیے یہ لفظ استعمال فرمایا ہے۔ مثلاً وہ حدیث جس میں ارشاد ہوا ہے: 'نحن امة امية'[*]۔ بعض جگہ اگر یہ لفظ تحقیر کے طور پر استعمال ہوا ہے تو وہاں اِس کا مفہوم محض لغوی ہے، اصطلاحی نہیں، مثلاً 'مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ'[**]۔ اِس سے مراد یہود کے ان پڑھ عوام ہیں۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۵۳)

[۸۶] یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ اگر یہ لوگ تمھاری دعوت قبول نہیں کرتے اور اپنی حماقتوں ہی میں مبتلا رہنا چاہتے ہیں تو اِنھیں اِن کے حال پر چھوڑ و اور مطمئن رہو کہ اِن کا فیصلہ اب اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ اِن کے ہر قول و فعل کو دیکھ رہا ہے، اور ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ مستحق ہو گا۔

[۸۷] اِس لفظ سے یہاں ایک تو یہود کے اِس جرم کی سنگینی ظاہر ہوتی ہے، اِس لیے کہ قتل ناحق اور وہ بھی اگر کسی نبی کا ہو تو اُس کی سنگینی کا تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے حق کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ ایسی چیز ہے کہ کوئی پیغمبر بھی اُس سے بالاتر نہیں ہو سکتا۔

---

[*] بخاری، رقم ۱۹۱۳۔ مسلم، رقم ۱۰۸۵۔

[**] البقرہ ۲: ۷۸۔

بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢١﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا
وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٢٢﴾
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى
كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ

خوش خبری سنا دو[۸۸]۔ یہی ہیں کہ جن کے اعمال دنیا اور آخرت، دونوں میں ضائع ہوئے اور اب اِن کا کوئی مددگار نہ ہوگا[۸۹]۔ ۲۱-۲۲

تم نے دیکھا نہیں[۹۰] اُن لوگوں کو جو کتاب سے بہرہ یاب ہوئے[۹۱]، اُنھیں اللہ کی کتاب ہی کی طرف بلایا جا رہا ہے کہ اُن کے درمیان (اختلافات کا) فیصلہ کر دے۔ پھر دیکھا نہیں کہ اُنھی میں سے ایک گروہ اُس سے منہ پھیر لیتا ہے[۹۲] اور

۸۸؎ اصل الفاظ ہیں: 'فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ'۔ یہ 'اِنَّ' کی خبر ہے اور اِس پر 'ف' اِس لیے آگئی ہے کہ 'اِنَّ' کا اسم اِس جملے میں جزا کے مفہوم پر متضمن ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی رعایت سے کیا ہے۔

۸۹؎ قرآن کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں اِن کی تمام تدبیریں اکارت ہو گئیں اور یہ ذلت و نامرادی کے ساتھ جزیرہ نماے عرب سے اِس طرح نکال دیے گئے کہ کوئی اِن کا حامی اور مددگار نہ تھا۔

۹۰؎ یہ اظہار تعجب کا اسلوب ہے جو عربی زبان میں اِس طرح کے موقعوں پر اختیار کیا جاتا ہے۔

۹۱؎ اصل میں 'نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'مِنْ' بیان کے لیے ہے، یعنی وہ لوگ جن کے حصے میں کتاب الٰہی آئی اور دنیا کی سب قوموں کو چھوڑ کر وہ اُس سے نوازے گئے۔

مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا
مَّعْدُوْدٰتٍ ۪ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ فَكَيْفَ

حقیقت یہ ہے کہ یہ منہ پھیر لینے والے لوگ ہی ہیں[۹۳ے]۔ اِن کے اِس رویے کی وجہ یہ ہے کہ اِن کا کہنا ہے کہ دوزخ کی آگ ہمیں ہرگز نہ چھوئے گی۔ ہاں، گنتی کے چند دنوں کی تکلیف، البتہ ہوسکتی ہے۔ اِس طرح یہ جو کچھ گھڑتے رہے ہیں، اُسی نے اپنے دین

۹۲ے اصل میں 'ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں اصلی زور 'مِنْھُمْ' کے لفظ پر ہے۔ یعنی تعجب اِس بات پر ہے کہ یہ منہ پھیرنے والے لوگ اہل کتاب ہیں جو سزاوار تھے کہ سب سے پہلے کتاب الٰہی کو پہچانتے اور اُس پر ایمان لاتے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اُن لوگوں کے لیے جو تورات وانجیل کو جانتے اور مانتے ہوں قرآن کا پہچاننا کچھ مشکل نہ تھا، بشرطیکہ اُنھوں نے اپنی آنکھوں پر تعصب اور ضد کی پٹیاں نہ باندھ رکھی ہوتیں۔ جس کتاب کے ابتدائی ابواب اُنھوں نے پڑھے ہوں، جس کے انداز، اسلوب اور مزاج سے آشنا ہوں، جس کی ہدایات وتعلیمات کا ابتدائی عکس اور خاکہ اُنھوں نے دیکھا ہو، جس کی پیشین گوئیوں سے وہ باخبر اور اُن کے مصداق کے وہ منتظر ہوں، یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ کتاب عزیز جب اپنے اصلی جمال وکمال کے روپ میں نمایاں ہو تو وہ اُس کو نہ پہچان سکیں؟ پھر کس قدر تعجب کی بات ہے کہ اہل کتاب نے اُس سے منہ موڑا اور جان کر اُس سے انجان بن گئے۔“
>
> (تدبر قرآن ۲/۶۰)

۹۳ے یہ اہل کتاب کے لیے ملامت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِن پتھروں میں جونک نہیں لگ سکتی۔ حق سے اعراض اِن کی فطرت ثانیہ بن چکا ہے، اِس لیے تمھاری دعوت اگر اِن کے لیے موثر نہیں ہو رہی تو اِس میں تمھارا کوئی قصور نہیں ہے، یہ سراسر اِن کے فساد طبیعت کا قصور ہے۔

إِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ قف وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ
وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٥﴾
قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ
الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ز وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِيَدِكَ
الْخَيْرُ ط اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٦﴾ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ

کے معاملے میں اِنھیں دھوکے میں ڈال دیا ہے۔[۹۴] لیکن کیا بنے گی اُس وقت جب اِن کو ہم ایک ایسے دن کی پیشی کے لیے اکٹھا کریں گے جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں[۹۵] اور جس میں ہر شخص کی کمائی کا بدلہ اُسے پورا دے دیا جائے گا اور لوگوں پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ ۲۳-۲۵

(اِن کا عہد تمام ہوا، اِس لیے اب) تم دعا کرو کہ اے اللہ، بادشاہی کے مالک، تو جس کو چاہے، بادشاہی دے اور جس سے چاہے، یہ بادشاہی چھین لے؛ اور جس کو چاہے، عزت دے اور جس کو چاہے، ذلیل کر دے۔ تمام خیر تیرے ہی اختیار میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔[۹۶] (ہم جانتے ہیں کہ) تو رات

---

[۹۴] یعنی اِس بات پر مطمئن کر دیا ہے کہ اِن کے اعمال خواہ کچھ بھی ہوں، اِن کے لیے ہمیشہ کی جہنم نہیں ہے۔ یہ اول تو اُس میں ڈالے نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے بھی گئے تو چند دن کے لیے گناہوں کی سزا پا کر لازماً چھوڑ دیے جائیں گے۔ یہ، ظاہر ہے کہ ایک دھوکا ہے جس میں اِن کی جھوٹی آرزوؤں نے اِنھیں مبتلا کر دیا ہے۔

[۹۵] اصل الفاظ ہیں: 'فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ'۔ اِن میں حرف جر کے بعد ایک مضاف ہمارے نزدیک محذوف ہے۔ چنانچہ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ز وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ز وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾

کو دن میں اور دن کو رات میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور (جانتے ہیں کہ) تو مردے سے زندہ کو اور زندہ سے مردے کو نکالتا ہے[۹۷] اور جس کو چاہتا ہے، بے حساب روزی عطا فرماتا ہے[۹۸]۔ ۲۶-۲۷

۹۶ے یہ بظاہر ایک دعا ہے، لیکن غور کیجیے تو اِس میں بنی اسمٰعیل کے لیے ایک عظیم بشارت چھپی ہوئی ہے، اِس لیے کہ یہ دعا صاف اشارہ کر رہی ہے کہ تمام خیر کے مالک، پروردگار عالم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ دنیا کی بادشاہی بنی اسمٰعیل کو دے دی جائے گی اور بنی اسرائیل کی کوئی مخالفت بھی اِس فیصلے کو تبدیل نہ کر سکے گی۔ اُن کے لیے ذلت ہی ذلت ہے۔ چنانچہ وہ اِس دنیا میں اب اگر رہیں گے تو بنی اسمٰعیل کے محکوم ہو کر رہیں گے، اِس کے سوا جینے کی کوئی دوسری صورت اُن کے لیے باقی نہیں رہی۔

پھر یہی نہیں، اِس بشارت کے ساتھ ایک عظیم نصیحت بھی اِس میں پوشیدہ ہے کہ بنی اسمٰعیل اِس بادشاہی کو اپنے استحقاق کا کرشمہ سمجھ کر فخر و غرور کے ساتھ قبول نہ کریں، بلکہ تواضع، فروتنی اور احساس عبدیت کے ساتھ قبول کریں، اِس لیے کہ تمام خیر اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، اور یہ محض اُس کی عنایت ہے کہ اُس نے دنیا کی سب قوموں میں اِس کا سزاوار اُنھیں قرار دیا ہے۔

۹۷ے یہ اُسی بات پر جو اوپر بیان ہوئی ہے، آفاق کی شہادت ہے کہ لوگ اِسے کوئی دور کی چیز نہ سمجھیں، جس طرح دن سے رات، رات سے دن، اور موت سے زندگی اور زندگی سے موت نمودار ہوتی رہتی ہے، اُسی طرح قوموں کے لیے عزل و نصب، عزت و ذلت اور موت و حیات کے فیصلے بھی صادر ہوتے رہتے ہیں۔ بنی اسمٰعیل اور بنی اسرائیل کی موت و حیات کی طرف جو اشارہ اِس تمثیل میں کیا گیا ہے، اُس کی وضاحت استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس طرح

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ
وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ
تُقٰىةً ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾ قُلْ اِنْ

(یہ اللہ کا فیصلہ ہے اور اِن اہل کتاب کے لیے عنقریب صادر ہو جائے گا، اِس لیے) ایمان والے اب مسلمانوں کو چھوڑ کر اِن منکروں کو اپنا دوست نہ بنائیں[۹۹] اور (یاد رکھیں کہ) جو یہ کریں گے، اللہ سے اُن کو کوئی تعلق نہیں ہے، الّا یہ کہ تم اُن سے بچو، جیسا کہ بچنے کا حق ہے[۱۰۰]۔ اللہ تمھیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور اِس لیے ڈراتا

فرمائی ہے:

> ''...حضرت ابراہیم نے جو پودا فلسطین کی سر سبز و شاداب زمین میں لگایا تھا، اب وہ سوکھ چکا تھا اور جیسا کہ حضرت یحییٰ نے فرمایا، اُس کی جڑ پر کلہاڑا رکھا ہوا تھا۔ اِس کے برعکس اُنھوں نے جو پودا عرب کی خشک اور بنجر زمین میں لگایا تھا، اور جو مرجھایا ہوا پڑا تھا، اب اُس میں شگوفے نکل رہے تھے اور جیسا کہ حضرت عیسیٰ نے فرمایا: وہ ایک تناور درخت بن کر ایک عالم کو اپنے سایے کی پناہ میں لینے والا تھا۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۶۵)

۹۸ؑ یعنی اتنا دیتا ہے کہ اُس کی کوئی حد و نہایت نہیں رہتی اور وہاں سے دیتا ہے، جہاں سے کسی کو اُس کا گمان بھی نہیں ہوتا۔

۹۹ؑ یہ اُن مسلمانوں کے لیے تنبیہ ہے جو اپنے ایمان کے تقاضوں کو سمجھنے میں ابھی پوری طرح یک سو نہیں تھے، اور اِس مرحلے پر بھی، جب کہ یہود و نصاریٰ کے لیے اللہ کا فیصلہ صادر ہونے والا تھا، نہ صرف یہ کہ اُن کی طرف میلان رکھتے تھے، بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اُن کی سازشوں میں اُن کے آلۂ کار بن جاتے تھے۔ اِس میں 'مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ' (مسلمانوں کو چھوڑ کر) کی قید اِس لیے لگائی ہے کہ یہ دوستی اگر اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے خلاف نہ ہو تو اِس کی

تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۹ يَوْمَ تَجِدُ

ہے کہ (ایک دن) تمھیں اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے[۸۰۱]۔ (اے پیغمبر)، اِن (مسلمانوں) سے کہہ دو کہ جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے[۸۰۲]، تم اُسے چھپاؤ یا ظاہر کرو، اللہ اُسے جانتا ہے، اور زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، اُسے بھی جانتا ہے، اور اللہ ہر چیز پر

ممانعت اُس وقت بھی پیش نظر نہیں تھی۔

۸۰۰؎ اصل میں 'اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ جملہ 'فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ' سے استثنا ہے اور اِس میں 'تُقٰىةً' بالکل اُسی طرح مفعول مطلق کے طور پر آیا ہے، جس طرح اِسی سورہ کی آیت 'اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ' (۱۰۲) میں ہے۔

۸۰۱؎ یہ اُنھی کم زور اور منافق قسم کے مسلمانوں کو تنبیہ ہے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> "...(اِس) میں منافقین کے لیے تنبیہ کا ایک خاص پہلو ہے۔ وہ یہ کہ اللہ کی کریمی سے دھوکے میں پڑ کے اُس کی ذات کے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز نہ کر جاؤ۔ وہ اگر شرارتوں سے درگذر کرتا ہے، سازشوں کو نظر انداز کرتا ہے اور ریشہ دوانیوں کا فوراً نوٹس نہیں لیتا تو اِس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ جرائم اُس کے نزدیک جرائم نہیں یا وہ اِن جرائم پر گرفت نہیں کر سکتا، بلکہ اِس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ بندوں کو آخری حد تک مہلت دیتا ہے۔ یہ مہلت بہر حال مہلت ہے جو ایک دن ختم ہونی ہے۔ اِس کے بعد اُس کا عدل ظہور میں آئے گا اور یہ عدل بھی اُس کی ذات ہی کا ایک پہلو ہے۔ یہ اگر ابھی ظہور میں نہیں آیا ہے تو اِس سے کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ یہ ظہور میں آئے گا ہی نہیں۔ خدا کے کاموں میں دیر ہے، اندھیر نہیں۔ جب اُس کی ذات کا یہ پہلو سامنے آئے گا تو ہر شخص پر کھل جائے گا کہ اُس سے زیادہ زور آور، اُس سے زیادہ بے لاگ اور اُس سے بڑا منتقم و قہار کوئی بھی نہیں۔" (تدبر قرآن ۲/ ۶۸)

كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚۛ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ
سُوْٓءٍ ۚۛ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًاۢ بَعِيْدًا ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ
نَفْسَهٗ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾
قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ

قدرت رکھتا ہے۔ جس دن ہر نفس اپنی کی ہوئی نیکی سامنے پائے گا اور اُس نے جو برائی کی ہوگی، اُسے بھی دیکھے گا[۸۰۳]، اُس دن وہ تمنا کرے گا کہ کاش اُس کے اور اِس دن کی پیشی کے درمیان ایک لمبی مدت حائل ہو جاتی۔ (یہ اللہ کی نصیحت ہے) اور اللہ تمھیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور اِس لیے ڈراتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کے لیے بڑا مہربان ہے[۸۰۴]۔ ۲۸-۳۰

اِن سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے

---

[۸۰۲] اشارہ ہے اُن میلانات کی طرف جو یہ مسلمان یہود و نصاریٰ کے لیے اپنے دل میں رکھتے تھے۔

[۸۰۳] اصل الفاظ ہیں: 'مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ'۔ اِن میں 'مُحْضَرًا' کا لفظ محذوف ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس سے پہلے 'مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ' میں یہ موجود ہے۔ چنانچہ عربیت کے اسلوب پر اِس دوسرے ٹکڑے میں اِسے حذف کر دیا ہے۔

[۸۰۴] یعنی اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے بندوں کے لیے بڑا مہربان ہے اور قیامت کے دن اُن کو برے نتائج سے بچانا چاہتا ہے، اِس لیے وہ اپنے آپ سے اُن کو بار بار ہوشیار کر رہا ہے کہ وہ اُس کی ڈھیل سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ اُنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ جب پکڑے گا تو اُس کی پکڑ بڑی سخت ہوگی، اُس سے نکلنا کسی کے لیے ممکن نہ رہے گا۔

ذُنُوْبَكُمْ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ج فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

محبت کرے گا اور تمھارے گناہوں کو بخش دے گا، اور اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔[۸۰۵] کہہ دو کہ اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو۔ پھر اِس کے بعد بھی یہ منہ موڑیں تو (اِنھیں بتا دو کہ) اِس طرح کے منکروں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔[۸۰۶] ۳۱-۳۲

---

[۸۰۵] یہ اِن مسلمانوں کو وہ صحیح رویہ سکھایا ہے جو اللہ سے محبت کا دعویٰ رکھنے کے بعد اُس کے رسول کے معاملے میں اِنھیں اختیار کرنا چاہیے۔

[۸۰۶] نہایت سخت الفاظ میں یہ اِس بات کا اعلان ہے کہ یہ لوگ سیدھے سیدھے اللہ اور رسول کی اطاعت کریں، ورنہ اِن کو بھی اُنھی منکروں میں شامل سمجھا جائے گا جن سے یہ دوستی رکھتے ہیں۔ اِس میں اور اِس سے پہلے کی آیت میں جو باتیں خاص طور پر ملحوظ رکھنے کی ہیں، وہ استاذ امام کے الفاظ میں یہ ہیں:

> ”ایک یہ کہ اِن دونوں (آیتوں) کا لب ولہجہ الگ الگ ہے۔ پہلی آیت میں شفقت ہے اور دوسری میں تنبیہ، بلکہ تہدید۔ گویا درشتی و نرمی بہم در بہ است۔
>
> دوسری یہ کہ ایمان کی اصل روح اللہ کی محبت ہے اور اِس محبت کے لیے یہ شرط ہے کہ اِس کے ساتھ کوئی ایسی محبت جمع نہ ہونے پائے جو اِس کے ضد ہو۔
>
> تیسری یہ کہ اللہ سے محبت کرنے کا واحد راستہ رسول کی پیروی ہے۔ اِس سے ہٹ کر جو راستے نکالے گئے ہیں، وہ سب بدعت و ضلالت ہیں۔
>
> چوتھی یہ کہ خدا کی محبوبیت کا راستہ بھی رسول کی پیروی ہی ہے، اگر کسی شخص کی زندگی رسول کی سنت سے منحرف ہو اور وہ اِس زعم میں مبتلا ہو کہ وہ خدا کا محبوب ہے یا دوسرے اُس کو محبوب خدا

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۙ(۳۳) ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۚ(۳۴)

([۸۰۷]یہ اہلِ کتاب تم سے بحث کرنا چاہتے ہیں)۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ نے آدم اور نوح کو، اورابراہیم اور عمران کے خاندان[۸۰۸] کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر (اُن کی رہنمائی کے لیے) منتخب فرمایا[۸۰۹]۔ یہ ایک دوسرے کی اولاد ہیں اور (جو کچھ کہتے اور کرتے رہے ہیں، اللہ اُس سے واقف ہے، اِس لیے کہ) اللہ سمیع و علیم ہے[۸۱۰]۔ ۳۳-۳۴

سمجھیں تو یہ بالکل خبط ہے۔

پانچویں یہ کہ دین کا کم سے کم مطالبہ اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ اگر کوئی شخص یہ مطالبہ پورا کرنے سے اعراض اختیار کرتا ہے تو اُس کا شمار دین کے منکروں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے محبت نہیں رکھتا۔'' (تدبر قرآن ۲/۷۱)

۸۰۷ سورہ کی تمہید یہاں ختم ہوئی۔ اِن آیتوں سے اب اہل کتاب، خاص کر نصاریٰ پر اتمام حجت کا مضمون شروع ہوتا ہے۔

۸۰۸ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ عمران کے خاندان کا ذکر یہاں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ عمران بن ماتان سیدہ مریم کے والد ماجد کا نام ہے۔ یہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے جد مادری ہیں۔ آگے کا مضمون چونکہ اُس دعا سے شروع ہو رہا ہے جو سیدہ مریم کی والدہ نے اُن کی پیدایش کے موقع پر کی تھی، اِس لیے یہاں بھی اُنھیں نمایاں کر دیا ہے۔

۸۰۹ اشارہ ہے نبوت و رسالت اور شہادت علی الناس کے اُس منصب کی طرف جو آدم اور نوح کو اُن کی انفرادی حیثیت میں اور ذریت ابراہیم کو بحیثیت جماعت عطا کیا گیا۔ ابراہیم اور عمران کے بجائے 'اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ' اور 'اٰلَ عِمْرٰنَ' کے الفاظ یہاں اِسی حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔

۸۱۰ مطلب یہ ہے کہ اِن بزرگوں کے علم و عمل اور اِن کی دعوت کے بارے میں جو لوگ اللہ

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ
مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا
قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰی ۗ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۗ وَلَیْسَ
الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی ۚ وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْٓ اُعِیْذُهَا بِکَ وَذُرِّیَّتَهَا

اِنھیں یاد دلاؤ وہ واقعہ جب عمران کی بیوی نے دعا کی کہ پروردگار، یہ میرے پیٹ میں جو بچہ ہے، اُس کو میں نے ہر ذمہ داری سے آزاد کر کے تیری نذر کر دیا ہے[۸۱۱]۔ سو تو میری طرف سے اِس کو قبول فرما، بے شک تو ہی سمیع و علیم ہے۔ پھر جب اُس نے اُس کو جنا تو بولی کہ پروردگار، یہ تو میں نے لڑکی جن دی ہے[۸۱۲] ـــــ اور جو کچھ اُس نے جنا تھا، اللہ کو اُس کا خوب پتا تھا[۸۱۳] ـــــ اور (بولی کہ) وہ لڑکا اِس لڑکی کی طرح نہ

اور اُس کے رسول سے بحث کرنا چاہتے ہیں، وہ سوچ لیں کہ کس سمیع و علیم ہستی کو وہ اپنی طرف سے کچھ بتانے کی جسارت کر رہے ہیں۔

[۸۱۱] بنی اسرائیل میں کسی بچے کو اللہ تعالیٰ کی نذر کرنے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ اُسے بیت المقدس کی خدمت کے لیے خاص کر دیا جائے گا اور اُس پر کھلانے کمانے اور گھر در کی کوئی ذمہ داری نہ ہو گی۔

[۸۱۲] اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدہ مریم کی والدہ لڑکے کی ولادت کی توقع کر رہی تھیں اور اِسی توقع پر اُنھوں نے اُسے معبد کی خدمت کے لیے وقف کر دینے کا ارادہ کیا تھا۔

[۸۱۳] یہ اُن کی بات کے بیچ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک جملۂ معترضہ ہے۔ استاذ امام اِس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

> ”... والدۂ مریم کا یہ کہنا کہ 'اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰی' (میں تو یہ لڑکی جنی ہوں) نومولود سے متعلق ایک کہتری کے احساس کی غمازی کر رہا تھا اور اُنھیں اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنا یہ ہدیہ بہت حقیر

مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۳۶﴾ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ

ہوتا[۸۱۴]۔ (خیر اب یہی ہے) اور میں نے اِس کا نام مریم رکھ دیا ہے اور اِس کو اور اِس کی اولاد کو میں شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ (اُس کے احساسات یہی تھے)، تاہم اُس کے پروردگار نے اُس لڑکی کو بڑی خوشی کے ساتھ قبول فرمایا اور نہایت عمدہ طریقے سے پروان چڑھایا اور زکریا[۸۱۵] کو اُس کا سرپرست بنا دیا۔ (چنانچہ)

> محسوس ہو رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی غایت درجہ رافت و رحمت سے یہ واضح فرمایا کہ والدۂ مریم تو مریم کو ایک لڑکی ہونے کی بنا پر نہایت حقیر چیز سمجھ رہی تھیں، لیکن اللہ کو خوب علم تھا کہ لڑکی کی صورت میں اُن کے پیٹ سے کیسی عظیم اور بابرکت ہستی ظہور میں آئی ہے۔‘‘
>
> (تدبر قرآن ۲/۷۷)

[۸۱۴] یہ سیدہ کی والدہ نے اپنے تردد کا اظہار کیا ہے کہ کہاں وہ لڑکا جس کے بارے میں میں نے سوچا تھا کہ اُسے اللہ تعالیٰ کی نذر کروں گی اور کہاں یہ لڑکی جو پیدا ہوئی ہے۔ اِس تردد کی وجہ یہ تھی کہ بنی اسرائیل میں معبد کی خدمت کے لیے لڑکیوں اور عورتوں کے لینے کا رواج نہیں تھا۔

[۸۱۵] یہ زکریا جن کا ذکر یہاں ہوا ہے، سیدنا ہارون علیہ السلام کے خاندان سے اور سیدہ مریم کے خالو تھے۔ بنی اسرائیل میں کہانت کا جو نظام قائم کیا گیا تھا، اُس کی رو سے لاوی بن یعقوب کا گھرانا مذہبی خدمات کے لیے خاص تھا۔ پھر بنی لاوی میں سے بھی مقدس میں خداوند کے آگے بخور جلانے اور پاک ترین چیزوں کی تقدیس کی خدمت سیدنا ہارون کے خاندان کے سپرد تھی۔ دوسرے بنی لاوی مقدس کے اندر نہیں جا سکتے تھے، بلکہ صحنوں اور کوٹھڑیوں میں کام کرتے تھے، سبت کے دن اور عیدوں کے موقع پر سوختنی قربانیاں چڑھاتے تھے اور مقدس کی نگرانی میں بنی ہارون کی مدد کرتے تھے۔ زکریا بنی ہارون کے خاندان میں سے ابیاہ کے سربراہ تھے۔ چنانچہ اپنے خاندان

وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

جب کبھی زکریا محراب[۸۱۶] میں اُس کے پاس جاتا[۸۱۷] تو وہاں (اللہ کی) عنایت دیکھتا تھا[۸۱۸]۔ (اِسی طرح کے ایک موقع پر) اُس نے پوچھا: مریم، یہ کہاں سے پاتی ہو؟[۸۱۹] اُس نے جواب دیا: یہ اللہ کے پاس سے ہے[۸۲۰]۔ (اُس لڑکی پر یہ تمھارے پروردگار کا کرم تھا)، اِس

کی طرف سے یہی معبد کی خدمت انجام دیتے تھے۔

[۸۱۶] اِس سے مراد وہ محراب نہیں ہے جو ہماری مسجدوں میں امام کے کھڑے ہونے کے لیے بنائی جاتی ہے۔ بیت المقدس میں جو حجرے اور گوشے عبادت گزاروں کے لیے بنائے گئے تھے، اُنھیں محراب کہا جاتا تھا۔ یہاں اِس سے مراد وہ خاص گوشہ اور حجرہ ہے جس میں بیٹھ کر سیدہ مریم ذکر و عبادت میں مشغول ہوتی تھیں۔

[۸۱۷] اِس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں: ایک یہ کہ حضرت زکریا سیدہ کی نگہداشت اور دیکھ بھال کے لیے اکثر اُن کے پاس جاتے رہتے تھے، دوسری یہ کہ سیدہ اپنا تمام وقت اِسی محراب میں ذکر و عبادت میں گزارتی تھیں۔

[۸۱۸] اصل میں 'وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں رزق سے مراد وہ حکمت و معرفت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی شخص کو عطا ہوتی ہے۔ قرآن نے یہ لفظ ایک سے زیادہ مقامات میں وحی و ہدایت کے لیے استعمال کیا ہے۔ قدیم صحیفوں میں بھی یہ تعبیر اِس مفہوم کے لیے اختیار کی گئی ہے۔

[۸۱۹] یہ محض استفہام نہیں، بلکہ اظہار تحسین کے لیے استعجاب کا جملہ ہے۔ یعنی تمھارے پاس آتا ہوں تو روحانی کمالات کے جو نفحات محسوس کرتا ہوں، یہ تمھیں کہاں سے حاصل ہوتے ہیں؟

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّیَّةً
طَیِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِیْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ
یُّصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكَ بِیَحْیٰی مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ

میں شبہ نہیں کہ اللہ جس کو چاہتا ہے، بے حساب دیتا ہے۔[۸۲۱] ۳۵-۳۷

یہی موقع تھا کہ زکریا نے اپنے رب کو پکارا۔ اُس نے دعا کی کہ پروردگار، تو مجھے بھی اپنی جناب سے (ایسی ہی) پاکیزہ اولاد عطا فرما۔ یقیناً تو (اپنے بندوں کی) دعائیں سننے والا ہے۔[۸۲۲] اِس کے جواب میں فرشتوں نے اُس کو ندا دی، جب کہ وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا[۸۲۳] کہ اللہ تجھے یحییٰ[۸۲۴] کی خوش خبری دیتا ہے جو اللہ کے

---

[۸۲۰] سیدہ مریم کا یہ جواب کم سنی کے باوجود اُن کے پختہ علم اور فہم و بصیرت پر دلالت کرتا ہے کہ اُنھوں نے اِسے اپنے زہد و ریاضت کا کرشمہ قرار نہیں دیا، بلکہ اللہ کی عنایت اور اُس کا فضل قرار دیا ہے۔

[۸۲۱] یہ جملہ، جیسا کہ استاذ امام نے لکھا ہے، سیدہ مریم کے جواب کا حصہ نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سیدہ کی تحسین اور اُن پر اپنے بے پایاں فضل کا اظہار ہے۔ شان کلام اِس سے ابا کرتی ہے کہ اِسے سیدہ کے جواب کا حصہ قرار دیا جائے۔

[۸۲۲] سیدہ مریم کو جو حکمت و معرفت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئی تھی، اُسے دیکھ کر زکریا اِس درجہ متاثر ہوئے کہ اُن کے اندر بھی یہ آرزو بھڑک اٹھی کہ کاش ایسا ہی کوئی نیک اور صالح فرزند اللہ تعالیٰ اُنھیں بھی عطا فرمائے۔

[۸۲۳] اِس سے یہ بات نکلتی ہے کہ فرشتوں سے قرب و اتصال اور اپنے پروردگار سے راز و نیاز اور دعا و مناجات کے لیے سب سے زیادہ موزوں وقت نماز ہی کا ہے۔

مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى

ایک کلمہ کی تصدیق کرنے والا،[۸۲۵] سردار[۸۲۶] اور دنیا کی لذتوں سے کنارہ کش[۸۲۷] اور (خدا کے) نیک بندوں میں سے ایک نبی ہوگا۔[۸۲۸] اُس نے تعجب سے پوچھا: پروردگار، میرے ہاں لڑکا

---

۸۲۴ یہ وہی یحییٰ پیغمبر ہیں جن کا نام بائیبل میں یوحنا آیا ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام سے یہ صرف چھ ماہ پہلے پیدا ہوئے تھے۔

۸۲۵ اصل میں 'مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِسی سورہ کی آیت ۴۵ میں آگے قرآن نے صراحت کردی ہے کہ اِس سے مراد سیدنا مسیح علیہ السلام ہیں۔ اُنھیں 'كَلِمَةٌ مِّنَ اللّٰهِ' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی ولادت عام ضابطۂ اسباب کے خلاف براہ راست اللہ تعالیٰ کے کلمہ 'کُنْ' سے ہوئی تھی۔ نصاریٰ نے اِسی سے سیدنا مسیح علیہ السلام کی الوہیت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، دراں حالیکہ یہ اُن کے دعوے کی تردید ہے۔ چنانچہ لفظ 'كَلِمَة' کی تنکیر سے قرآن نے واضح کردیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بے شمار کلمات میں سے حضرت مسیح بھی ایک کلمہ تھے۔ جس طرح اِس عالم رنگ و بو کی اَن گنت چیزیں محض کلمہ 'کُنْ' سے پیدا ہوئی ہیں، اُسی طرح وہ بھی اِسی کلمہ سے پیدا ہوئے تھے۔

۸۲۶ یہ اُن کی شخصیت کا بیان ہے کہ وہ اپنی ذات میں سرداری کی شان رکھنے والے ہوں گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... نبی اپنی فطرت، اپنی دعوت اور اپنے مشن کے لحاظ سے سردار ہوتا ہے۔ وہ داعی بن کر لوگوں کو پکارتا، منذر بن کر لوگوں کو جگاتا اور ہادی و مرشد بن کر لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ اِس کام کے لیے وہ قدرت کی طرف سے تمام لوازم و اسلحہ سے مسلح ہوتا ہے۔ اُس کا سینہ خلق کے لیے شفقت و رأفت سے لبریز ہوتا ہے، اُس کے کلام میں بے پناہ سطوت و جلالت ہوتی ہے، اُس کی آواز اور اُس کے انداز میں ہیبت ہوتی ہے، اُس کی تابناک پیشانی اُس کی عظمت و

صداقت کی گواہی دیتی ہے۔ اگرچہ وہ کمل کی پوشاک پہنتا ہو اور جنگلی شہد اور ٹڈیوں پر گزارہ کرتا ہو، لیکن اُس کے رعب و دبدبہ سے بادشاہوں پر لرزہ طاری ہوتا ہے۔ وہ حق کے لیے اُن کو بھی اُسی طرح سرزنش کرتا ہے، جس طرح دوسروں کو کرتا ہے۔ انجیلوں میں حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ، دونوں حضرات کے متعلق آتا ہے کہ وہ 'بااختیار' کی طرح بات کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اُن کے کلام میں بااختیاری کی یہ شان اُن کی اِس منصبی سرداری ہی کا ایک جلوہ تھی۔ اُس کی تحویل میں قدرت کی طرف سے ایک گلہ بھی ہوتا ہے، جس کی چرواہی اُس کے سپرد کی جاتی ہے اور اِس بات سے اُس کی حیثیت عرفی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ گلے نے اُس کی اطاعت کی یا نہیں کی۔ اگر اُس نے اپنا فرض ادا کیا تو اُس نے سرداری کا حق ادا کر دیا اور یہی اُس سے مطلوب ہوتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۸۱/۲)

۸۲۷۔ اِس کنارہ کشی کی وجہ یہ تھی کہ یحییٰ و مسیح، دونوں بنی اسرائیل پر عذاب سے پہلے آخری اتمام حجت کے لیے آئے تھے۔ وہ اُس بستی میں گھر کیا بناتے جو سیلاب کی زد میں تھی اور اُس درخت کی بہار کیا دیکھتے جس کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا ہوا تھا۔ ایک ایک دروازے پر دستک دے کر لوگوں کو آنے والے طوفان سے خبردار کرنے والے اپنا گھر بسانے اور اپنا کھیت اگانے میں لگ جاتے تو اپنے فرض سے کوتاہی کے مرتکب قرار پاتے۔ چنانچہ دونوں نے تجرد و انقطاع کا طریقہ اختیار کیا، قوت لایموت پر اکتفا کی، درویشوں کا لباس پہنا اور زمین و آسمان ہی کو چھت اور بچھونا بنا کر زندگی بسر کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یہ نصاریٰ کی بدقسمتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اِن جلیل القدر پیغمبروں کی اِس منصبی ذمہ داری کو سمجھنے کے بجائے اُنھوں نے اِسے رہبانیت کا رنگ دیا اور پھر اِسی کو دین کا اصلی مطالبہ قرار دے کر رہبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا۔ ہمارے ہاں بھی صوفیوں نے پیغمبروں کی زندگی میں اِسی طرح کی بعض چیزوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بہت سے اجنبی تصورات دین میں داخل کر دیے ہیں اور اب گذشتہ کئی صدیوں سے علما کو بھی اُن سے متاثر کر لینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ
اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ
اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ
بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾

کہاں سے ہوگا، میں تو بوڑھا ہو چکا اور میری بیوی بھی بانجھ ہے؟ فرمایا:[۸۲۹] اللہ اِسی طرح جو چاہے، کرتا ہے۔[۸۳۰] اُس نے عرض کیا: پروردگار، پھر میرے لیے کوئی نشانی ٹھیرا دیں۔[۸۳۱] فرمایا: تمھارے لیے نشانی یہ ہے کہ تین دن تک تم لوگوں سے اشارے کے سوا کوئی بات نہ کرسکو گے۔ (ہاں، تسبیح وتہلیل، البتہ کرسکو گے، لہٰذا یہ دن اِسی طرح گزارنا) اور (اِس دوران میں) اپنے پروردگار کو بہت یاد کرنا اور صبح وشام اُس کی تسبیح کرتے رہنا۔[۸۳۲] ۳۸-۴۱

---

[۸۲۸] یعنی اِن اوصاف وکمالات کے ساتھ وہ زمرۂ صالحین میں سے ایک پیغمبر بھی ہوگا جسے اللہ تعالیٰ لوگوں کی رہنمائی کے لیے مبعوث فرمائے گا۔

[۸۲۹] یہ لفظ واحد اِس لیے آیا ہے کہ کوئی متعین فرشتہ یا فرشتوں کی جماعت حضرت زکریا کے سامنے نہیں آئی، بلکہ ایک غیبی آواز تھی جو اُنھیں سنائی دی۔

[۸۳۰] یعنی اسباب تو محض ظاہر کا پردہ ہیں۔ اصلی چیز اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے۔ وہ چاہے تو دریا کو سراب بنادے اور چاہے تو صحرا سے حباب اٹھادے۔ اُس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔

[۸۳۱] اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ زکریا کا گمان تو اگرچہ یہی تھا کہ یہ بشارت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، لیکن دل کے کسی گوشے میں یہ کھٹک ضرور تھی کہ ممکن ہے یہ اپنے ہی گنبد دل کی صدا اور اپنی ہی آرزوؤں کے ہجوم میں شیطان کا کوئی القا ہو جسے وہ فرشتوں کا الہام سمجھ بیٹھے ہیں۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ
وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ
وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

اور وہ واقعہ بھی اِنھیں یاد دلاؤ، جب فرشتوں نے مریم سے کہا: اے مریم، اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا ہے اور پاکیزگی عطا فرمائی ہے[۸۳۳] اور دنیا کی تمام عورتوں پر ترجیح دے کر (اپنی ایک عظیم نشانی کے ظہور کے لیے) تم کو منتخب کرلیا ہے[۸۳۴]۔ (اِس لیے)، اے مریم، اب اپنے پروردگار کی فرماں برداری میں لگی رہو اور اُس کے حضور میں

۸۳۲۔ یہ چیز، ظاہر ہے کہ شیطانی تصرف کے ہر امکان کو ختم کر دیتی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... کسی شیطانی اثر سے یہ بات پیدا ہوتی تو اُس کا نتیجہ اِس کے بالکل برعکس ظاہر ہونا تھا، یعنی آدمی اپنی دنیا داری کی باتیں تو کر سکتا، لیکن اللہ اللہ کرنا اُس پر شاق گزرتا۔ اگر حضرت زکریا پر یہ حالت غیر اختیاری طور پر طاری کر دی گئی تو یقیناً یہ اِس بات کی ایک قطعی نشانی تھی کہ اُن کو بیٹے کی جو بشارت ملی ہے، من جانب اللہ ہے، اِس میں شیطانی دھوکے کو کوئی دخل نہیں ہے۔ قرآن نے یہاں ضمناً اُس بات کی تردید بھی کر دی جو انجیل لوقا میں بیان ہوئی ہے کہ حضرت زکریا کو جو یہ حالت پیش آئی، وہ اُن کے اِس جرم کی سزا کے طور پر تھی کہ اُنھوں نے فرشتے کی بات کا اعتبار نہ کیا اور سوال کر بیٹھے کہ مجھے اِس کی کوئی نشانی دی جائے۔“
>
> (تدبر قرآن ۲/ ۸۳)

۸۳۳۔ یعنی لوگوں سے الگ کر کے تمھاری خاص تربیت کر دی ہے تاکہ آنے والے مراحل میں حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تم اپنے آپ کو تیار کر لو۔

۸۳۴۔ یعنی سیدنا مسیح علیہ السلام کی ولادت کے لیے منتخب کر لیا ہے جو بنی اسرائیل پر اتمام حجت کے لیے فی الواقع اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نشانی بن کر آئے تھے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ سیدہ مریم کے لیے

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

جھکنے والوں کے ساتھ رکوع و سجود کرتی رہو۔[835] ۴۲-۴۳

[836]یہ غیب کی باتیں ہیں، (اے پیغمبر)، جو ہم تمھیں وحی کر رہے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ جب ہیکل کے خدام یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ اُن میں سے کون مریم کی سرپرستی کرے گا، اپنے اپنے قرعے ڈال رہے تھے تو تم اُس وقت اُن کے پاس موجود نہ تھے، اور نہ اُس وقت اُن کے پاس موجود تھے، جب وہ اِس معاملے میں ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے۔[837] ۴۴

یہ ایک ایسا شرف ہے جس میں اُن کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے۔

[835] اپنے پروردگار کی فرماں برداری میں لگے رہنے کی جو ہدایت اِس سے پہلے ہوئی ہے، یہ اُس کے اجمال کی تفصیل بھی ہے اور اُس نماز باجماعت کی تصویر بھی جس کی سعادت سیدہ مریم کو ہیکل میں معتکف ہونے کی وجہ سے ہمہ وقت حاصل تھی۔ پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ نماز کو یہاں رکوع و سجود سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اِس سے، اگر غور کیجیے تو استغراق و انہماک اور تبتل الی اللہ کی وہ کیفیت سامنے آتی ہے جو نماز کا اصلی حسن ہے۔ قرآن نے یہ اسلوب جگہ جگہ نماز کے اِسی پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے اختیار کیا ہے۔

[836] اثنائے کلام میں یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات ہے اور مقصود اِس سے مخاطبین کو اِس بات کی طرف توجہ دلانا ہے کہ وحی والہام کے بغیر آپ یہ واقعات اِس صحت و صداقت کے ساتھ ہرگز نہیں سنا سکتے تھے، اِس لیے کہ اہل کتاب کی تاریخ کا یہ حصہ بائیبل میں بھی تقریباً غائب ہی ہے۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ

اِنھیں یاد دلاؤ، جب فرشتوں نے کہا: اے مریم، اللہ تجھے اپنے ایک کلمہ کی بشارت دیتا ہے[۸۳۸]۔ اُس کا نام مسیح[۸۳۹] عیسیٰ ابن مریم ہوگا[۸۴۰]۔ وہ دنیا اور آخرت، دونوں

---

۸۳۷ بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ ہیکل میں ذمہ داریوں کا فیصلہ بالعموم قرعے سے کیا جاتا تھا، لیکن اِس موقع پر جھگڑے کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ سیدہ مریم کے بارے میں قبولیت کے جو آثار پہلے دن سے نمایاں تھے، اُنھیں دیکھ کر ہیکل کے خدام میں سے کوئی بھی اِس سعادت سے محروم نہیں رہنا چاہتا تھا۔

۸۳۸ سیدہ مریم کے لیے یہ بغیر کسی مرد کی ملاقات کے بچے کی پیدایش کی بشارت ہے۔ لیکن صرف لفظ 'کَلِمَہ' کے ساتھ اِس بشارت کی ابتدا اِس لیے کی گئی ہے کہ معاملے کی نوعیت بھی اُن پر واضح رہے اور ایک کنواری اور شرم و حیا کی پیکر خاتون اُس بات کو سننے کے لیے بھی تیار ہو جائے جو اُسے کہنا پیش نظر ہے۔

۸۳۹ یہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا لقب ہے۔ بنی اسرائیل کے یہاں روایت تھی کہ نبیوں اور بادشاہوں کو اُن کے منصب پر مامور کرنے کا اعلان بالعموم اُن کے سر پر ایک قسم کا مقدس تیل مل کر کیا جاتا تھا۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے لیے یہ اعلان اُن کی پیدایش کے فوراً بعد گہوارے ہی میں گویا براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا۔ چنانچہ مسیح کا یہ لقب اُنھی کے لیے خاص ہو گیا۔ انجیل میں اِسی بنا پر اُنھیں ”خداوند کا مسیح“ کہا گیا ہے۔

۸۴۰ یعنی وہ کسی باپ کا بیٹا نہیں ہوگا۔ استاذ امام کے الفاظ میں سیدنا مسیح علیہ السلام کو ابن مریم کہہ کر یہ قرآن نے اُن لوگوں کے لیے گفتگو کی ہر گنجایش ختم کر دی ہے جو کم زور تاویلات کے ذریعے سے قرآن کے نہایت واضح نصوص میں تحریف کرنا چاہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿٤٥﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٤٦﴾

میں صاحب وجاہت[۸۴۱] اور مقربین میں سے ہوگا، لوگوں سے گہوارے میں بھی (اپنی

”... اگر حضرت عیسیٰ کسی باپ کے بیٹے تھے تو آخر قرآن کو مسیح بن مریم کہنے کے بجاے اُن کے باپ کی طرف اُن کی نسبت کرنے میں کیا رکاوٹ تھی؟ قرآن بھی مسیح بن یوسف کہہ سکتا تھا، لیکن اُس نے ایسا نہیں کہا۔ آخر کیوں نہیں کہا؟“ (تدبر قرآن ۲/ ۹۳)

۸۴۱ یہ وہی وجاہت ہے جس کا ذکر اِس سے پہلے سیدنا یحییٰ علیہ السلام کے بیان میں ہو چکا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت اِس طرح فرمائی ہے:

”...لوقا کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲ سال کی عمر میں حضرت مسیح نے پہلی بار ہیکل میں تعلیم دی، لیکن اِس کم سنی کے باوجود اُن کی تعلیم کی حکمت و معرفت، کلام کی بلاغت و جزالت اور لب و لہجہ کی عظمت و جلالت کا عالم یہ تھا کہ فقیہ اور فریسی، سردار کاہن اور ہیکل کا تمام عملہ دم بخود رہ گیا۔ وہ حیرانی کے عالم میں ایک ایک سے پوچھتے پھرتے تھے کہ یہ کون ہے جو اِس شکوہ سے بات کرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے اِس کو اختیار ملا ہوا ہے۔ یہودیہ کی بستیوں میں جب اُنھوں نے تبلیغ شروع کی تو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلچل مچ گئی۔ خلقت اُن پر ٹوٹی پڑتی تھی۔ فقیہ اور فریسی سب پر ایک سراسیمگی کا عالم تھا، وہ اُن کو زچ کرنے اور عوام میں اُن کی مقبولیت کم کرنے کے لیے اُن سے طرح طرح کے سوالات کرتے، لیکن سیدنا مسیح دو دو لفظوں میں اُن کو ایسے دندان شکن جواب دیتے کہ پھر اُن کو زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوتی۔ تھوڑے ہی دنوں میں اُن کی وجاہت کا یہ غلغلہ ہوا کہ عوام اُن کو اسرائیل کا بادشاہ کہنے اور اُن کی بادشاہی کے گیت گانے لگے، یہاں تک کہ رومی حکام —— ہیرودیس اور پیلاطوس —— کے سامنے بھی یہ مسئلہ ایک نہایت اہم مسئلہ کی حیثیت سے آ گیا، لیکن وہ بھی اپنی تمام قوت و جبروت کے باوجود سیدنا مسیح کی عظمت و صداقت اور اُن کی بے پناہ مقبولیت سے مرعوب ہو گئے۔

اِس وجاہت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ باوجودیکہ سیدنا مسیح بن باپ کے پیدا ہوئے اور بن باپ کے پیدا ہونے والے کسی بچے کے لیے عام حالات میں کسی عزت و وجاہت کا تصور بھی نہیں کیا

قَالَتۡ رَبِّ اَنّٰی یَکُوۡنُ لِیۡ وَلَدٌ وَّلَمۡ یَمۡسَسۡنِیۡ بَشَرٌ ؕ قَالَ

نبوت کا) کلام کرے گا[۸۴۲] اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی[۸۴۳] اور صالحین میں شمار کیا جائے گا۔ وہ بولی: پروردگار، میرے ہاں بچہ کہاں سے ہوگا، مجھے تو کسی مرد نے چھوا تک نہیں۔ فرمایا:

جاسکتا، لیکن سیدنا مسیح چونکہ اللہ تعالیٰ کے کلمہ 'کُن' سے پیدا ہوئے تھے، اِس وجہ سے اِس کا معجزانہ اثر یہ ظاہر ہوا کہ روز اول سے اُن کو خلق کی نگاہوں میں وہ وجاہت حاصل رہی جو اُس عہد میں کسی کو بھی حاصل نہیں ہوئی۔ وہ زندگی بھر اپنے جانی دشمنوں میں گھرے رہے، لیکن اِس پہلو سے کسی کو اُن پر طعن کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ یہود کے ایک گروہ نے اگر جسارت بھی کی تو بعد کے زمانوں میں کی، اُن کے عہد مبارک میں کسی کو بھی اِس قسم کی جرأت نہ ہو سکی۔ اُن کی اِس وجاہت کی بشارت اُن کی ولادت کی بشارت کے ساتھ ہی حضرت مریم کو اِس لیے دی گئی کہ اُن کو اِس پہلو سے کوئی خلجان نہ ہو کہ بن باپ کے پیدا ہونے کے سبب سے بچے کی یا خود اُن کی وجاہت پر کوئی اثر پڑے گا۔

اِس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ اِس سے اُن تمام خرافات کی تردید ہو رہی ہے جو انجیلوں میں مذکور ہیں کہ یہودیوں نے سیدنا مسیح کے نعوذ باللہ طمانچے لگائے، اُن کا مذاق اڑایا، اُن کو گالیاں دیں، اُن کے منہ پر تھوکا۔ اِن خرافات کا اکثر حصہ، جیسا کہ ہم آگے واضح کریں گے، غلط ہے۔ اللہ کے رسولوں کے دشمن اُن کی توہین و تحقیر کی جسارت تو کرتے ہیں اور اِس سلسلے میں ایک حد تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کو ڈھیل بھی مل جاتی ہے، لیکن یہ ڈھیل بس ایک خاص حد تک ہی ہوتی ہے، جب کوئی قوم اِس حد سے آگے بڑھنے کی جسارت کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو اپنی حفاظت میں لے لیتا ہے اور اُس ناہنجار قوم کا بیڑا غرق کر دیا جاتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۹۲)

۸۴۲ مسیح علیہ السلام کے معاملے میں یہ غیر معمولی واقعہ اِس لیے ہوا کہ سیدہ مریم پر کسی تہمت کی گنجایش نہ رہے اور اُنھیں یہ بشارت اِسی موقع پر اِس لیے دی گئی کہ وہ مطمئن ہو جائیں کہ لوگوں کے اُن کے خلاف زبان کھولنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ ایک ایسی زبان اُن کے حق میں کھول دے گا جو سب کی زبانیں بند کر دے گی۔

كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ
كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ ج
وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ

اِسی طرح اللہ جو چاہے، پیدا کرتا ہے۔ وہ جب کسی معاملے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اُس کو اتنا ہی کہتا ہے کہ ہو جا، پھر وہ ہو جاتا ہے۔[۸۴۴] (لہٰذا اِسی طرح ہو گا) اور اللہ اُسے قانون اور حکمت سکھائے گا، یعنی تورات و انجیل کی تعلیم دے گا[۸۴۵] اور اُس کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گا۔[۸۴۶] (چنانچہ یہی ہوا اور اُس نے بنی اسرائیل کو دعوت دی کہ[۸۴۷]) میں

۸۴۳۔ یعنی اِس کے بعد وہ بڑی عمر کو پہنچے گا اور نبوت کا یہی کلام اپنی قوم سے کرے گا۔

۸۴۴۔ یہ اُس کلمے کی وضاحت ہے جس سے سیدنا مسیح علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔

۸۴۵۔ اِس سے تورات و انجیل کا باہمی تعلق بھی قرآن نے بتا دیا ہے اور یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ انجیل ایمان و اخلاق کے اُنھی حقائق کو بے نقاب کرنے کے لیے نازل کی گئی تھی جنھیں بنی اسرائیل فراموش کر بیٹھے تھے۔ اِس سے مقصود تورات کے احکام میں کوئی تغیر و تبدل کرنا نہیں تھا، بلکہ اُنھی کو پورا کرنا تھا تاکہ اُن کی روح اور اُن کی حکمت ہر لحاظ سے نمایاں ہو اور خدا کی شریعت لوگوں کے لیے زندگی سے خالی محض ایک بوجھ بن کر نہ رہ جائے۔

۸۴۶۔ اصل میں 'رَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْۤ اِسْرَآءِيْلَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن سے پہلے ایک فعل محذوف ہے، یعنی 'يَبْعَثُهٗ رَسُوْلًا'۔ سیدنا مسیح علیہ السلام حضرت یحییٰ کی طرح صرف ایک نبی نہیں تھے، بلکہ اِس کے ساتھ رسالت کے منصب پر بھی فائز تھے۔ آیت سے واضح ہے کہ اُن کی رسالت بنی اسرائیل کے لیے خاص تھی اور اُس کے ماننے یا جھٹلانے کے نتائج بھی دنیا میں اُنھی کو بھگتنا تھے۔ چنانچہ اُن پر ایمان لانے کے بجائے بنی اسرائیل جب اُن کے قتل کے درپے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے رسولوں سے متعلق اپنے قانون کے مطابق اُن کے اِس جرم کی یہ سزا اُن پر نافذ کر دی کہ اب وہ قیامت

اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ
طَيْرًاۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى
بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ؕ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ ﴿۴۹﴾ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ
يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ

تمھارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں۔[۸۴۸] میں تمھارے لیے مٹی سے پرندے کی ایک صورت بناتا ہوں، پھر میں اُس میں پھونکتا ہوں تو اللہ کے حکم سے وہ فی الواقع پرندہ بن جاتی ہے؛ اور مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں؛ اور اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیتا ہوں؛ اور میں تمھیں بتا سکتا ہوں جو کچھ تم کھا کر آتے ہو اور جو اپنے گھروں میں جمع کر رکھتے ہو۔ اِس میں تمھارے لیے یقیناً ایک بڑی نشانی ہے، اگر تم ماننے والے ہو۔ اور میں تورات کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں[۸۴۹] جو مجھ

تک کے لیے مسیح علیہ السلام کے ماننے والوں کے محکوم بن کر دنیا میں رہیں گے۔

[۸۴۷] سیدنا مسیح علیہ السلام کی سرگذشت کا ایک بڑا حصہ اپنے اسلوب کے مطابق حذف کر کے یہ قرآن نے گویا اُنھیں ایک داعی کی حیثیت سے بنی اسرائیل کے سامنے کھڑا کر دیا ہے کہ اُنھوں نے اِس طریقے سے اپنی دعوت اُنھیں پیش کی اور اِس کے لیے یہ معجزات اُنھیں دکھائے۔

[۸۴۸] اصل میں 'جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔ لفظ 'اٰيَة' کی تنکیر اِن میں وحدت کے لیے نہیں، بلکہ تعمیم کے لیے ہے۔ یعنی میں اپنے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں۔ اِس سے قطع نظر کہ وہ ایک ہی صورت میں سامنے آئے یا ایک سے زیادہ صورتوں میں۔

[۸۴۹] اصل الفاظ ہیں: 'مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ'۔ اِن میں 'مُصَدِّقًا' حال

بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ قف فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (۵۰) اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ
فَاعْبُدُوْهُ ط هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (۵۱)
فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى

سے پہلے آ چکی ہے اور اِس لیے آیا ہوں کہ تمھارے لیے بعض اُن چیزوں کو حلال ٹھیراؤں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔[۸۵۰] اور (دیکھو) میں تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں۔ سو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ یقیناً اللہ ہی میرا بھی رب ہے اور تمھارا بھی،[۸۵۱] لہٰذا تم اُسی کی بندگی کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے۔ ۴۵-۵۱

پھر جب عیسیٰ نے محسوس کیا کہ یہ لوگ انکار ہی کریں گے تو اُس نے (حواریوں[۸۵۲]

ہے جو 'اَنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَةٍ' کے جملے پر آیا ہے اور محض مشابہت کی وجہ سے پچھلے جملے پر عطف ہو گیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ میں تورات کی تردید کرنے نہیں، بلکہ اِسی کو قائم کرنے اور اِس کی اُن پیشین گوئیوں کو سچا کر دینے کے لیے آیا ہوں جو آنے والے نبیوں کے بارے میں تم اِس میں پڑھتے رہے ہو۔

[۸۵۰] یعنی تمھارے علما کے غلو اور اِس کے نتیجے میں اُن کی طرف سے صادر ہونے والے من گھڑت فتووں کی وجہ سے حرام کر دی گئی ہیں۔

[۸۵۱] انجیل میں اللہ تعالیٰ کے لیے میرا باپ اور تمھارا باپ کی جو تعبیر جگہ جگہ آئی ہے، یہ قرآن نے اُس کی تصحیح کر دی ہے کہ سیدنا مسیح نے جو بات فرمائی تھی، وہ درحقیقت یہ تھی، لیکن عبرانی زبان میں 'اب' اور 'ابن' کے الفاظ چونکہ باپ اور بیٹے اور رب اور بندے کے معنی میں مشترک تھے، اِس لیے نصاریٰ نے سیدنا مسیح کی الوہیت کا عقیدہ ایجاد کیا تو اِس اشتراک سے فائدہ اٹھا کر اُنھیں یہ

اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ

سے) کہا: کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے[۸۵۳]؟ حواریوں نے جواب دیا: ہم ہیں اللہ کے مددگار[۸۵۴]، ہم اللہ[۸۵۵] پر ایمان لائے ہیں اور آپ گواہ رہیے کہ ہم نے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ پروردگار، ہم نے اُسے مان لیا ہے جو آپ نے نازل کیا ہے اور (اُس کے

صورت دے دی۔

۸۵۲ یہ لفظ غالباً عبرانی سے عربی زبان میں آیا ہے۔ اِس کے معنی قریب قریب وہی ہیں جو ہمارے ہاں لفظ انصار کے ہیں، یعنی حامی، ناصر اور مددگار۔ یہاں یہ سیدنا مسیح علیہ السلام کے اُن خاص شاگردوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو آپ پر ایمان لائے، ہر قسم کے سرد و گرم حالات میں آپ کی مدد کی اور بالآخر آپ کی دعوت کے نقیب بن کر بنی اسرائیل کی ایک ایک بستی میں پہنچ گئے۔

۸۵۳ یعنی مسیح علیہ السلام نے جب بنی اسرائیل کے علما اور سرداروں کے رویے سے یہ محسوس کر لیا کہ اِن پتھروں میں جونک لگانا ممکن نہیں ہے اور اب یہ انکار کا فیصلہ کر چکے ہیں تو اپنے ساتھیوں سے مدد چاہی کہ اللہ تعالیٰ آگے کے مراحل میں جو ذمہ داری بھی اُنھیں دیں، اُس کو پورا کرنے میں وہ اُن کے مددگار بن کر کھڑے ہوں۔ اِس کے لیے جو جملہ اُن کی زبان سے نکلا ہے، اُس سے، اگر غور کیجیے تو استاذ امام کے الفاظ میں جس طرح جوش دعوت کا اظہار ہو رہا ہے، اُسی طرح یہ بات بھی نمایاں ہو رہی ہے کہ اِس دعوت کے ساتھ وہ گویا یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ میں تو اپنے رب کی راہ پر، یہ دیکھو، چل کھڑا ہوا ہوں۔ اب جس کے اندر حوصلہ ہو، وہ اِس وادی پر خار میں میرا ساتھ دے۔

۸۵۴ اصل الفاظ ہیں: 'نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ'۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کی طرف سے 'مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ' کی دعوت کے جواب میں 'نحن انصارك الی اللّٰه' کہنے کے بجائے یہ الفاظ جس مدعا پر دلالت کرتے ہیں، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت اِس طرح فرمائی ہے:

البیان

آل عمران ۳

فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ اِذْ قَالَ

تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے) رسول کی پیروی اختیار کر لی ہے۔ سو آپ ہمیں اُس کی گواہی دینے والوں میں لکھ لیں۔[۸۵۶] ۵۲-۵۳

(یہ ہوا) اور بنی اسرائیل نے (اُس کے خلاف) خفیہ تدبیریں کرنا شروع کیں،[۸۵۷] اور

’’...سیدنا مسیح کے ارشاد میں ’اِلَی‘ اُس مسافت کو واضح کر رہا ہے جو راہ اور منزل کے درمیان واقع ہے اور ایک داعی کی حیثیت سے اُن کے شایان شان یہی تھا کہ اِس راہ کی مشکلات اور درمیان کی مسافت سے آگاہ کر دیں، لیکن حواریین نے اپنے جواب میں جوش فدویت کی ایک ہی جست میں گویا ساری مسافت طے کر لی ہے اور دعوت حق کے اِس نازک مرحلے میں اُن کے جذبۂ ایمان واسلام کے شایان شان بات یہی تھی۔‘‘ (تدبر قرآن ۲/ ۹۹)

[۸۵۵] اِس سے آگے اُن تضمنات کی تفصیل ہے جو ’مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ‘ کے اجمال میں چھپے ہوئے تھے۔ اِس سے واضح ہے کہ حواری اِس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اللہ کے انصار ہونے سے کیا مراد ہے اور آدمی کو اِس کے لیے کیا کچھ کرنا چاہیے۔

[۸۵۶] مطلب یہ ہے کہ یہ حق ہم پر واضح ہوا ہے تو اب ہم اِس کے چھپانے والے نہیں، بلکہ دوسروں کے لیے اِس کی گواہی دینے والے بن کر رہیں گے۔ لہٰذا قیامت کے دن ہمارا نام اِنھی لوگوں میں لکھا جائے، حق کو چھپانے والوں میں نہ لکھا جائے۔

[۸۵۷] یہ تدبیریں کیا تھیں؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِن کی وضاحت اِس طرح فرمائی ہے:

’’ایک تو اُنھوں نے آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر اسلاف کی روایات توڑنے اور بزرگوں کی توہین وتحقیر کا الزام لگایا تاکہ عوام کے جذبات اُن کے خلاف بھڑکائے جا سکیں۔

اللّٰهُ يٰعِيۡسٰۤى اِنِّىۡ مُتَوَفِّيۡكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ

اللہ نے بھی (اِس کے جواب میں) خفیہ تدبیر کی اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے۔[۵۵۸] اُس وقت، جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تجھے

> دوسرا جال اُنھوں نے یہ بچھایا کہ اپنے مخصوص آدمی بھیج بھیج کر اُن سے ایسے سوالات کیے جن کے جوابوں سے اُن کے خلاف کفر و ارتداد کے فتوے کا مواد فراہم ہو سکے۔ یہ کام یہود کے فقیہوں اور فریسیوں نے بڑی سرگرمی سے انجام دیا اور سیدنا مسیح کی تمثیلوں اور تشبیہوں کے اندر سے اُنھوں نے اپنی دانست میں وہ مواد فراہم کر لیا جس کی بنیاد پر اُن کے واجب القتل ہونے کا فتویٰ دیا جا سکے۔
>
> تیسرا یہ کہ اُس زمانے میں چونکہ ملک پر سیاسی اقتدار رومیوں کا تھا، اِس وجہ سے اُن کو بھڑکانے کے لیے مواد فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔ پہلے تو خراج کی ادائیگی سے متعلق سیدنا مسیح علیہ السلام سے سوالات کیے گئے جن سے یہ ثابت ہو سکے کہ یہ شخص لوگوں کو قیصر کو خراج دینے سے روکتا ہے۔ لیکن اِس قسم کے سوالوں کے جواب سیدنا مسیح نے ایسے دندان شکن دیے کہ علماے یہود اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ پھر اُنھوں نے یہ الزام لگایا کہ یہ شخص اسرائیل کا بادشاہ ہونے کا مدعی ہے۔ اِس کے لیے حضرت مسیح کے بعض تمثیلی اقوال سے مواد حاصل کرنے اور اِس کے ذریعے سے رومی حکومت کو بھڑکانے کی کوشش کی گئی۔
>
> چوتھی تدبیر یہ کی گئی کہ سیدنا مسیح کے بارہ شاگردوں میں سے ایک شاگرد یہودا کو، جو منافق تھا، یہود نے رشوت دے کر اِس بات پر راضی کر لیا کہ وہ آں حضرت کی مخبری کرے اور اُن کو گرفتار کرائے۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۱۰۲)

۵۵۸۔ اِس کی صورت غالباً یہ ہوئی کہ جس شخص نے کوہ زیتون کی خلوت گاہ میں مسیح علیہ السلام کی مخبری کی تھی، اُس کی صورت اُنھی کی ہو گئی۔ چنانچہ یہود نے اُسی کو صلیب دی اور اُس کی توہین کرتے رہے۔ آپ کو ہاتھ لگانا بھی اُن کے لیے ممکن نہیں ہوا۔

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ

وفات دوں گا اور اپنی طرف اٹھا لوں گا[۸۵۹] اور تیرے اِن منکروں سے تجھے پاک کروں گا[۸۶۰] اور تیری پیروی کرنے والوں[۸۶۱] کو قیامت کے دن تک اِن منکروں پر غالب رکھوں گا۔[۸۶۲] پھر تم سب کو بالآخر میرے پاس آنا ہے تو اُس وقت میں تمھارے درمیان اُن

---

[۸۵۹] یعنی روح قبض کر کے تیرا جسم بھی اپنی طرف اٹھا لوں گا تاکہ یہ ظالم اُس کی توہین نہ کر سکیں۔ مسیح علیہ السلام اللہ کے رسول تھے اور رسولوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ قانون قرآن میں بیان ہوا ہے کہ اللہ اُن کی حفاظت کرتا ہے اور جب تک اُن کا مشن پورا نہ ہو جائے، اُن کے دشمن ہرگز اُن کو کوئی نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ اِسی طرح اُن کی توہین و تذلیل بھی اللہ تعالیٰ گوارا نہیں کرتے اور جو لوگ اِس کے درپے ہوں، اُنھیں ایک خاص حد تک مہلت دینے کے بعد اپنے رسولوں کو لازماً اُن کی دستبرد سے محفوظ کر دیتے ہیں۔

[۸۶۰] یعنی علم و عقل اور سیرت و کردار کی نجاست میں مبتلا اِن لوگوں سے الگ کر کے تمھیں صالحین و ابرار کی اُس دنیا میں لے جاؤں گا جو اُنھی کے لیے تیار کی گئی ہے۔

[۸۶۱] اِس سے مراد سیدنا مسیح علیہ السلام کے عام متبعین اور نام لیوا ہیں جو پہلے نصاریٰ اور اب مسیحی کہلاتے ہیں۔ یہ موقع بشارت کا ہے جس کا تقاضا یہی ہے کہ اِس میں وسعت ہو۔ پھر 'الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ' کے الفاظ یہاں 'الَّذِيْنَ كَفَرُوْا' کے مقابل میں آئے ہیں، لہٰذا اِن سے مراد منتسبین مسیح ہی ہو سکتے ہیں نہ کہ وہ لوگ جو آپ کے سچے پیرو اور آپ کی ہدایت پر مخلصانہ عمل کرنے والے ہوں۔

[۸۶۲] یہ بنی اسرائیل کے لیے خدائی دینونت کا ظہور ہے جسے گذشتہ دو ہزار سال سے ہر شخص بچشم سر دیکھ سکتا ہے۔ اِس غیر معمولی طور پر حیرت انگیز پیشین گوئی کو دنیا کا کوئی تغیر، زمانے کی کوئی

فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (۵۵) فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا
شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ز وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ (۵۶)
وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ط
وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (۵۷)

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ (۵۸) اِنَّ

چیزوں کا فیصلہ کر دوں گا جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔ سو یہی منکرین ہیں جن کو میں دنیا اور آخرت، دونوں میں سخت سزا دیتا ہوں[۸۶۳] اور وہ اپنے لیے کوئی مددگار نہیں پاتے، اور جنھوں نے مانا اور اچھے عمل کیے تو اُن کو اللہ اُن کا پورا اجر عطا فرماتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اِس طرح کے ظالموں کو اللہ ہرگز دوست نہیں رکھتا۔ ۵۶-۵۷

یہ ہماری آیتیں اور بڑی پرحکمت یاددہانی ہے جو ہم تمھیں سنا رہے ہیں۔[۸۶۴] اللہ کے

گردش اور وقت کی کوئی کروٹ کبھی ایک لمحے کے لیے بھی باطل نہیں کر سکی۔ خدا اور اُس کی عدالت کا یہ ایسا صریح ثبوت ہے جو ہر وقت ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اِس کے بعد وہ کیا چیز ہے جو قیامت کے بارے میں قرآن کی وعید کو جھٹلا سکتی ہے؟

[۸۶۳] رسولوں کے منکروں کے لیے اللہ کا قانون یہی ہے کہ اُن کی طرف سے اتمام حجت کے بعد وہ اِسی دنیا میں عذاب سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ پھر بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے شہادت کے جس منصب پر فائز کیا ہے، اُس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اُن کے گناہوں کی سزا اُنھیں دنیا میں دی جائے۔ چنانچہ قیامت تک کے لیے وہ جس طرح نصاریٰ کے محکوم بنائے گئے ہیں اور اُن پر جو دل ہلا دینے والی آفتیں وقتاً فوقتاً آتی رہی ہیں، وہ سب اِسی قانون کے مطابق ہیں۔

مَثَلَ عِيسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ
لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٥٩﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿٦٠﴾
فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا

نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے۔ اللہ نے اُسے مٹی سے بنایا، پھر اُس کو حکم دیا کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔[۸۶۵] تمھارے پروردگار کی طرف سے یہی حق ہے،[۸۶۶] لہٰذا تم کسی شبہے میں نہ رہو۔[۸۶۷] پھر یہ علم تمھارے پاس آجانے کے بعد بھی جو اِس معاملے میں تم سے جھگڑیں تو

---

[۸۶۴] یہ خاتمۂ بحث کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات ہے تاکہ مخاطبین جو رویہ اختیار کر رہے ہیں، اُس کے مقابل میں آپ کو تسلی دی جائے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام کے بارے میں حق وہی ہے جو آپ کو بتایا جا رہا ہے۔ نصاریٰ کے تصنیف کردہ اساطیر اِس کے برخلاف محض گم راہی ہیں، اُن کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

[۸۶۵] یعنی آدم علیہ السلام اگر ماں باپ، دونوں کے بغیر پیدا ہو کر معبود نہیں بن گئے تو سیدنا مسیح کو یہ لوگ آخر کیوں معبود بنا بیٹھے ہیں؟

[۸۶۶] اصل الفاظ ہیں: ’اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ‘۔ اِس جملے میں مبتدا محذوف ہے۔ یہ اُس موقع پر کیا جاتا ہے، جب مخاطب کی ساری توجہ خبر پر مرکوز کرانا پیش نظر ہو۔

[۸۶۷] اِس میں خطاب، بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن روے سخن، اگر غور کیجیے تو عام مسلمانوں کی طرف ہے کہ اُنھیں اب اِس معاملے میں کوئی شبہ نہیں رہنا چاہیے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام سے متعلق اصل حقیقت یہی ہے جو قرآن نے بیان کر دی ہے۔ اِس کے علاوہ جو کچھ ہے، وہ سب نصاریٰ کی افسانہ طرازی ہے۔ چنانچہ جملے میں جو عتاب محسوس ہوتا ہے، اُس کا تعلق اِنھی افسانہ طرازی کرنے والوں سے ہے۔

نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ قف
ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿٦١﴾ اِنَّ هٰذَا
لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ
لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٦٢﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿٦٣﴾

کہہ دو کہ آؤ، ہم بھی اپنے بچوں کو بلائیں اور تم بھی اپنے بچوں کو لے آؤ، اور ہم بھی اپنی عورتوں کو بلائیں اور تم بھی اپنی عورتوں کو لے آؤ اور ہم اور تم خود بھی آ جائیں،[۸۶۸] پھر دعا کریں[۸۶۹] اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔[۸۷۰] اِس میں شبہ نہیں کہ یہی سچا بیان ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اللہ ہی عزیز و حکیم ہے۔[۸۷۱] پھر وہ اعراض کریں تو اللہ تو اِن فساد کرنے والوں سے واقف ہی ہے۔ ۵۸-۶۳

۸۶۸۔ یہ جملہ اصل میں جس طرح آیا ہے، اُس میں عربی زبان کے اسلوب کے مطابق بعض چیزیں حذف ہو گئی ہیں۔ اُنھیں ظاہر کر دیا جائے تو پوری بات گویا اِس طرح ہے: 'ندع نحن أبناء نا و أنتم أبنائكم، و نحضر نحن أنفسنا و أنتم أنفسكم، ثم نبتهل نحن و أنتم'۔ ہم نے ترجمے میں اُنھیں کھول دیا ہے۔

۸۶۹۔ اصل میں لفظ 'نَبْتَهِلْ' آیا ہے۔ اِس کے معنی دعا اور تضرع کے ہیں، لیکن اِس کے ساتھ ترک کا جو مفہوم اِس میں پایا جاتا ہے، اُس کے باعث یہ ایک دوسرے پر لعنت کی بددعا کے لیے معروف ہو گیا ہے۔

۸۷۰۔ اِس طرح کی بددعا سے حق و باطل کے فیصلے کا چیلنج وہی دے سکتا ہے جسے اپنے موقف کی صحت و صداقت کا پورا یقین ہو۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ چیلنج نصاریٰ کو اِسی اذعان کے ساتھ دیا گیا، مگر تاریخ سے ثابت ہے کہ اُنھوں نے اِسے قبول کرنے کی

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا

اِن سے کہہ دو: اے اہل کتاب[۸۷۲]، اُس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے[۸۷۳]۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اُس کے ساتھ

جرأت نہیں کی جس سے یہ بات آخری درجے میں واضح ہوگئی کہ وہ خود بھی اپنے موقف کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، بلکہ محض بات کی پچ اور اپنی ہٹ دھرمی کی آن قائم رکھنے کے لیے اُس پر اڑے ہوئے تھے۔

۸۷۱ یعنی الوہیت صرف اللہ ہی کو سزاوار ہے۔ اِس میں مسیح کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اُن کا جو درجہ و مرتبہ بھی ہے، اللہ کے ایک بندے اور اُس کے رسول کی حیثیت سے ہے۔

۸۷۲ یہ خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن پیچھے کے مضمون سے واضح ہے کہ روے سخن نصاریٰ کی طرف زیادہ ہے۔

۸۷۳ قرآن نے یہ دعوت ٹھیک اُس طریقے کے مطابق دی ہے جس کی تلقین اُس نے خود فرمائی ہے کہ اللہ کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے سے بلانا چاہیے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِس طریقۂ حکمت کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اگر مخاطب سے بحث کے لیے کوئی مشترک بنیاد مل سکتی ہو تو اُسی پر گفتگو کو آگے بڑھایا جائے، خواہ مخواہ اپنی انفرادیت کی دھونس جمانے کی کوشش نہ کی جائے۔ چنانچہ قرآن نے یہاں یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے۔ اہل کتاب آسمانی صحیفوں کے حامل ہونے کے سبب سے توحید کی تعلیم سے اچھی طرح آشنا بھی تھے اور اُس کے علم بردار ہونے کے مدعی بھی تھے۔ اُن کے صحیفوں میں نہایت واضح الفاظ میں توحید کی تعلیم موجود تھی۔ اُنھوں نے اگر شرک اختیار کیا تھا تو اِس وجہ سے نہیں کہ اُن کے دین میں شرک کے

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

کسی چیز کو شریک ٹھیرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا اپنا رب بنائے۔[۸۷۴] پھر وہ اعراض کریں تو، (ایمان والو)، تم کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو مسلم ہیں۔[۸۷۵] ۶۴

> لیے کوئی گنجایش تھی، بلکہ اپنے نبیوں اور صحیفوں کی تعلیمات کے بالکل خلاف محض بدعت کی راہ سے اُنھوں نے یہ چیز اختیار کی اور پھر متشابہات کی پیروی کر کے، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں، اُس کے حق میں الٹی سیدھی دلیلیں گھڑنے کی کوشش کی۔ قرآن نے اُن کو دعوت دی کہ یہ بات ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں مسلم ہے کہ اللہ کے سوا نہ کسی کی بندگی کی جائے، نہ اُس کا کسی کو ساجھی ٹھیرایا جائے اور نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو رب ٹھیرائے، پھر اِس مسلم و مشترک حقیقت کے برخلاف تم نے خدا کی عبادت میں دوسروں کو شریک کیوں بنا رکھا ہے اور اپنے احبار و رہبان اور فقیہوں صوفیوں کو 'اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ' کا درجہ کیوں دے دیا۔" (تدبر قرآن ۲/ ۱۱۲)

۸۷۴ یعنی اپنے عقائد کا جائزہ لیں اور جو باتیں محض بدعات و متشابہات کی پیروی میں عقیدہ بنا لی گئی ہیں، اُنھیں چھوڑ کر توحید خالص کو اختیار کریں جس کی تعلیم تمام انبیا علیہم السلام نے دی ہے۔ یہاں خاص طور پر یہ بات جو آئی ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا اپنا رب نہ بنائے، اِس سے اشارہ تحلیل و تحریم کے اُن اختیارات کی طرف ہے جو اہل کتاب نے اپنے احبار و رہبان کو دے رکھے تھے۔ اِس لیے کہ کسی کو اپنی ذات میں شارع و حاکم سمجھ کر اُس کی اطاعت بھی درحقیقت اُس کی عبادت ہی ہے۔ قرآن نے ایک دوسرے مقام پر وضاحت فرمائی ہے کہ یہ اُنھیں رب بنا دینا ہے۔

۸۷۵ یہ اظہار براءت کے الفاظ ہیں۔ یعنی اِس بات کے گواہ رہو کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا اور تمھیں بتا دیا کہ اسلام کی حقیقت یہی توحید ہے۔ اِس سے محرومی کے بعد کسی شخص کو خدا حاصل نہیں ہو سکتا۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ
التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٥﴾ هٰٓاَنْتُمْ
هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا
لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٦﴾ مَا كَانَ
اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا
كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٦٧﴾ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ

اے اہل کتاب، تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو، دراں حالیکہ تورات و انجیل تو اُس کے بعد ہی نازل ہوئی ہیں۔ پھر کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے؟[۸۷۶] یہ تمھی لوگ ہو کہ اُن باتوں میں تو جھگڑ چکے جن کے بارے میں تمھیں کچھ علم تھا، مگر اب یہ اُس بات میں کیوں جھگڑ رہے ہو جس کا تمھیں کچھ بھی علم نہیں ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اِن سب حقائق کو اللہ جانتا ہے، مگر تم نہیں جانتے۔ ابراہیم نہ یہودی تھا اور نہ نصرانی، بلکہ ایک حنیف مسلم تھا[۸۷۷] اور وہ اِن مشرکوں میں سے بھی نہیں تھا۔[۸۷۸] ابراہیم کے ساتھ نسبت

---

۸۷۶ یہود و نصاریٰ اور مشرکین، تینوں ہی اپنی گم راہیوں کی حمایت میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا نام استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ قرآن نے اُن کے اِس جھگڑے کا حوالہ دیا ہے کہ اِن میں سے ہر کوئی یہ کہتا ہے کہ ابراہیم ہمارے طریقے پر تھے، دراں حالیکہ تورات اور انجیل، دونوں اُن کے صدیوں بعد نازل ہوئی ہیں، پھر وہ یہودیت یا نصرانیت پر کس طرح ہو سکتے ہیں؟ فرمایا ہے کہ حق کی عداوت کا یہ کیسا جنون ہے کہ اتنی سی بات بھی اِن لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔

۸۷۷ یعنی اپنے پروردگار کا فرماں بردار اور پوری یک سوئی کے ساتھ توحید کی راہ پر گام زن

اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۶۸﴾
وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ یُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا یُضِلُّوْنَ

کا زیادہ حق اُن لوگوں کو پہنچتا ہے جنھوں نے اُس کی پیروی کی۔ اب یہ پیغمبر اِس کے حق دار ہیں اور وہ بھی جو اِن پر ایمان لائے ہیں۔ اور اللہ تو اِنھی ایمان والوں کا ساتھی ہے۔[۸۷۹] ۶۵-۶۸

(ایمان والو)، اِن اہل کتاب کے ایک گروہ کی تمنا ہے کہ کسی طرح تمھیں صحیح

تھا۔ اِس سے ہٹ کر کج پیچ کے یہ مشرکانہ راستے اُس نے کبھی اختیار نہیں کیے تھے۔

[۸۷۸] یعنی ابراہیم علیہ السلام کو جس طرح یہودیت اور نصرانیت سے کوئی تعلق نہ تھا، اُسی طرح بنی اسمٰعیل کے اِن مشرکین سے بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... یہ بات جملے کے عام سیاق سے الگ کر کے اِس لیے فرمائی کہ یہ مشرکین بنی اسمٰعیل کی تردید میں ہے جو اِس سورہ میں براہ راست مخاطب نہیں ہیں۔ اِس سورہ کا خطاب، جیسا کہ اوپر وضاحت ہو چکی ہے، اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ سے ہے، مشرکین کی تردید میں اگر اِس میں کوئی بات آئی ہے تو وہ ضمناً ہی آئی ہے۔ یہ بات بھی ضمنی باتوں ہی میں سے ہے، اور اِس کے ذکر کی ضرورت، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، اِس لیے تھی کہ جس طرح یہود اور نصاریٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کو اپنی گم راہیوں کی تائید میں پیش کرتے تھے، اُسی طرح، بلکہ اِس سے بھی کچھ زیادہ زور و شور کے ساتھ قریش کے مشرکین اُن کے نام کو اپنی حمایت میں پیش کرتے تھے، بلکہ اُن کا تو یہ دعویٰ تھا کہ جس دین پر وہ ہیں، یہ دین اُن کو حضرت ابراہیم ہی سے وراثت میں ملا ہے۔“ (تدبر قرآن ۲/۱۱۵)

[۸۷۹] یعنی ساتھی ہے تو یقیناً اِن کی مدد بھی کرے گا اور اِن کے مخالفوں پر اِنھیں غلبہ بھی عطا فرمائے گا۔

اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٦٩﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿٧٠﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ
تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٧١﴾
وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ
عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۚ ﴿٧٢﴾
وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ۗ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ

راستے سے ہٹا دیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اِس طرح وہ اپنے آپ ہی کو گم راہی میں ڈال رہے ہیں، مگر نہیں سمجھتے۔ اے اہل کتاب، تم اللہ کی آیتوں کے منکر کیوں ہوتے ہو، دراں حالیکہ تم اُن کے گواہ ہو؟[۸۸۰] اے اہل کتاب،[۸۸۱] تم حق کو باطل سے کیوں ملاتے ہو اور کیوں حق کو چھپاتے ہو، دراں حالیکہ تم جانتے ہو؟[۸۸۲] ۶۹-۷۱

اور اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ مسلمانوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے، اُس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو اُس کا انکار کر دیا کرو تا کہ وہ بھی برگشتہ ہوں،[۸۸۳] اور اپنے مذہب والوں

---

[۸۸۰] یعنی اُن میں جو حقائق بیان ہوتے ہیں، اُنھیں تم پہلے سے جانتے ہو اور دنیا کے آگے اُن کی شہادت دینے کا اقرار کر چکے ہو۔

[۸۸۱] یہ تکرار اظہار حسرت و ملامت کے لیے ہے کہ افسوس، تم اہل کتاب ہو کر لوگوں کو اِس طرح گم راہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔

[۸۸۲] یہ اشارہ ہے اُن تحریفات کی طرف جو اِن لوگوں نے بیت الحرام سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے تعلق کی روایات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اپنے نبیوں کی پیشین گوئیوں میں کی تھیں۔ آیت میں 'وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ' کے الفاظ سے واضح ہے کہ نزول قرآن

اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ قُلْ

کے سوا کسی کی بات نہ مانا کرو ـــــ اِن سے کہہ دو، (اے پیغمبر) کہ ہدایت تو اصل میں اللہ کی ہدایت ہے[۸۸۴] ـــــ اِس لیے کسی کی بات نہ مانا کرو کہ مبادا اِس طرح کی چیز کسی

کے زمانے میں یہود کے علما اِن تحریفات سے پوری طرح واقف تھے۔

۸۸۳۔ یہ اُنھی چالوں میں سے ایک چال ہے جو یہود نے اپنے اِس منصوبے کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مقابلے میں چلیں کہ آپ کے ساتھی بن کر آپ کو اور آپ کی دعوت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ استاذ امام اِس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

> ”...اِن میں سے ایک چال یہ بھی تھی کہ اِن کے لیڈروں نے اپنے کچھ آدمیوں کو اِس بات کے لیے تیار کیا کہ وہ پہلے اپنے ایمان و اسلام کا اظہار و اعلان کر کے مسلمانوں کے اندر شامل ہوں، پھر اسلام کی کچھ خرابیوں کا اظہار کر کے اُس سے علیحدگی اختیار کر لیا کریں۔ اِس کا فائدہ اُنھوں نے ایک تو یہ سوچا ہو گا کہ اِس طرح بہت سے جدید العہد مسلمانوں کا اعتماد اسلام پر سے متزلزل ہو جائے گا، وہ یہ سوچنے لگیں گے کہ فی الواقع اسلام میں کوئی خرابی ہے جس کے سبب سے یہ پڑھے لکھے لوگ اسلام کے قریب آ کر اُس سے بدک جاتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ اِس تدبیر سے وہ خود اپنی قوم کے عوام کو اسلام کے اثر سے بچا لے جائیں گے، جب وہ یہ دیکھیں گے کہ اُن کی اپنی قوم کے کچھ پڑھے لکھے لوگ اسلام کو آزما کر چھوڑ چکے ہیں تو اُن کی وہ رغبت کم زور ہو جائے گی جو اسلام اور مسلمانوں کی کشش کے سبب سے اُن کے اندر اسلام میں داخل ہونے کے لیے پیدا ہوتی تھی۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۱۱۹)

۸۸۴۔ یہ ٹکڑا سلسلۂ کلام کا جز نہیں ہے، بلکہ جملۂ معترضہ ہے جس سے ایک غلط بات کی برسر موقع تردید فرما دی گئی ہے۔ اصل سلسلۂ کلام اِس طرح ہے: ’وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ‘ اور ’اَنْ‘ سے پہلے ’مخافة‘ یا اِس کے ہم معنی کوئی لفظ عربیت کے اسلوب پر حذف ہو گیا ہے۔ یہود جن لوگوں کو اپنے منصوبے کے مطابق ایمان لانے کے لیے بھیجتے تھے،

اِنَّ الۡفَضۡلَ بِیَدِ اللّٰہِ ۚ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ (۷۳) ۚۙ
یَّخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ (۷۴)

اور کو بھی مل جائے جو تمھیں ملی ہے[۸۸۵] یا تم سے وہ تمھارے پروردگار کے حضور میں حجت کر سکیں۔[۸۸۶] اِن سے کہہ دو کہ فضل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، جسے چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے اور اللہ بڑی وسعت اور بڑے علم والا ہے۔[۸۸۷] وہ جس کو چاہتا ہے، اپنی رحمت کے لیے

اُنھیں بڑی شد و مد کے ساتھ یہ تاکید بھی کر دیتے تھے کہ بنی اسرائیل سے باہر وہ کسی پیغمبر کی تصدیق نہ کریں۔ اُن کی تمام ضلالت چونکہ اِسی ایک بات پر مبنی تھی، اِس لیے قرآن نے برسر موقع اُنھیں ٹوک دیا ہے کہ تعصب کا یہ کیسا جنون ہے جس میں یہ لوگ مبتلا ہیں۔ اِن سے کہہ دو کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے، خواہ وہ کسی اسرائیلی پیغمبر سے ملے یا اسماعیلی سے۔ ہر شخص کو اِسی کا طالب ہونا چاہیے۔ نجات اگر حاصل ہو گی تو اِسی سے ہو گی۔ اِس کا ذریعہ یہودیت یا نصرانیت نہیں ہے۔

[۸۸۵] یعنی ایسا نہ ہو کہ مذہبی قیادت کا جو منصب اِس وقت تمھیں حاصل ہے، وہ کسی دوسرے کو بھی حاصل ہو جائے۔ اِس سے اشارہ بنی اسمٰعیل کی طرف ہے جن کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تھی۔ قرآن نے اِسے مبہم اِس لیے رکھا ہے کہ یہود یہ بات زبان سے نہیں کہتے تھے۔

[۸۸۶] یہ اُن کے اِس احمقانہ اندیشے کی طرف اشارہ ہے کہ اگر آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں کوئی بات اُن کے کسی آدمی کی زبان سے نکل گئی تو مسلمان اِسے قیامت کے دن اُن کے خلاف حجت بنائیں گے۔

[۸۸۷] یعنی اللہ تعالیٰ کے فیصلے تمھارے فیصلوں کی طرح تعصّبات پر مبنی نہیں ہوتے کہ اُن میں کسی اور کے لیے گنجایش ہی نہ رہے۔ وہ بڑی وسعت اور بڑے علم والا ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ کون کس چیز کا مستحق ہے اور کون مستحق نہیں ہے۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ
وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ
قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ

خاص کر لیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔[۸۸۸] ۷۳-۷۴

(تم اِن سے توقع رکھتے ہو کہ تمھارے پیغمبر کے معاملے میں یہ انصاف کی بات کہیں گے؟[۸۸۹]) اور اِدھر صورت حال یہ ہے کہ اہل کتاب میں وہ لوگ بھی ہیں کہ اگر تم مال و دولت کا ڈھیر اُن کے پاس امانت رکھ دو تو وہ تمھیں ادا کر دیں گے اور اِن میں وہ بھی ہیں کہ اگر تم ایک دینار بھی اُن کی امانت میں دے دو تو جب تک اُن کے سر پر سوار نہ ہو جاؤ، وہ اُس کو تمھیں ادا نہ کریں گے۔[۸۹۰] یہ اِس وجہ سے کہ اُنھوں نے کہہ رکھا ہے کہ

---

[۸۸۸] اِس جملے میں جن دو باتوں کی طرف اشارہ ہے، اُن کی وضاحت استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس طرح فرمائی ہے:

> ”...ایک تو اِس بات کی طرف کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ایک عظیم اور بے پایاں برکت و رحمت ہے۔ دوسری اِس بات کی طرف کہ یہ بنی اسمٰعیل پر اللہ تعالیٰ کا عظیم انعام ہے کہ اُس نے اُن کے خاندان کو اِس عظیم اور عالم گیر برکت کے ظہور کے لیے منتخب فرمایا۔ اِس سے لازمی نتیجہ کے طور پر دو باتیں نکلتی ہیں: ایک یہ کہ بنی اسمٰعیل پر یہ حق ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اِس عظیم انعام کی قدر کریں اور اُس کے شکر گزار ہوں۔ دوسری یہ کہ بنی اسرائیل کے غصہ اور حسد کے علی الرغم اللہ تعالیٰ نے اپنی اِس عظیم برکت سے امیوں کو نوازا۔ وہ جس کو چاہے اپنی رحمت کے لیے خاص کرے، اُس کی مشیت میں خود اُس کی حکمت کے سوا اور کسی کو بھی دخل نہیں ہے۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۱۲۲)

[۸۸۹] یعنی وہ پیشین گوئیاں پوری دیانت داری کے ساتھ بیان کر دیں گے جو نبی صلی اللہ علیہ

وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۶﴾

اِن امیوں کے معاملے میں ہم پر کوئی الزام نہیں ہے۔[۸۹۱] اور حقیقت یہ ہے کہ وہ جانتے بوجھتے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ ہاں، کیوں نہیں؟[۸۹۲] (اللہ کا طریقہ تو یہ ہے کہ) جو اُس کے عہد کو پورا کرے اور پرہیز گار رہے، وہ اُسے محبوب ہے، اِس لیے کہ اللہ پرہیز گاروں سے محبت کرتا ہے۔[۸۹۳] ۷۵-۷۶

وسلم کی بعثت کے متعلق اُن کے پیغمبروں نے کی تھیں اور جن کے وہ امین بنائے گئے تھے۔

۸۹۰ یہ قرآن نے دین و شریعت کے معاملے میں اُن کی خیانت کا سبب بیان کیا ہے کہ جو لوگ دنیا کی اِس متاعِ حقیر کو ادا کرنے میں لیت و لعل کرتے ہیں، وہ اتنی بڑی امانت کس طرح ادا کریں گے اور دنیا کے سامنے نبی امی کی صداقت کی گواہی کس طرح دیں گے؟ تاہم یہ بات بھی قرآن نے اِس کے ساتھ واضح کر دی ہے کہ اُن میں سے جو لوگ امانت دار ہیں، وہ اِس معاملے میں پیچھے نہیں رہیں گے اور جلد یا بدیر آپ کی تصدیق کر کے اسلام کی نعمت سے بہرہ ور ہو جائیں گے۔

۸۹۱ یہود کا نظریہ تھا کہ تورات میں دوسروں کا مال باطل طریقوں سے کھانے کی جو ممانعت بیان ہوئی ہے، اُس کا تعلق غیر قوموں سے نہیں ہے۔ بنی اسمٰعیل کو وہ امی کہتے اور اِنھی قوموں میں شامل سمجھتے تھے۔ چنانچہ اُن کے بارے میں بھی اُن کے مولویوں کا فتویٰ یہی تھا کہ اُن کا مال ہڑپ کر جانا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں اِس کی اجازت دے رکھی ہے۔

۸۹۲ یعنی کیوں الزام نہیں ہے؟ اللہ کا قانون سب کے لیے یکساں ہے۔ بدعہدی اور خیانت جس کے ساتھ بھی کی جائے، ہر حال میں ممنوع ہے۔ اللہ نے اِس کی اجازت کبھی کسی شخص یا قوم کو نہیں دی ہے۔

۸۹۳ اِس جملے میں جوابِ شرط حذف ہے جسے ہم نے کھول دیا ہے۔ یہود کی جو باتیں اوپر

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَشۡتَرُوۡنَ بِعَهۡدِ اللّٰهِ وَ اَیۡمَانِهِمۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا اُولٰٓئِكَ
لَا خَلَاقَ لَهُمۡ فِی الۡاٰخِرَةِ وَ لَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَ لَا یَنۡظُرُ اِلَیۡهِمۡ یَوۡمَ
الۡقِیٰمَةِ وَ لَا یُزَكِّیۡهِمۡ ۪ وَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۷۷﴾

اِس کے برخلاف جو لوگ اللہ کے عہد[۸۹۴] اور اپنی قسموں[۸۹۵] کو تھوڑی قیمت پر بیچ دیتے ہیں، اُن کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے، اور اللہ قیامت کے دن نہ اُن سے بات کرے گا، نہ اُن کی طرف نگاہ التفات سے دیکھے گا اور نہ اُنھیں (گناہوں سے) پاک کرے گا،[۸۹۶] بلکہ وہاں اُن کے لیے ایک دردناک سزا ہے۔[۸۹۷] ۷۷

نقل ہوئی ہیں، یہ اُن پر استدراک ہے۔ استاذ امام اِس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

> ”... مطلب یہ ہے کہ یہود کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اُن کے لیے خدا کے ہاں کوئی خاص مرتبہ و مقام ہے جس کے سبب سے وہ دوسروں سے بالاتر اور امیوں کے معاملے میں ذمہ داریوں سے بری ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اللہ کے ہاں جو مرتبہ و مقام بھی ہے، وہ اُن لوگوں کے لیے ہے جو خدا سے باندھے ہوئے عہد کو پورا کریں اور ہر طرح کے حالات میں اِس عہد کے تحت قائم کردہ حدود کی نگہداشت کریں۔ جن لوگوں کی روش یہ ہوگی، وہ اللہ کے نزدیک متقی ہیں اور اللہ ایسے ہی متقی بندوں کو دوست رکھتا ہے۔ جو لوگ خدا کے عہد اور اُس کے حدود کو توڑنے میں بے باک ہیں اور اِس کے باوجود تقویٰ اور محبوب الٰہی ہونے کے مدعی ہیں، وہ محض خیالی پلاؤ پکا رہے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۱۲۴)

[۸۹۴] اِس سے مراد وہ عہد ہے جو اللہ کی شریعت اور آخری بعثت سے متعلق یہود سے لیا گیا تھا۔

[۸۹۵] یعنی وہ قسمیں جو اُنھوں نے اللہ کے نبیوں، بالخصوص نبی امی پر ایمان اور اُن کی تائید و نصرت کا عہد کرتے وقت کھائی تھیں۔ آیت ۸۱ میں اُن کے اِس عہد اور اِن قسموں کا ذکر آئے گا۔

[۸۹۶] مطلب یہ ہے کہ اُن کے جرائم ایسے نہیں ہیں کہ تھوڑی بہت سزا دے کر اللہ اُنھیں پاک کر دے، بلکہ ایسے سخت ہیں کہ اُن کی سزا ہمیشہ کی دوزخ ہی ہو سکتی ہے۔

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿٧٨﴾

اور اِن میں وہ لوگ بھی ہیں کہ اللہ کی کتاب کو پڑھتے ہوئے اپنی زبان کو اِس طرح توڑتے مروڑتے ہیں کہ تم سمجھو کہ (جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں)، وہ کتاب ہی کی عبارت ہے، دراں حالیکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، دراں حالیکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتا، اور اِس طرح جانتے بوجھتے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔[۸۹۸] ۷۸

۸۹۷؎ آیت کے الفاظ میں یہود کے لیے کتنی نفرت اور کیسی شدید بے زاری چھپی ہوئی ہے، اِس کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جو الفاظ کے تیور کچھ پہچانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو حیثیت اُنھیں دی اور اُس کے لحاظ سے جو معاملہ اُن کے ساتھ کیا، اِس کے بعد وہ اِسی کے سزاوار تھے۔ سورۂ بقرہ میں اِس کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔ اِنھیں دیکھنے کے بعد کسی شخص کو اِس پر تعجب نہیں ہو سکتا۔

۸۹۸؎ یہ اُن تدبیروں میں سے ایک تدبیر کا ذکر ہے جو اہل کتاب نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے عہد کی ذمہ داریوں سے بچنے کے لیے اختیار کر رکھی تھیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِس جرم کا ارتکاب یہود اور نصاریٰ، دونوں ہی نے کیا ہے۔ اِس کی مثال میں ہم نے لفظ ”مروہ“ کا ذکر کیا ہے۔ یہ لفظ تورات میں حضرت ابراہیم کی سرگذشت کے سلسلے میں آیا ہے کہ اِس مقام پر اُن کو بیٹے کی قربانی کا حکم ہوا۔ یہود نے اِس قربانی کے واقعے میں جہاں کمی اور بیشی کی نوعیت کی بہت سی تبدیلیاں کی ہیں، وہیں لفظ مروہ کی قراءت کو بگاڑ کر مریا، موریا، موریاہ، مورہ اور نہ جانے کیا کیا بنایا تاکہ مکہ کی مشہور پہاڑی مروہ کے بجائے اُس سے بیت المقدس کے کسی مقام کو مراد لے سکیں اور اِس طرح حضرت ابراہیم اور اُن کی ہجرت و قربانی کے واقعہ کا

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ
يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ
بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَا
يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ
بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾

(پھر یہی نہیں، وہ اللہ کے پیغمبر پر بھی جھوٹ باندھتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ) کسی انسان کی یہ شان نہیں ہے کہ اللہ اُس کو اپنی کتاب دے اور اُس کے مطابق فیصلہ کرنے کی صلاحیت اور نبوت عطا فرمائے، پھر وہ لوگوں سے یہ کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ نہیں، بلکہ (وہ تو یہی کہے گا کہ لوگو)، اللہ والے بنو،[۸۹۹] اِس لیے کہ تم اللہ کی کتاب پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔ اور نہ وہ تم سے یہ کہے گا کہ فرشتوں اور نبیوں کو اپنا رب بنالو۔ تمھارے مسلمان ہو چکنے کے بعد کیا وہ تمھیں کفر اختیار کر لینے کی ترغیب دے گا؟[۹۰۰] ۷۹-۸۰

تعلق بیت اللہ سے بالکل کاٹ دیں۔ مقصد اِس ساری کاوش سے اُن کا یہ تھا کہ اِس ایرپھیر سے اُن پیشین گوئیوں اور اشارات کا رخ موڑا جا سکے جو بنی اسماعیل اور اُن کے اندر نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق تورات کے صحیفوں میں وارد تھیں۔" (تدبر قرآن ۲/ ۱۲۸)

[۸۹۹] اصل میں لفظ 'رَبّٰنِيّٖنَ' آیا ہے۔ یہ 'ربانی' کی جمع ہے جس کے معنی خدا پرست اور اللہ والے کے ہیں۔ عربی زبان میں یہ لفظ عبرانی سے آیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

[۹۰۰] یہ اب عقل سلیم کو مخاطب کر کے قرآن نے اپنے تمام مخاطبین یہود و نصاریٰ، بلکہ قریش مکہ کو بھی توجہ دلائی ہے کہ جن توہمات کو وہ اپنے عقائد بنائے ہوئے ہیں، اُن کی نسبت اُن

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ
وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ
وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ
قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾
فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

اور اِنھیں یاد دلاؤ، جب اللہ نے نبیوں کے بارے میں (اِن سے) عہد لیا کہ میں نے جو شریعت اور حکمت تمھیں عطا فرمائی ہے، پھر تمھارے پاس کوئی رسول[۹۰۱] اُس کی تصدیق کرتے ہوئے آئے جو تمھارے پاس موجود ہے تو تم اُس پر ضرور ایمان لاؤ گے اور ضرور اُس کی مدد کرو گے۔ اِس کے بعد پوچھا: کیا تم نے اقرار کیا اور اِس پر میرے عہد کی ذمہ داری اٹھالی ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا کہ پھر گواہ رہو اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں۔ (فرمایا کہ) پھر جو اِس کے

کے جلیل القدر پیغمبروں سے ہرگز درست نہیں ہے۔ اللہ کا کوئی پیغمبر بھی ایمان و اسلام کی دعوت دینے کے بعد اپنے پیروؤں کو کفر و شرک میں جھونک دینے کی کوشش نہیں کر سکتا۔ اِس طرح کی کوئی چیز جہاں نظر آئے، سمجھ لینا چاہیے کہ یہ گم راہ کن لوگوں کی تحریفات کا نتیجہ ہے۔ اِسے کسی پیغمبر کی دعوت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۹۰۱۔ اِس میں لفظ اگرچہ عام ہے، لیکن صاف واضح ہے کہ اشارہ خاص طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے جن کی بعثت سے اُس دین کی تصدیق ہوئی جو اِس سے پہلے یہود و نصاریٰ کو دیا گیا تھا، لیکن استاذ امام کے الفاظ میں یہ اُن کی شامت تھی کہ جس نے اُن کی تصدیق کی، اُس کو اُنھوں نے جھٹلایا اور جس کی حجت اور شہادت کا بار گراں وہ اتنی مدت تک اٹھائے رہے، جب وہ

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ

بعد اِس عہد سے پھریں گے تو وہی نافرمان ہیں۔[۹۰۲] ۸۱-۸۲

(یہ پیغمبر اِسی طرح آئے ہیں) تو کیا یہ لوگ اب اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کی تلاش میں ہیں، دراں حالیکہ زمین اور آسمانوں میں طوعاً و کرہاً، سب اُسی کے فرماں بردار ہیں اور اُسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔[۹۰۳] اِن سے کہہ دو کہ ہم نے اللہ کو

آیا تو اُنھوں نے اُس کی تکذیب کر دی۔

۹۰۲۔ اِس جملے کا ایک خاص موقع ہے جو نگاہ میں رہے تو اِس کا پورا زور سمجھا جا سکتا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر میں اِس کی وضاحت اِس طرح فرمائی ہے:

> ”...موسوی شریعت میں یہ قاعدہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِس طرح کی ہدایات اترتیں تو حضرت موسیٰ اُن کو انفرادی طور پر اپنے صحابہ کو صرف سنا دینے ہی پر اکتفا نہ فرماتے، بلکہ بنی اسرائیل کی پوری جماعت یا کم از کم اُن کے تمام سرداروں کو خیمۂ عبادت میں جمع کرتے، تابوت سامنے ہوتا، حضرت موسیٰ وعظ و تذکیر کے بعد خداوند خدا کا حکم سناتے، پھر سب سے اُس کی اطاعت کا اقرار لیتے۔ سب کے اقرار کے بعد لوگوں کو اُس کا گواہ رہنے کی تاکید کرتے، اور خدا کو اُس پر گواہ ٹھہراتے۔ آخر میں اُس حکم کی نافرمانی کے دنیوی و اخروی عواقب و نتائج سے بھی آگاہ فرما دیتے۔ اِس طرح گویا اللہ تعالیٰ کا ہر امر و نہی اللہ تعالیٰ اور بنی اسرائیل کے درمیان ایک عہد و میثاق کا درجہ حاصل کر لیتا۔ اب یہ کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ جس شریعت کے تحفظ کے لیے یہ جتن کیے گئے، اُس کے حاملوں نے اُس کے ایک ایک عہد کے پرزے اڑا کے رکھ دیے۔ اِس روشنی میں 'فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ' کے الفاظ پر غور کیجیے تو 'بَعْدَ ذٰلِكَ' کا حقیقی وزن محسوس ہو گا کہ اِس کے بعد بھی جو لوگ اپنے عہد سے منہ موڑیں تو اُن سے بڑھ کر عہد شکن کون ہو گا؟“
>
> (تدبر قرآن ۲/ ۱۳۵)

اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلٰٓى اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ
وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَمَاۤ اُوۡتِىَ مُوۡسٰى وَعِيۡسٰى وَالنَّبِيُّوۡنَ
مِنۡ رَّبِّهِمۡ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ وَنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۸۴﴾
وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ ۚ وَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ
مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۸۵﴾ كَيۡفَ يَهۡدِى اللّٰهُ قَوۡمًا كَفَرُوۡا بَعۡدَ اِيۡمَانِهِمۡ

مانا ہے اور اُس چیز کو مانا ہے جو ہم پر نازل کی گئی اور جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق اور یعقوب اور اُن کی اولاد پر نازل کی گئی، اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے سب نبیوں کو اُن کے پروردگار کی طرف سے دی گئی۔ ہم اِن میں سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔[۹۰۴] (یہ سب اللہ کے پیغمبر ہیں) اور ہم اُسی کے فرماں بردار ہیں۔[۹۰۵] (یہی اسلام ہے)، اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرنا چاہے گا تو اُس سے وہ ہرگز قبول نہ کیا

---

۹۰۳ یہ باانداز استعجاب سوال کیا ہے کہ زمین و آسمان کی تمام مخلوقات اپنے دائرۂ تکوینی میں اللہ کے دین ہی کی پیروی کر رہی ہیں۔ اِس سے نہ دنیا میں کسی کے لیے راہ فرار ہے، نہ مرنے کے بعد۔ یہ اہل کتاب اِس بات سے واقف ہیں۔ پھر اِس دین فطرت اور دین کائنات کو چھوڑ کر یہ کہاں بھاگنا چاہتے ہیں؟

۹۰۴ یعنی ہم اِن کی طرح یہ نہیں کرتے کہ کسی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں۔ اللہ تعالیٰ کی کسی ہدایت کو بھی ہم نہ جھٹلاتے ہیں اور نہ اُس کی تردید کرتے ہیں، بلکہ بغیر کسی استثنا کے سب پر ایمان رکھتے ہیں۔

۹۰۵ مطلب یہ ہے کہ ہم اُس دین پر ایمان لے آئے ہیں جو پوری کائنات اور تمام انبیا علیہم السلام کا دین ہے۔ یہ اہل کتاب اگر اُسے چھوڑ کر اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کر دینا چاہتے ہیں تو کریں۔ ہم تو اپنے آپ کو اللہ ہی کے حوالے کرتے ہیں۔

وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ
وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ
عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ
ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۟ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ

جائے گا اور قیامت میں وہ نامرادوں میں سے ہوگا۔ (تم اِن کی ہدایت چاہتے ہو)؟ اللہ اُن لوگوں کو ہدایت کس طرح دے گا جو ماننے کے بعد منکر ہو گئے، دراں حالیکہ وہ اِس بات کے گواہ ہیں کہ یہ رسول سچے ہیں[۹۰۶] اور (اِن کی سچائی پر گواہی کے لیے) اُن کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں بھی آ چکی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ اِس طرح کے ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ یہی ہیں کہ جن کی سزا یہ ہے کہ اِن پر اللہ اور اُس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے[۹۰۷]۔ یہ اُسی میں ہمیشہ رہیں گے[۹۰۸]، نہ اِن سے عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا اور نہ اِنھیں مہلت دی جائے گی۔ (اِن میں سے)، البتہ جو اِس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لیں،

---

[۹۰۶] یعنی اِن کے دل گواہی دیتے ہیں کہ یہ اللہ کے برحق رسول ہیں، لیکن زبانیں اِس کے باوجود جھٹلا رہی ہیں۔

[۹۰۷] 'النَّاس' کے ساتھ اصل میں 'اَجْمَعِيْنَ' کا لفظ آیا ہے۔ یہ اِس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ قیامت کے دن نیک و بد، سب ہی اِن پر لعنت کریں گے۔ نیکوں کی لعنت تو واضح ہے۔ رہے بد تو وہ اِس وجہ سے لعنت کریں گے کہ اِنھی کے سبب سے گم راہ ہوئے۔

[۹۰۸] اصل میں 'خٰلِدِيْنَ فِيْهَا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں اشارہ دوزخ کی طرف ہے۔ اگرچہ اُس کا ذکر الفاظ میں نہیں ہے، لیکن اِس سے پہلے جس لعنت کا ذکر ہے، وہی اُس کے لیے

كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ
وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴿٩٠﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ
فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ
اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٩١﴾
لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا

وہ اِس سے محفوظ رہیں گے، اِس لیے کہ اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔

اِس کے برخلاف جو ماننے کے بعد منکر ہو گئے، پھر اپنے اِس انکار میں بڑھتے چلے گئے، (یہاں تک کہ آخری وقت آ گیا)، اُن کی توبہ ہرگز قبول نہ ہوگی اور وہی درحقیقت راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ اِسی طرح جو منکر ہوئے اور اِسی انکار کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو گئے، اُن میں سے کوئی اگر (اپنے آپ کو سزا سے بچانے کے لیے) زمین بھر کر سونا بھی فدیے میں دے تو اُس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔[۹۰۹] یہی ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے اور وہاں وہ اپنا کوئی مددگار نہ پائیں گے۔[۹۱۰] ۸۳-۹۱

(اِن کا یہ رویہ محض اِس وجہ سے ہے کہ دین داری کی بعض رسمیں پوری کر دینے کے

قرینہ بن گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں گویا لعنت خود عذاب کی قائم مقام ہو گئی ہے۔

[۹۰۹] یہ اسلوب بیان محض اِس بات کی تعبیر کے لیے اختیار کیا ہے کہ اِن کی نجات کسی طرح ممکن نہ ہوگی، ورنہ آخرت میں نہ کسی کے پاس دینے کے لیے کچھ ہوگا اور نہ آخرت اِس قسم کے لین دین کی کوئی جگہ ہے۔

[۹۱۰] مطلب یہ ہے کہ اِن کے اسلاف اور بزرگوں کی شفاعت بھی، جس کی یہ توقع رکھتے ہیں، اِن کے کام نہ آ سکے گی۔ قیامت میں کوئی کسی کا مددگار نہ ہوگا۔

مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ﴿۹۲﴾
كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِیْلُ
عَلٰی نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ
فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ

باعث یہ اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں۔ اِن سے کہہ دو)، تم نیکی کی حقیقت[۹۱۱] کو ہرگز نہیں پا سکتے، جب تک اُن چیزوں میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو جو تمھیں محبوب ہیں، (اِس پر غور کرو) اور (یاد رکھو کہ) جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے، اُس کا صلہ تمھیں لازماً ملے گا، اِس لیے کہ اللہ اُسے جانتا ہے[۹۱۲]۔ ۹۲

(اِنھیں اعتراض ہے کہ یہ پیغمبر تورات کی تصدیق کرتے ہیں تو اُس میں جو چیزیں حرام ہیں، اُن میں سے بعض کو حلال کیوں سمجھتے ہیں؟ کہہ دو کہ) کھانے کی یہ سب چیزیں بنی اسرائیل کے لیے بھی (اِسی طرح) حلال تھیں، سوائے اُن کے جو اسرائیل نے تورات کے نازل ہونے سے پہلے خود اپنے لیے ممنوع ٹھیرالی تھیں[۹۱۳]۔ کہہ دو کہ نہیں

---

۹۱۱ نیکی کی حقیقت ایفاے عہد اور اداے حقوق و فرائض ہے۔ چنانچہ اصل میں لفظ 'اَلْبِرّ' استعمال ہوا ہے جس کی روح یہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نیکی کی حقیقت پانا چاہتے ہو تو اِن چیزوں کا اہتمام کرو۔ یہ محض دین داری کی چند رسمیں پوری کر دینے اور چند ظواہر کو اختیار کر لینے سے نہیں ملتی۔

۹۱۲ اِس سے مقصود اِس کا لازم ہے۔ یعنی جب اللہ جانتا ہے تو مطمئن رہو کہ اُس کا اجر بھی وہ دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک دے گا۔ تمھارے انفاق کا ایک حبہ بھی اُس کے حضور میں ضائع نہ ہو گا۔

۹۱۳ اشارہ ہے اُن چیزوں کی طرف جو سیدنا یعقوب علیہ السلام محض طبعی اور ذوقی عدم مناسبت یا

مِنۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۹۴﴾ قُلۡ صَدَقَ
اللّٰهُ قف فَاتَّبِعُوۡا مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴿۹۵﴾
اِنَّ اَوَّلَ بَيۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىۡ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى

مانتے تو لاؤ تورات اور اُس کو پڑھو، اگر تم سچے ہو۔[۹۱۴] پھر اِس کے بعد بھی جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھیں، وہی ظالم ہیں۔ کہہ دو کہ اللہ نے سچ فرمایا ہے، اِس لیے (اپنے اِن تعصّبات کو چھوڑ کر) ابراہیم کے طریقے کی پیروی کرو، جو (اسلام کے راستے پر) بالکل یک سو تھا اور مشرکوں میں سے نہیں تھا۔ ۹۳-۹۵

(اِسی طرح قبلے کے بارے میں بھی اِنھیں اعتراض ہے۔ اِن سے کہہ دو کہ) اللہ کا پہلا گھر جو لوگوں کے لیے تعمیر کیا گیا، وہ یقیناً وہی ہے جو مکہ[۹۱۵] میں ہے، تمام جہان والوں

کسی احتیاط کے باعث نہیں کھاتے تھے اور یہود نے اُنھیں اللہ کی حرام کردہ چیزیں قرار دے کر تورات کی محرمات کی فہرست میں شامل کر دیا تھا۔

[۹۱۴] یعنی تورات میں دیکھ لو، تم اُس کا مطالعہ تدبر کے ساتھ کرو گے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو جائے گی کہ تم جن چیزوں کو حرام سمجھتے ہو، وہ تورات کے نازل ہونے سے پہلے ہرگز حرام نہیں تھیں۔ یہ سب اُس کے نزول کے بعد حرام ٹھیرائی گئی ہیں اور خور و نوش کی حرمتیں ایسی چیز نہیں ہیں کہ وہ آج حلال ہوں اور کل حرام کر دی جائیں، اِلّا یہ کہ کسی قوم کو اُس کی سرکشی کی سزا دینا مقصود ہو۔

[۹۱۵] اِس کے لیے اصل میں لفظ 'بَكَّة' آیا ہے۔ اِس کے لغوی معنی شہر کے ہیں جیسا کہ لفظ 'بعلبك' سے اِس کی شہادت ملتی ہے۔ یہاں یہ لفظ جس وجہ سے آیا ہے، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت اِس طرح فرمائی ہے:

> "...یہود نے آخری بعثت کے نشانات گم کرنے کے لیے قراءت کے توڑ مروڑ یا بالفاظ قرآن 'لَيِّ لِسَان' کے ذریعے سے جو تحریفیں کی ہیں، اُن کی ایک مثال یہ لفظ بھی ہے۔ اِس کو یہود نے

لِّلْعٰلَمِيْنَ ۚ ﴿۹۶﴾ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ۬ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ
اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ
سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾

کے لیے برکت اور ہدایت کے مرکز کی حیثیت سے۔ اِس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں:[۹۱۶] ابراہیم کا مسکن ہے، جو اِس میں داخل ہو جائے، وہ مامون ہے اور جو لوگ وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں، اُن پر اللہ کے لیے اِس گھر کا حج ہے۔ (یہ اِس کی نشانیاں ہیں)، اور جو اِس کے بعد بھی انکار کریں، اللہ کو اُن کی کچھ پروا نہیں، اِس لیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔ ۹۶-۹۷

> بگاڑ کر 'بکہ' کے بجائے بکاء بنایا اور اِس کو مصدر قرار دے کر ترجمہ اِس کا رونا کر دیا اور اِس طرح 'وادی بکہ' کو رونے کی وادی میں تبدیل کر کے اُس سب سے بڑے نشان کو گم کر دیا، جس سے خلق کو آخری نبی کے بارے میں رہنمائی مل سکتی تھی۔ اِس آیت میں قرآن نے مکہ کو بکہ کے نام سے ذکر کر کے مکہ کے اُس قدیم نام کی یاددہانی کی ہے جو تورات کے صحیفوں میں تھا، بلکہ بعض صحیفوں میں اب بھی ہے، مثلاً زبور میں۔'' (تدبر قرآن ۲/۱۴۵)

۹۱۶ یعنی اِس بات کی کھلی ہوئی نشانیاں ہیں کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا گھر یہی ہے، اِس لیے قبلہ بھی اِسی کو ہونا چاہیے۔ اِس کے بعد اِن نشانیوں میں سے تین چیزوں کی طرف خاص اشارہ فرمایا ہے: ایک یہ کہ یہ مقام ابراہیم ہے، دوسری یہ کہ جو اِس حرم میں داخل ہو جائے، مامون ہو جاتا ہے، تیسری یہ کہ اِس کا حج ہمیشہ سے ایک دینی فریضہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ یہ تینوں چیزیں عرب میں سیدنا ابراہیم کی قائم کردہ روایت کی حیثیت سے لوگوں کے اجماع اور تواتر سے ثابت تھیں اور کوئی صاحب انصاف اِن کا انکار نہیں کر سکتا تھا۔ تورات میں بھی اِن کے لیے ناقابل تردید شواہد موجود تھے اور اُس کے پڑھنے والے اِس حقیقت کی تردید نہیں کر سکتے تھے کہ سیدنا ابراہیم کے ہاتھوں جس بیت ایل کی تعمیر کا ذکر اُس میں

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ
عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ وَمَا اللّٰهُ
بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ

اِن سے پوچھو، اے اہل کتاب، تم اللہ کی اِن آیتوں کا انکار کیوں کرتے ہو، دراں حالیکہ جو کچھ تم کر رہے ہو، وہ اللہ کے سامنے ہے؟ اِن سے پوچھو، اے اہل کتاب، تم اُن لوگوں کو اللہ کے راستے سے کیوں روکتے ہو جو ایمان لائے ہیں؟ تم اِس میں عیب ڈھونڈتے ہو، دراں حالیکہ تم اِس کے گواہ بنائے گئے ہو؟ (اِس پر غور کرو) اور (یاد رکھو کہ) جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ اُس سے بے خبر نہیں ہے۔ ۹۸-۹۹

ایمان والو[۹۱۷]، تم اِن اہل کتاب کے ایک گروہ[۹۱۸] کی بات مان لوگے تو تمھارے ایمان

ہوا ہے، اُس کا مصداق اگر کوئی ہوسکتا ہے تو بیت المقدس نہیں، بلکہ یہی مکہ کا بیت الحرام ہوسکتا ہے۔

[۹۱۷] سورہ کی پہلی فصل آیت ۹۹ پر ختم ہوئی۔ یہاں سے دوسری فصل شروع ہو رہی ہے۔ پہلی فصل میں خطاب اہل کتاب سے تھا۔ اُن پر اتمام حجت کے بعد اِس آیت سے خطاب کا رخ مسلمانوں کی طرف ہو گیا ہے۔ چنانچہ اِس دوسری فصل میں اب پہلے مسلمانوں کو اہل کتاب کی اُن گم راہ کن چالوں سے خبردار کیا گیا ہے جو وہ حق کے راستے سے اُن کو ہٹانے کے لیے اختیار کر رہے تھے۔ اِس کے بعد تزکیہ و تطہیر کا مضمون شروع ہوتا ہے جس میں اُن کو امتحان کے اِس مرحلے میں کامیابی کے لیے ضروری ہدایات دی گئی ہیں اور یہ حقیقت اُن پر واضح کی گئی ہے کہ اسلام کی پیروی

اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿١٠١﴾

کے بعد یہ پھر تمھیں کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے۔[۹۱۹] (اِس پر متنبہ رہو) اور (غور کرو کہ) تمھارا کفر میں پڑنا کس طرح جائز ہو سکتا ہے، جب کہ تمھیں اللہ کی آیتیں سنائی جا رہی ہیں اور اُس کا رسول تمھارے اندر موجود ہے۔[۹۲۰] (لٰہذا اللہ کو مضبوطی سے پکڑے رہو) اور (یاد رکھو کہ) جو اللہ کو مضبوطی سے پکڑے گا تو[۹۲۱] (سمجھ لو کہ) اُس نے سیدھی راہ کو پا لیا ہے۔ ۱۰۰-۱۰۱

کا صحیح حق وہ اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھام کر اور آزمایش کے موقعوں پر اللہ و رسول کی اطاعت پر پوری طرح قائم رہ کر ہی ادا کر سکتے ہیں۔

[۹۱۸] اِس سے اہل کتاب کا وہی گروہ مراد ہے جس کی مخالفتوں اور وسوسہ اندازیوں کا ذکر اوپر تفصیل سے ہوا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں سے ایک گروہ اہل انصاف کا بھی تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات ہر جگہ ملحوظ رکھی ہے کہ اُن کے ساتھ کوئی بے انصافی نہ ہونے پائے۔

[۹۱۹] یعنی تم سمجھتے ہو کہ یہ دین کے ماننے والے ہیں، اِس لیے کسی کو گم راہ کرنے کی بات کس طرح سوچ سکتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اِن کی تمام دین داری رسمی ہے۔ یہ اصل دین کے ایسے پکے دشمن ہیں کہ خود بھی منکر ہیں اور اِن کی باتوں میں آؤ گے تو تمھیں بھی اُس کا منکر بنا کر چھوڑیں گے۔

[۹۲۰] مطلب یہ ہے کہ اِس کے باوجود حق کو چھوڑتے ہو تو یہ تمھاری انتہائی محرومی اور بدبختی ہو گی۔ اللہ کے حضور میں پیش کرنے کے لیے اِس کے بعد کوئی عذر تمھارے لیے باقی نہ رہے گا۔ اِس کے معنی تو پھر یہی ہوں گے کہ تم نے پورے دن کی روشنی میں ٹھوکر کھائی ہے۔

[۹۲۱] اللہ کو مضبوطی سے پکڑنے کا مفہوم یہ ہے کہ نرم و گرم، ہر طرح کے حالات میں آدمی جادۂ حق پر قائم رہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام و ہدایات اور اُس کی کتاب سے کسی حال میں روگردانی

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

ایمان والو، اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے[۹۲۲]، اور دنیا سے رخصت ہو تو ہر حال میں اسلام پر رخصت ہو[۹۲۳]۔ اور اللہ کی رسّی[۹۲۴] کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑو اور

نہ کرے۔

۹۲۲ یہ اللہ کو مضبوطی سے پکڑنے کی حقیقت واضح فرمائی ہے کہ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ سے اُس طرح ڈرتے رہو، جس طرح اُس سے ڈرتے رہنے کا حق ہے۔ استاذ امام اِس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

> ''... یہ تقویٰ اگرچہ مطلوب تو اُسی حد تک ہے جس حد تک بندے کی استطاعت میں ہے، اِس کی وضاحت خود قرآن ہی نے فرما دی ہے کہ 'فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ'*۔ لیکن خدا سے ڈرنے اور دوسروں سے ڈرنے میں بڑا فرق ہے، اِس وجہ سے ارشاد ہوا کہ خدا سے ڈرتے رہو، جس طرح خدا سے ڈرتے رہنے کا حق ہے۔ اول تو بندے پر خدا کے جو حقوق ہیں، وہ کسی اور کے نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ خدا نے جو حدود و قیود قائم کیے ہیں اور اُن کے توڑنے کی جو سزا مقرر کی ہے، وہ تمام تر بندوں کی دنیوی و اخروی بہبود کے لیے کی ہے، اُن کی پابندی سے خدا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، بلکہ بندوں ہی کو پہنچتا ہے۔ تیسری یہ کہ خدا کی آنکھیں ہر جگہ نگراں ہیں، یہاں تک کہ وہ دلوں کے وسوسوں سے بھی باخبر ہے۔ چوتھی یہ کہ خدا کی پکڑ سے کوئی دوسرا بچا نہیں سکتا اور وہ دنیا اور آخرت، دونوں میں سزا دے سکتا ہے اور ہمیشہ کے لیے دے سکتا ہے۔ خدا سے ڈرنے میں، جب تک بندہ اِن تمام پہلوؤں کو مدنظر نہ رکھے، وہ خدا سے ڈرنے کا صحیح مفہوم سمجھ بھی نہیں سکتا، چہ جائیکہ وہ اُس کا صحیح حق ادا کر پائے۔ بہت سے لوگ جو انسانوں سے ڈر کر خدا اور اُس کی شریعت کو چھوڑ بیٹھتے ہیں، اُن کی بنیادی گم راہی یہی ہوتی ہے کہ وہ لوگوں

---

* التغابن ۶۴: ۱۶۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ

تفرقہ میں نہ پڑو، اور اپنے اوپر اللہ کی اِس عنایت کو یاد رکھو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن

کی مخالفت اور خدا کے غضب میں فرق نہیں کر پاتے۔'' (تدبرقرآن ۲/ ۱۵۲)

۹۲۳ یعنی خدا سے یہ ڈرنا اور اُس کی اطاعت پر قائم رہنا زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ اِس میں کسی انقطاع کی گنجایش نہیں ہے۔ شعور کی عمر کو پہنچنے کے بعد یہ جدوجہد شروع ہوگی اور زندگی کی آخری سانس تک جاری رہے گی۔ لہٰذا خبردار رہو، اہتمام سے ذرا پہلے بھی اگر اِس کا سلسلہ ٹوٹ گیا تو ساری محنت برباد ہو جائے گی۔

استاذ امام نے اِس کا ایک اور پہلو بھی واضح فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''... آیت کے اسلوب میں یہ بات بھی مخفی ہے کہ یہ راہ بہت ہموار نہیں ہے، بلکہ اِس میں بہت سے نشیب و فراز اور ہر قدم پر اتار چڑھاؤ ہیں۔ اِس میں آزمایشوں اور فتنوں سے دوچار ہونا ہو گا اور شیاطین کے شب خونوں اور معاندین کی دراندازیوں اور فساد انگیزیوں سے سابقہ پیش آئے گا۔ کبھی طمع ورغلانے کے لیے عشوہ گری کرے گی، کبھی خوف دھمکانے کے لیے اپنے اسلحہ سنبھالے گا۔ جو اِن سب مرحلوں سے اپنا ایمان و اسلام بچاتا ہوا منزل پر پہنچا اور اِسی حال میں اُس نے جان، جان آفرین کے سپرد کی، درحقیقت وہ ہے جو خدا سے اُس طرح ڈرا، جس طرح خدا سے ڈرنے کا حق ہے اور یہی ہے جس کو اعتصام باللہ کا مقام حاصل ہوا۔''
>
> (تدبرقرآن ۲/ ۱۵۲)

۹۲۴ اِس سے مراد یہاں قرآن ہے، اِس لیے کہ یہی وہ رسی ہے جو آسمان سے زمین تک خدا اور اُس کے بندوں کے درمیان تنی ہوئی ہے۔ ہمارے اور ہمارے رب کے درمیان یہی واسطہ اور یہی عہد و میثاق ہے۔ چنانچہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے کے معنی اِس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اُس کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑیں اور کسی حال میں اُس سے الگ نہ ہوں۔ پھر اِس کے ساتھ 'جَمِيْعًا' کی قید اور 'لَا تَفَرَّقُوْا' کی نہی بھی ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں سے یہ مطالبہ اُن کی اجتماعی

قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ
مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ
تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ
وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ

تھے تو اُس نے تمھارے دل جوڑ دیے اور اُس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے، اور یاد رکھو کہ تم آگ کے ایک گڑھے کے بالکل کنارے پر کھڑے تھے، پھر اُس نے تم کو اُس سے بچا لیا۔[۹۲۵] اللہ اِسی طرح اپنی آیتیں تمھارے لیے واضح کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پر رہو۔[۹۲۶] اور چاہیے کہ تمھارے اندر سے کچھ لوگ مقرر رہوں جو نیکی کی دعوت

حیثیت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ وہ سب مل کر اِس رسی کو مضبوطی سے تھامیں اور اِس کو چھوڑ کر اپنے شیرازے کو پراگندہ نہ کریں، بلکہ ایک جمعیت بن کر قرآن سے وابستہ ہوں، اُسے پڑھیں، اُس کی آیتوں پر تدبر کریں، اُس سے نصیحت حاصل کریں، خدا کی اتاری ہوئی ایک میزان عدل کی حیثیت سے اپنے تمام معاملات میں اُسی کو مرجع بنائیں اور اُس کے کسی حکم یا فیصلے کے سامنے کسی دوسری چیز کو ہرگز کوئی وقعت نہ دیں۔

۹۲۵ یہ اُس عظیم احسان کی یاددہانی ہے جو قرآن کے ذریعے سے عربوں پر ہوا۔ اِس کتاب کے نازل ہونے سے پہلے اُن کا ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کا دشمن تھا اور یہ باہم جنگ و جدال برپا کیے رہتے تھے۔ مذہبی حیثیت سے بھی اُن کے مابین وحدت کا کوئی رشتہ باقی نہ رہا تھا۔ ہر قبیلے نے اپنے دیوتا الگ کر لیے تھے اور سیاست و معیشت میں بھی اُن کے مفادات باہم متصادم تھے۔ لیکن قرآن کی صورت میں یہ رسی اُن کے ہاتھوں میں پکڑا دی گئی تو استاذ امام کے الفاظ میں اِس نے اُن کو ایک رشتے میں پرو کر موتیوں کی لڑی بنا دیا اور وہ جو ایک دوسرے کے دشمن تھے، ایک دوسرے کے جگری دوست اور غم خوار بھائی بن گئے۔

وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾
وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ
الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۵﴾ ۙ يَّوْمَ تَبْيَضُّ

دیں، بھلائی کی تلقین کریں اور برائی سے روکتے رہیں۔ (تم یہ اہتمام کرو) اور (یاد رکھو کہ) جو یہ کریں گے، وہی فلاح پائیں گے۔[۹۲۷] ۱۰۲-۱۰۴

(تم یہ کرو) اور اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو فرقوں میں بٹ گئے اور جنھوں نے نہایت واضح ہدایات اپنے پاس آجانے کے بعد اختلاف کیا[۹۲۸] اور (اب) وہی ہیں کہ

---

۹۲۶ مطلب یہ ہے کہ اِس وضاحت کے ساتھ یہ یاددہانی اِس لیے کی گئی ہے کہ اِس معاملے میں معمولی غلطی بھی بڑے غیرمعمولی فتنوں کا باعث بن سکتی ہے، لہٰذا متنبہ رہو کہ اگر وحدت و محبت کی اِس حالت کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو اِس کتاب کو مضبوطی سے پکڑے رکھنا ضروری ہے، ورنہ جاہلیت کی اُسی حالت کو لوٹ جاؤ گے جس میں تم اِس سے پہلے مبتلا رہ چکے ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ تم آگ کے ایک گڑھے کے بالکل کنارے پر کھڑے تھے کہ تمھارے پروردگار نے تمھارا ہاتھ تھام کر تم کو اُس سے بچالیا۔ اب اِس کتاب کو چھوڑو گے تو اندیشہ ہے کہ اِسی گڑھے میں گرو گے اور اِس کی آگ سے کسی طرح بچ نہ سکو گے۔

۹۲۷ یہ مسلمانوں کو اُن کی اجتماعی حیثیت میں حکم دیا ہے کہ اِس ہدایت پر قائم رہنے کے لیے اپنے اندر سے کچھ لوگوں کو مقرر کریں جو اُنھیں بھلائی کی تلقین کرتے اور برائی سے روکتے رہیں۔ پھر اِسی حیثیت سے فلاح کی بشارت بھی دی ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ یہ حکم اربابِ اقتدار سے متعلق ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی حکومت میں جمعہ کا منبر اور پولیس کا محکمہ یہی خدمت انجام دیتے ہیں۔ خطبۂ جمعہ کے ذریعے سے اُن کے اربابِ حل و عقد اُنھیں بھلائی کی دعوت دیتے اور برائیوں سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں اور پولیس ایسے منکرات کا ارتکاب کرنے والوں کا محاسبہ کرتی ہے

وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ قف اَكَفَرْتُمْ
بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاَمَّا
الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾
تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا
لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِلَى
اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾

جن کے لیے بڑی ہول ناک سزا ہے، اُس دن جب کچھ چہرے روشن ہوں گے اور کچھ چہروں پر تاریکی چھا رہی ہو گی۔ سو جن کے چہروں پر تاریکی چھا رہی ہو گی، اُن سے پوچھا جائے گا: کیا تم ایمان کی نعمت سے بہرہ یاب ہونے کے بعد پھر کافر ہو گئے؟ تو اپنے اِس کفر کی پاداش میں اب چکھو عذاب کا مزہ۔ رہے وہ جن کے چہرے روشن ہوں گے تو وہ اللہ کی رحمت کے سایوں میں ہوں گے، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمھیں ٹھیک ٹھیک سنا رہے ہیں، اور اِس لیے سنا رہے ہیں کہ اللہ نہیں چاہتا کہ وہ دنیا والوں پر کوئی ظلم کرے۔ (لہٰذا اِن اہل کتاب کی طرح جھوٹی امیدوں میں نہ رہو) اور (یاد رکھو کہ) زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، سب اللہ ہی کا ہے اور تمام معاملات اللہ ہی کے حضور میں پیش کیے جاتے ہیں۔[۹۲۹] ۱۰۵-۱۰۹

جنھیں قانون کی رو سے جرم قرار دیا جاتا ہے۔

[۹۲۸] یعنی محض سرکشی کے باعث اُنھیں ماننے سے انکار کر دیا۔ آگے اِسی کو ایمان کے بعد پھر کافر ہو جانے سے تعبیر کیا ہے۔

كُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَتَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوۡ اٰمَنَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ لَكَانَ خَيۡرًا لَّهُمۡ ؕ مِنۡهُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَاَكۡثَرُهُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۱۱۰﴾

(ایمان والو، اِس وقت تو اللہ کی عنایت سے) تم ایک بہترین جماعت ہو جو لوگوں پر حق کی شہادت کے لیے برپا کی گئی ہے۔ تم بھلائی کی تلقین کرتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر سچا ایمان رکھتے ہو۔[۹۳۰] اور یہ اہل کتاب بھی (قرآن پر) ایمان لاتے

---

[۹۲۹] اِس پیرے کی آیتوں پر غور کیا جائے تو اِس سے جو حقائق سامنے آتے ہیں، وہ استاذ امام کے الفاظ میں یہ ہیں:

> ”اول یہ کہ اعتصام بحبل اللہ سے محروم ہو جانے کے بعد اہل کتاب اختلاف و انتشار میں مبتلا ہوئے اور یہ انتشار و اختلاف درحقیقت ایمان کے بعد کفر کی طرف پلٹ جانے کے ہم معنی ہے۔
>
> دوم یہ کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ یہ سرفرازی و سرخ روئی بخشتا ہے کہ اُن کے ہاتھ میں خود اپنی رسی پکڑاتا ہے، اگر وہ اپنی شامت اعمال سے اِس رسی کو چھوڑ کر دوسرے پھندے اپنی گردنوں میں ڈال لیتے ہیں تو قیامت کے دن اُن کو اُسی درجے کی روسیاہی بھی حاصل ہو گی جس درجے کی اُن کو سرخ روئی بخشی گئی تھی۔ چہرے روشن اُن کے ہوں گے جو ہر طرح کے حالات میں اِس رسی کو تھامے رہیں گے۔ یہ لوگ، بے شک اللہ کے فضل و رحمت کے حق دار ہوں گے۔
>
> سوم یہ کہ یہ ساری تنبیہات بالحق ہیں یعنی ہر بات شدنی ہے۔ اِن کو محض خالی خولی دھمکی سمجھ کر جو لوگ نظر انداز کریں گے، وہ اپنی روسیاہی کا سامان خود کریں گے اور اِس کی تمام تر ذمہ داری اُنھی پر ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آگاہی پہلے سے اِسی لیے سنا دی ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ کسی کو سزا اُس پر حجت تمام کیے بغیر دے۔
>
> چہارم یہ کہ آسمان و زمین میں سارا اختیار صرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ سارے امور اُسی

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ؕ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۟ قف ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا

تو اِن کے لیے بہتر ہوتا۔[۹۳۱] (اِس میں شبہ نہیں کہ) اِن میں ماننے والے بھی ہیں، لیکن (افسوس کہ) اِن میں زیادہ نافرمان ہی ہیں۔ یہ تمھیں کچھ اذیت دے سکتے ہیں، اِس کے سوا یہ تم کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اور (مطمئن رہو کہ) اگر یہ تم سے لڑیں گے تو لازماً پیٹھ دکھائیں گے۔ پھر اِن کو کہیں سے کوئی مدد نہ ملے گی۔[۹۳۲] اِنھیں جہاں دیکھیے، اِن

کے حضور پیش ہوں گے اور اُسی کا فیصلہ ناطق و نافذ ہوگا۔ اگر کسی نے کسی اور سے امید باندھ رکھی ہو تو اُس کی یہ امید محض ایک واہمہ ہے جو حقیقت کے ظہور کے بعد بالکل سراب ثابت ہوگی۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۱۵۵)

۹۳۰ یہ بنی اسمٰعیل کے لیے تسلی اور بشارت ہے کہ ایمان و عمل کے لحاظ سے اِس وقت وہ خیر امت ہیں، لہٰذا اُن کا کوئی دشمن بھی اُن کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا یہی قانون بنی اسرائیل کے لیے بھی تھا، لیکن افسوس کہ اُن کی نافرمانیوں نے اُنھیں ہمیشہ کے لیے اللہ کے غضب کا مستحق بنا دیا ہے۔ اِس میں، ظاہر ہے کہ بنی اسمٰعیل کے لیے بھی تنبیہ ہے کہ دنیا کی امامت کا جو منصب اُنھیں حاصل ہوا ہے، اُس پر وہ محض نسل و نسب کی بنا پر نہیں، بلکہ علم و عمل میں نیکی اور خیر کے علم بردار ہونے کی وجہ سے سرفراز ہوئے ہیں۔ لہٰذا اُن کا یہ منصب صفات اور ذمہ داریوں کے ساتھ مشروط ہے۔ وہ اِن ذمہ داریوں کے پورا کرنے والے ہوں گے تو یہ سرفرازی اُنھیں حاصل رہے گی اور اِن سے گریز کریں گے تو لازماً اُسی انجام کو پہنچیں گے جس کو یہ اہل کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بار بار کی تنبیہ کے باوجود پہنچ چکے ہیں۔

۹۳۱ اِس جملے کے اندر جو ابہام و اجمال ہے، وہ استاذ امام کے الفاظ میں متکلم کے اُس غضب کا غماز ہے جس کے الفاظ متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ
وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا
عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ق

پر ذلت کی مار ہے، الاّ یہ کہ اللہ کی رسی تھام لیں اور (اُن) لوگوں کی رسی تھام لیں (جنھوں نے اللہ کی رسی تھام لی ہے)۔[۹۳۳] یہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے ہیں اور اِن پر پست ہمتی تھوپ دی گئی ہے۔ یہ اِس لیے کہ یہ اللہ کی آیتوں کے منکر رہے ہیں اور اُس کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں۔ یہ اِس لیے کہ اِنھوں نے نافرمانی کی اور یہ ہمیشہ حد سے بڑھتے رہے ہیں۔[۹۳۴] ۱۱۰-۱۱۲

---

[۹۳۲] یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی اور سرزمین عرب میں اُن کے تمام قبائل ایسے ذلیل وخوار ہوئے کہ ہر طرف سے بالکل بے یارومددگار ہو کر رہ گئے اور ذلت کے ساتھ وہاں سے نکال دیے گئے۔

[۹۳۳] یعنی ایمان لائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں شامل ہو کر پوری طرح آپ سے وابستہ ہو جائیں۔

[۹۳۴] مطلب یہ ہے کہ اِن کے جرائم کا باعث اِن کی یہ عادت ہے۔ چنانچہ اِس سے پہلے بھی یہ قانون الٰہی کی زد میں تھے، اِس لیے کہ اِن کے بارے میں اللہ کا وعدہ ہے کہ یہ حق سے انحراف کریں تو اِس کی سزا اِنھیں دنیا ہی میں مل جاتی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...یہ یہود کی شامت اعمال اور اِن کی بدبختی کا بیان ہے کہ جہاں سے اِن کو عزت وسرفرازی کی دولت دوجہاں لے کے لوٹنا تھا، یہ اپنی دوں ہمتی کی وجہ سے وہاں سے خدا کا غضب لے کر لوٹے، جس کے نتیجے میں اِن پر ذلت مسلط کر دی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اِن کو منصب امامت و

لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ
اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ
فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ
فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

(یہ بات، البتہ واضح رہے کہ) سب اہل کتاب یکساں نہیں ہیں۔ اِن میں ایک گروہ اپنے عہد پر قائم ہے[۹۳۵]۔ وہ راتوں کو اللہ کی آیتیں تلاوت کرتے اور (اُس کے سامنے) سجدہ ریز رہتے ہیں۔ اللہ پر اور قیامت کے دن پر سچا ایمان رکھتے ہیں، نیکی کی تلقین کرتے اور برائی سے روکتے ہیں، بھلائی کے کاموں میں سبقت کرتے ہیں اور وہ خدا کے نیک بندوں میں سے ہیں۔ (اِس میں شبہ نہیں کہ وہ حق کے سچے طالب ہیں) اور (اپنے اِس رویے کے صلے میں) جو نیکی بھی کریں گے، اُس کے اجر سے محروم نہ ہوں گے[۹۳۶] اور اللہ اِن پرہیزگاروں سے خوب واقف ہے۔ ۱۱۳-۱۱۵

شہادت پر مامور فرمایا تھا۔ اگر یہ اُس کی ذمہ داریاں ادا کرتے اور اپنے عہد پر استوار رہتے تو دنیا اور آخرت، دونوں میں اِن کا مقام بہت اونچا تھا، لیکن یہ اپنی دنیا پرستی اور پست ہمتی کی وجہ سے اُس کی ذمہ داریاں نہ سنبھال سکے اور خدا کے غضب کے مستحق ٹھیرے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۱۶۲)

۹۳۵ یعنی انبیا علیہم السلام کی تصدیق اور اُن کی لائی ہوئی شریعت کی پابندی کا جو عہد اُنھوں نے اپنے پروردگار کے ساتھ باندھا تھا، اُس پر پوری طرح قائم ہیں۔

۹۳۶ اصل میں 'فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں فعل 'کُفْر' دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں یہ 'حرمان' کے مفہوم پر متضمن ہے۔ مدعا یہ ہے کہ

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْــًٔا ؕ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَثَلُ مَا یُنْفِقُوْنَ فِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا كَمَثَلِ رِیْحٍ فِیْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

اِس کے برخلاف جن لوگوں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ منکر ہی رہیں گے، اُن کے مال و اولاد[۹۳۷] اللہ کے مقابل میں اُن کے کچھ بھی کام نہ آئیں گے اور وہ دوزخ کے لوگ ہیں، اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اِس دنیا کی زندگی میں جو کچھ وہ (بظاہر اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں، اُس کی تمثیل ایسی ہے کہ پالے کی ہوا ہو جو اُن لوگوں کی کھیتی پر چل جائے جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہو اور اُسے برباد کر دے۔[۹۳۸] (یہ اِسی کے سزاوار ہیں) اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے اِن پر کوئی ظلم نہیں کیا، بلکہ یہ آپ ہی اپنے اوپر ظلم

یہ اہل کتاب اگرچہ ابھی اسلام نہیں لائے ہیں، لیکن اندر سے بالکل مومن صادق ہیں، لہٰذا اِن کی کوئی نیکی بھی اجر سے محروم نہ رہے گی۔ اللہ تعالیٰ جانتے بوجھتے حق سے انکار کرنے والوں کے سوا کسی کو بھی اُس کی نیکیوں کے صلے سے محروم نہیں کرتے۔

[۹۳۷] یعنی وہ مال و اولاد جو خدا اور اُس کے پیغمبروں کی تعلیمات سے بے پروائی کا باعث ہے۔

[۹۳۸] اوپر جس طرح یہ بیان کیا ہے کہ حق کے سچے طالبوں کی کوئی نیکی بھی صلے سے محروم نہ ہوگی، اُسی طرح یہاں بیان فرمایا ہے کہ جانتے بوجھتے حق کا انکار کر دینے والوں کی کوئی نیکی بھی اُن کے کام نہ آئے گی۔ صدقہ اور خیرات ایک بڑی نیکی ہے، لیکن اِس کی مثال بھی قیامت میں اُس

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا بِطَانَةً مِّنۡ دُوۡنِكُمۡ لَا يَاۡلُوۡنَكُمۡ
خَبَالًا ؕ وَدُّوۡا مَا عَنِتُّمۡ ۚ قَدۡ بَدَتِ الۡبَغۡضَآءُ مِنۡ اَفۡوَاهِهِمۡ ۖۚ وَمَا
تُخۡفِىۡ صُدُوۡرُهُمۡ اَكۡبَرُ ؕ قَدۡ بَيَّنَّا لَـكُمُ الۡاٰيٰتِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۱۸﴾
هٰۤاَنۡتُمۡ اُولَاۤءِ تُحِبُّوۡنَهُمۡ وَلَا يُحِبُّوۡنَكُمۡ وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ
وَاِذَا لَقُوۡكُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوۡا عَضُّوۡا عَلَيۡكُمُ الۡاَنَامِلَ مِنَ

کرتے رہے ہیں۔ ۱۱۶-۱۱۷

ایمان[۹۳۹] والو، (یہ تمھارے دوست نہیں ہیں، اِس لیے) اپنے سے باہر کے لوگوں کو بھیدی نہ بناؤ۔[۹۴۰] تمھیں نقصان پہنچانے میں یہ کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ یہ تمھارے لیے زحمتوں کے خواہاں ہیں۔ اِن کی دشمنی اِن کے منہ سے نکلی پڑتی ہے اور جو کچھ اِن کے سینوں میں چھپا ہوا ہے، وہ اِس سے بھی سخت تر ہے۔ ہم نے یہ نشانیاں تمھارے لیے واضح کر دی ہیں، اگر تم عقل رکھتے ہو۔ یہ تمھی ہو کہ اِن کو دوست رکھنا چاہتے ہو، مگر وہ تم سے دوستی نہیں رکھتے، دراں حالیکہ تم خدا کی سب کتابوں کو مانتے ہو۔[۹۴۱] اور اِن کا طریقہ

کھیتی کی ہوگی جس پر پالے والی ہوا چل جائے اور اُس کو تباہ و برباد کر کے رکھ دے۔

[۹۳۹] یہ اب اُن مسلمانوں کو تنبیہ کی جا رہی ہے جو یا تو اپنی سادگی کی وجہ سے اہل کتاب کی چالوں کو اچھی طرح سمجھتے نہیں تھے یا اُن سے جو تعلقات و روابط پہلے سے چلے آ رہے تھے، اُنھیں اپنی کم زوری کے باعث توڑنا نہیں چاہتے تھے۔

[۹۴۰] اصل میں لفظ 'بِطَانَةً' استعمال ہوا ہے۔ اِس سے آدمی کے خواص و احباب اور محرمان راز مراد ہوتے ہیں۔

[۹۴۱] مطلب یہ ہے کہ تم اِن کی کتاب کو مانتے اور اِن کے دین کو اپنا دین سمجھتے ہو۔ بظاہر دشمنی

الْغَيْظِ ۗ قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿۱۱۹﴾
إِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا
بِهَا ۖ وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا ۗ إِنَّ اللَّهَ بِمَا
يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿۱۲۰﴾

وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۗ

یہ ہے کہ جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں[۹۴۲] اور جب الگ ہوتے ہیں تو غصے سے تم پر انگلیاں کاٹتے ہیں ـــــ کہہ دو کہ اپنے اِسی غصے میں مر جاؤ۔ (اللہ تمھاری ہر چیز سے واقف ہے اور) حقیقت یہ ہے کہ اللہ تو سینوں کے راز تک جانتا ہے ـــــ تمھیں کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو اِنھیں تکلیف پہنچتی ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو اِس سے خوش ہوتے ہیں۔ (یہ تمھارے دوست نہیں ہیں، اِن کی پروا نہ کرو) اور (یاد رکھو کہ) اگر تم صبر کرو گے اور اللہ سے ڈرتے رہو گے تو اِن کی کوئی تدبیر تمھیں کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکے گی، اِس لیے کہ جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اللہ اُس کو گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ ۱۱۸-۱۲۰

(یہ حقیقت اِنھیں سمجھاؤ، اے پیغمبر)، اور (اِس کے لیے) وہ موقع یاد دلاؤ، جب

کے لیے کوئی وجہ نظر نہیں آتی، لیکن اِس کے باوجود وہ تم سے دشمنی رکھتے ہیں۔ پھر تعجب ہے کہ تم اِن سے محبت کی پینگیں بڑھاتے ہو؟

[۹۴۲] یہ بات وہ اِس مفہوم میں کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عربوں کے لیے تو بے شک، خدا کے پیغمبر ہیں اور اِس حیثیت سے وہ آپ کو مانتے ہیں، لیکن خود اُن کے لیے آپ کی پیروی ضروری نہیں ہے۔ اِس مقصد کے لیے اُن کے اپنے پیغمبر ہی کافی ہیں۔

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿١٢١﴾
اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ۭ وَعَلَى

(احد کے دن) تم مسلمانوں کو جنگ کے مورچوں[۹۴۳] پر کھڑا کرنے کے لیے بہت سویرے اپنے گھر سے نکلے تھے۔ (اُس وقت اللہ تمھارے ارادوں سے واقف تھا اور تمھاری باتیں سن رہا تھا) اور اللہ سمیع و علیم ہے۔ ۱۲۱

اُس وقت، جب تم میں سے دو گروہوں[۹۴۴] نے حوصلہ چھوڑ نا چاہا، دراں حالیکہ اللہ اُن

---

۹۴۳ اصل میں لفظ 'مَقَاعِدَ' آیا ہے۔ یہ 'مقعد' کی جمع ہے جس کے معنی بیٹھنے کی جگہ کے ہیں، لیکن قرینہ موجود ہو تو اِس سے جنگ کا مورچا بھی مراد ہو سکتا ہے۔ یہاں یہ اِسی مفہوم میں ہے۔

۹۴۴ اِن دو گروہوں سے اشارہ، مورخین کے بیان کے مطابق قبیلۂ خزرج کے بنوسلمہ اور قبیلۂ اوس کے بنوحارثہ کی طرف ہے۔ یہاں جس واقعے کا ذکر ہوا ہے، اُس کا پس منظر استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس طرح بیان فرمایا ہے:

> "... اِن دونوں گروہوں کے اندر منافقین کی شرارت کی وجہ سے کچھ بزدلی پیدا ہوئی، لیکن پھر وہ سنبھل گئے۔ منافقین درحقیقت اِس جنگ کے لیے نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اِن کی اِس کمزوری کا اندازہ تھا۔ چنانچہ آپ نے یہ چاہا کہ نکلنے سے پہلے صحیح صورت حال سامنے آجائے۔ اِس کے لیے امتحاناً آپ نے مسلمانوں کے سامنے یہ سوال رکھا کہ قریش کا مقابلہ مدینہ کے اندر سے کیا جائے یا باہر نکل کر؟ اِس کا جواب سچے اور پکے مسلمانوں کی طرف سے تو ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا ہے کہ باہر نکل کر۔ چنانچہ اُنھوں نے پورے جوش و جذبے کے ساتھ یہی جواب دیا۔ لیکن منافقین نے مدینہ میں محصور ہو کر مقابلے کی مصلحتیں سمجھانے کی کوشش کی۔ آں حضرت نے جب صورت حال کا اندازہ کر لیا، منافقین کی کم زوری آپ پر واضح ہو گئی تو آپ نے وہی کیا جو آپ کے دل میں تھا اور جس کا اظہار آپ کے جاں نثار ساتھیوں نے کیا تھا۔ منافقین نے جب دیکھا کہ اُن کی یہ سازش ناکام ہو گئی تو وہ

اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ
اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾
اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ
اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ؕ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ
مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ

کی مدد کے لیے موجود تھا اور ایمان والوں کو تو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔ اللہ نے (اِس سے پہلے) بدر میں بھی تمھاری مدد کی تھی، جب کہ تم نہایت کمزور تھے۔ (پھر بھی ناشکری کرتے ہو)؟ سو اللہ سے ڈرو تا کہ تم اُس کے شکرگزار رہو۔ ۱۲۲-۱۲۳

یاد کرو، جب تم مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمھارے لیے کافی نہیں ہے کہ تمھارا پروردگار تین ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے جو (اِسی مقصد سے) اتارے گئے ہوں؟[945] ہاں کیوں نہیں، اگر تم صبر کرو اور خدا سے ڈرتے رہو اور تمھارے دشمن اِسی

نکلنے کو تو مسلمانوں کے ساتھ نکلے، لیکن نکلنے کے بعد اُن کے لیڈر ابن ابی نے اُن کو ورغلایا اور اِس چیز کو بہانہ بنا کر کہ اُس کے مشورے کی قدر نہیں کی گئی، راستے میں تین سو آدمیوں کے لشکر کے ساتھ الگ ہو گیا*۔ اِس واقعہ سے قدرتی طور پر مسلمانوں کی بعض جماعتوں کے حوصلے پر اثر پڑا۔ اِس لیے کہ مسلمانوں کی تعداد تین ہزار کفار کے مقابلے میں کل ایک ہزار تھی۔ ایک ہزار آدمیوں میں سے تین سو آدمیوں کا عین موقع پر فرار، ظاہر ہے کہ ایک اہم حادثہ تھا جس سے کمزور طبائع کا اثر لینا قدرتی امر تھا۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۱۷۰)

[945] مسلمانوں کا حوصلہ بحال کرنے کے لیے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غالباً اُس وقت فرمائی، جب عبداللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر واپس ہوا اور مسلمانوں کے

---

* تاریخ الامم والملوک، الطبری ۲/ ۵۹۔ البدایۃ والنہایۃ، ابن کثیر ۴/ ۳۸۷۔ الکامل فی التاریخ، ابن الاثیر ۲/ ۴۰۔

مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾
وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ط
وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ لا لِيَقْطَعَ طَرَفًا
مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَيْسَ لَكَ
مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ

وقت تم پر آ پڑیں تو تمھارا پروردگار پانچ ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا جو خاص نشان لگائے ہوئے ہوں گے۔[۹۴۶] ۱۲۴-۱۲۵

اور یہ تو اللہ نے صرف اِس لیے کیا کہ تمھیں بشارت ہو اور تمھارے دل اِس سے مطمئن ہو جائیں اور مدد تو اللہ ہی کی طرف سے آتی ہے جو زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔[۹۴۷] اِس لیے کیا کہ اِن منکروں (کو ایمان لانے کی توفیق دے اور اِس طرح اِن) کا ایک حصہ کاٹ لے یا اِنھیں ایسا ذلیل کرے کہ خوار ہو کر لوٹیں ___ تمھیں اِس معاملے میں کوئی اختیار نہیں[۹۴۸] (کہ اللہ اِن کے ساتھ یہی کرے) یا اِن پر عنایت کی نظر کرے

بعض گروہوں میں اُس سے کچھ بددلی پیدا ہوئی۔

۹۴۶ یعنی اِس جنگ میں وہ اپنے امتیازی نشان لگا کر آئیں گے۔ اِس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو خاص اہتمام کے ساتھ اِس مہم کے لیے بھیجے گا۔

۹۴۷ مطلب یہ ہے کہ اِس طرح کی کسی بشارت کے بغیر بھی ایمان والوں کا عقیدہ یہی ہونا چاہیے کہ فتح و نصرت ہمیشہ اللہ ہی کی طرف سے آتی ہے۔

۹۴۸ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اپنی قوم کے مستقبل سے متعلق کوئی خیال یہاں گزرا ہے جس پر اِس جملۂ معترضہ کے ذریعے سے بات کو روک کر توجہ دلائی گئی ہے کہ لوگوں کی ہدایت و

ظٰلِمُوْنَ (۱۲۸) وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۲۹)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا

اور اِن کی توبہ قبول کرلے، (اگر یہ توبہ کریں) یا اِن پر اپنا عذاب نازل کردے، اِس لیے کہ یہ ظالم ہیں۔ (یہ اللہ ہی کا اختیار ہے) اور زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، وہ اللہ ہی کا ہے۔ وہ (اپنے قانون کے مطابق) جس کو چاہے گا، بخش دے گا اور جس کو چاہے گا، سزا دے گا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۱۲۶-۱۲۹

ایمان والو، (آگے بھی خدا کی مدد چاہتے ہو تو) یہ بڑھتا اور چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو[۹۴۹]

ضلالت اور جزا و سزا کا معاملہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ وہ اگر چاہے گا تو تمھاری قوم کو توبہ کی توفیق دے گا اور چاہے گا تو اُن پر بھی وہی عذاب نازل کردے گا جو اُن سے پہلے کی قوموں پر نازل ہوا ہے۔ اِس کا فیصلہ اللہ کو کرنا ہے اور جو کچھ بھی وہ کرے گا، اپنی حکمت کے لحاظ سے اور اپنے قانون کے مطابق کرے گا، کسی دوسرے کے لیے اُس میں دخل اندازی کی گنجایش نہیں ہے۔ تاہم وہ غفور و رحیم ہے، اِس لیے امید رکھنی چاہیے کہ وہ اُن پر کرم فرمائے گا۔ جملۂ معترضہ کے بعد یہ پوری بات قرآن نے 'اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ' پر اِسی لیے عطف کردی ہے کہ اُس کے قارئین اِس نظم کلام پر متنبہ رہیں۔

[۹۴۹] اِس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ ممنوع صرف سود در سود ہے، بلکہ صورت حال کی تصویر اور اُس کے نفرت انگیز ہونے کو ظاہر کرنے کے لیے یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۲۷۳ 'لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا' میں بھی یہی اسلوب ہے۔ استاذ امام نے وہاں اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”... اصل مقصود سوال کرنے کی نفی ہے، 'اِلْحَافًا' کی قید اِس کے ساتھ صرف سوال کرنے

آل عمران ۳

اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۳۰﴾ۚ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡۤ اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۱۳۱﴾ۚ وَاَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوۡلَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۱۳۲﴾ۚ وَسَارِعُوۡۤا اِلٰی مَغۡفِرَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَجَنَّۃٍ عَرۡضُہَا السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ ۙ اُعِدَّتۡ

اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ اور اُس آگ سے بچو جو منکروں کے لیے تیار کی گئی ہے اور اللہ اور اُس کے رسول کے فرماں بردار رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔[۹۵۰] اور اپنے پروردگار کی مغفرت اور اُس جنت کی طرف بڑھ جانے کے لیے دوڑو جس کی وسعت زمین اور

> والوں کی عام حالت کی تصویر اور اُس کے گھنونے پن کے اظہار کے لیے لگائی ہے۔ مثلاً فرمایا ہے کہ 'لَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَکُمۡ خَشۡیَۃَ اِمۡلَاقٍ'* (اپنی اولاد کو فقر کے اندیشے سے قتل نہ کرو)۔ اِس میں ممانعت درحقیقت قتل کی ہے، 'خَشۡیَۃَ اِمۡلَاقٍ' کی قید محض اِس کے گھنونے پن کو واضح تر کرنے کے لیے ہے... یا فرمایا ہے: 'لَا تُکۡرِہُوۡا فَتَیٰتِکُمۡ عَلَی الۡبِغَآءِ اِنۡ اَرَدۡنَ تَحَصُّنًا'** (اور اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو، اگر وہ قید نکاح میں آنا چاہتی ہیں)۔ اِس میں بھی مقصود مطلق اکراہ کی ممانعت ہے، 'اِنۡ اَرَدۡنَ تَحَصُّنًا' کی قید محض اِس کے گھنونے پن کے اظہار کے لیے ہے۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۶۲۴)

پھر یہاں چونکہ انفاق میں سبقت کی دعوت دی گئی ہے، اِس لیے یہ واضح کرنا بھی پیش نظر ہے کہ مسابقت کا میدان اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اُس کی جنت ہے نہ کہ سود کی زیادہ سے زیادہ مقدار جس کو سمیٹنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے دنیا کے یہ طلب گار سر دھڑ کی بازی لگاتے ہیں۔

۹۵۰ اِس سے معلوم ہوا کہ اِس تنبیہ کے بعد بھی جو لوگ سود کھانے پر مصر رہیں گے، وہ منکر

---

* بنی اسرائیل ۱۷: ۳۱۔

** النور ۲۴: ۳۳۔

لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ
الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ ج
وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ
فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ قف
وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ
مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ

آسمانوں جیسی ہے، اُن پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے جو ہر حال میں خرچ کرتے ہیں،[۹۵۱] خواہ تنگی ہو یا کشادگی، اور (جن پر خرچ کرتے ہیں، اُن کی طرف سے زیادتی بھی ہو تو) غصے کو دبا لیتے اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں[۹۵۲] ـــــ (یہی خوبی سے عمل کرنے والے ہیں) اور اللہ اُن لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو خوبی سے عمل کرنے والے ہوں ـــــ اور جن کا معاملہ یہ ہے کہ جب کوئی بدکاری اُن سے ہو جاتی ہے یا اپنے حق میں کوئی برا کر بیٹھتے ہیں تو اُنھیں اللہ یاد آ جاتا ہے اور وہ اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں ـــــ اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو بخش دے ـــــ اور جانتے بوجھتے اپنے کیے پر

ہیں اور اُن کا انجام وہی ہوگا جو قرآن میں منکروں کے لیے بیان ہوا ہے۔

۹۵۱۔ یعنی اِس وسعت کے باوجود انسان اگر چاہے تو اللہ کی راہ میں خرچ کر کے اُس جنت کو خرید سکتا ہے جس کی یہ تمثیل بھی کہ وہ زمین و آسمان جیسی ہے، ایک تمثیل ہی ہے۔

۹۵۲۔ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ اکثر مال داروں کے پاس مال تو ہوتا ہے، لیکن اُس کی نسبت سے ظرف نہیں ہوتا، لہٰذا وہ سائلوں کے غلط رویے پر اُن کو جھڑک کر یا اُن پر غصے کا اظہار کر کے اپنے انفاق سے ثواب کمانے کے بجائے الٹا گناہ کما لیتے ہیں۔

فِيْهَا ؕ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾
قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى
وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۸﴾ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ

اصرار نہیں کرتے۔[۹۵۳] یہی ہیں کہ جن کا صلہ اُن کے پروردگار کی مغفرت ہے اور وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور کیا ہی اچھا صلہ ہے یہ نیک عمل کرنے والوں کے لیے۔ ۱۳۰-۱۳۶

(ایمان والو، آخری فتح تمھاری ہوگی)۔ اِس کی بہت سی مثالیں تم سے پہلے گزر چکی ہیں۔ سو اپنی اِس سرزمین ہی میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا ہے۔ یہ اُن لوگوں کے لیے نہایت واضح تنبیہ ہے (جو پیغمبر کو جھٹلا دینے پر مصر ہیں) اور اُن کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔ (اِس لیے مطمئن رہو)

---

[۹۵۳] یہ انفاق کے راستے کی ایک نہایت اہم مزاحمت کا بیان ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...جس طرح سود خوری کی علت روپے کی ایسی تونس پیدا کر دیتی ہے کہ آدمی کے لیے کسی اچھے کام میں خرچ کرنا پہاڑ ہو جاتا ہے، اُسی طرح بدکاری اور عیاشی کی چاٹ بھی کسی نیکی کے کام میں خرچ کرنے کی راہ بند کر دیتی ہے۔ جو لوگ اِس راہ پر چل پڑتے ہیں، وہ اپنی خواہشوں کے ہاتھوں اِس طرح بے بس ہو جاتے ہیں کہ اُن کو کسی اور طرف نگاہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ اِس وجہ سے قرآن نے انفاق کی تعلیم کے سلسلے میں جہاں سود خوری سے روکا ہے، وہیں بدکاری و بے حیائی اور اُس کے لازمی نتیجہ اسراف و تبذیر سے بھی روکا ہے۔“

(تدبر قرآن ۲/ ۱۷۹)

مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ ۙ

اور (جو نقصان تمھیں پہنچا ہے، اُس سے) بے حوصلہ نہ ہو اور غم نہ کرو۔[۹۵۴] اگر تم مومن ہو تو غلبہ بالآخر تمھیں ہی حاصل ہو گا۔[۹۵۵] (اِس وقت) اگر تم کو چوٹ لگی ہے تو ایسی ہی چوٹ (اِس سے پہلے) دشمن[۹۵۶] کو بھی لگ چکی ہے۔[۹۵۷] اور دنوں[۹۵۸] کا یہ الٹ پھیر تو ہم لوگوں کے اندر اِس لیے کرتے ہیں کہ اُن کا امتحان کریں[۹۵۹] اور اِس لیے کہ اللہ ایمان والوں کو جان لے

---

[۹۵۴] اشارہ ہے اُس نقصان کی طرف جس سے احد کے موقع پر مسلمانوں کو اپنی ایک غلطی کی وجہ سے دوچار ہونا پڑا۔

[۹۵۵] یہ اُس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کے تحت رسولوں کے منکرین پر اُن کی طرف سے اتمام حجت کے بعد عذاب آجاتا اور اُن کے ماننے والوں کو اللہ تعالیٰ لازماً غلبہ عطا فرماتے ہیں۔ اِس سنت کے مظاہر سرزمین عرب میں عاد و ثمود، قوم لوط اور قوم شعیب کے آثار کی صورت میں موجود تھے۔ قرآن نے یہاں اِنھی مظاہر کو سنن سے تعبیر فرمایا ہے۔

[۹۵۶] اصل میں لفظ 'اَلْقَوْم' استعمال ہوا ہے۔ اہل عرب کے عرف میں یہ اِس طرح کے موقعوں پر حریف اور دشمن کے لیے آتا ہے۔

[۹۵۷] یعنی بدر کے موقع پر۔

[۹۵۸] اصل میں لفظ 'اَلْاَيَّام' آیا ہے۔ یہ جب اِس طریقے سے جمع کی صورت میں آئے تو اِس سے مراد تاریخ کے وہ دن ہوتے ہیں جن میں بڑے بڑے حوادث اور واقعات پیش آئے ہوں۔

[۹۵۹] یہ 'وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' کا معطوف علیہ ہے جو عربیت کے اسلوب پر اصل میں

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ
اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ

اور تم میں سے اُن لوگوں کو چھانٹ لے جو (اپنی جان دے کر بھی) حق کی گواہی دینے والے ہوں[۹۶۰] ـــــ (اِن مصالح کو سمجھنے کی کوشش کرو) اور (یاد رکھو کہ) اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا[۹۶۱] ـــــ اور[۹۶۲] اِس لیے کرتے ہیں کہ ایمان والوں کو اللہ الگ کر لے اور اِن منکروں کو مٹا دے[۹۶۳] ـــــ کیا[۹۶۴] تم نے یہی سمجھا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے، اور اللہ نے

حذف ہو گیا ہے۔

۹۶۰ اِس سے معلوم ہوا کہ احد کے موقع پر جو افتاد پیش آئی، اُس میں دوسری مصلحتوں کے ساتھ ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ جو لوگ راہ حق میں شہادت کی سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں، اُن کی یہ آرزو بھی اِس موقع پر پوری ہو جائے۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُس زمانے میں شہادت کی طلب مسلمانوں کے اندر کتنی شدید تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے اِس جذبے کی تسکین کے لیے یہ موقع فراہم کرنا ضروری سمجھا۔

۹۶۱ یعنی اِس نقصان سے یہ خیال نہ کرو کہ اللہ اب اِن منکروں ہی سے محبت کرنے لگا ہے، نہیں، وہ اِن ظالموں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ اُس کے پیش نظر کچھ مصالح تھے جن کی وجہ سے اُس نے مسلمانوں کا یہ نقصان گوارا کیا ہے۔

۹۶۲ جملۂ معترضہ کے بعد یہاں سے کلام پھر اوپر کے بیان سے مربوط ہو گیا ہے۔

۹۶۳ مطلب یہ ہے کہ منکروں کو مٹانا بھی اُسی وقت ممکن تھا، جب وہ بالکل ممیز ہو گئے ہوں۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ لوگوں کو امتحان کی بھٹی سے گزارا جائے تاکہ ہر قسم کا کھوٹ اُن کے اندر سے نکل کر علیحدہ ہو۔ چنانچہ مسلمانوں کا نقصان، درحقیقت اِنھی منکروں کو مٹانے کی ایک تدبیر تھی۔

۹۶۴ یہ پھر ایک جملۂ معترضہ ہے جس سے مخاطبین کو اُن کے اِس خیال پر برسر موقع تنبیہ کی

الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ
اَنْ تَلْقَوْهُ ۖ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾
وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ
اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى

ابھی اُن لوگوں کو دیکھا ہی نہیں جنھوں نے تمھارے اندر سے جہاد کیا (اور جنھوں نے نہیں کیا) ـــــ اور اِس لیے کرتے ہیں کہ اللہ اُن کو بھی جان لے جو ثابت قدم رہنے والے ہوں[۹۶۵]۔ (اب حوصلہ چھوڑ رہے ہو) اور موت کے (اِس طرح) سامنے آ جانے سے پہلے تم اُس کی تمنا کرتے رہے ہو۔ سو (تمھاری یہ تمنا پوری ہو گئی، اِس لیے کہ) اب تو موت کو تم نے آنکھیں چار کر کے دیکھ لیا ہے[۹۶۶]۔ ۱۳۷-۱۴۳

محمد ایک رسول ہی ہیں۔ (اُن کے قتل ہو جانے کی خبر نے تمھارے قدم ڈگمگا دیے)۔ اُن سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں، (اور موت و حیات کے یہ مراحل اُن پر

گئی ہے جو اوپر کی بات سے اُن کے ذہن میں پیدا ہوا ہے کہ مومنین اور منکرین کو الگ الگ کرنے کے لیے ہمارے ایمان ہی کو کافی کیوں نہیں سمجھا گیا؟ اِس کے لیے یہ کیوں ضروری ہوا کہ لوگوں کو اِس طرح کے امتحان سے گزارا جائے؟

[۹۶۵] اصل الفاظ ہیں: 'وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ'۔ اِس کا عطف بھی، صاف واضح ہے کہ 'وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' پر ہے اور اِس کے اور 'يَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ' کے درمیان کا جملہ جملۂ معترضہ ہے جو مخاطبین کے ایک خیال پر، جیسا کہ بیان ہوا، برسرِ موقع تنبیہ کے لیے آ گیا ہے۔

[۹۶۶] یہ مخاطبین کی طرف سے شوقِ جہاد کے اظہار اور اللہ کی راہ میں اپنی جان قربان کر دینے کے اُن دعووں پر تعریض ہے جو وہ احد کے معرکے میں اترنے سے پہلے کر رہے تھے۔

عَقِبَیۡهِ فَلَنۡ یَّضُرَّ اللّٰهَ شَیۡـًٔا ؕ وَ سَیَجۡزِی اللّٰهُ الشّٰکِرِیۡنَ ﴿۱۴۴﴾
وَ مَا کَانَ لِنَفۡسٍ اَنۡ تَمُوۡتَ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ کِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ
وَ مَنۡ یُّرِدۡ ثَوَابَ الدُّنۡیَا نُؤۡتِهٖ مِنۡهَا ۚ وَ مَنۡ یُّرِدۡ ثَوَابَ الۡاٰخِرَةِ
نُؤۡتِهٖ مِنۡهَا ؕ وَ سَنَجۡزِی الشّٰکِرِیۡنَ ﴿۱۴۵﴾

بھی آئے ہیں[۹۶۷]۔ پھر کیا وہ وفات پا جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟[۹۶۸] (یاد رکھو)، جو الٹا پھرے گا، وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا اور اللہ عنقریب اُن کو صلہ دے گا جو ہر حال میں اُس کے شکر گزار رہے ہیں[۹۶۹]۔ ۱۴۴

(تم نے حوصلہ چھوڑ دیا) اور (اِس حقیقت کو فراموش کر بیٹھے کہ) ہر شخص اللہ کے اذن سے ایک مقررہ نوشتہ کے مطابق ہی دنیا سے رخصت ہوتا ہے اور (اِس کو بھی فراموش کر بیٹھے کہ) جو دنیا کا صلہ چاہے گا، اُس کو ہم اُسی میں سے دیں گے اور جو آخرت کا صلہ چاہے گا، اُس کو وہاں سے دیں گے اور اپنے شکر گزاروں کو ہم اُن کی جزا لازماً عطا فرمائیں گے[۹۷۰]۔ ۱۴۵

---

[۹۶۷] مطلب یہ ہے کہ دوسرے رسولوں کو جو آزمایشیں پیش آئی ہیں، وہ سب اِنھیں بھی پیش آسکتی ہیں اور جس طرح اُنھیں موت کے مرحلے سے گزرنا پڑا، اُسی طرح اِنھیں بھی ایک دن اِس مرحلے سے گزرنا ہے۔ اِن کے رسول ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اِنھیں موت نہیں آئے گی یا یہ کسی آزمایش سے دوچار نہیں ہوں گے۔

[۹۶۸] یعنی اسلام کو چھوڑ کر ایک بار پھر جاہلیت کی طرف لوٹ جاؤ گے۔

[۹۶۹] یعنی جاہلیت کی طرف لوٹنے کا خیال بھی اُن کے ذہن میں نہیں گزرا اور وہ اِس بات پر ہمیشہ اپنے پروردگار کے شکر گزار رہے کہ اُس نے اُنھیں اسلام کی نعمت سے بہرہ یاب کیا ہے۔

وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوۡنَ كَثِيۡرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوۡا لِمَاۤ
اَصَابَهُمۡ فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوۡا وَمَا اسۡتَكَانُوۡا ؕ وَاللّٰهُ
يُحِبُّ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۱۴۶﴾ وَمَا كَانَ قَوۡلَهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡا رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا

(اِن حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرو) اور (یاد رکھو کہ) کتنے ہی نبی گزرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی ہے تو اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں اُنھیں پیش آئیں، اُن سے نہ تو وہ پست ہمت ہوئے، نہ اُنھوں نے کم زوری دکھائی اور نہ دشمنوں کے آگے سپر ڈالی،[۹۷۱] (بلکہ ہر حال میں ثابت قدم رہے) اور اللہ ایسے ہی ثابت قدم رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اُن کی دعا بس یہ رہی کہ پروردگار، ہمارے

---

۹۷۰ یہ مخاطبین کو اُن کمزوریوں کی طرف توجہ دلائی ہے جن کی وجہ سے وہ اللہ و رسول کے بارے میں ایسے گمانوں میں مبتلا ہوئے جن کا ذکر یہاں ہو رہا ہے۔ اِن میں سے خاص طور پر دو چیزوں کو نمایاں کیا ہے: ایک یہ کہ وہ اِس بات پر عقیدہ نہیں رکھتے کہ ہر شخص کی موت کا ایک دن مقرر ہے، اِس کو نہ کوئی شخص پہلے لا سکتا ہے اور نہ آ جانے کے بعد ایک لمحے کے لیے ٹال سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اُن کی سعی و جہد کا مقصود یہی دنیا ہے۔ اپنے دنیوی مفادات سے آگے وہ کسی چیز کو بھی دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، لہٰذا اُنھیں باور نہیں آتا کہ دنیا کی محرومیوں کا ازالہ آخرت میں ہو جائے گا اور جو لوگ یہاں کھو رہے ہیں، وہ فی الواقع اپنے ایثار کا بھرپور صلہ وہاں پا لیں گے۔

۹۷۱ اِس مفہوم کے لیے اصل میں 'وَھَن'، 'ضُعف' اور 'اِستِکانَۃ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اگرچہ کمزوری کے معنی میں کچھ مشترک سے ہیں، لیکن اِن میں باریک سا فرق بھی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس فرق کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”...موت سے خوف اور زندگی کی محبت سے دل میں جو بزدلی پیدا ہوتی ہے، یہ وہن ہے۔ اِس وہن سے ارادے اور عمل میں جو تعطل پیدا ہوتا ہے، وہ ضعف ہے۔ اِس ضعف سے حریف

ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِیْۤ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَی
الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْیَا وَ حُسْنَ ثَوَابِ
الْاٰخِرَةِ ؕ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۴۸﴾
یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِیْعُوا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَرُدُّوْكُمْ عَلٰۤی
اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَ هُوَ خَیْرُ

گناہوں سے درگذر فرما؛ اپنے معاملات میں جو کچھ زیادتی ہم سے ہوئی ہے، اُسے معاف کر دے؛ ہمارے قدم جما دے اور اِن منکر لوگوں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔ پھر اللہ نے اُن کو دنیا کا صلہ بھی دیا اور آخرت کا اچھا اجر بھی عطا فرمایا۔ (یہی ہیں جو خوبی سے عمل کرنے والے ہیں) اور اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو خوبی سے عمل کرنے والے ہوں۔ ۱۴۶-۱۴۸

ایمان والو، اگر اِن منکروں کی بات مانو گے تو یہ تمھیں الٹے پیروں پھیر کر رہیں گے اور تم نامراد ہو جاؤ گے۔[۹۷۲] یہ لوگ نہیں، بلکہ اللہ ہی تمھارا مددگار ہے اور اُسی کی مدد سب

کے آگے گھٹنے ٹیک دینے کا جو نتیجہ ظہور میں آتا ہے، وہ استکانت ہے۔" (تدبر قرآن ۲/ ۱۸۷)

آیت کا مدعا یہ ہے کہ جنگ و جدال کا پیش آنا اور اُس کے نتیجے میں مصائب و شدائد سے گزرنا انبیا علیہم السلام کے لیے کوئی انوکھا معاملہ نہیں ہے کہ اِسے دیکھ کر یہ لوگ بددل ہو رہے ہیں۔ اِس طرح کے معاملات اِس سے پہلے بھی بہت سے پیغمبروں کو پیش آ چکے ہیں۔ داؤد و سلیمان اور موسیٰ علیہم السلام کی جنگوں کا ذکر بائیبل میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے قانون ابتلا کا لازمی تقاضا ہے، اِس سے کسی صاحب ایمان کو کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔

[۹۷۲] یہ اُس پروپیگنڈے کی طرف اشارہ ہے جو احد میں نقصان کے بعد کیا گیا اور جس سے

النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ

سے بہتر ہے۔ (تم دیکھو گے کہ) اِن منکروں کے دل میں اب ہم تمھارا رعب بٹھا دیں گے، اِس لیے کہ اِنھوں نے اللہ کے ساتھ اُن چیزوں کو شریک ٹھیرایا ہے جن کے حق میں اُس نے کوئی سند نہیں اتاری ہے۔ اِن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کے لیے یہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔ ۱۴۹-۱۵۱

اللہ نے (اپنی مدد کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا، وہ تو اُس نے پورا کر دیا، جب تم اللہ کے اذن[۹۷۳] سے اُن کو تہ تیغ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ خود تم نے کم زوری دکھائی اور حکم کی تعمیل میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا اور (پیغمبر کی) نافرمانی کی، جب کہ اللہ نے تمھیں وہ چیز دکھا دی جس کے تم آرزو مند تھے۔ (یہ حقیقت ہے کہ) تم میں کچھ دنیا کے طالب

مکہ کے ائمۂ کفر نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ محمد اگر خدا کے فرستادہ ہوتے تو اُنھیں نقصان نہ اٹھانا پڑتا، اِس لیے یقین رکھو کہ یہ محض تدبیر اور وسائل کا کھیل ہے جس میں ایک مرتبہ اُنھیں فتح ہوئی اور اب ہم جیت گئے ہیں، اِس کا خدا اور فرشتوں کی مدد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

[۹۷۳] اصل میں 'بِاِذْنِهٖ' کا لفظ آیا ہے۔ اِس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ جنگ کا جو غیر معمولی نتیجہ پہلے مرحلے میں سامنے آیا، وہ محض تمھاری قوت و تدبیر سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور مشیت

ثُمَّ صَرَفَكُمۡ عَنۡهُمۡ لِيَبۡتَلِيَكُمۡ ۚ وَلَقَدۡ عَفَا عَنۡكُمۡ ۗ وَاللّٰهُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۵۲﴾

اِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ وَلَا تَلۡوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ وَّالرَّسُوۡلُ يَدۡعُوۡكُمۡ فِىۡۤ

تھے اور کچھ آخرت کے۔ (چنانچہ) اللہ نے (اِس فتح کے بعد) پھر تمھارا رخ اُن سے پھیر دیا تاکہ تمھاری آزمایش کرے۔[۹۷۴] (اِس لیے کہ جو لوگ دنیا کے طالب ہیں، وہ تم سے چھٹ کر الگ ہو جائیں)۔ اور حق یہ ہے کہ اُس نے پھر بھی تمھیں معاف ہی کر دیا[۹۷۵] اور اللہ مسلمانوں پر بڑی عنایت فرمانے والا ہے۔ ۱۵۲

یاد کرو، جب تم بھاگے جا رہے تھے[۹۷۶] اور کسی کو مڑ کر دیکھ بھی نہیں رہے تھے اور اللہ کا پیغمبر

سے آیا تھا۔

۹۷۴ یہ اُس ابتلا کی طرف اشارہ ہے جو احد کے موقع پر مسلمانوں کو پیش آیا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...تمام ارباب سیر متفق ہیں کہ اس جنگ میں مسلمانوں کا ابتدائی حملہ بہت کامیاب رہا۔ اُنھوں نے دشمن پر غلبہ پالیا تھا، لیکن ایک دستہ جو ایک اہم درے کی حفاظت پر مامور تھا اور جس کو حضور کی طرف سے ہدایت تھی کہ وہ کسی حال میں بھی اپنی جگہ کو نہ چھوڑے، قبل از وقت اپنی جگہ چھوڑ کر مال غنیمت سمیٹنے میں مصروف ہو گیا۔ صرف تھوڑے سے آدمی اُس دستے کے اپنی جگہ پر قائم رہے۔ اِس چیز سے دشمن کے ایک دستے نے فائدہ اٹھایا اور کاوا لگا کر اُس نے پشت سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور یہ حملہ ایسا اچانک اور کامیاب ہوا کہ مسلمان اوسان کھو بیٹھے۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۱۹۳)

۹۷۵ یعنی غلطی تو تم نے ایسی کی تھی کہ اُس پر تمھیں سزا ملتی، لیکن اللہ کی عنایت ہے کہ اُس نے تم کو معاف کر دیا اور دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے بجائے محض ایک ابتلا سے گزارنے کے بعد سلامتی سے گھروں کو واپس آجانے کا موقع فراہم کر دیا۔

۹۷۶ اصل میں لفظ ’اِصْعَاد‘ آیا ہے۔ اِس کے معنی کسی چڑھائی کی سمت میں جانے کے ہیں۔

أُخۡرٰىكُمۡ فَاَثَابَكُمۡ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيۡلَا تَحۡزَنُوۡا عَلٰى مَا فَاتَكُمۡ وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۵۳﴾

(تمھارے پیچھے) تمھارے ہی لوگوں کی ایک دوسری جماعت میں تمھیں پکار رہا تھا (جو اُس کے ساتھ کھڑی تھی) تو اللہ نے تم کو غم پر غم پہنچایا،[۹۷۷] اِس لیے کہ (اِس امتحان سے گزرنے کے بعد آیندہ) کسی چیز کے ہاتھ سے جانے اور کسی مصیبت کے آنے پر تم رنجیدہ خاطر نہ ہو،[۹۷۸] اور (یاد رکھو کہ) جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے باخبر ہے۔ ۱۵۳

اِسی سے 'اصعد فی العدو' کا محاورہ نکلا ہے، جس میں کسی سمت میں منہ اٹھا کر بھاگ کھڑے ہونے کے معنی پیدا ہو گئے ہیں۔

۹۷۷؎ اصل میں 'غَمًّا بِغَمٍّ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'ب' تلبس کے مفہوم میں ہے، یعنی پہلے پسپائی کا غم پیش آیا، پھر اِس کے ساتھ ہی لپٹا ہوا ایک دوسرا غم بھی سامنے آ گیا۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت اِس طرح فرمائی ہے:

> ''...ہمارے نزدیک اِس غم سے مراد وہ غم ہے جو اِس دوران میں مسلمانوں کو کفار کی اڑائی ہوئی اِس افواہ سے پہنچا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی شہید کر دیے گئے۔ اِس افواہ کا ذکر تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں بھی ہے اور قرآن کی اِس آیت سے بھی اِس کا اشارہ نکلتا ہے۔ اِس لیے کہ فرمایا ہے کہ تم اِس طرح بگٹٹ بھاگے چلے جا رہے تھے کہ تمھیں اپنے دہنے بائیں کا بھی ہوش نہیں رہا تھا کہ تم ذرا مڑ کے دیکھ سکتے کہ کون ہے اور کیا کہہ رہا ہے، یہاں تک کہ اُس رسول کی طرف بھی تم نے توجہ نہیں کی جو تمھارے پیچھے سے تمھیں برابر پکارتا رہا کہ اللہ کے بندو، میری طرف آؤ۔ اِس کے بعد 'ف' کے ساتھ، جو عربی میں نتیجہ کے بیان کے لیے آتی ہے، اِس غم کا ذکر کیا ہے۔ اِس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ یہ غم پیغمبر کی ذات ہی سے متعلق ہو گا تاکہ پیغمبر کی جو ناقدری اُن سے صادر ہوئی ہے، اُس پر اُن کو تنبیہ کی جائے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۱۹۳)

۹۷۸؎ مطلب یہ ہے کہ اِس طرح کے ابتلا اور مصیبتوں سے گزر کر یہ حقیقت تم پر واضح ہو

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً
مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ
غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ
قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ
لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ

اِس غم کے بعد پھر اللہ نے تم پر اطمینان نازل فرمایا، ایک ایسی نیند کی صورت میں جو تم میں سے کچھ لوگوں پر چھا رہی تھی اور کچھ وہ تھے کہ جنھیں اپنی جانوں کی پڑی تھی۔[۹۷۹] وہ خدا کے متعلق بالکل خلاف حقیقت جاہلیت کے گمانوں میں مبتلا ہو رہے تھے۔[۹۸۰] وہ کہہ رہے تھے کہ اِن معاملات میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے؟ اِن سے کہہ دو کہ تمام معاملات اللہ ہی کے اختیار میں ہیں۔ وہ اپنے دلوں میں وہ کچھ چھپائے ہوئے ہیں جو تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ اِس معاملے میں ہمارا کوئی دخل ہوتا تو ہم یہاں (اِس طرح) مارے

جائے کہ دنیا اصلاً کھونے اور پانے کی نہیں، بلکہ امتحان کی جگہ ہے، لہٰذا اِس میں پیش آنے والے ہر حادثے کو اِسی زاویۂ نظر سے دیکھنا چاہیے۔ اِس کے بعد توقع ہے کہ تمھارے اندر وہ مایوسی اور دل شکستگی کبھی پیدا نہ ہوگی جو انسان کے عزم و حوصلہ کو ختم کر دیتی ہے اور تم ہمیشہ پابرجا رہو گے۔

[۹۷۹] یعنی اگرچہ دشمن جا چکا تھا، لیکن جیسا کہ روایتوں میں بیان ہوا ہے، اپنے خوف اور بزدلی کی وجہ سے وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ معلوم نہیں کس وقت وہ دوبارہ اُن پر آ پڑے۔

[۹۸۰] اصل الفاظ ہیں: 'يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ'۔ اِن میں 'ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ' 'غَيْرَ الْحَقِّ' کی وضاحت ہے اور اِس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اُن کی بزدلی کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے سوچنے کا انداز اب تک وہی ہے جو اسلام کی نعمت سے بہرہ یاب ہونے سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں تھا۔

لَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى
مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا
فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا
اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ

نہ جاتے۔[۹۸۱] کہہ دو کہ اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تو جن کے لیے قتل ہونا لکھا تھا، وہ اپنی قتل گاہوں تک پہنچ کر رہتے۔ (لہٰذا اِس بات کو ایک مرتبہ پھر اچھی طرح سمجھ لو کہ) یہ سب محض اِس لیے ہوا کہ اللہ تمھیں الگ الگ کرے[۹۸۲] اور اِس لیے کہ تمھارے سینوں میں جو کچھ چھپا ہوا ہے، اُس کو پرکھے اور اِس لیے کہ تمھارے دلوں کے کھوٹ چھانٹ دے، اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ دلوں کی باتیں جانتا ہے۔ ۱۵۴

تم میں سے جو لوگ دونوں گروہوں کی مڈبھیڑ کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے،[۹۸۳] اُن کی اِس لغزش کا سبب یہ تھا کہ اُن کے بعض کرتوتوں کی شامت سے شیطان نے اُن کے قدم

---

[۹۸۱] اُن کا خیال تھا کہ اِس جنگ کے بارے میں پیغمبر استبداد اور خود رائی سے کام نہ لیتے اور مدینہ کے اندر محصور رہ کر دشمن کا مقابلہ کرنے کی جو تجویز پیش کی گئی تھی، اُسے مان لیتے تو یہ افسوس ناک صورت حال پیش نہ آتی جو اِس وقت آئی ہے۔

[۹۸۲] اصل میں 'وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ' کے جو الفاظ آگے آئے ہیں، اُن میں عطف کی واو دلیل ہے کہ یہ پوری بات یہاں عربیت کے اسلوب پر حذف ہے۔

[۹۸۳] یعنی احد کے دن، جب بعض کم زور قسم کے مسلمان عبد اللہ بن ابی اور اُس کے ساتھیوں کی شرارتوں سے متاثر ہو گئے تھے۔

عَنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۵۵﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ
اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا
وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ يُحْيٖ
وَيُمِيْتُ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾ وَلَىِٕنْ قُتِلْتُمْ فِيْ

ڈگمگا دیے تھے۔[۹۸۴] تاہم اللہ نے اُنھیں معاف کر دیا۔ بے شک، اللہ بخشنے والا ہے، وہ بڑا بردبار ہے۔ ۱۵۵

ایمان والو، اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو منکر ہیں اور جن کے اعزہ واقربا کبھی سفر پر جاتے ہیں یا کسی جنگ کے لیے نکلتے ہیں (اور اُن کو موت آجاتی ہے) تو اُن کے بارے میں[۹۸۵] وہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے۔ یہ اِس لیے کہ اللہ اِس چیز کو اُن کے دلوں کی حسرت بنا دے،[۹۸۶] ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی زندگی دیتا اور

---

۹۸۴ یہ قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ اُن کی کچھ پچھلی غلطیاں تھیں جن کے سبب سے شیطان اُنھیں گم راہ کرنے میں کامیاب ہوا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...گناہ سے گناہ جنم لیتا ہے اور شیطان کے داؤں اُنھی لوگوں پر زیادہ آسانی سے کارگر ہوتے ہیں جن کے اندر گناہ کی کوئی جڑ موجود ہوتی ہے۔ اِس وجہ سے ضروری ہے کہ جب آدمی سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اُس کو دل میں جگہ نہ پکڑنے دے، بلکہ استغفار اور توبۂ نصوح کے ذریعے سے اُس کا استیصال کر دے۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۱۹۷)

۹۸۵ اصل میں ’قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ’ل‘ اُسی طرح کا ہے، جس طرح سورۂ احقاف کی آیت ’وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا‘* میں آیا ہے۔

---

* ۴۶:۱۱۔

سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا
يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِ۟لَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾
فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ

اللہ ہی مارتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو، وہ اللہ کی نگاہوں میں ہے۔ اور اِس پر مزید یہ کہ اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ گے یا مرو گے تو اللہ کی جو بخشش اور رحمت تمھیں حاصل ہو گی، وہ اُس سے کہیں بہتر ہے جو یہ جمع کر رہے ہیں۔ اور یہ بھی کہ تم مرو یا مارے جاؤ، تم کو سمٹ کر جانا بہرحال اللہ ہی کی طرف ہے[۹۸۷]۔ ۱۵۶-۱۵۸

سو یہ اللہ کی عنایت ہے[۹۸۸] کہ تم اِن کے لیے بڑے نرم خو واقع ہوئے ہو، (اے پیغمبر)۔

---

۹۸۶ اور اِس طرح اُن کے اِس وہم کی سزا اُنھیں دنیا ہی میں دے دے کہ اپنی تدبیروں سے وہ موت کو ٹال سکتے ہیں۔

۹۸۷ یہ آیات جس رویے کو اختیار کرنے کی تلقین کرتی ہیں، اُس کی وضاحت استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس طرح فرمائی ہے:

> ''... یہ آیت تہوّر کی دعوت نہیں دے رہی ہے، بلکہ اِس حقیقت سے آگاہ کر رہی ہے کہ فرائض سے فرار زندگی بچانے کی کوئی تدبیر نہیں ہے۔ آدمی کے لیے صحیح روش یہ ہے کہ جو فرض جب عائد ہو جائے، پورے عزم و جزم کے ساتھ اُس کو ادا کرے اور یہ یقین رکھے کہ موت اُس وقت آئے گی، جب اُس کا وقت مقرر ہے اور ساتھ ہی یہ بھی یقین رکھے کہ ادائے فرض کی راہ میں مرنا اِس دنیا کی زندگی اور اِس زندگی کے تمام اندوختوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔''
>
> (تدبر قرآن ۲/ ۲۰۷)

۹۸۸ اصل میں 'فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'مَا' ہمارے نزدیک جملے کے آہنگ کو قائم رکھنے کے لیے آ گیا ہے۔

لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ

اگر تم درشت خو اور سخت دل ہوتے تو یہ سب تمھارے پاس سے منتشر ہو جاتے۔ اِس لیے اِن سے درگذر کرو، اِن کے لیے مغفرت چاہو اور معاملات میں اِن سے مشورہ لیتے رہو۔[۹۸۹] پھر جب فیصلہ کر لو تو اللہ پر بھروسا کرو،[۹۹۰] اِس لیے کہ اللہ کو وہی لوگ پسند ہیں جو اُس پر

---

[۹۸۹] اِس سے پہلے منافقین پر جو تنقید کی گئی ہے، اُس کا اثر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں پر یہ پڑ سکتا تھا کہ سب کا رویہ اُن کے بارے میں سخت ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اِس مرحلے میں یہ پسند نہیں کیا۔ چنانچہ بطور التفات فرمایا ہے کہ اِس سے پہلے بھی جو کریمانہ طرز عمل آپ نے اختیار کیے رکھا ہے، وہی صحیح تھا اور اب بھی آپ کی یہ روش قائم رہنی چاہیے تاکہ جن کے اندر اصلاح پذیری کی ادنیٰ گنجایش بھی باقی ہے، وہ اپنے آپ کو درست کر لیں۔ اِس کے ساتھ ایک مزید ہدایت یہ فرمائی ہے کہ حسب سابق اِن سے مشورہ بھی کرتے رہیے، اِس لیے کہ مسلمانوں کی جماعت سے اِن کو الگ کر دینے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ اِن کی مہلت باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِن کے بارے میں کوئی فیصلہ آ جانے تک اِن کے معاشرتی حقوق اُسی طرح قائم رہنے چاہییں، جس طرح ہمیشہ سے قائم ہیں۔

اِس ہدایت کا موقع یہی ہے، لیکن اِس سے یہ بات نکلتی ہے کہ ارباب حل وعقد کے لیے عام حالات میں پسندیدہ طریقہ نرمی، چشم پوشی اور عفو ودرگذر ہی کا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِسی سے افراد میں حسن ظن اور اعتماد پیدا ہوتا ہے جس سے اجتماعی نظام میں وحدت، قوت اور استحکام کی برکتیں ظہور میں آتی ہیں۔ سختی اور سخت گیری اِس کی فطرت میں نہیں، بلکہ اِس کے عوارض میں سے ہے۔ جس طرح صحت کے لیے اصل شے غذا ہے، لیکن کبھی کبھی کسی مرض کے علاج کے لیے دوا کی بھی ضرورت پیش آ جاتی ہے، اِسی طرح اجتماعی نظام میں اصل چیز نرمی

الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿١٥٩﴾ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ
فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿١٦٠﴾
وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ۭ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿١٦١﴾
اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَاۗءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ

بھروسا کرنے والے ہوں۔ (ایمان والو)، اگر اللہ تمھاری مدد پر ہو تو کوئی تم پر غلبہ نہیں پا سکتا اور وہ تمھیں چھوڑ دے تو اُس کے بعد کون ہے جو تمھاری مدد کرے گا؟ اور اِیمان والوں کو تو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔[۹۹۱] ۱۵۹-۱۶۰

(یہ سمجھتے ہیں کہ اِس جنگ کے لیے باہر نکل کر پیغمبر نے اِن سے بدخواہی کی ہے۔ ہرگز نہیں)، یہ کسی پیغمبر کے شایانِ شان ہی نہیں کہ بدخواہی کرے اور (اِنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) جو کوئی بدخواہی کرے گا، قیامت کے دن وہ اپنی اِس بدخواہی کے ساتھ ہی حاضر ہوگا۔ پھر ہر شخص کو اُس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور اُن پر کوئی زیادتی نہیں

ہے، سختی کبھی کبھی ضرورت کے تحت اختیار کرنی پڑتی ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/۲۱۰)

۹۹۰ یعنی مشورے کے بعد جب فیصلہ کر لو تو اِس کی پروا نہ کرو کہ اِن میں سے کون تمھارا ساتھ دیتا ہے اور کون نہیں دیتا۔ اِن کی بات مانی جائے یا نہ مانی جائے، دونوں صورتوں میں یہ نازک سے نازک موقع پر تمھیں چھوڑ کر جا سکتے ہیں۔ اِس کی فکر نہ کرو، تمھارے لیے اللہ اور سچے ایمان والے ہی کافی ہیں۔

۹۹۱ یعنی اصلی چیز اللہ پر بھروسا ہے۔ یہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ اسباب و وسائل کی حیثیت بندۂ مومن کے لیے ہمیشہ ثانوی ہوتی ہے۔

جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ
بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ
اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ

کی جائے گی۔ پھر کیا وہ جو خدا کی خوشنودی چاہے، وہ اُن لوگوں کی طرح ہو جائے گا جو خدا کی ناراضی لے کر لوٹے اور جن کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے؟ اللہ کے نزدیک اِن کے درجے الگ الگ ہوں گے اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔[۹۹۲] حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے تو مسلمانوں پر بڑا احسان فرمایا ہے کہ اُن کے اندر خود اُنھی میں سے ایک رسول اٹھایا ہے[۹۹۳] جو اُس کی آیتیں اُنھیں سناتا ہے اور اُن کا تزکیہ

۹۹۲؎ یہ منافقین کے اُس الزام کی تردید ہے جو اُنھوں نے احد میں نقصان کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لگایا اور جس کے ذریعے سے مسلمانوں کے اندر بددلی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... الزام یہ تھا کہ ہم نے تو اِس شخص پر اعتماد کیا، اِس کے ہاتھ پر بیعت کی، اپنے نیک و بد کا اِس کو مالک بنایا، لیکن یہ اِس اعتماد سے بالکل غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ہمارے جان و مال کو اپنے ذاتی حوصلوں اور امنگوں کے لیے تباہ کر رہے ہیں۔ ہم نے تو واضح طور پر یہ مشورہ دیا تھا کہ شہر کے اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے، لیکن اِنھوں نے ہمارے مشوروں کی اور ہمارے بھائیوں کی جانوں کی کوئی قدر و قیمت نہ سمجھی اور اُن کو ایک بالکل نامناسب مقام میں لے جا کر دشمن سے تہ تیغ کرا دیا، یہ صریحاً قوم کی بدخواہی اور اُس کے ساتھ غداری و بے وفائی ہے۔“
>
> (تدبر قرآن ۲/ ۲۱۱)

۹۹۳؎ یعنی یہ اللہ کا احسان ہے کہ اُس نے یہ رسول اُنھی کے اندر سے اٹھایا ہے تا کہ کسی نوعیت

ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۱۶۴﴾

کرتا ہے[994] اور اِس کے لیے اُن کو قانون اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے[995]۔ اور اِس میں شبہ نہیں کہ اِس سے پہلے تو وہ کھلی گم راہی میں تھے[996]۔ ۱۶۱-۱۶۴

کی کوئی اجنبیت اُن کے اور اِس رسول کی دعوت کے مابین رکاوٹ نہ بنے اور اُس کی آواز کو وہ خود اپنے ضمیر کی آواز کی طرح پہچانیں اور سنیں۔

۹۹۴ یہ اِسی احسان کا دوسرا پہلو ہے کہ اِس رسول کے ذریعے سے جو دعوت پیش کی جا رہی ہے، وہ اُن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو پاکیزہ بنانے کی دعوت ہے۔ پھر اِس سے بڑھ کر اُن کے حق میں نصح و خیر خواہی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ اِس مفہوم کے لیے عربی زبان کا جو لفظ قرآن نے اختیار کیا ہے، وہ تزکیہ ہے۔ اِس کے معنی کسی چیز کو آلایشوں سے پاک کرنے کے بھی ہیں اور نشوونما دینے کے بھی۔ انبیا علیہم السلام انسانوں کو جس قانون و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں، اُس سے یہ دونوں ہی چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔

۹۹۵ اصل میں ‘یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ’ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ‘الکتاب’ قرآن کی زبان میں جس طرح خط اور کتاب کے معنی میں آتا ہے، اُسی طرح قانون کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ قرآن کے نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور ‘الحکمة’ جب اِس طرح عطف ہو کر آتے ہیں تو ‘الکتاب’ سے شریعت اور ‘الحکمة’ سے ایمان و اخلاق کے مباحث مراد ہوتے ہیں۔

۹۹۶ یہ احسان کا تیسرا پہلو ہے کہ جن لوگوں میں اِس پیغمبر کی بعثت ہوئی ہے، وہ گم راہیوں میں بھٹک رہے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن پر کرم فرمایا اور گم راہی سے نکال کر ہدایت کی سیدھی راہ پر گام زن کر دیا۔

اِس مفہوم کے لیے اصل میں ‘وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ’ کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ‘اِنْ’ درحقیقت ‘اِنَّ’ ہے جس پر ‘ل’ دلالت کر رہا ہے۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ
قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٦٥﴾ وَمَآ
اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۙ﴿١٦٦﴾

اور (ہاں)، جب ایک مصیبت تمھیں پہنچی جس سے دوگنی مصیبت (اِس سے پہلے) تم نے اُنھیں پہنچائی تھی تو کیا یہ بات بھی تم نے کہی کہ یہ کہاں سے آ گئی؟[۹۹۷] اِن سے کہہ دو، (اے پیغمبر) کہ یہ تمھاری اپنی ہی لائی ہوئی ہے۔[۹۹۸] (اللہ فتح دیتا ہے تو اپنی حکمت کے مطابق شکست بھی دلواتا ہے)، اِس لیے کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اور مزید یہ کہ جب دونوں فوجیں بھڑیں تو اُس دن جو مصیبت تم پر آئی، وہ اللہ کے اذن

---

[۹۹۷] یہ اعتراض جن لوگوں نے کیا، وہ اِس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ خدا کے رسول تو اللہ کی حفاظت میں ہوتے ہیں اور فرشتے ہر موقع پر اُن کی مدد کرتے ہیں، اِس لیے یہ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ اُنھیں اور اُن کے ساتھیوں کو کسی معرکے میں نقصان اٹھانا پڑے۔ اِس خیال کے لوگ احد کے نقصان سے سخت پریشان ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کے متعلق بھی اُن کے دل میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہونے لگے۔ چنانچہ منافقین نے اُن کی اِس ذہنی کیفیت سے فائدہ اٹھایا اور اِس نقصان کو آپ کے خلاف ایک دلیل کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا۔ قرآن نے اِس آیت میں اور اِس کے بعد کی آیات میں اِسی غلط فہمی کو دور کیا ہے اور اِس موقع پر جو آزمایش پیش آئی، اُس کی حکمت واضح فرمائی ہے۔

[۹۹۸] یہ اُس غلطی کی طرف اشارہ ہے جو احد کی جنگ میں درے کی حفاظت کے لیے کھڑے ہوئے لوگوں سے ہوئی۔ اُنھوں نے حکم کی خلاف ورزی کی اور مال غنیمت کی طمع میں اپنی جگہ چھوڑ دی جس کے نتیجے میں مسلمان اُس مصیبت سے دوچار ہوئے جس کا ذکر اِن آیتوں میں ہوا ہے۔

وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚۖ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ
اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ
وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ۚ ﴿١٦٧﴾ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا
لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿١٦٨﴾

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ

سے آئی اور اِس لیے آئی کہ اللہ اُن کو بھی دیکھ لے جو سچے مومن ہیں اور اُن کو بھی جو (ابتدا ہی سے) منافقت اختیار کیے ہوئے تھے۔ (وہی کہ) اُن سے کہا گیا کہ آؤ، اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا کم سے کم (اپنے شہر کی) مدافعت ہی کرو تو اُنھوں نے کہا تھا کہ اگر ہم جانتے کہ جنگ ہونی ہے تو ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔ اُس دن ایمان سے زیادہ وہ کفر کے قریب تھے۔ وہ اپنے منہ سے وہ باتیں کہہ رہے تھے جو اُن کے دل میں نہیں تھیں اور اللہ خوب واقف تھا اُس سے جو وہ چھپائے ہوئے تھے۔ وہی جو بیٹھے رہے اور اپنے (اُن) بھائیوں کے بارے میں (جو لڑنے کے لیے نکلے)، کہہ دیا کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے تو (اِس طرح) قتل نہ ہوتے۔[۹۹۹] اِن سے کہہ دو کہ اچھا اب اپنے اوپر سے موت کو ٹال کر دکھانا، اگر تم سچے ہو۔ ۱۶۵—۱۶۸

---

[۹۹۹] یہ قرآن نے ایک گفتگو جنگ سے پہلے اور ایک اُس کے بعد کی نقل کر کے گویا آئینہ فراہم کر دیا ہے، جس میں اِن منافقین کے چہرے دیکھ لیے جا سکتے تھے۔

بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ
فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ
اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ
اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ۚۛ اَلَّذِيْنَ
اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِيْنَ
اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۲﴾ۚ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ

(اِن باتوں کی پروا نہ کرو، اے پیغمبر)، اور (اِس جنگ کے دوران میں) جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، اُنھیں ہرگز مردہ خیال نہ کرو۔ وہ مردہ نہیں، بلکہ اپنے پروردگار کے حضور میں زندہ ہیں، اُنھیں روزی مل رہی ہے۔ اللہ نے جو کچھ اپنے فضل میں سے اُنھیں عطا فرمایا ہے، اُس پر شاداں و فرحاں، اُن کے اخلاف میں سے جو لوگ ابھی اُن سے نہیں ملے، اُن کے بارے میں خوشیاں مناتے ہوئے کہ (خدا کی اِس ابدی بادشاہی میں) اُن کے لیے بھی نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ کبھی غم زدہ ہوں گے، اللہ کی نعمتوں اور اُس کے فضل سے خوش وقت اور اِس بات سے کہ ایمان والوں کے اجر کو اللہ کبھی ضائع نہ کرے گا،[۱۰۰۰] اُن لوگوں کے اجر کو جنھوں نے چوٹ کھانے کے بعد بھی اللہ اور اُس کے رسول کی آواز پر لبیک کہی ہے۔[۱۰۰۱] اُن میں سے جنھوں نے خوبی سے کام کیے اور

[۱۰۰۰] اِن آیتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اِن کے ذریعے سے قرآن نے نہایت بلاغت کے ساتھ وہ تمام اثرات مٹا دیے ہیں جو منافقین مسلمانوں، خاص کر شہدا کے پس ماندگان کے دلوں میں پیدا کرنا چاہتے تھے۔

اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا
حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ

خدا سے ڈرتے رہے،[۱۰۰۱][۱۰۰۲] اُن کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ یہ وہ ہیں کہ جنھیں لوگوں نے کہا کہ دشمن نے تمھارے خلاف بڑی طاقت جمع کر لی ہے، سو اُس سے ڈرو تو اُن کا ایمان (یہ سن کر) اور بڑھ گیا اور اُنھوں نے جواب دیا کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہ

۱۰۰۱۔ یہ اُس مہم کا ذکر ہے جس کی منادی اللہ و رسول کی طرف سے احد کی جنگ کے بعد دشمن کے تعاقب کے لیے کی گئی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...تاریخ و سیرت کی کتابوں میں بیان ہوا ہے کہ احد میں مسلمانوں کی شکست کے بعد قریش کی فوج اول اول تو واپس چلی گئی، لیکن روحاء کے مقام تک پہنچنے کے بعد ابوسفیان اور اُن کے ساتھیوں کو احساس ہوا کہ اُنھوں نے اِس قدر جلد واپس ہونے میں سخت غلطی کی ہے، لگے ہاتھوں اُنھیں مدینے کا قصہ بھی پاک کر دینا تھا۔ یہ سوچ کر اُنھوں نے اپنی فوج کی از سر نو تنظیم شروع کر دی اور اُدھر مسلمانوں کو ہراساں کرنے کے لیے منافقین کے ذریعے سے یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ قریش نئے ساز و سامان سے مدینے پر حملہ کرنے کے لیے تیاریاں کر رہے ہیں۔ حضور کو جب اِس کی اطلاع پہنچی تو آپ نے بھی لوگوں کو قریش کے تعاقب کے لیے تیار ہو جانے کا حکم دے دیا۔ اِس فوج میں صرف اُنھی لوگوں کو شامل ہونے کی اجازت دی گئی جو پہلے روز کی جنگ میں شریک رہے تھے۔ یہ احتیاط غالباً اِس لیے کی گئی کہ منافقین کے لوث سے یہ لشکر پاک رہے۔ چنانچہ حضور جاں نثاروں کی ایک جماعت کے ساتھ ابوسفیان کے تعاقب میں نکلے اور حمراء الاسد تک گئے جو مدینہ سے ۸ میل کے فاصلے پر ہے۔ ابوسفیان نے جب دیکھا کہ ابھی مسلمانوں کے حوصلے میں کوئی فرق نہیں آیا ہے تو ارادہ بدل دیا اور مسلمان کامیاب و بامراد واپس آ گئے*۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۲۱۶)

۱۰۰۲۔ اصل میں ’لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ’اِحْسَان‘ سے مراد اللہ و رسول کی وفاداری کے حق کو بہتر سے بہتر صورت میں ادا کرنا ہے اور ’تَقْوٰی‘ کے معنی

---

* تاریخ الامم والملوک، الطبری ۲/ ۴۷۔ الکامل فی التاریخ، ابن الاثیر ۲/ ۵۲۔ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳/ ۴۴۔

لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ (۱۷۴)
اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۱۷۵)

بہترین کارساز ہے[۱۰۰۳]۔ سو وہ اللہ کی نعمت اور اُس کا فضل لے کر (اِس مہم سے) واپس آئے، اُن کو کوئی گزند نہیں پہنچا اور وہ اللہ کی خوشنودی کے طلب گار رہے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑی عنایت کرنے والا ہے۔ (اب یہ بات تو تم پر واضح ہو گئی کہ) یہ شیطان ہی ہے جو اپنے ساتھیوں کے ڈراوے دے رہا تھا[۱۰۰۴]۔ سو اِن سے مت ڈرو، اگر تم سچے مومن ہو تو صرف مجھ سے ڈرو۔ ۱۶۹-۱۷۵

نفاق کی تمام آلایشوں سے بچنے کے ہیں۔

[۱۰۰۳] یہ بات بھی، ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو ہراساں کرنے کے لیے کہی گئی، لیکن اُن کے عزم و جزم میں اِس سے کوئی فرق نہیں آیا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... یہ خبر بجاے اِس کے کہ اُن کے اندر خوف و ہراس پیدا کرتی، اُن کے عزم و ایمان کو بڑھانے کا سبب بن گئی۔ قاعدہ ہے کہ جس کنوئیں کے سوتے زوردار ہوں، اُس کے اندر سے جتنا ہی پانی نکالا جائے، اتنا ہی اُس کے سوتے اور زیادہ جوش کے ساتھ ابلتے ہیں۔ اِسی طرح آگ اگر قوت ور ہو تو گیلی لکڑی بھی اُس میں ڈالیے تو اُس کو بھی اپنی غذا بنا کر مزید طاقت ور بن جاتی ہے۔ یہی حال اصحاب عزم و ایمان کا ہے۔ اُن کو بھی رکاوٹیں ضعیف کرنے کے بجاے اور زیادہ پرعزم اور پرحوصلہ بنا دیتی ہیں۔ ہر آزمایش اُن کی مخفی صلاحیتوں کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہے اور ہر امتحان اُن کے لیے فتح مندی کا ایک نیا میدان کھولتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۲۱۷)

[۱۰۰۴] شیطان کے ساتھیوں سے مراد، ظاہر ہے کہ یہاں قریش اور اُن کے اعوان و انصار ہیں۔

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ
يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ
وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ
يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ
وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰي مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ

اور تمھارے لیے، (اے پیغمبر)، یہ لوگ کسی غم کا باعث نہ ہوں جو (اِس وقت) کفر کی راہ میں بڑے سرگرم ہیں۔ یہ اللہ کو ہرگز کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ اللہ چاہتا ہے کہ آخرت میں اِن کا کوئی حصہ نہ رکھے۔ (یہ مجرم ہیں) اور اِن کے لیے وہاں ایک بڑا عذاب ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ایمان کو چھوڑ کر جن لوگوں نے بھی اپنے لیے کفر خریدا ہے، وہ اللہ کو ہرگز کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور اُن کے لیے (اُس نے) بڑا دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ یہ ڈھیل جو ہم اِن کو دے رہے ہیں، اِس کو یہ منکر اپنے حق میں ہرگز کوئی بہتری کی چیز نہ سمجھیں۔ (اِنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) اِن کو یہ ڈھیل ہم صرف اِس لیے دے رہے ہیں کہ اپنے گناہوں میں کچھ اور اضافہ کر لیں۔ (اِس کے بعد اِنھیں ہمارے ہی پاس آنا ہے) اور (وہاں) ایک سخت ذلیل کر دینے والی سزا اِن کی منتظر ہے۔ ۱۷۶-۱۷۸

(اِس جنگ کے موقع پر جو آزمایش پیش آئی ہے، یہ اُس کو سمجھ نہیں رہے۔ اِنھیں بتاؤ

الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ
وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ
هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

کہ) اللہ یہ نہیں کر سکتا تھا کہ ناپاک کو پاک سے الگ کیے بغیر مسلمانوں کو اُسی طرح چھوڑ دے، جس طرح تم تھے،[۱۰۰۵] اور نہ یہ اللہ کا طریقہ ہے کہ تمھیں غیب پر مطلع کر دے (اور اِن کے دلوں کی حالت جان کر تم اِنھیں الگ الگ کر لو)، بلکہ اللہ (کا طریقہ یہ ہے کہ اِس کے لیے وہ) اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے، منتخب کر لیتا ہے، (پھر اُن کی جدوجہد میں ایسی آزمایش برپا کرتا ہے کہ کھوٹے اور کھرے، سب ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں)، اِس لیے اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان رکھو اور (جان لو کہ) اگر تم ایمان اور تقویٰ اختیار کرو گے تو تمھارے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ ۱۷۹

اور (اِن میں سے) جو لوگ اُن چیزوں میں بخل کرتے ہیں جو اللہ ہی نے اپنے فضل سے اُنھیں عطا فرمائی ہیں، وہ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ یہ اُن کے لیے بہتر ہے۔ نہیں، یہ اُن

[۱۰۰۵] اِس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت کے بعد جزا و سزا کا جو فیصلہ اِن کے لیے اِسی دنیا میں صادر ہونے والا تھا، وہ اِس کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ اِس طرح کے کسی فیصلے کے لیے انصاف کا تقاضا یہی تھا کہ پہلے لوگوں کو ایمان و عمل کے لحاظ سے الگ الگ کر دیا جائے۔

خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ

کے حق میں بہت برا ہے۔ (اُنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) جس چیز پر اُنھوں نے بخل کیا ہے، قیامت کے دن عنقریب اُس کا طوق اُنھیں پہنایا جائے گا اور (معلوم ہونا چاہیے کہ) زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے جانتا ہے۔[۱۰۰۶] اللہ نے اُن لوگوں کی بات سن لی ہے جنھوں نے کہا ہے کہ اللہ محتاج ہے اور ہم غنی ہیں۔[۱۰۰۷] اِن کی یہ باتیں ہم لکھ رکھیں گے[۱۰۰۸] اور اِن کا پیغمبروں کو ناحق قتل کرنا بھی

[۱۰۰۶] یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ منافقین جس طرح جان دینے سے جی چراتے تھے، اُسی طرح مال کے معاملے میں بھی چور تھے اور اُسے خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے تھے۔

[۱۰۰۷] یہ منافقین کے اُس استہزا کا ذکر ہے جو وہ قرآن کی دعوت انفاق کا کرتے تھے۔ قرآن جب یہ کہتا کہ کون ہے جو اللہ کو قرض دے تو یہ اُس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتے کہ جی ہاں، اللہ اِن دنوں بہت غریب ہو گئے ہیں، اِس لیے وہ ہم امیروں سے قرض مانگ رہے ہیں۔

[۱۰۰۸] اصل الفاظ ہیں: 'سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا'۔ یہ تہدید نہایت بلیغ ہے۔ استاذ امام نے اِس کی بلاغت اِس طرح واضح فرمائی ہے:

> ”...فن بلاغت کے اداشناس اندازہ کر سکتے ہیں کہ اِن دو لفظوں کے اندر جو قہر و غضب چھپا ہوا ہے، اُس کی تعبیر ہم عاجزوں کے قلم سے صفحوں میں بھی ممکن نہیں ہے۔ پھر اِس سے زیادہ بلیغ بات یہ ہے کہ اِسی پر عطف کر دیا ہے 'وَقَتْلَهُمُ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ' کو، یعنی اِن کے ناحق قتل انبیا کو بھی ہم نے لکھ رکھا ہے۔ یہ قتل انبیا کا جرم، ظاہر ہے کہ یہود کا ہے۔ منافقین کے ایک قول اور یہود کے ایک فعل کو ایک ہی زمرے میں اِس طرح شمار کرنا اور دونوں کے لیے ضمیر بھی ایک ہی

ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿١٨١﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿١٨٢﴾ج

اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ط قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿١٨٣﴾ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ

ہم نے لکھ رکھا ہے۔ اور (فیصلے کے دن) اِن سے کہیں گے کہ اب چکھو آگ کا عذاب۔ یہ اُسی کا بدلہ ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں آگے بھیجا تھا اور اِس لیے ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ ۱۸۰-۱۸۲

یہ لوگ، جنھوں نے کہا ہے کہ اللہ نے ہمیں یہ ہدایت کر رکھی ہے کہ ہم کسی رسول کی بات اُس وقت تک نہ مانیں گے، جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی پیش نہ کرے جسے (آسمان سے اتر کر) آگ کھا لے، اِن سے کہو: تمھارے پاس مجھ سے پہلے بہت سے رسول نہایت واضح نشانیاں لے کر آ چکے ہیں اور وہ نشانی بھی لائے ہیں جس کے لیے تم کہہ رہے ہو، پھر تم نے اُن کو قتل کیوں کر دیا، اگر تم سچے ہو؟[۱۰۰۹] اِس لیے، (اے پیغمبر)،

استعمال کرنا یہاں دو باتوں پر دلیل ہے: ایک تو اِس بات پر کہ یہ سنگین بات کہہ کر یہ منافقین یہود کی اُسی برادری میں پھر جا شامل ہوئے ہیں جس سے نکل کر اُنھوں نے اسلام میں داخل ہونے کا ڈھونگ رچایا تھا۔ دوسری یہ کہ منافقین کا یہ استہزا اور یہود کا یہ عمل، دونوں ایسے سنگین جرائم ہیں کہ خدا اِن کو بھولنے والا نہیں ہے، بلکہ وہ بھی ایک دن اُن سے کہے گا کہ 'ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ'، خدا کا یہ عذاب چکھو اور یہ عذاب جو کچھ بھی ہوگا، اُن کے اعمال ہی کا ثمرہ و نتیجہ ہوگا،

وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا

یہ تمھیں جھٹلاتے ہیں تو اِس میں تعجب کی کیا بات ہے، بہت سے رسول تم سے پہلے بھی (اِسی طرح) جھٹلائے گئے ہیں جو کھلی ہوئی نشانیاں اور صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے تھے۔[۱۰۱۰] (تم انتظار کرو اور یہ بھی انتظار کریں)، ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور

اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر کسی قسم کا ظلم کرنے والا نہیں ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/۲۱۹)

۱۰۰۹۔ اِس سے پہلے منافقین کے ذکر سے بات یہود کے ذکر تک پہنچ گئی تھی، اِس لیے یہ اُن کی ایک شرارت کا حوالہ دے کر اُس کی بھی تردید فرمادی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''یہود کی جس شرارت کا حوالہ دیا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو چپ کرنے کے لیے یہ کہتے کہ ہمیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت ہے کہ ہم کسی شخص کے دعویٰ رسالت کی اُس وقت تک تصدیق ہی نہ کریں، جب تک اُس سے یہ معجزہ نہ صادر ہو کہ وہ ایسی قربانی پیش کرے جس کو کھانے کے لیے قبولیت کے نشان کے طور پر آسمان سے آگ اترے۔ یہ بات یہود محض شرارت کی وجہ سے کہتے تھے۔ تورات میں بعض انبیا سے اِس معجزے کا صادر ہونا مذکور ہے۔ مثلاً سلاطین ۱۸: ۳۷-۳۸ میں ایلیا نبی کے متعلق اور تواریخ ۷: ۱ میں حضرت سلیمان کے متعلق، لیکن یہ کہیں مذکور نہیں ہے کہ یہ معجزہ لوازم و شرائط نبوت میں سے ہے، جب تک کوئی نبی یہ معجزہ نہ دکھائے، اُس کا دعویٰ نبوت ہی قابل غور نہیں، بالخصوص آخری نبی سے متعلق تو اُن کے ہاں جو پیشین گوئیاں ہیں، وہ اِس قسم کے تکلفات سے بالکل ہی خالی ہیں۔'' (تدبر قرآن ۲/۲۲۰)

۱۰۱۰۔ اصل میں یہاں تین لفظ استعمال ہوئے ہیں: بینات، زبر اور کتاب منیر۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِن کی وضاحت اِس طرح فرمائی ہے:

''بینات' کے معنی واضح اور روشن کے ہیں۔ یہ لفظ آیات کی صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں یہ لفظ تنہا بغیر موصوف کے استعمال ہوا ہے، دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ واضح اور مسکت دلائل کے معنی میں یا حسی معجزات کے معنی میں۔

'زبر' زبور کی جمع ہے۔ اِس کے معنی ٹکڑے، قطعے اور صحیفے کے ہیں۔ مزامیر داؤد کے لیے اِس کا

تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ
الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾
لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ۫ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ؕ وَاِنْ
تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾ وَاِذْ اَخَذَ
اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ز

تم کو تمھارا پورا پورا بدلہ تو قیامت کے دن ہی ملے گا۔ پھر جو دوزخ سے بچا لیا جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے، وہی کامیاب ہے اور یہ دنیا کی زندگی تو محض دھوکے کا سودا ہے۔ ۱۸۳-۱۸۵

(ایمان والو)، تمھارے جان و مال میں تمھاری آزمایش تو ہر حال میں ہونی ہے اور اُن لوگوں کی طرف سے جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور اُن لوگوں کی طرف سے جنھوں نے شرک کیا ہے، تمھیں بہت سی تکلیف دہ باتیں بھی سننا پڑیں گی۔[101] البتہ، اگر تم ثابت قدم رہے اور تم نے تقویٰ اختیار کیے رکھا تو خدا تمھاری مدد کرے گا، اِس لیے کہ یہی وہ کام

استعمال معروف ہے۔ یہاں اِس سے مراد انبیا کے وہ صحائف ہیں جو تورات کے مجموعہ میں شامل ہیں۔

'کتاب منیر' سے مراد تورات ہے۔ قرآن سے پہلے کی نازل شدہ چیزوں میں سے تورات ہی ہے جو اِس لفظ کا اصلی مصداق ہو سکتی ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/۲۲۱)

[101] یہ اُن آزمایشوں کی طرف اشارہ ہے جو پیغمبر کے ساتھیوں کو اُس کے منکرین کی طرف سے اُن کی تطہیر کے لیے لازماً پیش آتی ہیں تاکہ عذاب سے پہلے وہ اُن سے الگ بالکل نمایاں ہو جائیں۔

فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ
مَا يَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ
اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ
بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾ وَلِلّٰهِ مُلْكُ

ہیں جو (اِس کے لیے) ضروری قرار دیے گئے ہیں۔ اور اُن لوگوں کو جنھیں کتاب دی گئی، اُن کا وہ عہد بھی یاد دلاؤ جو اللہ نے اُن سے لیا تھا کہ تم لوگوں کے سامنے اِس کتاب کو لازماً بیان کرو گے اور اِسے ہرگز نہ چھپاؤ گے۔ پھر اُنھوں نے اِسے پس پشت ڈال دیا[۱۰۱۲] اور اِس کے بدلے میں بہت تھوڑی قیمت لے لی۔ سو کیا ہی بری ہے وہ چیز جسے یہ خرید لائے ہیں۔ تم اُن لوگوں کو ہرگز عذاب سے بری نہ سمجھو جو اپنے اِن کرتوتوں پر مگن ہیں اور ایسے کاموں پر اپنی تعریف چاہتے ہیں جو اُنھوں نے کیے نہیں ہیں[۱۰۱۳]، بلکہ اُن

[۱۰۱۲] یعنی اِس طرح کی باتیں تو اُنھیں یاد ہیں کہ بعض پیغمبروں نے ایسی قربانی کی تھی جسے آگ نے آسمان سے اتر کر کھا لیا تھا، مگر اللہ نے اپنی کتاب اُن کے سپرد کرتے وقت جو عہد اُن سے لیا تھا، وہ اُنھیں یاد نہیں رہا۔ اُنھیں یاد دلاؤ کہ اُن کا یہ عہد اب بھی اُن کی کتابوں میں لکھا ہوا موجود ہے۔ چنانچہ استثنا میں ہے:

> ”اِس لیے میری اِن باتوں کو تم اپنے دل اور اپنی جان میں محفوظ رکھنا اور نشان کے طور پر اِن کو اپنے ہاتھوں پر باندھنا اور وہ تمھاری پیشانی پر ٹیکوں کی مانند ہوں۔ اور تم اِن کو اپنے لڑکوں کو سکھانا اور تو گھر بیٹھے اور راہ چلتے اور لیٹتے اور اٹھتے وقت اِن ہی کا ذکر کیا کرنا۔ اور تو اِن کو اپنے گھر کی چوکھٹوں پر اور اپنے پھاٹکوں پر لکھا کرنا۔“ (۱۱:۱۸-۲۰)

اِسی طرح انجیلوں میں بھی یہ نہایت موثر اسلوبوں میں بیان ہوا ہے۔ متی میں ہے:

> ”جو کچھ میں تم سے اندھیرے میں کہتا ہوں، اجالے میں کہو اور جو کچھ تم کان میں سنتے ہو،

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۸۹﴾
اِنَّ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ
لَاٰيٰتٍ لِّاُولِى الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ۚۙ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا
وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ
رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾

کے لیے ایک دردناک سزا تیار ہے۔ (وہ اِس سے بھاگ کر کہیں جا نہیں سکتے، اِس لیے کہ) زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ ۱۸۶-۱۸۹

* * *

[۱۰۱۴](یہ عقل کے اندھے ہیں، اِس لیے پیغمبر پر ایمان کے لیے نشانی مانگتے ہیں، ورنہ) حقیقت یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں کے بنانے میں اور دن اور رات کے باری باری آنے میں اُن لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو بصیرت والے ہیں۔ اُن کے لیے جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے اور زمین اور آسمانوں کی خِلقت میں غور کرتے رہتے ہیں[۱۰۱۵]۔ (اُن کی دعا یہ ہوتی ہے کہ) پروردگار، تو نے یہ سب

کوٹھوں پر اُس کی منادی کرو۔'' (۱۰:۲۷)

[۱۰۱۳] یعنی اللہ کے عہد کو اپنے دنیوی اغراض کے لیے حقیر داموں بیچ دینے کے باوجود جن کی خواہش ہے کہ اُنھیں حامل کتاب سمجھا جائے، اُنھیں خدا کی برگزیدہ امت قرار دیا جائے اور دنیا اور آخرت، دونوں میں خدا کی تمام عنایتوں اور تمام لطف و کرم کا تنہا حق دار مانا جائے۔

[۱۰۱۴] سورہ کی آخری فصل ختم ہوئی۔ یہاں سے اب خاتمۂ سورہ کی آیات شروع ہوتی ہیں۔

[۱۰۱۵] اِس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے نزدیک اہل عقل اور ارباب بصیرت وہی ہیں جو اِس

رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ

بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ تو اِس سے پاک ہے کہ مقصد کے بغیر کوئی کام کرے۔ سو ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا لے۔ پروردگار، تو نے جسے دوزخ میں ڈالا، اُسے درحقیقت بڑی رسوائی میں ڈال دیا اور (وہ ایسی جگہ ہے کہ) ظالموں کا وہاں کوئی مددگار نہ ہوگا۔[۱۰۱۶] پروردگار، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا کہ (لوگو)، اپنے

کارخانۂ ہستی پر غور کر کے خدا اور آخرت کے ذکر و فکر تک رہنمائی حاصل کریں۔ نیز یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اللہ کا ذکر ہر حال میں مطلوب ہے اور جس طرح یہ ذکر مطلوب ہے، اُسی طرح فکر بھی مطلوب ہے، اِس لیے کہ آخرت کا یقین اِسی فکر سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ نہ ہو تو ذکر محض زبان کا ایک شغل بن کر رہ جاتا ہے۔ اِس سے زیادہ اِس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

[۱۰۱۶] اِن آیتوں میں قرآن نے کمال بلاغت کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ جو سچے ارباب بصیرت خدا کو یاد رکھتے اور زمین و آسمان کی خلقت میں غور کرتے رہتے ہیں، اُن کا یہ ذکر و فکر کس طرح اُنھیں صحیح نتائج تک پہنچا دیتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...یہ ذکر و فکر خود بخود اُن کو اِس نتیجے تک پہنچا دیتا ہے کہ یہ عظیم کارخانہ بے غایت و بے مقصد نہیں ہو سکتا اور جب بے غایت و بے مقصد نہیں ہو سکتا تو لازم ہے کہ یہ محض اتنے ہی پر تمام نہ ہو جائے، جتنا ظاہر ہو رہا ہے، بلکہ ضروری ہے کہ ایک دن ایسا آئے جس میں گناہ گار اور نیکوکار، دونوں اپنے اپنے اعمال کا بدلہ پائیں اور اِس دنیا کی خلقت میں جو عظیم حکمت پوشیدہ ہے، وہ ظاہر ہو۔

آسمان و زمین کی خلقت اور رات اور دن کی آمد و شد میں جو نشانیاں ہیں، اُن کی طرف یہاں صرف اجمالی اشارہ ہے۔ اِن کی تفصیل پورے قرآن میں پھیلی ہوئی ہے۔ قرآن نے بڑی وضاحت کے ساتھ گونا گوں پہلوؤں سے آفاق کی اُن نشانیوں کو نمایاں کیا ہے جو شہادت دیتی

اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا

پروردگار کو مانو تو ہم نے مان لیا۔[۱۰۱] اب تو ہمارے گناہوں کو بخش دے، اے مالک۔ ہماری

ہیں کہ اِس کائنات کے پیچھے صرف ایک عظیم طاقت ہی نہیں ہے، بلکہ اِس کے ساتھ عظیم حکمت بھی ہے۔ صرف بے پناہ قدرت ہی نہیں ہے، بلکہ بے پایاں رافت و رحمت بھی ہے۔ صرف بے اندازہ کثرت ہی نہیں ہے، بلکہ اِس کثرت کے اندر نہایت حیرت انگیز توافق و توازن بھی ہے۔ یہ چیز ظاہر کرتی ہے کہ اِس دنیا کا پیدا ہونا نہ تو کوئی اتفاقی سانحہ ہے، نہ کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے، بلکہ یہ ایک قدیر و حکیم، عزیز و غفور اور سمیع و علیم کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔ اِس وجہ سے یہ بات اِس کی فطرت کے خلاف ہے کہ یہ خیر و شر اور نیک و بد کے درمیان امتیاز کے بغیر یوں ہی چلتی رہے یا یوں ہی تمام ہو جائے۔ اگر ایسا ہو تو اِس کے معنی یہ ہوں گے کہ یا تو اِس کا کوئی خالق و مالک ہی نہیں ہے، یہ آپ سے آپ کہیں سے آ دھمکی ہے اور اِسی طرح چلتی رہے گی یا یہ کہ نعوذ باللہ اِس کا خالق کوئی کھلنڈرے مزاج کا ہے جو کسی کو گداگر، کسی کو تونگر، کسی کو ظالم اور کسی کو مظلوم بنا کر اُس کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں اُس قدرت اور اُس حکمت کے بالکل منافی ہیں جن کی شہادت اِس کائنات کے گوشے گوشے سے مل رہی ہے۔ ایسی علیم و حکیم ہستی کی شان علم و حکمت کے یہ بات بالکل منافی ہے کہ وہ کوئی بے حکمت کام کرے۔

اِس طرح اِس کائنات کی قدرت و حکمت پر غور کرنے والا شخص نہ صرف خدا تک، بلکہ اقرار آخرت تک خود پہنچ جاتا ہے اور جس کا ذہن اِس حقیقت تک پہنچ جائے گا، ظاہر ہے کہ جزا و سزا کے تصور سے اُس کا دل کانپ اٹھے گا اور اُس کے اندر شدید داعیہ اِس بات کے لیے پیدا ہو گا کہ وہ اُس عذاب اور اُس رسوائی سے پناہ مانگے جو اُن لوگوں کے لیے مقدر ہے جو اِس دنیا کو بس ایک کھلنڈرے کا کھیل سمجھتے رہے اور اِس طرح اُنھوں نے اپنی ساری زندگی بالکل بطالت میں گزار دی۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۲۲۷)

اِن آیتوں کے آخری جملے پر غور کیجیے تو یہ بات بھی اِن میں واضح کر دی گئی ہے کہ قیامت کے دن اِس رسوائی سے زیادہ تر وہ لوگ دوچار ہوں گے جو جھوٹی شفاعتوں پر تکیہ کیے بیٹھے

وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۚ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا
تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۱۹۴﴾
فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ
مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا

برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہمیں اپنے وفادار بندوں کے ساتھ موت دے۔ پروردگار، اپنے رسولوں کی زبان سے جو وعدے تو نے ہم سے کیے ہیں[۱۰۱۸]، وہ ہمارے لیے پورے کر دے اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کر۔ بے شک، تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے[۱۰۱۹]۔ ۱۹۰-۱۹۴

سو اُن کے پروردگار نے اُن کی یہ دعا اِس طرح قبول فرمائی کہ[۱۰۲۰] مرد ہو یا عورت،

ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ اُس دن اُن کا کوئی حمایتی اور مددگار نہ ہوگا۔

[۱۰۱۷] یعنی معجزات اور خوارق نہیں مانگے اور نہ کٹ حجتیاں کی ہیں، بلکہ پیغمبر کی آواز اور اُس کا چہرہ ہی ہمارے لیے معجزہ بن گیا۔ چنانچہ ہم نے جب یہ دیکھا کہ خدا اور آخرت پر ایمان کی یہ دعوت ہمارے دل کی آواز ہے، ہمارا باطن اِس کی شہادت دیتا ہے اور علم و عقل بھی اِسی کا تقاضا کرتے ہیں تو بغیر کسی تردد کے ہم نے اِسے مان لیا ہے۔

[۱۰۱۸] اصل میں 'مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ایک مضاف عربیت کے قاعدے کے مطابق حذف ہو گیا ہے، یعنی 'عَلٰى اَلْسِنَةِ رُسُلِكَ'۔

[۱۰۱۹] اپنے ایمان پر اظہار فخر کے بجاے یہ اِن ارباب بصیرت نے نہایت عاجزی اور فروتنی کے ساتھ اپنے آپ کو اپنے رب کے آگے ڈال دیا ہے کہ جس طرح اُس نے قبول حق کی توفیق عطا فرمائی ہے، اُسی طرح وہ اُن کی کوتاہیوں سے بھی درگذر فرمائے اور اِس راہ کی مشکلات اُن کے لیے آسان کر دے۔

وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا
لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ

میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا کوئی عمل ضائع نہ کروں گا۔[۱۰۲۱] تم سب آپس میں ایک ہی ہو۔[۱۰۲۲] لہٰذا جنھوں نے ہجرت کی ہے اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے ہیں اور میری راہ میں ستائے گئے اور (میرے لیے) لڑے اور مارے گئے ہیں، اُن کے گناہ میں اُن سے دور کر دوں گا اور اُن کو ضرور ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی

[۱۰۲۰] یہ نہایت بلیغ اسلوب میں دعا کی قبولیت کا اظہار ہے۔ گویا اِدھر یہ دعا زبان پر آئی اور اُدھر جواب آ گیا کہ پروردگار نے اِسے قبول کر لیا ہے۔

[۱۰۲۱] یہ اُن تمام اہل ایمان کی حوصلہ افزائی ہے جو خدا کی راہ میں ہجرت اور جہاد جیسے مراحل سے گزرے اور معاندین اسلام کے ہاتھوں لرزہ خیز مظالم کا ہدف بنے رہے۔ 'مرد ہو یا عورت' کے الفاظ اِس جملے میں خاص طور پر اِس لیے بڑھائے گئے ہیں کہ اُس زمانے میں خواتین پر جو ستم توڑے جا رہے تھے، وہ ایسے سخت تھے کہ اُن کو سن کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> "...اِس ٹکڑے نے کلام کو بالکل مطابق حال کر دیا۔ اور کون اندازہ کر سکتا ہے کہ اِن دو لفظوں نے اِن مظلوم خواتین کی کتنی ڈھارس بندھائی ہو گی جو محض اسلام کی خاطر طرح طرح کے مظالم کا نشانہ بنی ہوئی تھیں۔" (تدبر قرآن ۲/۲۳۱)

[۱۰۲۲] یہ اِس بات کی دلیل بیان فرمائی ہے کہ مرد و عورت، دونوں کا عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیوں ایک ہی حیثیت رکھتا ہے؟ اِس سے، اگر غور کیجیے تو قرآن نے اُن تمام جاہلی نظریات کی تردید کر دی ہے جو عورت کو ایک فروتر مخلوق اور مرد کو اُس کے مقابل میں برتر قرار دیتے تھے۔

حُسۡنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾
لَا یَغُرَّنَّکَ تَقَلُّبُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِی الۡبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِیۡلٌ قف
ثُمَّ مَاۡوٰىهُمۡ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئۡسَ الۡمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰکِنِ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّهُمۡ

ہوں گی۔ یہ اللہ کے ہاں سے اُن کی جزا ہے اور بہترین جزا تو اللہ ہی کے پاس ہے۔[۱۰۲۳] ۱۹۵

اِس ملک کے شہروں میں منکروں کی یہ چلت پھرت[۱۰۲۴] تمھیں کسی مغالطے میں نہ ڈالے، (اے پیغمبر)۔ یہ تھوڑا سا لطف ہے،[۱۰۲۵] پھر اِن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیا ہی بری جگہ ہے۔

[۱۰۲۳] اصل میں 'ثَوَابًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'ثَوَابًا' مصدر کے محل میں ہے اور اِس کے معنی اُس ثمرے اور نتیجے کے ہیں جو کسی عمل کے ردعمل میں اُس عمل کے کرنے والے کو حاصل ہوتا ہے۔ اِس تعبیر کی بلاغت استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس طرح واضح فرمائی ہے:

> ”...بندوں کے حقیر اعمال پر اللہ تعالیٰ جو ابدی اور لازوال انعامات عطا فرمائے گا، اُن کو ثواب کے لفظ سے تعبیر کر کے رب کریم نے بندوں کے اعمال کی قدر و قیمت بڑھائی ہے۔ ورنہ ذرے اور پہاڑ میں کیا نسبت ہے۔ 'مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗ حُسۡنُ الثَّوَابِ' کے الفاظ سے اِسی بُعد کو رفع فرمایا گیا ہے۔ یعنی ہے تو تمھارے ہی عمل کا بدلہ، لیکن ہے اللہ کے پاس سے، جس کے پاس حسن ثواب کے خزانے ہیں۔ وہ داتا جس کو جتنا چاہے دے دے۔ اُس کے پاس کیا کمی ہے۔“ (تدبر قرآن ۲/۲۳۱)

[۱۰۲۴] اصل میں لفظ 'تَقَلُّب' استعمال ہوا ہے۔ اِس سے مراد وہ آزادی و خود مختاری اور ایک نوعیت کا غلبہ اور زور ہے جو پیغمبر کے منکروں کو مسلمانوں کے مقابل میں اُس وقت سرزمین عرب میں حاصل تھا۔

[۱۰۲۵] اصل میں 'مَتَاعٌ قَلِیۡلٌ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ خبر ہے جس کا مبتدا یہاں اِس لیے حذف

لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ
عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ۝۱۹۸
وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ
وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۱۹۹

اِس کے برخلاف جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے رہے، اُن کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کے ہاں سے اُن کے لیے پہلی مہمانی ہے[۱۰۲۶] اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے، اُس کے وفادار بندوں کے لیے وہ کہیں بہتر ہے۔ ۱۹۶-۱۹۸

(اِن وفادار بندوں سے اہل کتاب بھی خالی نہیں ہیں)۔ یہ حقیقت ہے کہ اِن اہل کتاب میں ایسے بھی ہیں جو خدا پر سچا ایمان رکھتے ہیں، اُس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو تمھاری طرف نازل کی گئی ہے اور اُس پر بھی جو (اِس سے پہلے) اُن کی طرف نازل کی گئی تھی، اللہ سے ڈرتے ہوئے۔ وہ اللہ کی آیتوں کو تھوڑی قیمت پر بیچ نہیں دیتے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے اُن کا اجر اُن کے پروردگار کے پاس ہے۔ (وہ بہت جلد اُنھیں مل جائے گا)، اِس لیے کہ اللہ حساب چکانے میں دیر نہیں لگاتا۔ ۱۹۹

کر دیا گیا کہ ساری توجہ اِسی خبر پر مرکوز رہے۔

[۱۰۲۶] اصل میں لفظ ’نُزُلًا‘ آیا ہے۔ اِس کا نصب حال کے لیے ہے اور یہ اُس ضیافت کے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا قف
وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾

ایمان والو، (آخری فتح تمھاری ہوگی، لیکن اِس کے لیے ضروری ہے کہ) صبر کرو، اپنے حریفوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ، مقابلے کے لیے تیار رہو اور (تمام معاملات میں) اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ کامیاب رہو۔ ۲۰۰

لیے آتا ہے جو کسی مہمان کے آنے پر سب سے پہلے اُسے پیش کی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کے لیے پہلی پیش کش ہی جنت ہوگی۔ اِس کے بعد اُنھیں مزید کیا ملنے والا ہے، اِس کا اندازہ اِس پیش کش سے کیا جا سکتا ہے۔

لاہور

۵/ مارچ ۲۰۰۶ء

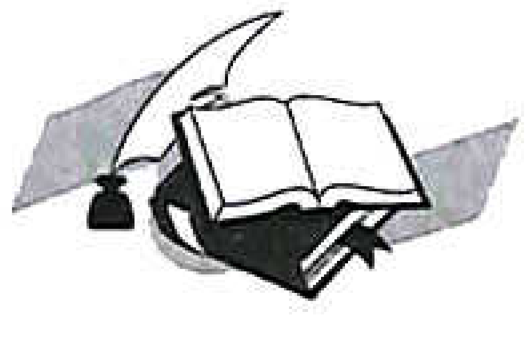

النساء - المائدة

۴ ـــ ۵

النساء - المائدة

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ میں جس امت کے لیے صالح معاشرت کی اساسات واضح کی گئی ہیں، دوسری سورہ میں اُسی پر اتمام نعمت اور اُس کے ساتھ اللہ کے آخری عہد و پیمان کا بیان ہے۔ اِن میں خطاب اگرچہ اہل کتاب سے بھی ہوا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی، لیکن دونوں سورتوں کے مخاطب اصلاً مسلمان ہی ہیں۔ اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ بقرہ و آل عمران کی طرح یہ بھی ہجرت کے بعد مدینہ میں اُس وقت نازل ہوئی ہیں، جب مسلمانوں کی ایک باقاعدہ ریاست وہاں قائم ہو چکی تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اہل کتاب پر اتمام حجت اور مسلمانوں کا تزکیہ و تطہیر کر رہے تھے۔

پہلی سورہ ـــــ النساء ـــــ کا موضوع امت مسلمہ کے لیے صالح معاشرت کی اساسات اور اُس کا تزکیہ و تطہیر ہے۔

دوسری سورہ ـــــ المائدة ـــــ کا موضوع اِس امت پر اتمام نعمت اور اِس کے ساتھ اللہ، پروردگار عالم کے آخری عہد و پیمان کا بیان ہے۔

سورة النسآء

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِيۡرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِهٖ وَالۡاَرۡحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيۡكُمۡ رَقِيۡبًا ①

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

لوگو، اپنے اُس پروردگار سے ڈرو جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی کی جنس سے اُس کا جوڑا بنایا[1] اور اِن دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں (دنیا میں) پھیلا دیں۔ اُس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے مدد چاہتے ہو[2] اور ڈرو رشتوں کے توڑنے سے۔ بے شک، اللہ تم پر نگران ہے[3]۔ ۱

---

[1] اِس مفہوم کے لیے اصل میں 'خَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِنھیں سورۂ نحل (۱۶) کی آیت ۷۲ 'وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجًا' کی روشنی میں دیکھیے تو اِن کا ترجمہ یہی ہو سکتا ہے۔ اِسے 'اُس میں سے' یا 'اُس کے اندر سے' کے معنی میں لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

[2] اصل میں لفظ 'تَسَآءَلُوۡنَ' آیا ہے۔ اِس کے معنی جس طرح ایک دوسرے سے پوچھنے اور سوال کرنے کے ہیں، اُسی طرح ایک دوسرے سے مدد چاہنے کے بھی ہیں۔ یہاں یہ اِسی دوسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

[3] اِس سورہ میں جو ہدایات آگے دی گئی ہیں، یہ آیت اُن کے لیے ایک جامع تمہید کی حیثیت

رکھتی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کے حقائق اپنی تفسیر میں بیان فرمائے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”پہلی بات یہ ہے کہ اِس آیت میں جس تقویٰ کی ہدایت کی گئی ہے، اُس کا ایک خاص موقع و محل ہے۔ اِس تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ یہ خلق آپ سے آپ وجود میں نہیں آ گئی ہے، بلکہ خدا کی پیدا کی ہوئی ہے جو سب کا خالق بھی ہے اور سب کا رب بھی۔ اِس وجہ سے کسی کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اِس کو ایک بے مالک اور بے راعی کا ایک آوارہ گلہ سمجھ کر اِس میں دھاندلی مچائے اور اِس کو اپنے ظلم و تعدی کا نشانہ بنائے، بلکہ ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اِس کے معاملات میں انصاف اور رحم کی روش اختیار کرے، ورنہ یاد رکھے کہ خدا بڑا زور آور اور بڑا منتقم و قہار ہے۔ جو اُس کی مخلوق کے معاملات میں دھاندلی مچائیں گے، وہ اُس کے قہر و غضب سے نہ بچ سکیں گے۔ وہ ہر چیز کی نگرانی کر رہا ہے۔

دوسری یہ کہ تمام نسل انسانی ایک ہی آدم کا گھرانا ہے۔ سب کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی آدم و حوا کی نسل سے پیدا کیا ہے۔ نسل آدم ہونے کے اعتبار سے سب برابر ہیں۔ اِس پہلو سے عربی و عجمی، احمر و اسود اور افریقی و ایشیائی میں کوئی فرق نہیں، سب خدا کی مخلوق اور سب آدم کی اولاد ہیں۔ خدا اور رحم کا رشتہ سب کے درمیان مشترک ہے۔ اِس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ سب ایک ہی خدا کی بندگی کرنے والے اور ایک ہی مشترک گھرانے کے افراد کی طرح آپس میں حق و انصاف اور مہر و محبت کے تعلقات رکھنے والے بن کر زندگی بسر کریں۔

تیسری یہ کہ جس طرح آدم تمام نسل انسانی کے باپ ہیں، اُسی طرح حوا تمام نسل انسانی کی ماں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حوا کو آدم ہی کی جنس سے بنایا ہے، اِس وجہ سے عورت کوئی ذلیل، حقیر، فروتر اور فطری گناہ گار مخلوق نہیں ہے، بلکہ وہ بھی شرف انسانیت میں برابر کی شریک ہے۔ اُس کو حقیر و ذلیل مخلوق سمجھ کر نہ اُس کو حقوق سے محروم کیا جا سکتا نہ کم زور خیال کر کے اُس کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔

چوتھی یہ کہ خدا اور رحم کا واسطہ ہمیشہ سے باہمی تعاون و ہم دردی کا محرک رہا ہے۔ جس کو بھی کسی مشکل یا خطرے سے سابقہ پیش آتا ہے، وہ اُس میں دوسروں سے خدا اور رحم کا واسطہ دے کر اپیل کرتا ہے اور یہ اپیل چونکہ فطرت پر مبنی ہے، اِس وجہ سے اکثر حالات میں یہ موثر بھی ہوتی ہے۔ لیکن خدا اور رحم کے نام پر حق مانگنے والے اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ جس طرح اِن واسطوں پر

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ص وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ط اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۲

(اللہ سے ڈرو) اور یتیموں کے مال اُن کے حوالے کر دو اور اُن کے لیے اُن کے اچھے مال کو اپنے برے مال سے نہ بدلو[۴] اور نہ اُن کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر کھاؤ[۵]، اِس لیے کہ یہ بہت بڑا گناہ ہے[۶]۔ ۲

حق مانگنا حق ہے، اُسی طرح اِن کا حق ادا کرنا بھی فرض ہے۔ جو شخص خدا اور رحم کے نام پر لینے کے لیے تو چوکس ہے، لیکن دینے کے لیے آمادہ نہیں ہے، وہ خدا سے دھوکا بازی اور رحم سے بے وفائی کا مجرم ہے اور اِس جرم کا ارتکاب وہی کر سکتا ہے جس کا دل تقویٰ کی روح سے خالی ہو۔ خدا اور رحم کے حقوق پہچاننے والے جس طرح اِن ناموں سے فائدے اٹھاتے ہیں، اُسی طرح اِن کی ذمہ داریاں بھی اٹھاتے ہیں اور درحقیقت حق طلبی و حق شناسی کا یہی توازن ہے جو صحیح اسلامی معاشرے کا اصلی جمال ہے۔ اِسی حقیقت کی طرف 'وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ' کا ٹکڑا اشارہ کر رہا ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/۲۴۶-۲۴۷)

[۴] اصل میں 'خَبِيْث' اور 'طَيِّب' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ جس طرح اخلاقی لحاظ سے خبیث و طیب چیزوں کے لیے آتے ہیں، اُسی طرح مادی لحاظ سے عمدہ اور ناقص چیزوں کے لیے بھی آتے ہیں۔

[۵] اصل الفاظ ہیں: 'وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ'۔ اِن میں 'اِلٰى' کا صلہ 'ضَمًّا' یا اِس کے ہم معنی کسی لفظ سے متعلق ہے جو عربیت کے اسلوب پر حذف ہو گیا ہے۔

[۶] اِس پوری آیت کا مدعا یہ ہے کہ یتیموں کے سرپرست اُن کے مال اُن کے حوالے کریں، اُسے خود ہضم کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ظلم و ناانصافی سے یتیم کا مال ہڑپ کرنا گویا اپنے پیٹ میں آگ بھرنا ہے۔ لہٰذا کوئی شخص نہ اپنا برا مال اُن کے اچھے مال سے بدلنے کی کوشش کرے اور نہ انتظامی سہولت کی نمایش کر کے اُس کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر کھانے کے مواقع پیدا کرے۔ اِس طرح کا اختلاط اگر کسی وقت کیا جائے تو یہ خرد برد کے لیے نہیں، بلکہ اُن کی بہبود اور اُن کے

وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی فَانۡکِحُوۡا مَا طَابَ
لَکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا
فَوَاحِدَۃً اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ ؕ ذٰلِکَ اَدۡنٰۤی اَلَّا تَعُوۡلُوۡا ؕ﴿۳﴾

اور اگر اندیشہ ہو کہ یتیموں کے معاملے میں انصاف نہ کر سکو گے تو اُن کے ساتھ جو عورتیں ہیں، اُن میں سے جو تمھارے لیے موزوں ہوں[۷]، اُن میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو۔ پھر اگر ڈر ہو کہ (اُن کے درمیان) انصاف نہ کر سکو گے تو (اِس طرح کی صورت حال میں بھی) ایک ہی بیوی رکھو[۸] یا پھر لونڈیاں جو تمھارے قبضے میں ہوں[۹]۔ یہ اِس

معاملات کی اصلاح کے لیے ہونا چاہیے۔

[۷] اصل میں 'مَا طَابَ لَکُمۡ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن کے معنی 'جو پسند آئیں' اور 'جو راضی ہوں' کے بھی ہو سکتے ہیں۔ تاہم جس معنی کو ہم نے ترجیح دی ہے، وہ موقع و محل سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

[۸] یہ آیت اصلاً تعدد ازواج سے متعلق کوئی حکم بیان کرنے کے لیے نازل نہیں ہوئی، بلکہ یتیموں کی مصلحت کے پیش نظر تعدد ازواج کے اُس رواج سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب کے لیے نازل ہوئی ہے جو عرب میں پہلے سے عام تھا۔ قرآن نے دوسرے مقامات پر صاف اشارہ کیا ہے کہ انسان کی تخلیق جس فطرت پر ہوئی ہے، اُس کی رو سے خاندان کا ادارہ اپنی اصلی خوبیوں کے ساتھ ایک ہی مرد و عورت میں رشتۂ نکاح سے قائم ہوتا ہے۔ چنانچہ جگہ جگہ بیان ہوا ہے کہ انسانیت کی ابتدا سیدنا آدم سے ہوئی ہے اور اُن کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ہی بیوی پیدا کی تھی۔ یہ تمدن کی ضروریات اور انسان کے نفسی، سیاسی اور سماجی مصالح ہیں جن کی بنا پر تعدد ازواج کا رواج کم یا زیادہ، ہر معاشرے میں رہا ہے اور اِنھی کی رعایت سے اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی کسی شریعت میں اِسے ممنوع قرار نہیں دیا۔ یہاں بھی اِسی نوعیت کی ایک مصلحت میں اِس سے فائدہ اٹھانے کی

طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ یتیموں کے مال کی حفاظت اور اُن کے حقوق کی نگہداشت ایک بڑی ذمہ داری ہے۔ لوگوں کے لیے تنہا اِس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہو اور وہ یہ سمجھتے ہوں کہ یتیم کی ماں یا اُس کی بہن کو اُس میں شامل کر کے وہ اپنے لیے سہولت پیدا کر سکتے ہیں تو اُنھیں چاہیے کہ اِن عورتوں میں سے جو اُن کے لیے موزوں ہوں، اُن کے ساتھ نکاح کر لیں۔ تاہم دو شرطیں اِس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اِس پر عائد کر دی ہیں:

ایک یہ کہ یتیموں کے حقوق جیسی مصلحت کے لیے بھی عورتوں کی تعداد کسی شخص کے نکاح میں چار سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔

دوسری یہ کہ بیویوں کے درمیان انصاف کی شرط ایک ایسی اٹل شرط ہے کہ آدمی اگر اِسے پورا نہ کر سکتا ہو تو اِس طرح کی کسی اہم دینی مصلحت کے پیشِ نظر بھی ایک سے زیادہ نکاح کرنا اُس کے لیے جائز نہیں ہے۔

۹ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ غلامی کا ادارہ اُس وقت تک ختم نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ سورۂ محمد میں جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے کی ممانعت کے باوجود جو غلام پہلے سے معاشرے میں موجود تھے، اُن کے لیے یہ استثنا باقی رکھنا ضروری تھا۔ بعد میں قرآن نے اُن کے ساتھ لوگوں کو مکاتبت کا حکم دے دیا۔ یہ اِس بات کا اعلان تھا کہ لوحِ تقدیر اب غلاموں کے ہاتھ میں ہے اور وہ اپنی آزادی کی تحریر اُس پر، جب چاہیں، رقم کر سکتے ہیں۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ قرآن کے زمانۂ نزول میں غلامی کو معیشت اور معاشرت کے لیے اُسی طرح ناگزیر سمجھا جاتا تھا، جس طرح اب سود کو سمجھا جاتا ہے۔ نخاسوں پر ہر جگہ غلاموں اور لونڈیوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی اور کھاتے پیتے گھروں میں ہر سن و سال کی لونڈیاں اور غلام موجود تھے۔ اِس طرح کے حالات میں اگر یہ حکم دیا جاتا کہ تمام غلام اور لونڈیاں آزاد ہیں تو اُن کی ایک بڑی تعداد کے لیے جینے کی کوئی صورت اِس کے سوا باقی نہ رہتی کہ مرد بھیک مانگیں اور عورتیں جسم فروشی کے ذریعے سے اپنے پیٹ کا ایندھن فراہم کریں۔ یہ مصلحت تھی جس کی وجہ سے قرآن

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ
مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ④
وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا
وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ⑤

کے زیادہ قریب ہے کہ تم بے انصافی سے بچے رہو۔ اور اِن عورتوں کو بھی اِن کے مہر دو، مہر کے طریقے سے[۱۰]۔ پھر اگر وہ اُس میں سے تمھارے لیے اپنی خوشی سے کچھ چھوڑ دیں[۱۱] تو اُس کو، البتہ تم مزے سے کھا سکتے ہو۔ ۳-۴

اور (یتیم اگر ابھی نادان اور بے سمجھ ہوں تو) اپنے وہ اموال جن کو اللہ نے تمھارے

نے تدریج کا طریقہ اختیار کیا اور اِس سلسلہ کے کئی اقدامات کے بعد بالآخر سورۂ نور (۲۴) کی آیت ۳۳ میں مکاتبت کا وہ قانون نازل فرمایا جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ اِس کے بعد نیکی اور خیر کے ساتھ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت رکھنے والے کسی شخص کو بھی غلام بنائے رکھنے کی گنجایش باقی نہیں رہی۔ اِس قانون کی وضاحت اگر اللہ نے چاہا تو ہم نور کی اِسی آیت کے تحت کریں گے۔

[۱۰] اصل میں 'نِحْلَةً' کا لفظ آیا ہے۔ اِس کا نصب ہمارے نزدیک مصدر کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِن عورتوں کا مہر اُسی طریقے سے دیا جائے، جس طرح عام عورتوں کو دیا جاتا ہے۔ یہ عذر نہیں پیدا کرنا چاہیے کہ نکاح چونکہ اُنھی کی اولاد کی مصلحت سے کیا گیا ہے، اِس لیے اب کوئی ذمہ داری باقی نہیں رہی۔

[۱۱] اصل الفاظ ہیں: 'فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ'۔ اِن میں حرف 'عَنْ' دست برداری کے مفہوم کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ یعنی اپنی خوشی سے اگر وہ مہر کے کسی حصے سے دست بردار ہو جائیں یا کوئی اور رعایت کریں تو اِس میں حرج نہیں ہے۔ لوگ اگر چاہیں تو اِس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ
رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا

لیے قیام و بقا کا ذریعہ بنایا ہے، اِن بے سمجھوں کے حوالے نہ کرو۔[12] ہاں، اِن سے فراغت کے ساتھ اُن کو کھلاؤ،[13] پہناؤ اور اُن سے بھلائی کی بات کرو۔ اور نکاح کی عمر کو پہنچنے تک اِن یتیموں کو جانچتے رہو،[14] پھر اگر اُن کے اندر اہلیت پاؤ تو اُن کے مال اُن کے حوالے

---

[12] اِس سے واضح ہے کہ حقوق ملکیت کے ساتھ خاندانی اور اجتماعی بہبود کا پہلو بھی لازماً ملحوظ رہنا چاہیے، اِس لیے کہ کسی شخص کے مال کی بربادی پورے خاندان، بلکہ بعض اوقات پورے معاشرے کے لیے نقصان کا باعث ہو جاتی ہے۔ یتیم کے مال کو اِسی بنا پر اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے معاشرے کا مال قرار دیا ہے اور ہدایت فرمائی ہے کہ یتیم اگر ابھی نادان اور بے سمجھ ہے تو اُس کے سرپرستوں کا فرض ہے کہ اُس کا مال اپنی حفاظت اور نگرانی میں رکھیں، اُسے ہرگز اُس کے حوالے نہ کریں، ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ اپنا یہ مال جسے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے قیام و بقا کا ذریعہ بنایا ہے، ضائع کر بیٹھے گا۔

[13] اصل میں 'وَارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'فِيْهَا' کا لفظ اشارہ کرتا ہے کہ یتیموں کے مال سے اُن کی ضروریات فراخ دلی کے ساتھ پوری کی جائیں۔ عربی زبان میں 'اُرْزُقُوْهُمْ فِيْهَا' کہا جائے تو اِس کا مفہوم یہی ہو گا۔ 'فِيْهَا' کے بجائے اِس جملے میں 'منہا' ہوتا تو اِس کے معنی، البتہ یہ ہوتے کہ اُن کو اِس میں سے کچھ دے دلا دیا جائے۔

[14] یعنی کوئی چھوٹی یا بڑی ذمہ داری اُن کے سپرد کر کے دیکھتے رہو کہ معاملات کی سوجھ بوجھ اور اپنی ذمہ داریوں کو اٹھانے کی صلاحیت اُن کے اندر پیدا ہو رہی ہے یا نہیں، اِس لیے کہ جنسی بلوغ ہر حال میں عقلی بلوغ کو مستلزم نہیں ہے۔ اِس طرح کے تمام معاملات میں یہ چیز لازماً پیش نظر رہنی چاہیے۔

اَنْ يَّكْبَرُوْا ؕ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ
فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ
فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴿۶﴾
لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۪

کر دو، اور اِس اندیشے سے کہ بڑے ہو جائیں گے، اُن کے مال اڑا کر اور جلد بازی کر کے کھا نہ جاؤ۔ اور (یتیم کا) جو (سرپرست) غنی ہو، اُسے چاہیے کہ (اُس کے مال سے) پرہیز کرے اور جو محتاج ہو، وہ (اپنے حق خدمت کے طور پر) دستور کے مطابق (اُس سے) فائدہ اٹھائے۔[۱۵] پھر جب اُن کے اموال اُن کے حوالے کرنے لگو تو اُن پر گواہ ٹھیرا لو، ورنہ حساب کے لیے تو اللہ کافی ہے۔[۱۶] ۵-۶

---

[۱۵] یہ سرپرستوں کو نصیحت فرمائی ہے کہ اپنی کسی خدمت کے عوض کچھ لینا اگرچہ ممنوع نہیں ہے، تاہم وہ اگر مستغنی ہوں تو بہتر یہی ہے کہ اِس سے پرہیز کریں، لیکن غریب ہوں تو یتیم کے مال سے اپنا حق خدمت دستور کے مطابق لے سکتے ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت میں لکھا ہے:

> ”...دستور کے مطابق سے مراد یہ ہے کہ ذمہ داریوں کی نوعیت، جایداد کی حیثیت، مقامی حالات اور سرپرست کے معیار زندگی کے اعتبار سے وہ فائدہ اٹھانا جو معقولیت کے حدود کے اندر ہو، یہ نوعیت نہ ہو کہ ہر معقول آدمی پر یہ اثر پڑے کہ یتیم کے بالغ ہو جانے کے اندیشے سے اسراف اور جلد بازی کر کے یتیم کی جایداد ہضم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔“
>
> (تدبر قرآن ۲/ ۲۵۵)

[۱۶] یعنی اِس بات کو یاد رکھو کہ ایک دن یہی حساب اللہ تعالیٰ کو بھی دینا ہے اور وہ سمیع وعلیم ہے، اُس سے کوئی چیز چھپائی نہیں جا سکتی۔

وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ
مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ⑦ وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا

(تمھارے) ماں باپ اور اقربا جو کچھ چھوڑیں، اُس میں مردوں کا بھی ایک حصہ ہے اور (تمھارے) ماں باپ اور اقربا جو کچھ چھوڑیں، اُس میں عورتوں کا بھی ایک حصہ ہے، خواہ ترکہ کم ہو یا زیادہ، ایک متعین حصے کے طور پر۔[۱۷] لیکن تقسیم کے موقع پر جب

---

[۱۷] یہ میراث کے اُن حصوں کی طرف اشارہ ہے جو آگے کی آیات میں متعین کر دیے گئے ہیں تاکہ انسان جس چیز کا فیصلہ خود کر لینے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اُس کے بارے میں اُسے رہنمائی حاصل ہو جائے اور زور آور وارثوں کے لیے مرنے والے کی تمام املاک اور جایداد سمیٹ کر قبضہ کر لینے کا کوئی موقع باقی نہ رہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اسلام سے پہلے نہ صرف عرب میں، بلکہ ساری دنیا میں یہ حال رہا ہے کہ یتیموں اور عورتوں کا کیا ذکر، تمام کم زور رشتہ زور آور وارثوں کے رحم و کرم پر تھے۔ قرآن نے اِس صورت حال کی طرف دوسرے مقام ’وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا‘ کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ اِس صورت حال کو ختم کر دینے کے لیے قرآن نے تمام وارثوں کے حقوق معین کر دیے۔ مردوں کے بھی، عورتوں کے بھی۔ اوپر کی آیات کی تلاوت کرتا ہوا آدمی جب اِس آیت پر پہنچتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ گویا یتیموں کی برکت سے دوسروں کے حقوق معین کرنے کی بھی راہ کھل گئی۔ یعنی جو خود حقوق سے محروم تھے، اُنھوں نے نہ صرف یہ کہ حقوق حاصل کیے، بلکہ اُن کی بدولت دوسروں کو بھی حقوق حاصل ہوئے۔ خاص طور پر عورتوں کا ذکر اِس طرح آیا ہے گویا پہلی بار اُن کو بھی مردوں کے پہلو بہ پہلو حق داروں کی صف میں جگہ ملی اور اپنے والدین و اقربا کے ترکے میں سے، خواہ کم ہو یا زیادہ، اُن کا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک معین حصہ فرض کر دیا گیا۔“
>
> (تدبرقرآن ۲/۲۵۶)

الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا
مَّعْرُوْفًا ۝۸ وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً
ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۖ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝۹
اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ
فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝۱۰
يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۤ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ

النساء ۴

قریبی اعزہ اور یتیم اور مسکین وہاں آجائیں تو اُس میں سے اُن کو بھی کچھ دے دو اور اُن سے بھلائی کی بات کرو۔[۱۸] اُن لوگوں کو ڈرنا چاہیے جو اگر اپنے پیچھے ناتواں بچے چھوڑتے تو اُن کے بارے میں اُنھیں بہت کچھ اندیشے ہوتے۔ سو چاہیے کہ اللہ سے ڈریں اور (ہر معاملے میں) سیدھی بات کریں۔ ۷-۹

(سنو، خبردار رہو)، یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ ہی بھرتے ہیں اور عنقریب وہ دوزخ کی بھڑکتی آگ میں پڑیں گے۔ ۱۰

تمھاری اولاد کے بارے میں اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے[۱۹] کہ اُن میں سے لڑکے کا

---

[۱۸] یعنی اِس میں شبہ نہیں کہ ہر ایک کا حصہ مقرر کر دیا گیا ہے، لیکن اِس کے باوجود، اُنھیں کچھ دے دلا کر اور اُن سے بھلائی کی بات کر کے رخصت کرنا چاہیے اور اِس طرح کے موقعوں پر چھوٹے دل کے کم ظرف لوگ جس طرح کی باتیں کیا کرتے ہیں، اُس طرح کی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے۔

[۱۹] اصل الفاظ ہیں: 'یُوْصِیْکُمُ اللّٰهُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ'۔ اِن سے واضح ہے کہ آگے جو حصے بیان ہوئے ہیں، اُنھیں اللہ نے اپنی وصیت قرار دیا ہے۔ اِس کے بعد، ظاہر ہے کہ کوئی مسلمان

فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَ اِنْ كَانَتْ
وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ؕ

حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔[۲۰] پھر اگر اولاد میں لڑکیاں ہی ہوں اور وہ دو یا دو سے زیادہ ہوں[۲۱] تو اُنھیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اُس کے لیے

اِس کے مقابلے میں اپنی وصیت پیش کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔

[۲۰] یہ حکم اگر اِسی جملے پر ختم ہو جاتا تو اِس کے معنی یہ تھے کہ مرنے والے کی اولاد میں اگر ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہی ہو تو لڑکے کو لڑکی سے دونا ملے گا؛ لڑکے اور لڑکیاں اِس سے زیادہ ہوں تو میت کا ترکہ اِس طرح تقسیم کیا جائے گا کہ ہر لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر رہے؛ اولاد میں صرف لڑکے یا صرف لڑکیاں ہوں تو سارا ترکہ دونوں میں سے جو موجود ہوگا، اُسے دیا جائے گا۔ لیکن حکم یہاں ختم نہیں ہوا، بلکہ اِس سے متصل اگلے ہی جملے میں ایک استثنا کے ذریعے سے قرآن نے وضاحت کر دی ہے کہ اولاد میں صرف لڑکیاں ہی ہوں تو سارا ترکہ اُن میں تقسیم نہیں ہوگا۔ ایک ہی لڑکی ہو تو اُسے ترکے کا نصف اور دو یا دو سے زیادہ ہوں تو اُنھیں دو تہائی دیا جائے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کا قانون لوگوں کے جذبات پر نہیں، بے لاگ انصاف پر مبنی ہے۔ لڑکی کی منفعت والدین کے لیے لڑکے سے کم ہوتی ہے، اِس لیے کہ شادی کے بعد اُس کی منفعت بیش تر اُس کے شوہر اور شوہر کے گھر والوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ قرآن نے اِسی بنا پر لڑکے سے اُس کا حصہ آدھا رکھا ہے اور اولاد میں صرف لڑکیاں ہوں تو اُن کا حصہ کم بھی کر دیا ہے۔

[۲۱] اصل میں 'فَوْقَ اثْنَتَيْنِ' (دو سے زیادہ) کے الفاظ آئے ہیں، لیکن اِن کا مفہوم ہم نے دو یا دو سے زیادہ بیان کیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ 'فَوْقَ اثْنَتَيْنِ' سے پہلے 'اثنتین' کا لفظ عربیت کے قاعدے سے حذف ہو گیا ہے۔ قرآن کی زبان میں اگر ہم ایک لڑکی اور دو یا دو سے زائد لڑکیوں کا حصہ اُن کے حصوں میں فرق کی وجہ سے الگ الگ بیان کرنا چاہیں تو اِس کے دو طریقے

وَلِاَبَوَیۡهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنۡ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ

آدھا ہے۔[۲۲]

لیکن ترکے کا چھٹا حصہ، (اِس سے پہلے) میت کے والدین میں سے ہر ایک کو ملنا

ہیں: ترتیب صعودی کے مطابق بیان کرنا پیش نظر ہو تو پہلے ایک لڑکی اور اُس کے بعد دو لڑکیوں کا حصہ بیان کیا جائے گا۔ دو سے زائد کا حصہ اگر وہی ہے جو دو کا ہے تو اُسے لفظوں میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک کے فوراً بعد جب دو کا حصہ اِس طرح بیان کیا جائے کہ وہ ایک کے حصے سے زیادہ ہو تو اِس کے صاف معنی یہ ہیں کہ دو سے زائد کا حکم بھی وہی ہے جو دو لڑکیوں کا ہے۔ اِسی بات کو ہم ترتیب نزولی کے مطابق بیان کریں گے تو اِس کے لیے 'فوق اثنتین او اثنتین' کے الفاظ چونکہ عربیت کی رو سے موزوں نہ ہوں گے، اِس لیے دو سے زائد کا حصہ بیان کرنے کے بعد ایک کا حصہ بیان کر دیا جائے گا۔ اِس اسلوب میں 'فوق اثنتین' سے کلام کی ابتدا خود دلیل ہوگی کہ اِس سے پہلے 'اثنتین' کا لفظ محذوف ہے۔ اِس کا قرینہ بھی واضح ہے۔ اِس ترتیب کا حسن مقتضی ہے کہ 'فَوۡقَ اثۡنَتَيۡنِ' سے پہلے 'اثنتین' کا لفظ استعمال نہ کیا جائے اور صحت زبان کا تقاضا ہے کہ 'فَوۡقَ اثۡنَتَيۡنِ' سے بات شروع کی جائے تو بعد میں 'اثنتین' مذکور نہ ہو۔ قرآن مجید نے یہ حصے یہاں ترتیب نزولی کے مطابق بیان کیے ہیں، اِس لیے حذف کا یہ اسلوب ملحوظ ہے۔ سورۂ نساء کی آخری آیت میں یہی حصے ترتیب صعودی کے مطابق بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہاں 'اِثۡنَتَيۡنِ' کے بعد 'فوق اثنتین' کا لفظ حذف کر دیا ہے: 'اِنِ امۡرُؤٌا هَلَكَ لَيۡسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗۤ اُخۡتٌ، فَلَهَا نِصۡفُ مَا تَرَكَ، وَهُوَ يَرِثُهَآ، اِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهَا وَلَدٌ، فَاِنۡ كَانَتَا اثۡنَتَيۡنِ، فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ'*۔

۲۲؎ یہ جملہ پچھلے جملے سے استثنا ہے، اِس لیے اِس کا حکم بھی وہی ہوگا جو پچھلے جملے کا ہے، یعنی اولاد میں صرف لڑکیاں ہی ہوں تو اُنھیں ترکے کے اُسی حصے کا دو تہائی یا نصف دیا جائے گا جو اگر تنہا لڑکے ہوتے تو اُن میں تقسیم کیا جاتا۔ وہ پورے ترکے کے دو تہائی یا نصف کی حق دار نہ ہوں گی۔ 'فَاِنۡ

---

* ۴:۱۷۶۔

فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ ؕ

چاہیے[۲۳]، اگر اُس کی اولاد ہو[۲۴]۔ اور اگر اولاد نہ ہو اور والدین ہی اُس کے وارث ہوں تو تیسرا حصہ اُس کی ماں کا ہے اور باقی اُس کے باپ کا[۲۵]۔ لیکن اُس کے بھائی بہن ہوں[۲۶]

کُنَّ نِسَآءً' پر اصل میں جو حرف 'ف' اور 'وَلِاَبَوَیْہِ' سے پہلے حرف 'وُ' آیا ہے، وہ اِسی پر دلالت کرتا ہے۔

[۲۳] یہ جملہ اِس سے متصل پہلے لڑکیوں کے حصوں پر نہیں، بلکہ اُس پورے حکم پر عطف ہوا ہے جو اوپر اولاد کے لیے آیا ہے۔ چنانچہ اِس کا عطف اب استدراک کے لیے ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس سے پہلے یہ بات تو بیان ہوئی ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہوگا، لیکن یہ کتنا ہوگا، اِسے متعین نہیں کیا گیا۔ چنانچہ والدین اور زوجین کے جو حصے اِس کے بعد آئے ہیں، وہ لازماً پہلے دیے جائیں گے اور اِس کے بعد جو کچھ بچے گا، صرف وہی اولاد میں تقسیم ہوگا۔ لڑکے اگر تنہا ہوں تو اُنھیں بھی یہی ملے گا اور لڑکے لڑکیاں، دونوں ہوں تو اُن کے لیے بھی یہی قاعدہ ہوگا۔ اِسی طرح میت کی اولاد میں اگر تنہا لڑکیاں ہوں تو اُنھیں بھی اِس بچے ہوئے ترکے ہی کا نصف یا دو تہائی دیا جائے گا۔ اِس کے لیے 'فَاِنْ کُنَّ نِسَآءً' کے جو الفاظ اصل میں آئے ہیں، اُن کے بارے میں ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ یہ 'لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ' سے استثنا اور اِسی کے ایک پہلو کی وضاحت ہیں، اِن کا حکم اُس سے مختلف نہیں ہو سکتا۔

[۲۴] اصل میں 'اِنْ کَانَ لَہٗ وَلَدٌ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'وَلَدٌ' کا لفظ ذکور و اناث، دونوں کے لیے ہے۔ یہاں اور اِس کے بعد ازواج کے حصوں میں بھی ہر جگہ اِس کا مفہوم یہی ہے۔ لڑکا لڑکی ایک ہوں یا دو، اولاد میں صرف لڑکے ہوں یا صرف لڑکیاں ہوں، نفی و اثبات میں اِس شرط کا اطلاق لازماً ہوگا۔

اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًاؕ فَرِيْضَةً

تو ماں کے لیے وہی چھٹا حصہ ہے اور باپ کے لیے بھی وہی چھٹا حصہ۔[۲۷] یہ حصے اُس وقت دیے جائیں، جب وصیت جو اُس نے کی ہو، وہ پوری کر دی جائے[۲۸] اور قرض، (اگر ہو تو) ادا کر دیا جائے۔

تم نہیں جانتے کہ تمھارے ماں باپ اور تمھاری اولاد میں سے کون بہ لحاظ منفعت

---

۲۵ یہ الفاظ یہاں حذف ہیں۔ ہم اگر یہ کہیں کہ —— ''اِس رقم کے وارث زید اور علی ہی ہوں تو زید کا حصہ ایک تہائی ہوگا'' —— تو اِس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ —— ''باقی دو تہائی علی کے لیے ہے۔''

۲۶ اصل میں لفظ 'اِخْوَةٌ' استعمال ہوا ہے۔ یہ جمع ہے، لیکن اِس طرح کے اسلوب میں جمع بیان عدد کے لیے نہیں، محض بیان وجود کے لیے آتی ہے۔ اِس سے مقصود صرف یہ ہے کہ بھائی بہنوں کی موجودگی میں، عام اِس سے کہ وہ ایک ہوں یا دو، یا دو سے زیادہ ہوں، والدین کا حصہ اپنی اصل کی طرف لوٹ آئے گا۔

۲۷ اصل الفاظ ہیں: 'فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ، فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ'۔ اِن کے بعد بھی 'ولابیه' یا اِس کے ہم معنی الفاظ حذف ہو گئے ہیں۔ اِس میں جملوں کی تالیف اِس طرح ہے: ''اولاد ہو تو ماں باپ میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ۔ اولاد نہ ہو اور والدین ہی وارث ہوں تو ماں کے لیے تہائی، لیکن اگر بھائی بہن ہوں تو ماں کے لیے وہی چھٹا حصہ۔'' اِس میں دیکھ لیجیے، کلام خود پکار رہا ہے کہ —— ''اور باپ کے لیے بھی وہی چھٹا حصہ۔'' اِس سے اشارہ نکلتا ہے کہ اولاد کی عدم موجودگی میں اُن کا حصہ اب بھائی بہنوں کو ملنا چاہیے۔ یہ اشارہ واضح تھا، لیکن قرآن کے مخاطبین جب اِس کو نہیں سمجھ سکے تو اُس نے وضاحت فرما دی۔ یہ وضاحت اِسی سورہ کے آخر میں بطور ضمیمہ درج ہے۔

۲۸ اِس سے واضح ہے کہ وصیت کا حق باقی ہے، لیکن قرآن نے اِس کے ساتھ آگے 'غَيْرَ مُضَآرٍّ' کی شرط لگا دی ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ وصیت اتنی ہونی چاہیے جس سے وارثوں کی حق تلفی نہ

مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱﴾

تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصے اِسی بنا پر اللہ نے مقرر کر دیے ہیں، اِس لیے کہ اللہ علیم و حکیم ہے۔[۲۹] ۱۱

ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی بنا پر نصیحت فرمائی ہے کہ یہ تہائی مال تک محدود رہے تو بہتر ہے۔*

۲۹ سلسلۂ کلام کے بیچ میں یہ آیت جس مقصد کے لیے آئی ہے، وہ یہ ہے کہ لوگوں پر یہ بات واضح کر دی جائے کہ جن رشتہ داروں کو اللہ تعالیٰ نے کسی میت کے وارث قرار دیا ہے، اُن کے بارے میں مبنی بر انصاف قانون وہی ہے جو اُس نے خود بیان فرما دیا ہے۔ چنانچہ اُس کی طرف سے اِس قانون کے نازل ہو جانے کے بعد اب کسی مرنے والے کو محض رشتہ داری کی بنیاد پر اللہ کے ٹھیرائے ہوئے اِن وارثوں کے حق میں وصیت کا حق باقی نہیں رہا۔ اُن کے لیے کوئی وصیت اب اگر وہ کرے گا تو صرف اُس صورت میں کرے گا، جب اُن میں سے کسی کی کوئی ضرورت یا اُس کی کوئی خدمت یا اِس طرح کی کوئی دوسری چیز اِس کا تقاضا کرتی ہو۔ اِس لیے کہ جس منفعت کے کم یا زیادہ ہونے کا علم اِس آیت میں اللہ تعالیٰ کے لیے خاص قرار دیا گیا ہے، وہ رشتہ داری کی منفعت ہے۔ اِس کا اُن ضرورتوں اور منفعتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے جو ہمارے لیے معلوم اور متعین ہوتی ہیں۔

آیت کا اصل مدعا یہی ہے، لیکن اگر غور کیجیے تو اِس سے یہ بات بھی نہایت لطیف طریقے سے واضح ہو گئی ہے کہ وراثت کا حق جس بنیاد پر قائم ہوتا ہے، وہ قرابت نافعہ ہے اور حصوں میں فرق کی وجہ بھی اُن کے پانے والوں کی طرف سے مرنے والے کے لیے اُن کی منفعت کا کم یا زیادہ ہونا ہی ہے۔ چنانچہ لڑکوں کا حصہ اِسی بنا پر لڑکیوں سے اور شوہر کا بیوی سے دوگنا رکھا گیا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ والدین، اولاد، بھائی بہن، میاں بیوی اور دوسرے اقربا کے تعلق میں یہ منفعت بالطبع موجود ہے اور عام حالات میں یہ اِسی بنا پر بغیر کسی تردد کے وارث ٹھیرائے جاتے ہیں، لیکن اِن میں سے کوئی اگر اپنے مورث کے لیے منفعت کے بجائے سراسر مضرت بن جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف

---

* بخاری، رقم ۲۷۴۲۔ مسلم، رقم ۱۶۲۸۔

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ
فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ

اور تمھاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو، اُس کا آدھا حصہ تمھیں ملے گا، اگر اُن کے

سے علت حکم کا یہ بیان تقاضا کرتا ہے کہ اُسے وراثت سے محروم قرار دیا جائے۔

اِسی طرح یہ رہنمائی بھی ضمناً اِس آیت سے حاصل ہوتی ہے کہ ترکے کا کچھ حصہ اگر بچا ہوا رہ جائے اور مرنے والے نے کسی کو اُس کا وارث نہ بنایا ہو تو اُسے بھی 'اَقْرَبُ نَفْعًا' ہی کو ملنا چاہیے۔

آیت کے آخر میں تنبیہ فرمائی ہے کہ اللہ علیم و حکیم ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت میں لکھا ہے:

> ''... یہ تقسیم اللہ تعالیٰ کے علم اور اُس کی حکمت پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم پیش و عقب، ہر چیز پر حاوی اور حاضر و غائب، سب پر محیط ہے۔ کسی کا علم بھی اُس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اِسی طرح اُس کی ہر بات اور اُس کے ہر کام میں نہایت گہری حکمت ہوتی ہے اور کسی کا بھی یہ مرتبہ نہیں ہے کہ اُس کی حکمت کی تمام باریکیوں کو سمجھ سکے۔ اِس وجہ سے خدا کی اِس تقسیم پر نہ تو اپنے علم و فلسفہ کے غرے میں کسی کو معترض ہونا چاہیے، نہ جذباتی جنبہ داری کے جوش میں کسی کو کوئی قدم اِس کے خلاف اٹھانا چاہیے۔ بسا اوقات آدمی اپنے ذاتی میلان کی بنا پر ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہے، لیکن یہ ترجیح دنیا اور آخرت، دونوں ہی اعتبارات سے غلط ہوتی ہے۔ اِسی طرح کسی کو اپنے ذاتی میلان کی بنا پر نظر انداز کرتا ہے، حالاں کہ بعد کے حالات ثابت کرتے ہیں کہ دنیا اور عقبیٰ، دونوں ہی اعتبار سے اُس کا رویہ زیادہ صحیح رہا جس کو اُس نے نظر انداز کیا۔ پس صحیح روش یہی ہے کہ آدمی جو قدم بھی اٹھائے، اپنے ذاتی میلانات کے بجائے شریعت کی ہدایت کے مطابق اٹھائے۔ اِسی میں خیر و برکت ہے۔ جو لوگ شریعت کے خلاف قدم اٹھاتے ہیں، وہ خدا کے علم و حکمت کی تحقیر کرتے ہیں جس کی سزا بالعموم اُنھیں دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں تو بہر حال ملنی ہی ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۲۶۱)

يُوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ
وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ
وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ
فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ

اولاد نہیں ہے۔ اور اگر اولاد ہے تو اُن کے ترکے کا ایک چوتھائی تمھارا ہے، جب کہ وصیت جو اُنھوں نے کی ہو، وہ پوری کر دی جائے اور قرض (اگر ہو تو) ادا کر دیا جائے۔ اور وہ تمھارے ترکے میں سے ایک چوتھائی کی حق دار ہیں، اگر تمھارے اولاد نہیں ہے۔ اور اگر اولاد ہے تو تمھارے ترکے کا آٹھواں حصہ اُن کا ہے، جب کہ وصیت جو تم نے کی ہو، وہ پوری کر دی جائے اور قرض (اگر ہو تو) ادا کر دیا جائے۔[30]

اور (اِن وارثوں کی عدم موجودگی میں) اگر کسی مرد یا عورت کو اُس سے رشتہ داری کی بنا پر وارث بنا دیا جاتا ہے[31] اور اُس کا ایک بھائی یا بہن ہے تو بھائی اور بہن، ہر ایک

---

[30] یہ حصے ہر لحاظ سے واضح ہیں اور والدین کے حصوں کی طرح یہ بھی پورے ترکے میں سے دیے جائیں گے۔

[31] اصل الفاظ ہیں: 'وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ'۔ اِن میں لفظ 'كَلٰلَةً' والدین اور اولاد کے سوا باقی سب رشتہ داروں کے لیے آیا ہے۔ اِس معنی کے لیے اِس کا استعمال عربی زبان میں معروف ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ یہ اُس شخص کے لیے بھی آتا ہے جس کے پیچھے اولاد اور والد، دونوں میں سے کوئی نہ ہو، لیکن آیت ہی میں دلیل موجود ہے کہ یہ معنی یہاں مراد نہیں ہیں۔ 'يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ' سے جو سلسلۂ بیان شروع ہوتا ہے، اُس میں اولاد اور

شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ

کو چھٹا حصہ ملے گا، اور اگر وہ ایک سے زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں سب شریک ہوں گے اور باقی اُس کو ملے گا جسے وارث بنایا گیا ہے[۳۲]، جب کہ وصیت جو کی گئی ہو، پوری کر دی جائے اور قرض (اگر ہو تو) ادا کر دیا جائے، بغیر کسی کو نقصان پہنچائے۔ یہ

والدین کا حصہ بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے وصیت پر عمل درآمد کی تاکید 'مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ' کے الفاظ میں کی ہے۔ زوجین کے حصوں میں اِسی مقصد کے لیے 'مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ' اور 'مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔ تدبر کی نگاہ سے دیکھیے تو اِن سب مقامات پر فعل مبنی للفاعل استعمال ہوا ہے اور 'يُوْصِيْ'، 'يُوْصِيْنَ' اور 'تُوْصُوْنَ' میں ضمیر کا مرجع ہر جملے میں بالصراحت مذکور ہے، لیکن کلالہ کے احکام میں یہی لفظ مبنی للمفعول ہے۔ یہ تبدیلی صاف بتا رہی ہے کہ 'اِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ' میں 'يُوْصٰى' کا فاعل، یعنی مورث مذکور نہیں ہے، اِس وجہ سے اِس آیت میں 'كَلٰلَةً' کو کسی طرح مرنے والے کے لیے اسم صفت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ تغیر حجت قطعی ہے کہ قرآن مجید نے یہ لفظ یہاں اُس شخص کے لیے جس کے پیچھے اولاد اور والد، دونوں میں سے کوئی نہ ہو، استعمال نہیں کیا ہے۔ چنانچہ آیت کی تالیف ہمارے نزدیک یہ ہے کہ 'يُوْرَثُ' باب افعال سے مبنی للمفعول ہے۔ 'كَلٰلَةً' اِس سے مفعول لہ ہے۔ 'كَانَ' ناقصہ ہے اور 'يُوْرَثُ' اُس کی خبر واقع ہوا ہے۔ 'رَجُلٌ اَوِ امْرَاَةٌ' 'كَانَ' کے لیے اسم ہیں۔ وارث بنانے کا جو اختیار اِس آیت میں دیا گیا ہے، وہ ظاہر ہے کہ مرنے والے ہی کو ہو گا اور اِس کے معنی اِس سیاق میں یہی ہو سکتے ہیں کہ اُن وارثوں کی عدم موجودگی میں ترکے کا وارث بنا دیا جاتا ہے جن کے حصے اوپر بیان ہوئے ہیں۔

۳۲ یعنی ایک ہی رشتہ کے متعلقین میں سے اگر کسی ایک مرد یا عورت کو وارث بنایا جاتا ہے تو جس کو وارث بنایا جائے گا، اُس کا ایک بھائی یا بہن ہو تو اُس مال کا چھٹا حصہ جس کا اُسے وارث

وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۭ ﴿۱۲﴾

حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ جاننے والا ہے، وہ بڑا نرم خو ہے۔[۳۳] ۱۲

بنایا گیا ہے، اُس کے بھائی یا بہن کو دیا جائے گا اور اگر اُس کے بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو وہ سب ایک تہائی میں برابر کے شریک ہوں گے۔ اِس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ باقی ۵/۶ یا دو تہائی اُس مرد یا عورت کو دیا جائے گا جسے وارث بنایا گیا ہے۔ قرآن نے اِسی بنا پر اِسے لفظوں میں بیان نہیں کیا ہے۔ ہم اگر یہ کہیں کہ ـــــ ”زید نے اِس رقم کا وارث اپنے بیٹے کو بنایا ہے، لیکن اُس کا کوئی بھائی ہو تو ایک تہائی کا حق دار وہ ہوگا“ ـــــ تو اِس جملے کا مطلب ہر شخص یہی سمجھے گا کہ بھائی کا حصہ دینے کے بعد باقی روپیہ اُس بیٹے کو دیا جائے گا جسے رقم کا وارث بنایا گیا ہے۔

قرآن مجید کی یہ ہدایت بڑی حکمت پر مبنی ہے۔ مرنے والا کلالہ رشتہ داروں میں سے اپنے کسی بھائی، بہن، ماموں، پھوپھی یا چچا وغیرہ کو وارث بنا سکتا ہے۔ لیکن، ظاہر ہے کہ جس بھائی یا ماموں کو وارث بنایا جائے گا، مرنے والے کے بھائی اور ماموں اِس کے علاوہ بھی ہو سکتے ہیں۔ یہی معاملہ چچا، پھوپھی اور خالہ وغیرہ کا ہے۔ کوئی شخص اپنے ذاتی رجحان کی بنا پر کسی ایک ماموں یا پھوپھی کو ترجیح دے سکتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے اِس کو پسند نہیں فرمایا کہ ایک ہی رشتے کے دوسرے متعلقین بالکل محروم کر دیے جائیں۔ چنانچہ اِس کے لیے یہ ہدایت فرمائی کہ کوئی شخص اگر، مثال کے طور پر اپنے چچا زید کو ترکے کا وارث بنا دیتا ہے اور اُس کے چچا عثمان اور احمد بھی ہیں تو ترکے کے جس حصے کا وارث زید کو بنایا گیا ہے، اُس کا ایک تہائی عثمان اور احمد میں تقسیم کرنے کے بعد باقی ترکہ زید کو دیا جائے گا۔

[۳۳] آیت کے آخر میں یہ الفاظ اِس تنبیہ کے لیے آئے ہیں کہ یہ پروردگار عالم کی وصیت ہے۔ اُس کا بندہ جانتے بوجھتے کسی حق دار کو محروم کرتا ہے تو اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ اُس کے ہر عمل سے باخبر ہے اور اگر بے جانے بوجھے اُس سے کوتاہی ہو جاتی ہے تو اُس کا خالق بردبار ہے،

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ

یہ اللہ کی ٹھیرائی ہوئی حدیں ہیں، (اِن کا لحاظ کرو) اور (یاد رکھو کہ) جو اللہ اور اُس کے رسول کی فرماں برداری کریں گے، اُنھیں وہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کریں گے اور اُس کی ٹھیرائی ہوئی حدوں سے آگے بڑھیں گے، اُنھیں وہ آگ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور اُن کے لیے رسوا کر دینے والی سزا ہے۔ ۱۳-۱۴

اور تمھاری عورتوں میں سے جو بدکاری کرتی ہیں[۳۴]، اُن پر اپنے اندر سے چار گواہ

اپنے بندوں کے گناہوں کو معاف کرتا ہے۔ وہ نرم خو ہے، بندوں پر اُن کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اُس کی ہدایات میں اُن کے لیے سہولت ہے، تنگی اور مشقت نہیں ہے۔

[۳۴] اصل الفاظ ہیں: 'وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ'۔ اِن میں 'الْفَاحِشَةَ' سے مراد زنا ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ اِس معنی کے لیے معروف ہے۔ اِس کے ساتھ جو فعل اِس جملے میں آیا ہے، وہ بیان مداومت کے لیے ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ یہ قحبہ عورتوں کا ذکر ہے۔ اِس صورت میں اصل مسئلہ چونکہ عورت ہی کا ہوتا ہے، اِس لیے مرد زیر بحث نہیں آئے۔

أَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَإِنْ شَهِدُوْا فَأَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿١٥﴾
وَالَّذٰنِ يَأْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَإِنْ تَابَا وَأَصْلَحَا فَأَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۭ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿١٦﴾

طلب کرو۔[۳۵] پھر اگر وہ گواہی دے دیں تو اُنھیں گھروں میں بند کر دو، یہاں تک کہ اُن کی موت آ جائے یا اللہ اُن کے لیے کوئی راستہ نکال دے۔[۳۶] ۱۵

اور جو مرد و عورت تمھارے لوگوں میں سے اِس جرم کا ارتکاب کریں،[۳۷] اُنھیں ایذا دو۔[۳۸] پھر اگر وہ توبہ کریں اور اصلاح کر لیں[۳۹] تو اُن سے درگذر کرو۔ بے شک، اللہ بہت

۳۵؎ یعنی اِس بات کے گواہ کہ یہ فی الواقع زنا کی عادی قحبہ عورتیں ہیں۔ سورۂ نور میں بھی اللہ تعالیٰ نے اِس جرم کو ثابت کرنے کے لیے چار گواہوں کی یہ شرط اِسی طرح برقرار رکھی ہے۔

۳۶؎ اِس سے واضح ہے کہ یہ ایک عارضی حکم تھا۔ چنانچہ اِس میں جس راہ نکالنے کا ذکر ہے، وہ بعد میں اِس طرح نکلی کہ قحبہ ہونے کی وجہ سے اِن عورتوں کو زنا اور فساد فی الارض، دونوں کا مجرم قرار دیا گیا اور اِن جرائم کی جو سزائیں سورۂ نور (۲۴) کی آیت ۲ اور سورۂ مائدہ (۵) کی آیت ۳۳ میں بیان ہوئی ہیں، وہ بعض روایتوں کے مطابق اِن پر نافذ کرنے کی ہدایت کی گئی۔

۳۷؎ یہ زنا کے عام مجرموں کا ذکر ہے جو بالعموم یاری آشنائی کے نتیجے میں اِس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اِس میں زانی اور زانیہ، دونوں چونکہ متعین ہوتے ہیں، اِس لیے دونوں کا ذکر ہوا ہے اور مذکر کے صیغے زبان کے عام قاعدے کے مطابق شریک غالب کے لحاظ سے آئے ہیں۔

۳۸؎ یہی ایذا ہے جو بعد میں سو کوڑوں کی صورت میں متعین کر دی گئی۔ یہ اِس جرم کی انتہائی سزا ہے اور صرف اُنھی مجرموں کو دی جاتی ہے جن سے جرم بالکل آخری درجے میں سرزد ہو جائے اور اپنے حالات کے لحاظ سے وہ کسی رعایت کے مستحق نہ ہوں۔

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ
ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ
اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿١٧﴾ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ
السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ
وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا
لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿١٨﴾

توبہ قبول کرنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۱۶

(یہ بات، البتہ واضح رہنی چاہیے کہ) اللہ پر توبہ قبول کرنے کی ذمہ داری اُنھی لوگوں کے لیے ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی گناہ کر بیٹھتے ہیں[۴۰]، پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ سو وہی ہیں جن پر اللہ عنایت کرتا اور اُن کی توبہ قبول فرماتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ اِس کے برخلاف اُن لوگوں کے لیے کوئی توبہ نہیں ہے جو گناہ کیے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب اُن میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آجاتا ہے، اُس وقت وہ کہتا ہے کہ اب میں نے توبہ کر لی ہے۔ اِسی طرح اُن کے لیے بھی توبہ نہیں ہے جو مرتے دم

---

[۳۹] اِس سے معلوم ہوا کہ رویے کی اصلاح توبہ کے لازمی شرائط میں سے ہے۔ اگر کوئی شخص برائی سے باز نہیں آتا تو زبان سے توبہ توبہ کا ورد کر لینے سے اُس کی توبہ قبول نہیں ہوتی، بلکہ الٹا خدا کی ناراضی کا باعث بن سکتی ہے۔

[۴۰] اصل میں لفظ ’جَهَالَة‘ استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی اگرچہ نہ جاننے کے بھی آتے ہیں، لیکن اِس کا غالب استعمال جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی شرارت یا کسی گناہ کا ارتکاب کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ چنانچہ عربی زبان میں یہ لفظ عام طور پر علم کے بجائے حلم کے ضد کے طور پر آتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ

تک منکر ہی رہیں۔ یہی تو ہیں جن کے لیے ہم نے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے[۴۱]۔ ۱۷-۱۸

ایمان والو، تمھارے لیے جائز نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ[۴۲] اور

یہاں بھی قرینہ دلیل ہے کہ یہ اِسی معنی میں آیا ہے۔

[۴۱] توبہ کی قبولیت اور عدم قبولیت کی یہ دو صورتیں قرآن نے بالکل متعین کر دی ہیں۔ اِس کے بعد صرف ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ کوئی شخص گناہ کے بعد جلد ہی توبہ کر لینے کی سعادت تو حاصل نہیں کر سکا، لیکن اُس نے اتنی دیر بھی نہیں کی کہ موت کا وقت آ پہنچا ہو۔ اِس صورت کے بارے میں قرآن خاموش ہے اور استاذ امام کے الفاظ میں، یہ خاموشی جس طرح امید پیدا کرتی ہے، اُسی طرح خوف بھی پیدا کرتی ہے اور قرآن حکیم کا منشا یہی معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ خوف و رجا کے درمیان ہی رہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اِس کے باوجود ذہن کبھی کبھی اِس طرف جاتا ہے کہ اِس امت کے اِس طرح کے لوگ، امید ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے نجات پا جائیں گے، اِس لیے کہ اُن کے بارے میں شفاعت کے ممنوع ہونے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔

[۴۲] اصل میں 'اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'كَرْهًا' 'و هن کارهات او مکرهات' کے مفہوم میں ہے۔ یہ مفہوم، اگر غور کیجیے تو اِس سے مانع ہے کہ وارث بننے کو اِس جملے میں اُن کے مال کا وارث بننے کے معنی میں لیا جائے۔ اِس لیے کہ آدمی کسی کے مال کا وارث اُس کے مرنے کے بعد ہی بنتا ہے اور زبردستی کی جس حالت کا یہاں ذکر ہے، وہ اُس کے وارثوں پر تو ہو سکتی ہے، اُس کے مر جانے کے بعد خود اُس پر نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ وارث بننے سے مراد یہاں عورتوں کو میراث سمجھ کر اُن کا مالک بن جانا ہی ہے۔ اِس مفہوم کی تائید اُن روایتوں سے بھی ہوتی ہے جن میں بیان کیا گیا ہے کہ عرب جاہلیت کے بعض طبقوں میں یہ رواج تھا کہ مرنے والے کی جایداد اور اُس کے مال مواشی کی طرح اُس کی بیویاں بھی وارثوں کی طرف منتقل ہو جاتی تھیں۔ قرآن نے اِس آیت میں واضح کر دیا ہے کہ عورتیں جانور نہیں ہیں کہ جس کو میراث میں

وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ
يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ج وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ج
فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ

نہ یہ جائز ہے کہ (نکاح کر لینے کے بعد) جو کچھ تم نے اُن کو دیا ہے، اُس کا کچھ حصہ واپس لینے کے لیے اُنھیں تنگ کرو۔ ہاں، اِس صورت میں کہ وہ کسی کھلی ہوئی بدکاری کا ارتکاب کریں۔[۴۳] اور اُن سے اچھا برتاؤ کرو۔[۴۴] اِس لیے کہ اگر تم اُنھیں ناپسند کرتے ہو تو

ملیں، وہ اُن کو لے جا کر اپنے باڑے میں باندھ لے۔ اُن کی حیثیت ایک آزاد ہستی کی ہے۔ وہ اپنی مرضی کی مالک ہیں اور حدود الٰہی کے اندر اپنے فیصلے کرنے کے لیے پوری طرح آزاد ہیں۔ اُن کی مرضی کے بغیر کوئی چیز اُن پر مسلط نہیں کی جا سکتی۔

[۴۳] یعنی جس طرح زبردستی کسی عورت کا مالک بن بیٹھنا جائز نہیں ہے، اُسی طرح یہ بات بھی جائز نہیں ہے کہ بیوی اگر ناپسند ہے تو اُس سے اپنا دیا دلایا واپس لینے کے لیے اُس کو ضیق میں ڈالنے اور تنگ کرنے کی کوشش کی جائے۔ اِس طرح کا رویہ صرف اُس صورت میں گوارا کیا جا سکتا ہے، جب وہ کھلی ہوئی بدکاری کرنے لگے۔ اِس قسم کی کوئی چیز اگر اُس سے صادر نہیں ہوئی ہے، وہ اپنی وفاداری پر قائم ہے اور پاک دامنی کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہے تو محض اِس بنیاد پر کہ بیوی پسند نہیں ہے، اُس کو تنگ کرنا عدل و انصاف اور فتوت و شرافت کے بالکل منافی ہے۔ اخلاقی فساد، بے شک قابل نفرت چیز ہے، لیکن محض صورت کے ناپسند ہونے یا کسی ذوقی عدم مناسبت کی بنا پر اُسے شریفانہ معاشرت کے حقوق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔

[۴۴] یعنی ناپسندیدگی کے باوجود اُن کے ساتھ اُس طرح کا برتاؤ کرو جو شریفوں کے شایان شان ہو، عقل و فطرت کے مطابق ہو، رحم و مروت پر مبنی ہو، اُس میں عدل و انصاف کے تقاضے ملحوظ رہے ہوں۔ اِس کے لیے آیت میں 'وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'مَعْرُوْف' کا لفظ قرآن مجید میں خیر و صلاح کے رویوں اور شرفا کی روایات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں

اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ⑲
وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ
قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا

ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند نہ ہو اور اللہ اُسی میں تمھارے لیے بہت کچھ بہتری پیدا کر دے[۴۵]۔ ۱۹

اور اگر ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ارادہ کر لو اور تم نے اُن میں سے کسی کو ڈھیروں مال بھی دے رکھا ہو تو اُس میں سے کچھ واپس نہ لو[۴۶]۔ کیا تم بہتان لگا کر

بھی یہ اِسی مفہوم میں ہے۔ مدعا یہ ہے کہ بیوی پسند ہو یا ناپسند، بندۂ مومن سے اُس کے پروردگار کا تقاضا یہی ہے کہ وہ ہر حال میں نیکی اور خیر کا رویہ اختیار کرے اور فتوت و شرافت کی جو روایت انسانی معاشروں میں ہمیشہ سے قائم رہی ہے، اُس سے سرمو انحراف نہ کرے۔

[۴۵] یہ ترغیب دی ہے کہ ناپسندیدگی کے باوجود اچھا برتاؤ کرتے ہو تو ہو سکتا ہے کہ دنیا اور آخرت کی برکتوں کے بہت سے دروازے اِسی کے ذریعے سے تم پر کھول دیے جائیں۔ اِس مفہوم کے لیے جو الفاظ آیت میں آئے ہیں، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُن کی وضاحت میں لکھا ہے:

> ”یہاں لفظ اگرچہ ’عسٰی‘ استعمال ہوا ہے جو عربی میں صرف اظہار امید اور اظہار توقع کے لیے آتا ہے، لیکن عربیت کے اداشناس جانتے ہیں کہ اِس طرح کے مواقع میں، جیسا کہ یہاں ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کا وعدہ مضمر ہوتا ہے۔ اِس اشارے کے پیچھے جو حقیقت جھلک رہی ہے، وہ یہی ہے کہ جو لوگ ظاہری شکل و صورت کے مقابل میں اعلیٰ اخلاقی و انسانی اقدار کو اہمیت اور اُن کی خاطر اپنے جذبات کی قربانی دیں گے، اُن کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر کثیر کا وعدہ ہے۔ جن لوگوں نے اِس وعدے کے لیے بازیاں کھیلی ہیں، وہ گواہی دیتے ہیں کہ یہ بات سو فی صدی حق ہے اور خدا کی بات سے زیادہ سچی بات کس کی ہو سکتی ہے۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۲۷۰)

مُبِيْنًا ﴿۲۰﴾ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾

اور کھلی ہوئی حق تلفی کر کے اُسے لو گے؟[۴۷] اور کس طرح لو گے، جب کہ تم ایک دوسرے کے آگے بے حجاب ہو چکے ہو[۴۸] اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں[۴۹]۔ ۲۰-۲۱

---

۴۶ مطلب یہ ہے کہ اگر اِس فیصلے پر پہنچ ہی گئے ہو کہ بیوی کو چھوڑ دینا ضروری ہے تو اِس صورت میں بھی جو کچھ اُسے دے چکے ہو، اُس کا واپس لینا تمھارے لیے جائز نہیں ہے۔ یہی بات سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۲۲۹ میں بھی اِسی تاکید کے ساتھ فرمائی ہے۔ اِس سے صاف واضح ہے کہ بیوی کو کوئی مال، جایداد، زیورات اور ملبوسات، خواہ کتنی ہی مالیت کے ہوں، اگر تحفے کے طور پر دیے گئے ہیں تو قرآن کا حکم یہی ہے کہ اُس سے علیحدگی کے وقت وہ ہرگز واپس نہ لیے جائیں۔

۴۷ اِس سے پہلے آیت ۱۹ میں چونکہ اجازت دی ہے کہ بیوی اگر بدکاری کی مرتکب ہو تو شوہر اُس سے اپنا دیا ہوا مال واپس لے سکتا ہے، اِس لیے یہ آخر میں تنبیہ فرمادی ہے کہ کوئی شخص بیوی پر بہتان لگا کر اِس کا جواز پیدا کرنے کی جسارت نہ کرے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ’’...یہ مرد کی فتوت کے بالکل منافی ہے کہ جس عورت کے ساتھ اُس نے زندگی بھر کا پیمان وفا باندھا، جو ایک نہایت مضبوط میثاق کے تحت اُس کے حبالۂ عقد میں آئی، جس نے اپنا سب ظاہر و باطن اُس کے لیے بے نقاب کر دیا اور دونوں نے ایک مدت تک یک جان و دو قالب ہو کر زندگی گزاری، اُس سے جب جدائی کی نوبت آئے تو اپنا کھلایا پہنایا اُس سے اگلوانے کی کوشش کی جائے، یہاں تک کہ اِس ذلیل غرض کے لیے اُس کو بہتانوں اور تہمتوں کا ہدف بھی بنایا جائے۔‘‘ (تدبر قرآن ۲/ ۲۷۱)

۴۸ اصل میں ’قَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِن کی وضاحت میں لکھا ہے:

> ’’...’افضٰی فلان الی فلان‘ کے معنی ہیں ’وصل الیہ و دخل فی حیزہ‘۔ اِسی طرح

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ

اور جن عورتوں سے تمھارے باپ نکاح کر چکے ہوں، اُن سے ہرگز نکاح نہ کرو، مگر جو

’افضٰی الی فلان بسرہ ‘ کے معنی ہیں: ’اُس نے فلاں کے آگے اپنے سارے بھید بے نقاب کر دیے۔‘ یہ میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات کی نہایت جامع اور نہایت شایستہ تعبیر ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے اِس طرح بے نقاب ہو جاتے ہیں کہ اُن کے ظاہر و باطن اور احساسات و جذبات کا کوئی گوشہ اور کوئی پہلو ایک دوسرے سے مخفی نہیں رہ جاتا۔‘‘

(تدبر قرآن ۲/ ۲۷۰)

۴۹؎ عقد نکاح کو اِس آیت میں پختہ عہد یا قرآن کے الفاظ میں ’مِیْثَاقًا غَلِیْظًا‘ سے تعبیر کیا ہے۔ اِس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

’’... میرے نزدیک اِس کی وجہ یہ ہے کہ عقد نکاح کی اصل عرفی اور شرعی حقیقت یہی ہے کہ وہ میاں اور بیوی کے درمیان حقوق اور ذمہ داریوں کا ایک مضبوط معاہدہ ہوتا ہے جس کے ذریعے سے دونوں زندگی بھر کے سنجوگ کے عزم کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ جڑتے ہیں اور دونوں یکساں طور پر حقوق بھی حاصل کرتے ہیں اور یکساں طور پر ایک دوسرے کے لیے ذمہ داریاں بھی اٹھاتے ہیں۔ بظاہر تو اِس میثاق کے الفاظ نہایت سادہ اور مختصر ہوتے ہیں، لیکن اِس کے مضمرات و تضمنات بہت ہیں اور یہ مضمرات و تضمنات ہر مہذب سوسائٹی اور ہر شریعت میں معلوم و معروف ہیں۔ یہ امر بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ میثاق بندھتا تو ہے میاں اور بیوی کے درمیان، لیکن اِس میں گرہ خدا کے حکم سے لگتی ہے اور جس طرح خلق اِس کی گواہ ہوتی ہے، اُسی طرح خالق بھی اِس کا گواہ ہوتا ہے۔ پھر اِس کے ’’میثاق غلیظ‘‘ ہونے میں کیا شبہ رہا؟ یہاں اِس رشتے کو اِس لفظ سے تعبیر فرما کر قرآن نے اِس کی اصلی عظمت واضح فرمائی ہے کہ مرد کو کسی حال میں بھی یہ بھولنا نہیں چاہیے کہ بیوی کے ساتھ اُس کا تعلق کچے دھاگے سے نہیں بندھا ہے، بلکہ یہ رشتہ نہایت محکم رشتہ ہے اور اِس کے تحت جس طرح مرد کے حقوق ہیں، اُسی طرح بیوی کے بھی حقوق ہیں جن سے مرد کے لیے فرار کی گنجایش نہیں ہے۔ اگر وہ اِن سے بھاگنے کی کوشش کرے گا تو اپنی

إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ط وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿٢٢﴾

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَأَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْأَخِ وَبَنٰتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ أَرْضَعْنَكُمْ

پہلے ہو چکا، سو ہو چکا[۵۰]۔ بے شک، یہ کھلی ہوئی بے حیائی ہے، سخت قابل نفرت بات ہے اور نہایت برا طریقہ ہے[۵۱]۔ ۲۲

تم پر تمھاری مائیں، تمھاری بیٹیاں، تمھاری بہنیں، تمھاری پھوپھیاں، تمھاری خالائیں، تمھاری بھتیجیاں اور تمھاری بھانجیاں حرام کی گئی ہیں[۵۲] اور تمھاری وہ مائیں بھی

فتوت کو بھی رسوا کرے گا اور اپنے خدا کو بھی ناراض کرے گا۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۲۷۱)

۵۰ مطلب یہ ہے کہ اِس قانون کا اطلاق ماضی پر نہ ہوگا کہ اِس کو بنیاد بنا کر تمام پچھلے تعلقات کی تحقیق کی جائے اور اِس کی روشنی میں جائز اور ناجائز کے احکام صادر کیے جائیں۔

۵۱ اِس برائی کا رواج عرب جاہلی کے بعض طبقوں ہی میں تھا، اِس لیے کہ جو الفاظ اِس کے لیے استعمال ہوئے ہیں، اُن سے واضح ہے کہ اِس کا کھلی ہوئی بے حیائی اور قابل نفرت ہونا عرب کے شرفا کو بھی معلوم تھا۔

۵۲ یہ اور اِس کے بعد جو حرمتیں بیان ہوئی ہیں، وہ استاذ امام کے الفاظ میں انسانی فطرت کے اِس تقاضے پر مبنی ہیں کہ جہاں رحمی رشتے کی قربت قریبہ موجود ہو یا اُس سے مشابہت پائی جاتی ہو، وہاں باہمی ارتباط کی بنیاد صرف رحم، محبت اور رافت و شفقت کے اعلیٰ جذبات ہی پر ہونی چاہیے۔ اِس میں نہ تو نفس کی شہوات و رغبات کی کوئی آمیزش ہونی چاہیے نہ رشک و رقابت کو اِس میں خلل انداز ہونے کا موقع دینا چاہیے۔ اِس لحاظ سے دیکھیے تو سب سے مقدم یہی نسبی رشتے ہیں اور اِن کی قربت اپنے اندر فی الواقع اِس نوعیت کا تقدس رکھتی ہے کہ اِس میں جنسی رغبت کا شائبہ بھی ہو تو اُسے فطرت صالحہ کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی۔ اِس میں شبہ نہیں کہ یہ تقدس ہی

وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ

جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا اور رضاعت کے اِس تعلق سے تمھاری بہنیں بھی۔[53] اِسی

درحقیقت تمدن کی بنیاد، تہذیب کی روح اور خاندان کی تشکیل کے لیے رأفت و رحمت کے بے لوث جذبات کا منبع ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ماں کے لیے بیٹے، بیٹی کے لیے باپ، بہن کے لیے بھائی، پھوپھی کے لیے بھتیجے، خالہ کے لیے بھانجے، بھانجی کے لیے ماموں اور بھتیجی کے لیے چچا کی نگاہ جنس و شہوت کی ہر آلایش سے پاک رہے اور عقل شہادت دیتی ہے کہ اِن رشتوں میں اِس نوعیت کا علاقہ شرف انسانی کا ہادم اور شرم و حیا کے اُس پاکیزہ احساس کے بالکل منافی ہے جو انسانوں اور جانوروں میں وجہ امتیاز ہے۔

۵۳؎ نسبی رشتوں کے بعد اب یہ رضاعی رشتوں کا بیان ہے۔ یہ رشتے اپنے اندر کیا تقدس رکھتے ہیں؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت میں لکھا ہے:

> ''رضاعت کے تعلق کو لوگ ہمارے ہاں اُس گہرے معنی میں نہیں لیتے، جس معنی میں اِس کو لوگ عرب میں لیتے تھے۔ اِس کا سبب محض رواج کا فرق ہے۔ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ اِس کو مادرانہ رشتے سے بڑی گہری مناسبت ہے۔ جو بچہ جس ماں کی آغوش میں، اُس کی چھاتیوں کے دودھ سے پلتا ہے، وہ اُس کی پوری نہیں تو آدھی ماں تو ضرور بن جاتی ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ جس کا دودھ اُس کے رگ و پے میں جاری و ساری ہے، اُس سے اُس کے جذبات و احساسات متاثر نہ ہوں۔ اگر نہ متاثر ہوں تو یہ فطرت کا بناؤ نہیں، بلکہ بگاڑ ہے اور اسلام جو دین فطرت ہے، اُس کے لیے ضروری تھا کہ اِس بگاڑ کو درست کرے۔''
>
> (تدبر قرآن ۲/۲۷۵)

یہ تعلق کس طرح دودھ پلانے سے قائم ہوتا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... یہ تعلق مجرد کسی اتفاقی واقعے سے قائم نہیں ہو جاتا۔ قرآن نے یہاں جن لفظوں میں اِس کو بیان کیا ہے، اِس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ یہ اتفاقی طور پر نہیں، بلکہ اہتمام کے ساتھ

الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ مِّنْ نِّسَآئِکُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ز فَاِنْ لَّمْ

طرح تمھاری بیویوں کی مائیں حرام کی گئی ہیں[۵۴] اور تمھاری بیویوں کی لڑکیاں حرام کی گئی

ایک مقصد کی حیثیت سے عمل میں آیا ہو، تب اِس کا اعتبار ہے۔ اول تو فرمایا ہے: ''تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا ہے۔'' پھر اِس کے لیے رضاعت کا لفظ استعمال کیا ہے: 'وَاَخَوٰتُکُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ'۔ عربی زبان کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ 'ارضاع' باب افعال سے ہے جس میں فی الجملہ مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اِسی طرح 'رضاعت' کا لفظ بھی اِس بات سے ابا کرتا ہے کہ اگر کوئی عورت کسی روتے بچے کو بہلانے کے لیے اپنی چھاتی اُس کے منہ سے لگا دے تو یہ رضاعت کہلائے۔'' (تدبر قرآن ۲/۲۷۵)

آیت کے الفاظ سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ رضاعت کے تعلق سے وہ سب رشتے حرام ہوں گے جو نسبی تعلق سے حرام ہوتے ہیں۔ قرآن کا مدعا یہی ہے، لیکن اِس کے لیے عربیت کا جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ الفاظ و قرائن کی دلالت اور حکم کے عقلی تقاضے جس مفہوم کو آپ سے آپ واضح کر رہے ہوں، اُسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ اصل میں دیکھیے تو 'وَاُمَّهٰتُکُمُ الّٰتِیْ اَرْضَعْنَکُمْ' کے ساتھ 'وَاَخَوٰتُکُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ بات اگر رضاعی ماں ہی پر ختم ہو جاتی تو اِس میں، بے شک کسی اضافے کی گنجایش نہ تھی، لیکن رضاعت کا تعلق اگر ساتھ دودھ پینے والی کو بہن بنا دیتا ہے تو عقل تقاضا کرتی ہے کہ رضاعی ماں کے دوسرے رشتوں کو بھی یہ حرمت لازماً حاصل ہو۔ دودھ پینے میں شراکت کسی عورت کو بہن بنا سکتی ہے تو رضاعی ماں کی بہن کو خالہ، اُس کے شوہر کو باپ، شوہر کی بہن کو پھوپھی اور اُس کی پوتی اور نواسی کو بھتیجی اور بھانجی کیوں نہیں بنا سکتی؟ لہٰذا یہ سب رشتے بھی یقیناً حرام ہیں۔ یہ قرآن کا منشا ہے اور 'اَخَوٰتُکُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ' کے الفاظ اِس پر اِس طرح دلالت کرتے ہیں کہ قرآن پر تدبر کرنے والے کسی صاحب علم سے اُس کا یہ منشا کسی طرح مخفی نہیں رہ سکتا۔

[۵۴] نسب اور رضاعت کے بعد اب وہ حرمتیں بیان ہوئی ہیں جو مصاہرت پر مبنی ہیں۔ یہ

تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ز وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ
مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ

ہیں جو تمھاری گودوں میں پلی ہیں[۵۵] ـــــ اُن بیویوں کی لڑکیاں جن سے تم نے خلوت کی ہو، لیکن اگر خلوت نہ کی ہو تو تم پر کچھ گناہ نہیں ـــــ اور تمھارے صلبی بیٹوں کی بیویاں بھی[۵۶]۔

رشتے چونکہ بیوی اور شوہر کی وساطت سے قائم ہوتے ہیں اور اِس سے ایک نوعیت کا ضعف اِن میں پیدا ہو جاتا ہے، اِس لیے قرآن نے تین شرطیں اِن پر عائد کر دی ہیں: ایک یہ کہ بیٹی صرف اُس بیوی کی حرام ہے جس سے خلوت ہو جائے۔ دوسری یہ کہ بہو کی حرمت کے لیے بیٹے کا صلبی ہونا ضروری ہے۔ تیسری یہ کہ بیوی کی بہن، بھانجی اور بھتیجی کی حرمت اُس حالت کے ساتھ خاص ہے، جب میاں بیوی میں نکاح کا رشتہ قائم ہو۔

۵۵؎ یہ الفاظ یہاں بیانِ شرط کے لیے نہیں، بلکہ حرمت کے حکم کو موثر بنانے کے لیے آئے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... عربی زبان میں ہر صفت کو لازماً قید و شرط کی حیثیت حاصل نہیں ہو جاتی کہ اِن میں سے کوئی نہ پائی جائے تو وہ حکم کالعدم ہو جائے، بلکہ اِس کا انحصار قرینے پر ہوتا ہے۔ قرینہ بتاتا ہے کہ کون سی صفت قید اور شرط کا درجہ رکھتی ہے اور کون سی صفت محض تصویرِ حال کے لیے ہے۔ یہاں صرف قرینہ ہی نہیں، بلکہ تصریح ہے کہ ربیبہ کی ماں اگر تمھاری مدخولہ نہ بنی ہو تو اُس ربیبہ سے نکاح میں کوئی قباحت نہیں۔ اِس سے یہ بات صاف ہو گئی کہ ربیبہ کی حرمت میں اصل موثر چیز اُس کی ماں کا مدخولہ ہونا ہے۔ اگر وہ مدخولہ ہے تو اُس کی لڑکی سے نکاح ناجائز ہوگا، قطع نظر اِس سے کہ وہ آغوشِ تربیت میں پلی ہے یا نہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اعلیٰ عربی، بالخصوص قرآن حکیم میں اثبات کے بعد نفی کے اسلوب یا نفی کے بعد اثبات کے اسلوب میں جو باتیں بیان ہوتی ہیں، وہ محض سخن گسترانہ نہیں ہوتیں، بلکہ کسی خاص فائدے کے لیے ہوتی ہیں۔ اِن سے مقصود اکثر صورتوں میں رفعِ ابہام ہوتا ہے۔ اِس وجہ سے اُن لوگوں کا

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۳﴾

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ

اور یہ بھی حرام ہے کہ تم دو بہنوں کو ایک ہی نکاح میں جمع کرو،[۵۷] مگر جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اللہ یقیناً بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۲۳

اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی کے نکاح میں ہوں، الّا یہ کہ وہ تمھاری ملکیت

خیال قرآن کے خلاف ہے جو ربیبہ کے ساتھ نکاح صرف اُس صورت میں حرام سمجھتے ہیں، جب وہ نکاح کرنے والے کے آغوش تربیت میں پلی ہو۔ بصورت دیگر وہ اُس کے ساتھ نکاح کو جائز سمجھتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۲/۲۷۶)

۵۶؎ اِس میں صلبی ہونے کی شرط، خاص طور پر اِس لیے عائد کی گئی ہے کہ اُس زمانے کے عرب میں لوگ اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کو ناجائز سمجھتے تھے۔ قرآن نے اِس شرط سے واضح کر دیا کہ کسی کو اپنا بیٹا کہہ دینے سے نہ وہ بیٹا بن جاتا ہے اور نہ اُس سے کوئی حرمت قائم ہوتی ہے۔

۵۷؎ اصل میں 'وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہاں بھی، اگر غور کیجیے تو زبان کا وہی اسلوب ہے جس کا ذکر اوپر رضاعت کی بحث میں ہوا ہے۔ قرآن نے 'بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ' ہی کہا ہے، لیکن صاف واضح ہے کہ زن وشو کے تعلق میں بہن کے ساتھ بہن کو جمع کرنا اگر اُسے فحش بناتا اور دو بہنوں کو بہنیں ہوتے ہوئے بھی سوکنوں کے جلاپے اور رشک و رقابت کے جذبات میں مبتلا کر دیتا ہے تو پھوپھی کے ساتھ بھتیجی اور خالہ کے ساتھ بھانجی کو جمع کرنا بھی گویا ماں کے ساتھ بیٹی ہی کو جمع کرنا ہے۔ لہٰذا قرآن کا مدعا، لاریب یہی ہے کہ 'ان تجمعوا بین الاختین، وبین المرأة وعمتها، و بین المرأة و خالتها'۔ وہ یہی کہنا چاہتا ہے، لیکن 'بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ' کے بعد یہ الفاظ اُس نے اِس لیے حذف کر دیے ہیں کہ مذکور کی دلالت اپنے عقلی اقتضا کے ساتھ اِس محذوف پر ایسی واضح ہے کہ قرآن کے اسلوب سے واقف اُس کا کوئی طالب علم اِس کے سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔

اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمۡ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمۡ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا بِاَمۡوَالِكُمۡ
مُّحۡصِنِيۡنَ غَيۡرَ مُسٰفِحِيۡنَ ؕ فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهٖ

میں آ جائیں[۵۸]۔ یہ اللہ کا قانون ہے جس کی پابندی تم پر لازم کی گئی ہے۔ اور اِن کے ماسوا جو عورتیں ہیں، (اُن کا مہر ادا کر کے) اپنے مال کے ذریعے سے اُنھیں حاصل کرنا تمھارے لیے حلال ہے[۵۹]، اِس شرط کے ساتھ کہ تم پاک دامن رہنے والے ہو نہ کہ

---

[۵۸] اِس لیے کہ کسی کی ملکیت میں آتے ہی اُن کا پہلا نکاح آپ سے آپ کالعدم سمجھا جاتا تھا۔ یہ اُس زمانے کا قانون تھا جسے قرآن نے بھی باقی رکھا۔ چنانچہ قیدی عورتیں اگر چاہتیں تو پکڑے جانے کے بعد کسی بھی شخص سے نکاح کر سکتی تھیں۔ اِس کے لیے اُنھیں اپنے پہلے شوہروں سے طلاق لینے کی ضرورت نہیں تھی۔

[۵۹] اِس سے واضح ہے کہ نکاح مال، یعنی مہر کے ساتھ ہونا چاہیے۔ یہ نکاح کی ایک لازمی شرط ہے۔ چنانچہ آگے ہدایت فرمائی ہے کہ اِس سے پہلے اگر کسی عورت کا مہر ادا نہیں کیا گیا تو اُسے فوراً ادا کر دیا جائے۔

یہ مہر کیا ہے؟ مرد و عورت نکاح کے ذریعے سے مستقل رفاقت کا جو عہد باندھتے ہیں، اُس میں نان و نفقہ کی ذمہ داریاں ہمیشہ سے مرد اٹھاتا رہا ہے، یہ اُس کی علامت (token) ہے۔ قرآن میں اِس کے لیے 'صَدَقَة' اور 'اَجر' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، یعنی وہ رقم جو عورت کی رفاقت کے صلے میں اُس کی ضرورتوں کے لیے دی جائے۔ نکاح اور خطبے کی طرح یہ بھی ایک قدیم سنت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب میں اِسی طرح رائج تھی۔ بائیبل میں بھی اِس کا ذکر اِسی حیثیت سے ہوا ہے*۔

اِس کی یہ اہمیت کیوں ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

---

* پیدایش ۳۴: ۱۲، خروج ۲۲: ۱۷۔

مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ
فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾

بدکاری کرنے والے[۶۰]۔ پھر (اِس سے پہلے اگر مہر ادا نہیں کیا ہے تو) جو فائدہ اُن سے اٹھایا ہے، اُس کے صلے میں اُن کا مہر اُنھیں ادا کرو، ایک فرض کے طور پر۔ مہر ٹھیرانے کے بعد، البتہ آپس کی رضامندی سے جو کچھ طے کر لو تو اُس میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ بے شک، اللہ علیم و حکیم ہے۔ ۲۴

> ”...جس معاملے کے ساتھ ادائے مال کی شرط لگی ہو اور اُس ادائے مال کی حیثیت محض ایک تبرع اور احسان کی نہ ہو، بلکہ ایک فریضے کی ہو، یہاں تک کہ اگر وہ مذکور نہ بھی ہو، جب بھی لازماً مضمر سمجھا جائے اور عورت کی حیثیت عرفی کے اعتبار سے اُس کی ادائیگی واجب قرار پائے، شرعاً و عرفاً ایک اہم اور سنجیدہ معاملہ بن جاتا ہے۔ کوئی بھی ذی ہوش آدمی ایسے معاہدے میں ایک پارٹی بننے کی جرأت نہ کرے گا، جب تک وہ سو بار سوچ کر اُس میں شرکت کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار نہ کرے ـــــ اِن مصالح سے مہر کی شرط ضروری ہوئی۔ جن لوگوں کی نظر اِن مصالح کی طرف نہیں گئی، وہ سمجھتے ہیں کہ اِس شرط نے عورت کو ایک خریدنی و فروختنی شے کے درجے تک گرا دیا ہے۔ یہ خیال محض ناسمجھی کا نتیجہ ہے۔ یہ شرط تو ایک آگاہی ہے کہ جو بھی عورت کے حرم میں قدم رکھنا چاہے، وہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر قدم رکھے۔ نکاح و طلاق کے معاملے میں کسی مذاق کی گنجایش نہیں ہے۔ یہاں مذاق بھی حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۲/۲۷۸)

[۶۰] اِس سے واضح ہے کہ نکاح کے لیے پاک دامن ہونا ضروری ہے۔ کوئی زانی یہ حق نہیں رکھتا کہ کسی عفیفہ سے بیاہ کرے اور نہ کوئی زانیہ یہ حق رکھتی ہے کہ کسی مرد عفیف کے نکاح میں آئے، اِلاّ یہ کہ معاملہ عدالت میں نہ پہنچا ہو اور وہ توبہ و استغفار کے ذریعے سے اپنے آپ کو اِس گناہ سے پاک کر لیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ
الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ
وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ
اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ

اور تم میں سے جو آزاد مسلمان عورتوں کے ساتھ نکاح کی مقدرت نہ رکھتے ہوں، اُنھیں چاہیے کہ تمھاری اُن مسلمان لونڈیوں سے نکاح کر لیں جو تمھارے قبضے میں ہوں[۶۱]، اور (یہ حقیقت پیش نظر رکھیں کہ) اللہ تمھارے ایمان سے خوب واقف ہے[۶۲]۔ تم سب ایک ہی جنس سے ہو[۶۳]۔ سو اُن کے مالکوں کی اجازت سے اُن کے ساتھ نکاح کر لو

---

[۶۱] یہ بھی اُنھی اقدامات میں سے ہے جو غلامی کے ادارے کو بتدریج ختم کر دینے کے لیے کیے گئے۔ چنانچہ اجازت دی گئی کہ جن لونڈیوں کی تربیت اُن کے مالکوں نے اچھے طریقے سے کی ہے، اُنھیں پاک دامن رکھا ہے اور وہ مسلمان بھی ہو گئی ہیں، اُن کے ساتھ وہ لوگ نکاح کر لیں جنھیں خاندانی عورتوں کے ساتھ نکاح کا مقدور نہیں ہے تاکہ اُن کی ضرورت بھی پوری ہو جائے اور یہ عورتیں بھی، جنھیں ذہنی اور اخلاقی لحاظ سے پستی میں گرا دیا گیا ہے، خاندانی عورتوں کے برابر ہو کر زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔

[۶۲] یعنی عزوشرف کی اصلی بنیاد ایمان پر ہے اور یہ محض خاندانی گھرانوں ہی کا حصہ نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ ایک لونڈی اپنے ایمان کے لحاظ سے بڑے بڑے شریف زادوں اور شریف زادیوں پر فوقیت رکھتی ہو۔

[۶۳] مطلب یہ ہے کہ تم سب آدم و حوا کی اولاد ہو۔ لونڈی اور غلام ہونا محض ایک عارضی حالت ہے۔ انسان ہونے کے اعتبار سے تم میں کوئی فرق نہیں ہے۔

مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ
بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ
الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ تَصْبِرُوْا

اور دستور کے مطابق اُن کے مہر بھی اُن کو دو،[۶۴] اِس شرط کے ساتھ کہ وہ پاک دامن رہی ہوں، بدکاری کرنے والی اور چوری چھپے آشنائی کرنے والی نہ ہوں۔ پھر جب وہ پاک دامن رکھی جائیں اور اِس کے بعد اگر کسی بدچلنی کی مرتکب ہوں تو اُن پر اُس سزا کی آدھی سزا ہے جو آزاد عورتوں کے لیے مقرر کی گئی ہے۔[۶۵] نکاح کی یہ اجازت تم میں سے اُن لوگوں کے لیے ہے جنھیں گناہ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو۔[۶۶] ورنہ صبر کرو

---

[۶۴] اِس لیے کہ سوسائٹی کے اندر اُن کا معیار اونچا ہو اور اُنھیں بھی عام عورتوں کے برابر سمجھا جائے۔

[۶۵] اِس سے یہ حقیقت پوری قطعیت کے ساتھ واضح ہو جاتی ہے کہ سورۂ نور میں زنا کے مجرموں کے لیے سو کوڑے کی جو سزا بیان ہوئی ہے، وہ اِس جرم کی انتہائی سزا ہے اور صرف اُنھی مجرموں کو دی جائے گی جن سے جرم بالکل آخری درجے میں سرزد ہو جائے اور اپنے حالات کے لحاظ سے وہ کسی رعایت کے مستحق نہ ہوں۔ پاگل، بدھو، مجبور، سزا کے تحمل سے معذور اور جرم سے بچنے کے لیے ضروری ماحول، حالات اور حفاظت سے محروم سب لوگ اِس سے یقیناً مستثنیٰ ہیں اور عدالت اُنھیں کوئی کم تر سزا بھی دے سکتی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ خاندان کی حفاظت سے محرومی اور ناقص اخلاقی تربیت کی وجہ سے لونڈیوں کو سو کوڑے کی یہ سزا نہیں دی جائے گی، یہاں تک کہ اُس صورت میں بھی جب اُن کے مالکوں اور شوہروں نے اُنھیں پاک دامن رکھنے کا پورا اہتمام کیا ہو، وہ اِس سزا کی نسبت سے آدھی سزا کی مستحق ہوں گی۔ یعنی سو کے بجائے اُنھیں پچاس کوڑے مارے جائیں گے۔

خَيۡرٌ لَّكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿٢٥﴾
يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمۡ وَيَهۡدِيَكُمۡ سُنَنَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ
وَيَتُوۡبَ عَلَيۡكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ﴿٢٦﴾

تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے اور (مطمئن رہو کہ احتیاط کے باوجود کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو) اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۲۵

اللہ کا ارادہ ہے کہ تم پر اپنی آیتیں واضح کر دے[۶۷] اور تمھیں اُن لوگوں کی راہوں پر چلائے جو تم سے پہلے گزرے ہیں اور تم پر عنایت کی نظر کرے، اور اللہ علیم و حکیم ہے[۶۸]۔ ۲۶

۶۶۔ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ اِس طرح کے نکاح میں حقوق ملکیت اور حقوق نکاح میں تصادم کا اندیشہ تھا اور یہ چیز ازدواجی زندگی کو برباد کر دے سکتی تھی۔

۶۷۔ اصل میں 'یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُبَیِّنَ لَکُمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'یُرِیْدُ' کے بعد 'ل' ہے اور اِس کے بعد آیت ۲۷ میں 'اَنْ'۔ یہ فرق کیوں ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...قرآن مجید میں اِن دونوں اسلوبوں کے تتبع سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ 'ارادہ' کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک تو قطعی فیصلے اور حتمی ارادہ کے معنی میں، دوسرے چاہنے کے معنی میں۔ جب پہلے معنی مراد ہوتے ہیں تو اِس کے بعد 'ل' آتا ہے اور جب مجرد چاہنے کے معنی میں آتا ہے تو اِس کے بعد 'اَنْ' آتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۲۸۲)

ہم نے ترجمہ اِنھی اسالیب کی رعایت سے کیا ہے۔

۶۸۔ یہ پوری بات ایک فیصلۂ الٰہی کی حیثیت سے بیان ہوئی ہے۔ اِس کی وجہ ہمارے نزدیک، یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے تمام عالم کے لیے اتمام ہدایت کا اہتمام اللہ تعالیٰ کی اسکیم میں پہلے سے طے تھا، انبیا علیہم السلام نے اِس کی خبر دی تھی اور یہ خدا کے علم و حکمت کا تقاضا بھی تھا، اِس لیے کہ وہ علیم و حکیم لوگوں کو پیدا کر کے اُن کی ہدایت کے اہتمام سے غافل نہیں

وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ قف وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿۲۷﴾
يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ج وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ

اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ تم پر عنایت کی نظر کرے، لیکن جو لوگ اپنی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں، اُن کی خواہش اِس کے برخلاف یہ ہے کہ تم حق کے راستے سے بالکل ہی بھٹک کر رہ جاؤ[۶۹]۔ ۲۷

اللہ تم پر سے پابندیوں[۷۰] کو ہلکا کرنا چاہتا ہے، (اِس لیے کہ تمھاری کمزوریوں کی رعایت کرے) اور حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی کمزور پیدا کیا گیا ہے[۷۱]۔ ۲۸

ایمان والو، ایک دوسرے کے مال آپس میں باطل طریقوں سے نہ کھاؤ[۷۲]، الّا یہ کہ

ہوسکتا تھا۔

[۶۹] اشارہ ہے اہل کتاب، خاص کر یہود کی طرف جو دین حق اور اُس کے پیرووں کے ساتھ اپنے عناد کی وجہ سے دن رات اِسی تگ و دو میں لگے رہتے تھے۔

[۷۰] یہ اُن پابندیوں کی طرف اشارہ ہے جو علما کی فقہی موشگافیوں کے باعث لوگوں پر لگ چکی تھیں۔ قرآن نے دوسری جگہ اِنھیں اصر و اغلال سے تعبیر فرمایا ہے۔

[۷۱] یہ انسان کی فطرت کا بیان ہے۔ مدعا یہ ہے کہ جو غیر فطری اور خودساختہ بوجھ اُس پر ڈال دیے گئے تھے، اُنھیں ایک دن اترنا ہی تھا۔ انسان کا خالق اُس کی کمزوریوں سے واقف ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ ایسے بوجھوں تلے اُس کو دبا رہنے دے جن کا تحمل اُس کے لیے ممکن نہ ہو یا سخت دشوار ہو جائے۔

اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿٢٩﴾ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا

تمھاری باہمی رضامندی کی تجارت ہو، جس سے کوئی مال حاصل ہو جائے، اور نہ ایک دوسرے کو قتل کرو۔[۷۳] اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ تم پر بڑا مہربان ہے۔[۷۴] اور (یاد رکھو کہ) جو لوگ

۷۲۔ اِس سے مراد وہ طریقے ہیں جو عدل وانصاف، معروف، دیانت اور سچائی کے خلاف ہوں اور جن میں لین دین اور معاملت کی بنیاد فریقین کی حقیقی رضامندی پر نہ ہو، بلکہ ایک کا مفاد ہر حال میں محفوظ رہے اور دوسرے کی بے بسی اور مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اُسے ضرر یا غرر کا ہدف بنایا جائے۔ اسلام میں معاشی معاملات سے متعلق تمام حرمتوں کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہی حکم ہے۔ رشوت، چوری، غصب، سود، جوا، غلط بیانی، تعاون علی الاثم، غبن، خیانت اور لقطہ کی مناسب تشہیر سے گریز کے ذریعے سے دوسروں کا مال لے لینا، یہ سب اِسی کے تحت داخل ہیں۔ روایتوں میں بیع وشرا اور مزارعت وغیرہ کی جن صورتوں سے منع کیا گیا ہے، وہ بھی اِسی کے تحت ہیں۔

۷۳۔ اصل الفاظ ہیں: 'وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ'۔ اِن میں 'اَنْفُسَكُمْ' کا لفظ بالکل اُسی طرح آیا ہے، جس طرح اوپر 'اَمْوَالَكُمْ' کا لفظ ہے، اِس لیے جن لوگوں نے اِس سے خودکشی کے معنی لیے ہیں، اُن کی رائے عربیت کے خلاف ہے۔ اِس کے لیے اسلوب دوسرا ہونا چاہیے۔ اِسی طرح یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ایک دوسرے کا مال کھانے اور ناحق کسی کی جان لینے کی حرمت کو اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں ایک ساتھ جمع کر دیا ہے۔ اِس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''...اِن کو ایک ساتھ جمع کرنے کی حکمت یہ ہے کہ اِن دونوں میں بڑا گہرا رشتہ ہے۔ مال کی حرص اُس کے حصول کے جائز وناجائز طریقوں کی تمیز اٹھا دیتی ہے اور پھر یہ بیماری لوگوں کو اِس طرح اندھا کر دیتی ہے کہ اُس کے لیے قتل وخون تک نوبت آ جاتی ہے۔ سماجی فسادات اور خوں ریزیوں کے اسباب کا سراغ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ حرص مال کو اِن میں سب سے

وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾ اِنْ
تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ

ظلم و زیادتی[۵] کے ساتھ ایسا کریں گے، اُن کو ہم ضرور ایک سخت بھڑکتی ہوئی آگ میں[۶] جھونک دیں گے، اور یہ اللہ کے لیے بہت ہی آسان ہے[۷]۔ (اِن گناہوں سے بچو، اِس لیے کہ) تمھیں جن چیزوں سے منع کیا جا رہا ہے، اُن کے بڑے بڑے گناہوں سے اگر تم بچتے رہے تو تمھاری چھوٹی برائیوں کو ہم تمھارے حساب سے ختم کر دیں گے اور

> زیادہ دخل ہے۔ اسلام نے اِن دونوں چیزوں کے اِس گہرے باہمی رشتے کی وجہ سے ایک دوسرے کے مال اور ایک دوسرے کی جان، دونوں چیزوں کی حرمت کی یکساں تاکید فرمائی ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۲۸۵)

[۴] مطلب یہ ہے کہ جب اللہ مہربان ہے تو وہ کس طرح پسند کر سکتا ہے کہ اُس کے بندے ایک دوسرے کا مال ناحق طریقوں سے کھائیں اور ایک دوسرے کو قتل کریں۔ وہ تو یہی چاہے گا کہ لوگ آپس میں 'رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ' بن کر زندگی بسر کریں۔

[۵] اصل میں 'عُدْوَانًا وَّ ظُلْمًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اگر ایک ساتھ آئیں تو گناہ کی دو الگ الگ صورتوں پر دلالت کرتے ہیں۔ ظلم کا لفظ اُس صورت پر دلالت کرتا ہے، جب دھاندلی سے کسی کا حق واجب ادا نہ کیا جائے اور عدوان کا اُس صورت پر، جب زور و زبردستی سے کسی کے جان و مال پر دست درازی کی جائے۔ اِس کے برخلاف الگ الگ آئیں تو کم و بیش ایک ہی مفہوم کے حامل ہو جاتے ہیں۔

[۶] اصل میں لفظ 'نَارًا' آیا ہے۔ اِس کی تنکیر یہاں تفخیم کے لیے ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

[۷] یہ الفاظ ایک مخفی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ استاذ امام نے اِس کی وضاحت

وَنُدۡخِلۡكُمۡ مُّدۡخَلًا كَرِيۡمًا ﴿۳۱﴾

تمھیں عزت کی جگہ داخل کریں گے[۸۷]۔ ۲۹-۳۱

فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”...جو لوگ خدا کو مانتے ہیں، لیکن خدا کی صفات عدل و رحم کا صحیح تصور نہیں رکھتے، وہ اپنے آپ کو الاؤنس دینے میں بڑے فیاض ہوتے ہیں۔ وہ بڑے بڑے جرائم کرتے چلے جاتے ہیں، لیکن یہود کی طرح توقع یہی رکھتے ہیں کہ خدا اُن پر بڑا مہربان ہے، اِس لیے سب بخش دے گا۔ قرآن نے یہود کا قول 'سَيُغۡفَرُ لَنَا' جو نقل کیا ہے، وہ اِسی ذہنیت کی غمازی کر رہا ہے۔ درحقیقت اِس قماش کے لوگ شہ تو حاصل کرتے ہیں اُس ڈھیل اور مہلت سے جو ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق عطا فرماتا ہے، لیکن اُن کی حیلہ جو طبیعت آڑ ڈھونڈتی ہے خدا کی رحمت کی۔ حالاں کہ خدا رحیم ہے تو آخر وہ ظالموں پر کیوں رحم فرمائے گا؟ اُس کی رحمت کے اصلی مستحق تو وہ مظلوم ہیں جو اُن کے ہاتھوں زندگی بھر ستائے گئے اور آہ بھی نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی ہی ذہنیت رکھنے والوں کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ جو لوگ ظلم و عدوان کی زندگی بسر کر رہے ہیں، اُن کو جہنم میں جھونک دینا خداے رحیم پر ذرا بھی شاق نہیں گزرے گا، اِس لیے کہ وہ جس طرح رحیم ہے، اُسی طرح عادل بھی ہے اور یہ عدل بھی اُس کی رحمت ہی کا تقاضا ہے۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۲۸۶)

[۸۷] بڑے گناہوں سے مراد وہ گناہ ہیں جو قرآن کے اُن احکام عشرہ کی خلاف ورزی سے پیدا ہوتے ہیں جو سورۂ بنی اسرائیل (۱۷) کی آیات ۲۲-۳۹ میں مذکور ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے کہ اِن سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے کا صلہ اُس نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اِس کے بعد آدمی کے چھوٹے گناہوں کو وہ اپنی بے پایاں رحمت سے معاف کر دیتا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس آیت کی تفسیر میں ایک اور حقیقت کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”یہاں یہ حقیقت بھی یاد رکھنی چاہیے کہ صغائر سے بچنے کی راہ بھی یہی ہے کہ آدمی کبائر سے

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ
نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ
وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ﴿۳۲﴾

اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی ہے، اُس کی تمنا نہ کرو،[۷۹] اِس لیے کہ مردوں نے جو کچھ کمایا ہے، اُس کا حصہ اُنھیں مل جائے گا اور عورتوں نے جو کچھ کمایا ہے، اُس کا حصہ اُنھیں بھی لازماً مل جائے گا۔ (ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی تمنا ہو تو اِس میدان میں آگے بڑھو) اور (اِس کے لیے) اللہ سے

اجتناب کرے۔ جو آدمی اپنے ہزاروں کے قرضے چکا تا رہتا ہے، وہ اِس بات پر کبھی راضی نہیں ہوتا کہ کسی کے پانچ روپے دبا کر نادہند کہلانے کی ذلت گوارا کرے۔ برعکس اِس کے جو لوگ کبائر کے مرتکب ہوتے ہیں، لیکن چھوٹی چھوٹی نیکیوں کا بڑا اہتمام کرتے ہیں، اُن کا حال زندگی بھر یہ رہتا ہے کہ مچھر کو چھانتے رہتے ہیں اور اونٹ کو نگلتے رہتے ہیں۔ دوسروں کو تو یہ زیرے اور سونف تک کی زکوٰۃ کا حساب سمجھاتے ہیں، لیکن خود یتیموں کے مال اور اوقاف کی آمدنیوں سے اپنی کوٹھیاں بنواتے اور اُن کو سجاتے ہیں۔‘‘ (تدبر قرآن ۲/۲۸۸)

[۷۹] یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ انسان کے لیے جدوجہد اور مسابقت کا اصلی میدان اُس کی خلقی صفات نہیں ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ خلقی صفات کے لحاظ سے بعض کو بعض پر فی الواقع ترجیح حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی کو ذہنی، کسی کو جسمانی، کسی کو معاشی اور کسی کو معاشرتی برتری کے ساتھ پیدا کیا اور دوسروں کو اُس کے مقابلے میں کم تر رکھا ہے۔ مرد و عورت کا معاملہ بھی یہی ہے۔ اِن میں زوجین کا تعلق ایک کو فاعل اور دوسرے کو منفعل بنا کر پیدا کیا گیا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ فعلیت جس طرح غلبہ، شدت اور تحکم چاہتی ہے، انفعالیت اُسی طرح نرمی، نزاکت اور اثر پذیری کا تقاضا کرتی ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھیے تو اِن میں سے ہر ایک کو دوسرے پر برتری حاصل ہے۔ اِن میں

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۭ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿۳۳﴾

اُس کے فضل کا حصہ مانگو۔ یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔[۸۰] (یہی ترجیحات وراثت کی تقسیم میں بھی ملحوظ ہیں) اور والدین اور قرابت مندوں کے چھوڑے ہوئے مال میں (اِنھی کے مطابق) ہم نے ہر ایک کے لیے وارث ٹھیرا دیے ہیں۔ (اِن میں تبدیلی کی کوشش نہ کرو)، رہے وہ لوگ جن سے تمھارے عہد و پیمان ہوں تو اُن کا حصہ اُنھیں دو۔ (اِس میں، البتہ کسی حق دار کو نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں ہونا چاہیے)، اِس لیے کہ اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔[۸۱] ۳۲-۳۳

اگر مسابقت اور تنافس کا رویہ اختیار کیا جائے گا تو یہ فطرت کے خلاف جنگ ہوگی جس کا نتیجہ اِس کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا کہ بالآخر دونوں اپنی بربادی کا ماتم کرنے کے لیے باقی رہ جائیں۔

۸۰؎ یہ ایک دوسرے میدان کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یہ اکتسابی صفات، یعنی نیکی، تقویٰ، عبادت، ریاضت اور علم و اخلاق کا میدان ہے۔ قرآن نے اِس کے لیے جگہ جگہ ایمان اور عمل صالح کی تعبیر اختیار فرمائی ہے۔ مسابقت اور تنافس کا میدان درحقیقت یہی ہے۔ اِس میں بڑھنے کے لیے کسی پر کوئی پابندی نہیں، بلکہ مسابقت اِس میدان میں اُتنی ہی محمود ہے، جتنی خلقی صفات کے میدان میں مذموم ہے۔ مرد بڑھے تو اُسے بھی اپنی جدوجہد کا پھل ملے گا اور عورت بڑھے تو وہ بھی اپنی تگ و دو کا ثمرہ پائے گی۔ بانو، باندی، آزاد، غلام، شریف، وضیع، خوب صورت، بدصورت اور بینا و نابینا، سب کے لیے یہ میدان یکساں کھلا ہوا ہے۔ دوسروں پر فضیلت کی خواہش ہو تو انسان کو اِس میدان میں خدا کا فضل تلاش کرنے کے لیے نکلنا چاہیے۔ اپنی محنت غلط میدان میں برباد کرنے سے لاحاصل تصادم اور بے فائدہ تنازعات کے سوا کچھ بھی

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ

(میاں اور بیوی کے تعلق میں بھی اِسی اصول کے مطابق) مرد عورتوں کے سر براہ بنائے گئے ہیں، اِس لیے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی ہے اور اِس لیے کہ اُنھوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں۔[۸۲] پھر جو نیک عورتیں ہیں، وہ (اپنے شوہروں

حاصل نہیں ہوتا۔ حوصلہ آزمانے اور ارمان نکالنے کا صحیح میدان یہ ہے۔ جس کو اترنا ہو، وہ اِس میدان میں اترے۔

[۸۱] یہ تقسیم وراثت کے اُس ضابطے کی طرف اشارہ ہے جو اِس سے پہلے اِسی سورہ میں بیان ہوا ہے۔ موقع کلام کی رعایت سے اِس کا ذکر یہاں حصوں میں خدا کی قائم کی ہوئی ترجیحات کو بدلنے کی کوشش پر تنبیہ کے لیے ہوا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِس حوالے سے مقصود اِس کو مزید موکد کرنا ہے کہ ہر مورث کے جو وارث خدا نے ٹھہرا دیے ہیں، وہی اصلی وارث ہیں۔ اب اُن میں اپنے ذاتی رجحانات کی بنا پر نہ کسی ترمیم و تبدیلی کی گنجایش ہے اور نہ اُن کے مقررہ حصوں میں کسی کمی بیشی کی۔ اگر کسی نے کسی غیر وارث سے کچھ دینے دلانے کا وعدہ کر رکھا ہے تو اُس کو وہ حصہ دے جو اُس کا ہے۔ ’اُس کا حصہ‘ سے مراد، ظاہر ہے کہ وہی حصہ ہو سکتا ہے جس کی مورث کو وصیت کی اجازت ملی ہوتی ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی تقسیم سے علیحدہ کر رکھا ہے۔ یہ حصہ درحقیقت ایسے ہی لوگوں کے لیے خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے چھوڑا گیا ہے۔ اِس وجہ سے اِس کے لیے ’نَصِیْبَهُمْ‘ کا لفظ استعمال ہوا۔ آخر میں اپنی صفت ’عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدًا‘ کا حوالہ بطور تنبیہ دیا ہے کہ بے جا جانب داری کی مخفی سے مخفی کوشش بھی اللہ کے علم سے مخفی نہیں رہ سکتی۔ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر اور ہر جلی و خفی سے آگاہ ہے۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۲۸۹)

[۸۲] یہ خاندان کی تنظیم کے لیے اللہ نے اپنا قانون بیان فرمایا ہے۔ خاندان کا ادارہ بھی، اگر غور کیجیے تو ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ جس طرح ہر ریاست اپنے قیام و بقا کے لیے ایک سر براہ کا

لِلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۭ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ

کی) فرماں بردار ہوتی ہیں، رازوں کی حفاظت کرتی ہیں، اِس بنا پر کہ اللہ نے بھی
رازوں کی حفاظت کی ہے[۸۳]۔ اور (اِسی اصول پر تم کو حق دیا گیا ہے کہ) جن عورتوں سے

تقاضا کرتی ہے، اُسی طرح یہ ریاست بھی ایک سربراہ کا تقاضا کرتی ہے۔ سربراہی کا مقام اِس ریاست میں مرد کو بھی دیا جا سکتا ہے اور عورت کو بھی۔ قرآن نے بتایا ہے کہ یہ مرد کو دیا گیا ہے۔ آیت میں اِس کے لیے 'قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ عربی زبان میں 'قام' کے بعد 'علٰی' آتا ہے تو اِس میں حفاظت، نگرانی، تولیت اور کفالت کا مضمون پیدا ہو جاتا ہے۔ سربراہی کی حقیقت یہی ہے اور اِس میں یہ سب چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ اپنے اِس فیصلے کے حق میں قرآن نے دو دلیلیں دی ہیں۔ استاذ امام اِن کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

> ''ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت پر فضیلت بخشی ہے۔ مرد کو بعض صفات میں عورت پر نمایاں تفوق حاصل ہے جن کی بنا پر وہی سزاوار ہے کہ قوامیت کی ذمہ داری اُسی پر ڈالی جائے۔ مثلاً محافظت و مدافعت کی جو قوت و صلاحیت یا کمانے اور ہاتھ پاؤں مارنے کی جو استعداد و ہمت اُس کے اندر ہے، وہ عورت کے اندر نہیں ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں زیر بحث کلی فضیلت نہیں ہے، بلکہ صرف وہ فضیلت ہے جو مرد کی قوامیت کے استحقاق کو ثابت کرتی ہے۔ بعض دوسرے پہلو عورت کی فضیلت کے بھی ہیں، لیکن اُن کو قوامیت سے تعلق نہیں ہے۔ مثلاً عورت گھر درسنبھالنے اور بچوں کی پرورش و نگہداشت کی جو صلاحیت رکھتی ہے، وہ مرد نہیں رکھتا۔ اِسی وجہ سے قرآن نے یہاں بات ابہام کے انداز میں فرمائی ہے جس سے مرد اور عورت، دونوں کا کسی نہ کسی پہلو سے صاحب فضیلت ہونا نکلتا ہے۔ لیکن قوامیت کے پہلو سے مرد ہی کی فضیلت کا پہلو راجح ہے۔
>
> دوسری یہ کہ مرد نے عورت پر اپنا مال خرچ کیا ہے۔ یعنی بیوی بچوں کی معاشی اور کفالتی ذمہ داری تمام تر اپنے سر اٹھائی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داری مرد نے اتفاقیہ یا تبرعاً نہیں اٹھائی ہے، بلکہ اِس وجہ سے اٹھائی ہے کہ یہ ذمہ داری اُسی کے اٹھانے کی ہے۔ وہی اِس کی صلاحیتیں

وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ج فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا

تمھیں سرکشی کا اندیشہ ہو[۸۴]، اُنھیں نصیحت کرو اور اُن کے بستروں پر اُنھیں تنہا چھوڑ دو اور

رکھتا ہے اور وہی اِس کا حق ادا کر سکتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/۲۹۱)

۸۳؎ میاں اور بیوی کے تعلق میں شوہر کو قوام قرار دینے کے بعد خاندان کے نظم کو صلاح و فلاح کے ساتھ قائم رکھنے کے لیے یہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں سے دو چیزوں کا تقاضا کیا ہے:

ایک یہ کہ اُنھیں اپنے شوہروں کے ساتھ موافقت اور فرماں برداری کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

دوسری یہ کہ شوہر کے رازوں اور اُس کی عزت و ناموس کی حفاظت کرنی چاہیے۔

پہلی بات تو محتاج وضاحت نہیں، اِس لیے کہ نظم، خواہ ریاست کا ہو یا کسی ادارے کا، اطاعت اور موافقت کے بغیر ایک دن کے لیے بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ نظم کی فطرت ہے۔ اِسے نہ مانا جائے تو وہ نظم نہیں، بلکہ اختلال و انتشار ہو گا جس کے ساتھ کوئی ادارہ بھی وجود میں نہیں آتا۔

رہی دوسری بات تو اِس کے لیے قرآن نے 'حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ' کی تعبیر اختیار کی ہے۔ عام طور پر اِس کے معنی پیٹھ پیچھے کی حفاظت کے لیے جاتے ہیں۔ ہم نے اِسے رازوں کی حفاظت کرنے والی کے معنی میں لیا ہے۔ اِس کا یہی مفہوم ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت میں لکھا ہے:

> ''... یہ معنی لینے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ 'غیب' کا لفظ راز کے مفہوم کے لیے مشہور ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں ترکیب کلام ایسی ہے کہ ''پیٹھ پیچھے'' کے معنی لینے کی گنجایش نہیں، تیسری یہ کہ عورت اور مرد کے درمیان رازوں کی امانت داری کا مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والا مسئلہ ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے قدرتی امین ہیں۔ بالخصوص عورت کا مرتبہ تو یہ ہے کہ وہ مرد کے محاسن و معائب، اُس کے گھر در، اُس کے اموال و املاک اور اُس کی عزت و ناموس ہر چیز کی ایسی رازدان ہے کہ اگر وہ اُس کا پردہ چاک کرنے پہ آ جائے تو مرد بالکل ہی ننگا ہو کر رہ جائے۔ اِس وجہ سے قرآن نے اِس صفت کا خاص طور پر ذکر فرمایا۔ اِس کے ساتھ 'بِمَا حَفِظَ

عَلَيۡهِنَّ سَبِيۡلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيۡرًا ﴿۳۴﴾

(اِس پر بھی نہ مانیں تو) اُنھیں سزا دو۔ پھر اگر وہ تمھاری بات ماننے لگیں تو اُن پر الزام کی راہ نہ ڈھونڈو۔ بے شک، اللہ بہت بلند ہے، وہ بہت بڑا ہے۔[۸۵] ۳۴

> اللہ' کا جو اضافہ ہے، اُس سے اِس صفت کی عالی نسبی کا اظہار مقصود ہے کہ اُن کی اِس صفت پر خدا کی صفت کا ایک پرتو ہے، اِس لیے کہ خدا نے بھی اپنے بندوں اور بندیوں کے رازوں کی حفاظت فرمائی ہے، ورنہ وہ لوگوں کا پردہ چاک کرنے پر آ جاتا تو کون ہے جو کہیں منہ دکھانے کے قابل رہ جاتا۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۲۹۲)

قرآن نے فرمایا ہے کہ صالح بیویوں کا رویہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ اِس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو عورتیں سرکشی اور تمرد اختیار کریں یا گھر کے راز دوسروں پر افشا کرتی پھریں، وہ خدا کی نگاہ میں ہرگز صالحات نہیں ہیں۔

۸۴۔ اصل میں 'نُشُوْز' کا لفظ آیا ہے۔ اِس کے معنی سر اٹھانے کے ہیں، مگر اِس کا زیادہ استعمال اُس سرکشی اور شوریدہ سری کے لیے ہوتا ہے جو کسی عورت سے اُس کے شوہر کے مقابل میں ظاہر ہو۔ یہ لفظ عورت کی ہر کوتاہی، غفلت یا بے پروائی یا اپنے ذوق اور راے اور اپنی شخصیت کے اظہار کی فطری خواہش کے لیے نہیں بولا جاتا، بلکہ اُس رویے کے لیے بولا جاتا ہے، جب وہ شوہر کی قوامیت کو چیلنج کر کے گھر کے نظام کو بالکل تلپٹ کر دینے پر آمادہ نظر آتی ہے۔

۸۵۔ یہ اِس سوال کا جواب ہے کہ کوئی عورت اگر موافقت کا رویہ اختیار کرنے کے بجاے سرکشی پر اتر آئے اور شوہر کے گھر میں رہتے ہوئے اُس کو شوہر ماننے سے انکار کر دے تو اُس کی اصلاح کے لیے شوہر کیا اُس کی تادیب کر سکتا ہے؟ فرمایا ہے کہ معاملہ یہاں تک پہنچ رہا ہو تو مرد تین صورتیں اختیار کر سکتا ہے۔

پہلی یہ کہ عورت کو نصیحت کی جائے۔ آیت میں اِس کے لیے 'وَعْظ' کا لفظ آیا ہے جس کے معنی

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ؕ

اور اگر (اِس کے بعد بھی صورت حال بہتر نہ ہو اور) تم لوگ میاں اور بیوی کے درمیان افتراق کا اندیشہ محسوس کرو تو ایک حکم مرد کے لوگوں میں سے اور ایک عورت کے لوگوں میں سے مقرر کر دو۔[۸۶] (اِس سے توقع ہے کہ) اگر (میاں اور بیوی)، دونوں

یہ ہیں کہ اِس میں کسی حد تک زجر و توبیخ بھی ہو سکتی ہے۔

دوسری یہ کہ اُس سے بے تکلفانہ قسم کا خلا ملا ترک کر دیا جائے تاکہ اُسے اندازہ ہو کہ اُس نے اپنا رویہ نہ بدلا تو اِس کے نتائج غیر معمولی ہو سکتے ہیں۔

تیسری یہ کہ عورت کو جسمانی سزا دی جائے۔ یہ سزا، ظاہر ہے کہ اتنی ہی ہو سکتی ہے جتنی کوئی معلم اپنے زیر تربیت شاگردوں کو یا کوئی باپ اپنی اولاد کو دیتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی بنا پر اِس کی حد 'غیر مبرح'* کے الفاظ سے متعین فرمائی ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ ایسی سزا نہ دی جائے جو کوئی اثر چھوڑے۔

آیت کے انداز بیان سے واضح ہے کہ اِن تینوں میں ترتیب و تدریج ملحوظ ہے، یعنی پہلی کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری صورت اُسی وقت اختیار کرنی چاہیے، جب آدمی مطمئن ہو جائے کہ بات نہیں بنی اور اگلا قدم اٹھانے کے سوا چارہ نہیں رہا۔ مرد کے تادیبی اختیارات کی یہ آخری حد ہے۔ قرآن نے فرمایا ہے کہ اگر اِس سے اصلاح ہو جائے تو عورت کے خلاف انتقام کی راہیں نہیں ڈھونڈنی چاہییں۔ چنانچہ 'اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا' کے الفاظ میں تنبیہ کی گئی ہے کہ سب سے بلند اور سب سے بڑا خدا ہے۔ وہ جب آسمان و زمین کا مالک ہو کر بندوں کی سرکشی سے درگذر فرماتا ہے اور توبہ و اصلاح کے بعد نافرمانیوں کو معاف کر دیتا ہے تو اُس کے بندوں کو بھی

---

*ابوداؤد، رقم ۱۹۰۵۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾
وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا

اصلاح چاہیں گے تو اللہ اُن کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا۔ بے شک، اللہ علیم و خبیر ہے۔[۸۷] ۳۵

اور تم سب اللہ کی بندگی کرو اور اُس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھیراؤ۔[۸۸] والدین

دوسروں پر اختیار پا کر اپنے حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔

۸۶۔ یعنی مرد وہ سارے جتن کرنے کے بعد بھی عورت کے نشوز پر قابو نہیں پا سکا جو اوپر بیان ہوئے ہیں تو اِس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اب اِس رشتے کو قائم رکھنا آسان نہیں رہا۔ لیکن اِس موقع پر بھی اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ وہ بیوی کو طلاق دے کر جان چھڑا لے۔ چنانچہ اصلاح احوال کے لیے یہ ایک دوسری تدبیر اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی ہے اور میاں بیوی کے قبیلہ، برادری اور اُن کے رشتہ داروں اور خیر خواہوں سے کہا ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر معاملات کو سدھارنے کی کوشش کریں۔

۸۷۔ یہ نہایت بلیغ اسلوب میں میاں بیوی کو ترغیب دی ہے کہ اُنھیں اِس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ وہ اگر افتراق کے بجائے سازگاری چاہیں گے تو اُن کا پروردگار بڑا کریم ہے۔ اُس کی توفیق اُن کے شامل حال ہو جائے گی۔

۸۸۔ یہ اخلاق کے فضائل و رذائل کا بیان ہے۔ اِس کی ابتدا قرآن میں بعض دوسرے مقامات پر بھی اللہ کی عبادت کرتے رہنے کی ہدایت سے ہوئی ہے۔ یہ عبادت اللہ کا حق ہے اور خالق و مالک اور جہانوں کا پروردگار ہونے کی وجہ سے اُسی کا حق سب سے بڑا ہے۔ اِس کی حقیقت خضوع اور تذلل ہے جس کا اولین ظہور پرستش کی صورت میں ہوتا ہے۔ پھر انسان کے عملی وجود کی رعایت سے یہی پرستش اطاعت کو شامل ہو جاتی ہے۔ پہلی صورت کے مظاہر تسبیح و تحمید، دعا و

وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی

کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو[۸۹] اور قرابت مندوں،[۹۰] یتیموں، مسکینوں[۹۱] اور رشتہ دار پڑوسیوں اور

مناجات، رکوع و سجود، نذر نیاز، قربانی اور اعتکاف ہیں۔ دوسری صورت میں آدمی کسی کو مستقل بالذات شارع و حاکم سمجھ کر اُس کے لیے تحلیل و تحریم اور امر و نہی کے اختیارات مانتا اور اُس کے حکم پر سر تسلیم خم کرتا ہے۔ اللہ، پروردگار عالم کا فیصلہ ہے کہ اِن میں سے کوئی چیز بھی اُس کے سوا کسی اور کے لیے نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ساتھ ہی تاکید کر دی ہے کہ خدا کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھیرایا جائے۔ یہ تنہا خدا کا حق ہے۔ اِس میں کسی دوسرے کو شریک کیا جائے تو یہ باطل ہو کر رہ جاتی ہے۔

۸۹ اصل میں 'وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'ب' اِس بات پر دلیل ہے کہ 'اِحْسَانًا' یہاں 'بر' کے مفہوم پر متضمن ہے، یعنی یہ حسن سلوک اداے حقوق کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اِس کی تعلیم تمام الہامی صحائف میں دی گئی ہے۔ قرآن مجید نے یہاں اور اِس کے علاوہ بنی اسرائیل (۱۷) کی آیت ۲۳، عنکبوت (۲۹) کی آیت ۸، لقمان (۳۱) کی آیات ۱۴-۱۵ اور احقاف (۴۶) کی آیت ۱۵ میں یہی تلقین فرمائی ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ انسانوں میں سب سے مقدم حق والدین کا ہے۔ چنانچہ اللہ کی عبادت کے بعد سب سے پہلے اِسی کو ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے والدین ہی اُس کے وجود میں آنے اور پرورش پانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ لقمان اور احقاف میں یہ حکم جس طرح بیان ہوا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن میں بھی ماں کا حق زیادہ ہے۔ بچے کی پرورش کے معاملے میں باپ کی شفقت بھی کم نہیں ہوتی، لیکن حمل، ولادت اور رضاعت کے مختلف مراحل میں جو مشقت بچے کی ماں اٹھاتی ہے، اُس میں یقیناً اُس کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اِسی بنا پر ماں کا حق باپ کے مقابلے میں تین درجے زیادہ قرار دیا ہے۔*

۹۰ اِس سے واضح ہے کہ والدین کے علاوہ جو تعلقات اِس دنیا میں پیدا ہوتے ہیں، اُن میں

---

* بخاری، رقم ۵۹۷۱۔ مسلم، رقم ۶۵۰۰۔

وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ ﴿۳۶﴾

اجنبی پڑوسیوں اور ہم نشینوں کے ساتھ بھی حسن سلوک سے پیش آؤ۔ اِسی طرح مسافروں اور لونڈی غلاموں کے ساتھ جو تمھارے قبضے میں ہوں[۹۲]۔ اللہ اُن لوگوں کو

پہلا حق اعزہ واقربا کا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن سے حسن سلوک کو صلۂ رحمی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انسانوں کے مابین وجہ تعلق ہم عمری بھی ہو سکتی ہے، ہم درسی، ہم سایگی، ہم نشینی، ہم مذاقی، ہم پیشگی اور ہم وطنی بھی، لیکن اِن تمام تعلقات میں سب سے بڑھ کر وہی تعلق ہے جو رحم مادر کے اشتراک سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ خالق فطرت کی باندھی ہوئی گرہ ہے جسے توڑنا انسان کے لیے کسی طرح زیبا نہیں ہے، لہٰذا اِس کے حقوق کی نگہداشت بھی سب سے مقدم ہے۔

۹۱ اعزہ واقربا کے بعد یہ یتامیٰ ومساکین کو اِس حکم میں شامل کیا گیا ہے۔ اِس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ گویا یہ بھی قرابت مندوں ہی کے زمرے میں ہیں۔ لہٰذا ہر مسلمان کو اِنھیں اِسی نگاہ سے دیکھنا چاہیے اور اِسی جذبے سے اِن کی خدمت اور سرپرستی کرنی چاہیے۔

۹۲ تمدن کی تبدیلی کے باوجود مسافر تو اب بھی کسی نہ کسی صورت میں ضرورت مند ہو جاتے ہیں، لیکن غلامی اِس زمانے میں ختم ہو چکی ہے۔ اسلام نے جو اقدامات اِسے ختم کرنے کے لیے کیے، اُن کی تفصیلات ہم اپنی کتاب ''میزان'' میں ''قانون معاشرت'' کے زیر عنوان بیان کر چکے ہیں۔ پڑوسی کے بارے میں، البتہ قرآن کا تصور مذہب واخلاق کی تاریخ میں ایک بالکل ہی منفرد تصور ہے۔ عام طور پر تو لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ پڑوسی وہ ہے جس کا مکان آپ کے مکان سے ملا ہوا یا اُس کے قریب ہے، لیکن قرآن نے اِس آیت میں بتایا ہے کہ پڑوسی تین قسم کا ہوتا ہے:

ایک وہ جو پڑوسی بھی ہے اور قرابت مند بھی۔ اِسے 'اَلْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی' سے تعبیر کیا ہے اور

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ
مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۳۷﴾ ۚ
وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

پسند نہیں کرتا جو اتراتے اور اپنی بڑائی پر فخر کرتے ہیں[۹۳]، جو خود بھی بخل کرتے اور دوسروں کو بھی اِسی کا مشورہ دیتے ہیں اور اللہ نے اپنے فضل میں سے جو کچھ اُنھیں دیا ہے، اُسے چھپاتے ہیں[۹۴]۔ ایسے ناشکروں کے لیے ہم نے ذلیل کر دینے والا عذاب تیار کر

اِس کا ذکر سب سے پہلے ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے پڑوسیوں کے مقابلے میں یہ حسن سلوک کا زیادہ حق دار ہے۔

دوسرا وہ جو قرابت مند تو نہیں، لیکن پڑوسی ہے۔ اُس کے لیے 'اَلْجَارِ الْجُنُبِ' یعنی اجنبی پڑوسی کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اجنبیت رشتہ و قرابت کے لحاظ سے بھی ہو سکتی ہے اور دین و مذہب میں اختلاف کے باعث بھی ہو سکتی ہے۔ قرابت مند پڑوسی کے بعد اِسی کا درجہ ہے۔

تیسرا وہ جو سفر و حضر میں کسی جگہ آدمی کا ساتھی یا ہم نشین بن گیا ہے۔ قرآن نے اسے 'اَلصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ' سے تعبیر کیا ہے اور اِس کے لیے اُسی طرح حسن سلوک کی ہدایت فرمائی ہے، جس طرح دوسرے پڑوسیوں کے لیے فرمائی ہے۔

۹۳ اداے حقوق اور احسان کی تاکید کے بعد یہ اُس کے منافی ذہنیت کا بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو خود اپنی قابلیت اور اپنی تدبیر و حکمت کا کرشمہ سمجھنے لگتے ہیں، اُن کے اندر تواضع اور شکر گزاری کے جذبے کے بجاے اترانے اور اپنی بڑائی پر فخر کرنے کی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے۔

۹۴ یہ اترانے اور بڑائی مارنے والوں کی چند مزید خصوصیات بیان ہوئی ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِن کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَاۗءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾

رکھا ہے ـــــ جو اپنے مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور نہ اللہ کو مانتے ہیں اور نہ قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ (اُن کا ساتھی شیطان ہے) اور حقیقت

”پہلی یہ کہ یہ خود بھی بخیل ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں۔ بخیل اُس شخص کو کہتے ہیں جو دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں تنگ دل ہو۔ جو شخص دوسروں کے حقوق فیاضی اور کشادہ دلی کے ساتھ ادا کرتا ہے، لیکن خود اپنی ذات کے معاملے میں احتیاط اور تنگی برتتا ہے، اُس کو بخیل نہیں کہتے۔ بخالت کا بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے مال و اسباب کو خدا کی دین سمجھنے کے بجاے خود اپنی تدبیر و قابلیت کا کرشمہ سمجھنے لگتا ہے۔ اِس وجہ سے اُس کے اندر تواضع اور شکرگزاری کا وہ جذبہ ہی مردہ ہو جاتا ہے جو فیاضی اور جودوکرم کا اصل محرک ہے۔

بخیل آدمی دوسروں کو بھی بخالت کا مشورہ دیتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دوسروں کی فیاضی سے خود اُس کی بخالت کا راز فاش ہوتا ہے۔ اپنے اِس عیب پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے اُس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس طرح وہ دوسروں کے حقوق دبائے بیٹھا ہے، اُسی طرح دوسرے بھی بیٹھے رہیں کہ نہ کوئی ناک والا ہو گا، نہ اُس کو نکو بننا پڑے گا۔ قاعدہ ہے کہ جو آدمی بزدل ہوتا ہے، وہ دوسروں کو بھی بزدلی ہی کا درس دیتا ہے تاکہ خود اُس کی بزدلی کا بھانڈا نہ پھوٹے۔

دوسری یہ کہ یہ اللہ کے اُس فضل کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے اُن کو دے رکھا ہے ـــــ یہ بخیل مال داروں کے ایک نہایت مخفی نفسیاتی پہلو کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ بخیل مال داروں کی خواہش ایک طرف تو یہ ہوتی ہے کہ ہر شخص پر اُن کی ریاست و امارت کی دھونس جمی رہے، دوسری طرف یہ کوشش بھی وہ کرتے رہتے ہیں کہ کوئی شخص اداے حقوق کے معاملے میں اُن کو کوئی ملامت نہ کر سکے۔ چنانچہ یہ ہر ملنے جلنے والے اور ہر طالب و سائل کے سامنے اپنے وسیع اخراجات، کاروبار میں نقصانات، اپنی پھیلی ہوئی ذمہ داریوں اور طالبوں اور سائلوں کی کثرت

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ﴿۳۹﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾ يَوْمَىِٕذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ۭ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴿۴۲﴾

یہ ہے کہ جس کا ساتھی شیطان بن جائے تو وہ بہت ہی برا ساتھی ہے۔ اِن کا کیا نقصان تھا، اگر یہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لاتے اور اللہ نے جو کچھ انھیں بخشا ہے، اُس میں سے خرچ کرتے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ اِن سے خوب باخبر ہے۔[۹۵] اللہ کسی کی ذرہ برابر حق تلفی نہ کرے گا اور کسی کی ایک نیکی ہوگی تو اُسے کئی گنا بڑھائے گا اور (اِس کے ساتھ) خاص اپنے پاس سے اُس کو بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔ ۳۶-۴۰

پھر اُس دن یہ کیا کریں گے، جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور اِن لوگوں پر، (اے پیغمبر)، تمھیں گواہ بنا کر کھڑا کریں گے۔ (پھر) اُس دن وہ لوگ جو انکار پر اصرار کرتے رہے اور جنھوں نے رسول کی نافرمانی کی ہے، تمنا کریں گے کہ

کا دکھڑا روتے رہتے ہیں تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ ہے تو یہ شخص غنی دریا دل، لیکن بے چارہ کیا کرے، بڑی بھاری ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ اِس وجہ سے ہزاروں لاکھوں کی آمدنی رکھنے کے باوجود اِس کے پاس بچتا بچاتا کچھ بھی نہیں ہے۔" (تدبر قرآن ۲/۲۹۹)

[۹۵] یہ اظہار افسوس کا اسلوب ہے جو اِن بخل کرنے والوں کو اِن کی بدقسمتی پر توجہ دلانے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْاؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ

کاش، زمین اُن پر اُن کے سمیت برابر کر دی جائے اور وہاں وہ اللہ سے کوئی بات بھی چھپا نہ سکیں گے۔[۹۶] ۴۱-۴۲

ایمان والو، (خدا کی بندگی کا جو حکم تمھیں اوپر دیا گیا ہے، اُس کا سب سے بڑا مظہر نماز ہے، اِس لیے) تم نشے میں ہو تو نماز کی جگہ کے قریب نہ جاؤ،[۹۷] یہاں تک کہ جو کچھ

۹۶؎ اِس گواہی کی پوری حقیقت سیدنا مسیح علیہ السلام کی اُس گواہی سے واضح ہوتی ہے جس کا ذکر سورۂ مائدہ کے آخر میں ہوا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ ایک عظیم شرف کا بیان ہے، لیکن غور کیجیے تو اِس کے ساتھ یہ آپ کے لیے ایک عظیم ذمہ داری کا بیان بھی ہے۔ چنانچہ روایتوں میں آتا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سناتے ہوئے یہ آیت پڑھی تو آپ شدت تاثر سے آب دیدہ ہو گئے۔*

۹۷؎ اصل میں 'لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن کے ساتھ دو قرینے موجود ہیں جو اِس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہاں 'صَلٰوة' کا لفظ موضع صلٰوۃ، یعنی مسجد پر بھی مشتمل ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> "...ایک تو یہ کہ فرمایا نشے اور جنابت کی حالت میں نماز کے قریب بھی نہ پھٹکو۔ ظاہر ہے کہ اگر 'صلٰوۃ' سے مراد مجرد نماز ہوتی تو اِس کے لیے 'نماز نہ پڑھو' کہہ دینا کافی تھا۔ 'لَا تَقْرَبُوْا' کے الفاظ سے اِس مطلب کو ادا کرنے کا کوئی خاص فائدہ سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسرا یہ کہ اِس کے ساتھ 'اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ' کا استثنا بھی ہے۔ یعنی اگر نماز کی جگہ سے مجرد گزر جانا مد نظر ہو تو اِس میں

---

* بخاری، رقم ۴۳۰۶، ۴۷۶۳۔ مسلم، رقم ۸۰۰۔

مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا
طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾

کہہ رہے ہو، اُسے سمجھنے لگو اور اِسی طرح جنابت کی حالت میں بھی، جب تک غسل نہ کرلو، اِلاّ یہ کہ صرف گزر جانا پیش نظر ہو۔ اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی رفع حاجت کرکے آئے[98] یا تم نے عورتوں سے مباشرت کی ہو، پھر پانی نہ ملے تو کوئی پاک جگہ دیکھو اور اپنے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کرلو۔ (اللہ نے تمھارے ساتھ یہ رعایت فرمائی ہے)، اِس لیے کہ اللہ درگذر کرنے والا اور بخشش فرمانے والا ہے[99]۔ ۴۳

> مضائقہ نہیں۔ یہ گزر جانا، نماز کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا، بلکہ اِس کی واضح مناسبت ہوسکتی ہے تو موضع نماز ہی کے ساتھ ہوسکتی ہے۔ بعض لوگوں نے اِسی عدم مناسبت سے بچنے کے لیے 'عَابِرِیْ سَبِیْلٍ' سے مراد حالت سفر کولیا ہے، لیکن یہ محض تکلف ہے۔ اول تو سفر کے لیے یہ تعبیر بالکل اجنبی ہے، دوسرے یہ کہ حالت سفر کے لیے جو رخصت ہے، وہ اِسی آیت میں 'اَوْ عَلٰی سَفَرٍ' کے الفاظ سے مستقلاً بیان ہوئی ہے۔ پھر یہاں اِس کے ذکر کی کیا ضرورت تھی۔"
>
> (تدبر قرآن ۲/ ۳۰۲)

[98] اصل الفاظ ہیں: 'اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ'۔ لفظ 'غَآئِط' عربی زبان میں نشیبی زمین کے لیے آتا ہے۔ یہاں یہ رفع حاجت سے کنایہ ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ دیہاتی زندگی میں لوگ اِس مقصد کے لیے بالعموم نشیبی زمینوں ہی میں جاتے ہیں۔

[99] اوپر جس طرح عبادت اور احسان و انفاق کو باطل کر دینے والی چیزوں، شرک اور ریا وغیرہ کا ذکر فرمایا تھا، اُسی طرح سلسلۂ بیان کے آخر میں اب یہ عبادت الٰہی کے سب سے بڑے مظہر نماز کے مفسدات بیان کیے ہیں۔ آیت پر غور کیجیے تو صاف واضح ہوتا ہے کہ نشے اور جنابت کو

اِس میں یکساں مفسد نماز قرار دیا گیا ہے، اِس لیے کہ یہ دونوں حالتیں نجاست کی ہیں۔ بس اتنا فرق ہے کہ نشہ عقل کی نجاست ہے اور جنابت جسم کی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ شراب جس طرح عقل کو معطل کر دیتی ہے، اُسی طرح جنابت کا انقباض بھی اُس انشراح اور حضورِ قلب کو ختم کر دیتا ہے جو نماز کے لیے مطلوب ہے۔ اِس میں اتنی رخصت، البتہ اللہ تعالیٰ نے رکھ دی ہے کہ اِس حالت میں کوئی شخص اگر کسی ضرورت کے باعث مسجد کے اندر سے محض گزرنا چاہے تو گزر سکتا ہے۔ فرمایا ہے کہ جنابت کی اِس حالت کے بعد غسل ضروری ہے، اِس کے بغیر نماز نہیں پڑھی جا سکتی۔ اِس غسل کے لیے آیت میں 'تَغْتَسِلُوْا' کا لفظ آیا ہے۔ اِس کا تقاضا ہے کہ اِسے پورے اہتمام کے ساتھ کیا جائے۔ تاہم اِس کے ساتھ اجازت دی ہے کہ سفر، مرض یا پانی کی نایابی کی صورت میں وضو اور غسل، دونوں مشکل ہو جائیں تو آدمی تیمّم کر سکتا ہے۔ اِس کا طریقہ اِس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ کوئی پاک جگہ دیکھ کر اُس سے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کر لیا جائے۔ نیز صراحت فرمائی ہے کہ تیمّم ہر قسم کی نجاست میں کفایت کرتا ہے۔ وضو کے نواقض میں سے کوئی چیز پیش آ جائے تو اُس کے بعد بھی کیا جا سکتا ہے اور مباشرت کے بعد غسل جنابت کی جگہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...مرض میں وضو یا غسل سے ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے، اِس وجہ سے یہ رعایت ہوئی ہے۔ اِسی طرح سفر میں مختلف حالتیں ایسی پیش آ سکتی ہیں کہ آدمی کو تیمّم ہی پر قناعت کرنی پڑے۔ مثلاً یہ کہ پانی نایاب تو نہ ہو، لیکن کم یاب ہو۔ اندیشہ ہو کہ اگر غسل وغیرہ کے کام میں لایا گیا تو پینے کے لیے پانی تھڑ جائے گا یا یہ ڈر ہو کہ اگر نہانے کے اہتمام میں لگے تو قافلے کے ساتھیوں سے بچھڑ جائیں گے، یا ریل اور جہاز کا ایسا سفر ہو کہ غسل کرنا شدید زحمت کا باعث ہو۔“
>
> (تدبر قرآن ۲/ ۳۰۳)

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ تیمّم سے بظاہر کوئی پاکیزگی تو حاصل نہیں ہوتی، لیکن اصل طریقۂ طہارت کی یادداشت ذہن میں قائم رکھنے کے پہلو سے اِس کی بڑی اہمیت ہے۔ شریعت میں یہ چیز بالعموم ملحوظ رکھی گئی ہے کہ جب اصلی صورت میں کسی حکم پر عمل کرنا ممکن نہ ہو تو شبھی

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ

تم نے دیکھا نہیں[۱۰۰] اُن لوگوں کو جو خدا کی کتاب سے بہرہ یاب ہوئے؟[۱۰۱] (اُن کے سامنے یہ اُسی کتاب کے بھیجنے والے کی شریعت پیش کی جاتی ہے تو اِس کے مقابلے میں) وہ گم راہی کو ترجیح دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راستہ گم کر دو۔ تمھارے اِن دشمنوں سے اللہ خوب واقف ہے۔ (تم اِن کی پروا نہ کرو) اور (مطمئن رہو کہ) تمھاری حمایت کے لیے اللہ کافی ہے اور تمھاری مدد کے لیے اللہ کافی ہے۔ ۴۴-۴۵

(پھر اِن میں سے خاص کر) جو یہودی بن گئے ہیں، اُن کا ایک گروہ زبان کو توڑ موڑ کر اور دین پر طعن کرتے ہوئے[۱۰۲] لفظوں کو اُن کے موقع و محل سے ہٹا دیتا ہے اور 'سَمِعْنَا

صورت میں اُس کی یادگار باقی رکھی جائے۔ اِس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ حالات معمول پر آتے ہی طبیعت اصلی صورت کی طرف پلٹنے کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے۔

[۱۰۰] اصل میں 'اَلَمْ تَرَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اسلوب مخاطبین کو فرداً فرداً متوجہ کرنے اور اظہار تعجب و افسوس کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔

[۱۰۱] اصل الفاظ ہیں: 'الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ'۔ اِن میں 'مِنْ' بیان کے لیے ہے، یعنی وہ لوگ جن کے حصے میں کتاب الٰہی آئی اور دنیا کی سب قوموں کو چھوڑ کر وہ اُس سے نوازے گئے۔

وَطَعۡنًا فِی الدِّیۡنِ ؕ وَلَوۡ اَنَّہُمۡ قَالُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا وَاسۡمَعۡ
وَانۡظُرۡنَا لَکَانَ خَیۡرًا لَّہُمۡ وَاَقۡوَمَ ۙ وَلٰکِنۡ لَّعَنَہُمُ اللّٰہُ بِکُفۡرِہِمۡ

وَعَصَیۡنَا‘، ’اِسۡمَعۡ غَیۡرَ مُسۡمَعٍ‘ اور ’رَاعِنَا‘ کہتا ہے[۱۰۴] دراں حالیکہ اگر وہ ’سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا‘، ’اِسۡمَعۡ‘ اور ’اُنۡظُرۡنَا‘ کہتے تو اُن کے لیے بہتر ہوتا اور موقع و محل کے مطابق بھی۔[۱۰۵] لیکن اُن کے منکر ہو جانے کے باعث اللہ نے اُن پر لعنت کر دی ہے، اِس لیے

۱۰۲؎ یہود کی جن شرارتوں کا ذکر آگے ہوا ہے، وہ سب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر طنز کے لیے ہیں، لیکن قرآن نے اِن کو ’طَعۡنًا فِی الدِّیۡنِ‘ (دین پر طعن) سے تعبیر کیا ہے۔ اِس سے یہ اشارہ مقصود ہے کہ دین و شریعت اور نبی کی شخصیت اصل میں ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ اِس وجہ سے نبی پر طعن خود دین پر طعن کے مترادف ہے۔

۱۰۳؎ یہ اُن شرارتوں کی طرف اجمالاً اشارہ کیا ہے جو یہود کے اشرار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کے ارادے سے اور آپ کے لائے ہوئے دین کو دوسروں کی نگاہ میں حقیر اور بے وقعت بنانے کے لیے کرتے تھے۔ اِس کی ایک مثال عرب کے مجلسی الفاظ میں اُن کی تحریف تھی جو متکلم کی تحسین، سننے والوں کی طرف سے ذوق و شوق اور اعتراف و قبول کے اظہار کے لیے بولے جاتے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... یہ الفاظ اصلاً تو اظہار تحسین یا اعتراف و قبول کے لیے ہیں، لیکن اگر کوئی گروہ شرارت اور بدتمیزی کرنا چاہے تو ذرا زبان کو توڑ مروڑ کر، تلفظ کو بگاڑ کر، یا لب و لہجے میں ذرا مصنوعی انداز پیدا کر کے بڑی آسانی سے تحسین کو تقبیح اور اعتراف و اقرار کو طنز و استہزا بنا سکتا ہے۔ اِس سے متکلم کے وقار کو کوئی نقصان پہنچے یا نہ پہنچے، لیکن شرارت پسند اشخاص اِس طرح اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کر کے خوش ہو جاتے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۳۰۹)

۱۰۴؎ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِن الفاظ کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

‘‘سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا’ کے لفظی معنی ہیں: ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ اہل عرب یہ اُس موقع پر بولتے تھے، جب اپنے کسی بڑے، کسی سردار، کسی بادشاہ کے حکم وارشاد پر اپنی طرف سے امتثال امر کے لیے آمادگی اور مستعدی کا اظہار کرنا چاہتے۔ عربی میں اِس کے لیے ’طَاعَةٌ‘ کا لفظ بھی ہے جو قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے۔ یہودی اشرار آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں جاتے تو اپنی سعادت مندی اور وفاداری کی نمایش کے لیے ’سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا‘ تو بات بات پر کہتے، لیکن لب و لہجے کے تصرف سے اُس کو ادا اِس طرح کرتے کہ ’اَطَعْنَا‘ کو ’عَصَيْنَا‘ بنا لیتے۔ چونکہ دونوں کے حروف ہم آہنگ اور قریب المخرج ہیں، اِس وجہ سے اِس تحریف میں اُن کو کامیابی ہو جاتی۔ اِس طرح وہ تسلیم واطاعت کے جملے کو نافرمانی وسرکشی کے قالب میں ڈھال دیتے اور سمجھنے والے اُن کی اِس شرارت پر کوئی گرفت بھی نہ کر سکتے، اِس لیے کہ وہ بڑی آسانی سے یہ بہانہ بنا سکتے تھے کہ ہم نے ’سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا‘ کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں شریف اور خوددار آدمی بات کو سن اور سمجھ کر بھی خاموشی سے ٹال دینے ہی کو بہتر خیال کرتا ہے۔

’اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ‘ کے لفظی معنی ہیں: سنو وہ بات جو پہلے سنائی نہیں گئی۔ اِس فقرے کا اچھا محل یہ ہے کہ مجلس میں متکلم یا خطیب کی کوئی حکیمانہ بات سن کر ایک سامع دوسرے سامع کو متوجہ کرے کہ یہ دانش مندانہ اور حکیمانہ بات سنیے، یہ بات پہلی بار ہمارے کانوں نے سنی ہے، اِس سے پہلے یہ بات کبھی ہم نے نہیں سنی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات نہ صرف متکلم اور خطیب کی قدردانی کی دلیل ہے، بلکہ دوسروں کو اُس کی قدردانی کے لیے تشویق وترغیب بھی ہے، لیکن کوئی شخص ہوٹنگ (hooting) کے انداز میں باندازِ تمسخر یہی بات کہے تو اِس کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ ’ذرا اِس کی ناشنیدنی سنو، یہ کیسی بے پر کی اڑا رہا ہے، ایسی بات کا ہے کو کبھی کسی نے سنی ہوگی!‘ ظاہر ہے کہ محض انداز اور لب و لہجے کی تبدیلی نے اِس نہایت اعلیٰ فقرے کو طعن وطنز کا ایک زہر آلود نشتر بنا دیا۔ لیکن اِس پر بھی کوئی گرفت نہیں ہو سکتی، اِس لیے کہ گرفت ہو تو کہنے والا صفائی پیش کر سکتا ہے کہ میں نے تو طنز کے طور پر نہیں، بلکہ تحسین کے طور پر کہا ہے۔ چونکہ اِس فقرے میں طنز کا پہلو ’غَيْرَ مُسْمَعٍ‘ کے الفاظ سے پیدا ہوتا تھا، اِس لیے قرآن نے اُس کی یہ نوک توڑ دی اور ہدایت کی کہ صرف ’اِسْمَعْ‘ کہا جائے۔

فَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۴۶﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ اٰمِنُوۡا بِمَا نَزَّلۡنَا مُصَدِّقًا لِّمَا

وہ کم ہی ایمان لائیں گے[۱۰۵]۔ ۴۶

اے وہ لوگو، جنھیں کتاب دی گئی، اُس چیز کو مان لو[۱۰۶] جو ہم نے اُن چیزوں کی تصدیق

> ’رَاعِنَا‘ کے لفظی معنی ہیں، ذرا ہماری رعایت فرمایئے۔ اِس لفظ کا اچھا محل استعمال یہ ہے کہ اگر مخاطب نے متکلم کی بات اچھی طرح سنی یا سمجھی نہ ہو یا بات ایسی لطیف اور حکیمانہ ہو کہ خود متکلم کی زبان سے اُس کو مکرر سننا چاہے تو اُس کو دوبارہ متوجہ کرنے کے لیے جس طرح ہمارے ہاں کہتے ہیں: پھر ارشاد ہو، پھر فرمایئے، اُسی طرح عربی میں ’رَاعِنَا‘ کہتے ہیں۔ یہ لفظ سامع کے ذوق و شوق اور اُس کی رغبت علم کی دلیل ہے، لیکن یہودی اشرار ’لیّ لسان‘ یعنی زبان کے توڑ مروڑ کے ذریعے سے اِس کو بھی طنز کے قالب میں ڈھال لیتے تھے۔ اِس کی شکل یہ ہوتی کہ ’رَاعِنَا‘ میں ’ع‘ کے کسرہ کو ذرا دبا دیجیے تو یہ لفظ ’راعینا‘ بن جائے گا اور اِس کے معنی ہوں گے: ”ہمارا چرواہا“۔ قرآن نے یہود کی اِس شرارت کی وجہ سے اِس لفظ کو سرے سے مسلمانوں کے مجلسی الفاظ ہی سے خارج کر دیا اور اِس کی جگہ ’اُنۡظُرۡنَا‘ کے استعمال کی ہدایت فرمائی جس کے معنی ہیں: ذرا ہمیں مہلت عنایت ہو، ذرا پھر توجہ فرمایئے۔ یعنی مفہوم کے لحاظ سے یہ ٹھیک ٹھیک ’رَاعِنَا‘ کا قائم مقام ہے اور اِس میں لہجے کے بگاڑ سے کسی بگاڑ کے پیدا کیے جانے کا کوئی موقع نہیں ہے۔“
>
> (تدبر قرآن ۲/ ۳۰۹)

۱۰۵؎ یعنی اِن میں سے شاذ کوئی مان لے تو مان لے، ایک گروہ کی حیثیت سے اب اِن کے ایمان لانے کا کوئی امکان نہیں ہے، اِس لیے کہ اتمام حجت کے باوجود جب اِنھوں نے رسول کی تکذیب کا فیصلہ کر لیا ہے تو اِن کے اِس جرم کی پاداش میں اللہ نے بھی اِن پر لعنت کر دی ہے جس کے نتیجے میں یہ توفیق ہدایت سے محروم ہو چکے ہیں۔

۱۰۶؎ یہ تہدید و وعید کی آیت ہے۔ اِس میں دعوت کا ذکر محض اتمام حجت کے لیے ہوا ہے۔

مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ

میں اتاری ہے جو خود تمھارے پاس موجود ہیں۔ مان لو، اِس سے پہلے کہ ہم چہرے بگاڑ دیں[۱۰۷] اور اُن کو پیچھے کی طرف الٹ کر برابر کر دیں[۱۰۸] یا اُن پر بھی (جن کے یہ چہرے

۱۰۷۔ اصل میں 'اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'طمس الشئ' کے معنی کسی چیز کے آثار و علامات مٹا دینے کے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ تمھارے چہروں پر یہ آنکھ، کان، منہ اور ناک کے نشانات مٹا کر برابر کر دیں گے، اِس لیے کہ یہ قوتیں جس مقصد سے عطا ہوئی ہیں، جب اِن سے وہ کام نہیں لیا گیا تو اِنھیں باقی رکھنے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اِس کے بعد تو یہی بہتر ہے کہ چہرے بھی اُسی طرح سپاٹ بنا دیے جائیں، جس طرح سر کے پیچھے کا حصہ سپاٹ ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ 'وُجُوْهًا' کا لفظ اِس جملے میں نکرہ آیا ہے۔ یہ نفرت و کراہت کے اظہار کے لیے ہے اور اِس سے یہ اشارہ مقصود ہے کہ متکلم اِن لعنت زدہ چہروں کا تعین کے ساتھ ذکر کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ لہٰذا 'وجوهم' نہیں کہا، اُن سے منہ پھیر کر 'وُجُوْهًا' کہا ہے۔ اِس کے بعد 'نَلْعَنَهُمْ' کی ضمیر غائب بھی اِسی رعایت سے آئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> "یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے مجھے بار بار یہ خیال ہوتا ہے کہ چہروں کو بگاڑ دینے کی دھمکی جو اُن کو دی گئی، اُس میں عمل اور سزا کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ اوپر والی آیت میں اُن کی یہ حرکت جو بیان ہوئی ہے کہ پیغمبر کا مذاق اڑانے کے لیے منہ بنا بنا کر اور لہجے بگاڑ بگاڑ کر الفاظ کو کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں اور اِس منہ بنانے اور الفاظ کے بگاڑنے کو اُنھوں نے ہنر سمجھ رکھا ہے، اِس کی بنا پر وہ مستحق ہوئے کہ واقعی اُن کے چہرے مسخ ہی کر دیے جائیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس جنھوں نے حق سے منہ موڑنے ہی کو شیوہ بنا لیا ہے تو وہ سزاوار ہیں کہ اُن کے چہرے پیچھے ہی کی طرف الٹ دیے جائیں۔" (تدبر قرآن ۲/ ۳۱۲)

۱۰۸۔ اِس سے پہلے جو مضمون 'اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے، یہ اُسی کی

اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ
يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾

ہیں) اُسی طرح لعنت کر دیں، جس طرح ہم نے سبت والوں پر لعنت کر دی تھی[109] اور (یاد رکھو کہ) خدا کی بات ہو کر رہتی ہے۔ ۴۷

(اِن کا خیال ہے کہ اِن کے عقائد و اعمال خواہ کچھ ہوں، یہ لازماً جنت میں جائیں گے۔ اِنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) اللہ اِس بات کو نہیں بخشے گا کہ (جانتے بوجھتے کسی کو) اُس کا شریک ٹھیرایا جائے[110]۔ اِس کے نیچے، البتہ جس کے لیے جو گناہ چاہے گا، (اپنے قانون کے مطابق) بخش دے گا[111]، اور (اِس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ) جو اللہ کا

تفصیل ہے۔

[109] یعنی یہود کے جن لوگوں نے سبت کے دن کی بے حرمتی کی، اُن پر لعنت کر دی تھی۔ اِس کی صورت یہ ہوئی کہ یہ ذلیل بندر بنا دیے گئے۔ قرآن میں یہ واقعہ جس طرح بیان ہوا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اُن کی سیرت مسخ ہوئی اور اِس کے بعد ایک ظاہری فرق جو تھوڑا سا رہ گیا تھا، وہ بھی بالآخر مٹ گیا۔ یہاں تک کہ اِس لعنت نے اُن کے ظاہر و باطن، ہر چیز کا احاطہ کر لیا۔

[110] اِس لیے کہ شرک خدا پر افترا ہے اور اِس لحاظ سے سب سے بڑا ظلم ہے جس کا ارتکاب کوئی شخص خدا کی زمین پر کر سکتا ہے۔ اِس سے توبہ اور رجوع کے بغیر کوئی شخص اگر دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو خدا کی بارگاہ میں پھر اُس کے لیے معافی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

[111] اِس سے واضح ہے کہ دوسرے گناہوں کے معاملے میں بھی کسی کو دلیر نہیں ہونا چاہیے، اِس لیے کہ یہ بھی اُسی وقت معاف ہوں گے، جب خدا چاہے گا اور خدا کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ جو کچھ چاہتا ہے، اپنی حکمت اور اپنے قانون کے مطابق چاہتا ہے۔ اُس کی کوئی مشیت بھی

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ط بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ
يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ
الْكَذِبَ ط وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۰﴾
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ

شریک ٹھیراتا ہے، وہ ایک بہت بڑے گناہ کا افترا کرتا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جو (شرک جیسے گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں اور اِس کے باوجود) اپنے آپ کو پاکیزہ ٹھیراتے ہیں[۱۱۲]۔ ہرگز نہیں، بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے (اپنے قانون کے مطابق) پاکیزگی عطا کرتا ہے[۱۱۳]۔ (یہ اپنے کرتوتوں کی سزا لازماً بھگتیں گے) اور اِن پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اِنھیں دیکھو، (اپنے اِن دعووں سے) یہ اللہ پر کیسا افترا باندھ رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ صریح گناہ ہونے کے لیے تو یہی کافی ہے۔ ۴۸-۵۰

الل ٹپ نہیں ہوتی۔ وہ علیم و حکیم ہے اور اُس کی یہ صفات اُس کی ہر مشیت کے ساتھ شامل رہتی ہیں۔

[۱۱۲] یعنی اِس زعم باطل میں مبتلا ہیں کہ ہم چونکہ خدا کے محبوبوں کی اولاد اور اُس کی برگزیدہ امت ہیں، اِس لیے بڑے بڑے گناہوں کا مرتکب ہونے کے باوجود اُس کی جنت میں داخل ہونے کے لیے جو پاکیزگی چاہیے، وہ ہمیں ہر حال میں حاصل رہتی ہے۔

[۱۱۳] یعنی اپنے اِس قانون کے مطابق کہ پاکیزگی ایمان و عمل اور بر و تقویٰ سے وابستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نعمت اُنھی کو عطا فرماتا ہے جو اِن چیزوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ اِن کے بغیر یہ کسی کو بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى
مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴿۵۱﴾ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ
يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ﴿۵۲﴾ ۭ اَمْ لَھُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ
فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ﴿۵۳﴾ ۙ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰي

تم نے دیکھا نہیں اِن لوگوں کو جو خدا کی کتاب سے بہرہ یاب ہوئے؟ یہ جبت اور طاغوت[۱۱۴] پر عقیدہ رکھتے ہیں اور منکروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان والوں سے زیادہ صحیح راستے پر تو یہ ہیں[۱۱۵]۔ یہی لوگ ہیں کہ جن پر اللہ نے لعنت کر دی ہے اور جن پر اللہ لعنت کر دے، پھر تم اُن کا کوئی مددگار نہیں پا سکتے۔ کیا خدا کی بادشاہی میں اِن کا بھی کوئی حصہ ہے؟[۱۱۶] اگر ایسا ہوتا تو یہ لوگوں کو پھوٹی کوڑی بھی دینے کے لیے تیار نہ ہوتے۔

---

[۱۱۴] یہود جن معاملات میں شرک کے مرتکب ہوئے، یہ اُس کی ایک مثال ہے۔ اِس میں جبت سے مراد اعمال سفلیہ ہیں۔ اِن میں چونکہ شیطانی قوتوں کو موثر بالذات مانا جاتا ہے، اِس لیے جبت کے ساتھ طاغوت کا ذکر بھی ہوا ہے۔ اِس میں اور شیطان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قرآن میں یہ دونوں بالکل ہم معنی استعمال ہوتے ہیں۔

[۱۱۵] یعنی اِس قدر پستی میں گر چکے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں کھلم کھلا مشرکین عرب کو مسلمانوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ قرآن کے بعض دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس کے لیے وہ کتاب الٰہی کی اُن اصلاحات کو آڑ بناتے تھے جو اُن بدعتوں اور تشددات کے خلاف تھیں جو اُن کے فقہا نے خدا کی شریعت میں پیدا کر دیے تھے۔

[۱۱۶] یہ استفہام انکار کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کی بادشاہی اور اُس کا اختیار و اقتدار اُسی کے پاس ہے۔ اُس نے اُس کا کوئی حصہ اُنھیں نہیں دے رکھا ہے کہ وہ جس کو چاہیں دیں اور جسے چاہیں محروم کر دیں۔

مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ
وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۭ وَكَفٰى
بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ
نَارًا ۭ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا

کیا یہ لوگوں سے اللہ کی اُس عنایت پر حسد کر رہے ہیں جو اُس نے اُن پر کی ہے؟[۱۱۷] یہی بات ہے تو سن لیں کہ ہم نے تو اولاد ابراہیم (کی اِس شاخ) کو اپنی شریعت اور اپنی حکمت بخش دی اور اُنھیں ایک عظیم بادشاہی عطا فرما دی ہے۔[۱۱۸] ۵۱-۵۴

لیکن (اِن پر افسوس، اِنھوں نے ابھی تک اُس کی قدر نہیں پہچانی، سو) اِن میں ایسے بھی ہیں جو اِس (حکمت اور اِس شریعت) پر ایمان لائے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو اِس سے منہ موڑ گئے ہیں۔ اِس طرح کے لوگوں کے لیے دوزخ کی بھڑکتی آگ ہی کافی ہے۔ جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو ماننے سے انکار کر دیا ہے، اُنھیں ہم عنقریب ایک بڑی آگ میں جھونک دیں گے۔ اُن کی کھالیں جب پک جائیں گی،

---

[۱۱۷] یہ اُن کے باطن سے پردہ اٹھا دیا ہے کہ اُن کا تمام غم و غصہ صرف اِس بات پر ہے کہ نبوت تو اُن کے خاندان کا حصہ تھی۔ یہ اُس سے نکل کر بنی اسمٰعیل کے اندر کس طرح چلی گئی ہے؟

[۱۱۸] یعنی اُن کے حسد کے علی الرغم بنی اسمٰعیل کے حق میں نبوت اور نبوت کے ساتھ ایک عظیم بادشاہی کا بھی فیصلہ کر دیا ہے۔ یہ وہی بادشاہی ہے جو بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کو حاصل ہوئی۔ اُس وقت یہ ایک پیشین گوئی تھی، لیکن چند ہی برسوں میں حقیقت بن گئی اور خدا کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں پوری شان کے ساتھ نافذ ہو گیا۔

الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿٥٦﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۫ وَّنُدْخِلُهُمْ
ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿٥٧﴾

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا
حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا
يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿٥٨﴾

ہم اُن کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے تاکہ وہ خوب عذاب کا مزہ چکھیں۔ بے شک، اللہ عزیز و حکیم ہے۔[۱۱۹] اور جو لوگ (ہماری آیتوں پر) ایمان لائے اور نیک عمل کیے، اُن کو عنقریب ہم ایسے باغوں میں داخل کر دیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔ اُن کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور اُنھیں ہم گھنی چھاؤں میں رکھیں گے۔ ۵۵-۵۷

(ایمان والو، اللہ نے تمھیں ایک عظیم بادشاہی عطا کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو اِس موقع پر) اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ امانتیں اُن کے حق داروں کو ادا کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو۔ نہایت اچھی بات ہے یہ جس کی اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے۔ بے شک، اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔[۱۲۰] ۵۸

---

[۱۱۹] لہٰذا نہ کوئی اُس کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے اور نہ اُس کا کوئی کام انصاف اور حکمت سے خالی ہو سکتا ہے۔ اُس کا قانون بے لاگ ہے، بنی اسرائیل ہوں یا بنی اسمٰعیل، وہ ہر ایک کے ساتھ اُسی کے مطابق معاملہ کرے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِى
الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ ۚ فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِىۡ شَىۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَى اللّٰهِ

ایمان والو، (یہ خدا کی بادشاہی ہے، اِس میں) اللہ کی اطاعت کرو اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو اور اُن کی بھی جو تم میں سے معاملات کے ذمہ دار بنائے جائیں۔

---

۱۲۰ امانت کا لفظ اُن چیزوں کے لیے آتا ہے جن کا کسی شخص کو امین بنایا جائے۔ یہاں اِس سے مراد وہ مناصب اور ذمہ داریاں ہیں جو نظم اجتماعی سے پیدا ہوتی ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ تم سے پہلے یہ بادشاہی جن لوگوں کو دی گئی تھی، وہ تو اِس میں چور ثابت ہوئے، مگر تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ تمھاری اولین ذمہ داری یہ ہے کہ اِس نعمت عظمیٰ کو پانے کے بعد قوم کی امانتیں اہلیت (merit) کی بنیاد پر لوگوں کے سپرد کرو اور عدل و انصاف کو زندگی کے ہر شعبے میں اور اُس کی آخری صورت میں قائم کر دینے کی جدوجہد کرتے رہو۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے یہ دوسری بات اپنی تفسیر میں اِس طرح واضح فرمائی ہے:

> ”... یہ امانت کے سب سے اہم پہلو کی تفصیل بھی ہے اور اقتدار کے ساتھ جو ذمہ داری وابستہ ہے، اُس کی وضاحت بھی۔ جن کو اللہ تعالیٰ اپنی زمین میں اقتدار بخشتا ہے، اُن پر اولین ذمہ داری جو عائد ہوتی ہے، وہ یہی ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والے جھگڑوں کو عدل و انصاف کے ساتھ چکائیں۔ عدل کا مطلب یہ ہے کہ قانون کی نگاہ میں امیر و غریب، شریف و وضیع، کالے اور گورے کا کوئی فرق نہ ہو، انصاف خریدنی و فروختنی چیز نہ بننے پائے، اُس میں کسی جنبہ داری، کسی عصبیت، کسی سہل انگاری کو راہ نہ مل سکے۔ کسی دباؤ، کسی زور و اثر اور کسی خوف و طمع کو اُس پر اثر انداز ہونے کا موقع نہ ملے۔
>
> جن کو بھی اللہ تعالیٰ اِس زمین میں اقتدار بخشتا ہے، اِسی عدل کے لیے بخشتا ہے۔ اِس وجہ سے سب سے بڑی ذمہ داری اِسی چیز کے لیے ہے۔ خدا کے ہاں عادل حکمران کا اجر بھی بہت بڑا ہے اور غیر عادل کی سزا بھی بہت سخت ہے۔ اِس وجہ سے تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ بہت ہی اعلیٰ نصیحت ہے جو اللہ تعالیٰ تمھیں کر رہا ہے، اِس میں کوتاہی نہ ہو۔ آخر میں اپنی صفات سمیع و بصیر کا

وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ
خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿٥٩﴾

پھر اگر کسی معاملے میں تمھارا اختلاف راے ہو تو (فیصلے کے لیے) اُسے اللہ اور اُس کے رسول کی طرف لوٹا دو، اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے اچھا ہے[۱۲۱]۔ ۵۹

حوالہ دیا ہے کہ یاد رکھو کہ خدا سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے، کوئی مخفی سے مخفی ناانصافی بھی اُس سے مخفی رہنے والی نہیں۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۳۲۳)

[۱۲۱] یہ حکم خدا کی براہ راست حکومت کے لیے دیا گیا تھا جس کی سربراہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھی اور جس کے اولی الامر آپ ہی کے مقرر کردہ عمال تھے، لیکن صاف واضح ہے کہ اللہ و رسول کی جو حیثیت اِس میں بیان ہوئی ہے، وہ ابدی ہے۔ چنانچہ جن معاملات میں کوئی حکم اُنھوں نے ہمیشہ کے لیے دے دیا ہے، اُن میں مسلمانوں کے اولی الامر کو، خواہ وہ ریاست کے سربراہ ہوں یا پارلیمان کے ارکان، اب قیامت تک اپنی طرف سے کوئی فیصلہ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اولی الامر کے احکام اِس اطاعت کے بعد اور اِس کے تحت ہی مانے جا سکتے ہیں۔ اِس اطاعت سے پہلے یا اِس سے آزاد ہو کر اُن کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ لہٰذا مسلمان اپنی حکومت میں کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکتے جو اللہ و رسول کے احکام کے خلاف ہو یا جس میں اُن کی ہدایت کو نظر انداز کر دیا گیا ہو۔

آیت کے سیاق سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اولی الامر کی اطاعت کا جو حکم اِس میں بیان ہوا ہے، وہ صرف مسلمان حکمرانوں کے لیے ہے۔ اُن لوگوں سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے جو کھلے کفر کے مرتکب ہوں، اللہ و رسول کے مقابلے میں سرکشی اختیار کریں یا خدا کے دین کو چھوڑ کر عملاً اپنے لیے کوئی اور دین پسند کر لیں۔ اِس طرح کے لوگ قرآن کی یہ آیت سنا کر مسلمانوں سے اپنے لیے اطاعت کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ
اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى
الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ
اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا (۶۰) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ
اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ
عَنْكَ صُدُوْدًا (۶۱) ۚ فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا
قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ

تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جو دعوٰی کرتے ہیں کہ وہ اُس پر بھی ایمان لائے ہیں جو تمھاری طرف نازل کیا گیا اور اُس پر بھی جو تم سے پہلے نازل کیا گیا تھا، مگر چاہتے ہیں کہ (اللہ و رسول کو چھوڑ کر) اپنے معاملات کے فیصلے کے لیے اُسی سرکش کی طرف رجوع کریں جو بدی کا سرغنہ ہے[۱۲۲]، دراں حالیکہ اُنھیں ہدایت کی گئی تھی کہ اُس کا انکار کر دیں۔ (یہ شیطان کے پیرو ہیں) اور شیطان چاہتا ہے کہ اِنھیں دور کی گم راہی میں ڈال دے۔ جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب اور اُس کے رسول کی طرف آؤ تو اِن منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ وہ تم سے صاف کترا جاتے ہیں۔ مگر اُس وقت کیا ہوگا، جب اِن کے ہاتھوں کی لائی ہوئی کوئی مصیبت اِن پر آپڑے گی[۱۲۳]، پھر یہ خدا کی قسمیں

---

[۱۲۲] یہود کے بڑے لیڈر کی طرف اشارہ ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کعب بن اشرف تھا جسے اتمام حجت کے بعد اللہ تعالیٰ نے موت کی سزا دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے یہ سزا اُس پر نافذ کر دی گئی*۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس قدر سرکش ہو چکا تھا۔

---

* بخاری، رقم ۲۳۷۵، ۲۸۶۷، ۲۸۶۸، ۳۸۱۱۔ مسلم، رقم ۱۸۰۱۔

اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ﴿۶۲﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا
فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ
اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا ﴿۶۳﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ

کھاتے ہوئے تمھارے پاس آئیں گے کہ ہم نے تو صرف بہتری چاہی تھی اور ہم تو یہی چاہتے تھے کہ کچھ موافقت پیدا ہو جائے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ اِن کے دلوں میں ہے۔ سو اِن سے اعراض کرو اور اِنھیں نصیحت کرو اور اِن کے بارے میں اِن کے ساتھ اِس انداز سے بات کرو کہ دلوں میں اتر جائے۔[۱۲۴] (اِنھیں بتاؤ کہ) ہم

---

۱۲۳ استاذ امام نے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”جس مصیبت کے پیش آنے کا یہاں ذکر ہے، وہ بعد میں اِس طرح پیش آئی کہ جب اسلام نے طاقت پکڑ لی اور یہود کی سیاسی طاقت بالکل کم زور ہو گئی تو مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی گئی کہ اب منافقین کے معاملے میں چشم پوشی اور اغماض کی روش وہ بدل دیں۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنی روش بدل لی اور قدم قدم پر منافقین کا احتساب شروع کر دیا۔ منافقین اِس صورت حال سے بہت پریشان ہوئے۔ نہ یہود میں اتنا دم خم باقی رہا تھا کہ اُن کی سرپرستی کر سکیں، نہ مسلمان اب اُن کے چکموں میں آنے کے لیے تیار تھے۔ نہ جاے ماندن نہ پاے رفتن۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منافقین بھاگ بھاگ کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے اور قسمیں کھا کھا کے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ وہ یہود سے جو ربط ضبط اب تک رکھتے اور کبھی کبھی اپنے معاملات میں اُن کی بالاتری تسلیم کرتے رہے ہیں، اُس میں کسی فساد نیت کو دخل نہیں تھا، بلکہ اُن کی خواہش صرف یہ رہی ہے کہ اِس سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا اور جو خلیج اختلاف و عناد یہود اور مسلمانوں کے درمیان حائل ہو گئی ہے وہ زیادہ وسیع نہ ہونے پائے گی۔ اِس طرح وہ اپنی منافقت کو مصالحت کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتے اور اُس کو احسان اور توفیق کے خوب صورت الفاظ سے تعبیر کرتے، لیکن واقعات کے تشت ازبام ہو جانے کے بعد اِس سخن سازی

بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَلَوۡ اَنَّہُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ جَآءُوۡکَ فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰہَ وَاسۡتَغۡفَرَ لَہُمُ الرَّسُوۡلُ لَوَجَدُوا اللّٰہَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًا ﴿۶۴﴾ فَلَا

نے جو رسول بھی بھیجا ہے، اِسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن سے اُس کی اطاعت کی جائے۔[۱۲۵] (اِنھیں بتاؤ کہ رسول کی عدالت کو چھوڑ کر اِنھوں نے ایک بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے)۔ اگر یہ اُس وقت تمھاری خدمت میں حاضر ہو جاتے، جب اِنھوں نے اپنی جان پر یہ ظلم ڈھایا تھا، پھر اللہ سے معافی مانگتے اور رسول بھی اِن کے لیے معافی

کا موقع بالکل نکل چکا تھا۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۳۲۷)

[۱۲۴] یہ ہدایت اِس لیے ہوئی کہ بڑی سے بڑی غلطی پر بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ نہایت نرم اور کریمانہ ہوتا تھا۔ قرآن نے فرمایا کہ اب زیادہ نرمی برتنے کا موقع نہیں ہے، اِس لیے اِن منافقوں کو نیک و بد اچھی طرح سمجھا دیا جائے اور واضح الفاظ میں تنبیہ کر دی جائے تاکہ یہ سنبھلنا چاہیں تو اللہ تعالیٰ کی آخری گرفت سے پہلے پہلے سنبھل جائیں۔

[۱۲۵] یہ رسول کا صحیح مرتبہ واضح فرمایا ہے کہ رسول صرف عقیدت ہی کا مرکز نہیں، بلکہ اطاعت کا مرکز بھی ہوتا ہے۔ وہ اِس لیے نہیں آتا کہ لوگ اُسے نبی اور رسول مان کر فارغ ہو جائیں۔ اُس کی حیثیت صرف ایک واعظ و ناصح کی نہیں، بلکہ ایک واجب الاطاعت ہادی کی ہوتی ہے۔ اُس کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ زندگی کے تمام معاملات میں جو ہدایت وہ دے، اُس کی بے چون و چرا تعمیل کی جائے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ براہ راست معاملہ نہیں کرتا۔ وہ اپنی ہدایت نبیوں اور رسولوں کی وساطت سے دیتا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اصلی مقصود تو خدا کی اطاعت ہے، مگر اُس کا طریقہ ہی یہ ہے کہ اُس کے رسول کی اطاعت کی جائے۔ پھر یہ اطاعت کوئی رسمی چیز نہیں ہے۔ قرآن کا مطالبہ ہے کہ یہ اتباع کے جذبے سے اور پورے اخلاص، پوری محبت اور انتہائی عقیدت و احترام سے ہونی چاہیے۔ انسان کو خدا کی محبت اِسی اطاعت اور اِسی اتباع سے حاصل ہوتی ہے۔

وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾

کی درخواست کرتا تو اللہ کو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور بڑا مہربان پاتے۔[۱۲۶] لیکن نہیں، (اے پیغمبر)، تمھارے پروردگار کی قسم،[۱۲۷] یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے، جب تک اپنے اختلافات میں تمھی کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کر دو، اُس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور دل و جان سے اُس کے آگے سر تسلیم خم کر دیں۔[۱۲۸]

---

[۱۲۶] آیت میں رسول کے استغفار کی جو شرط عائد کی گئی ہے، استاذ امام نے وضاحت فرمائی ہے کہ اُس کے دو پہلو ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”...ایک تو یہ کہ رسول کا یہ استغفار اُن کے لیے اِس دنیا میں بمنزلۂ شفاعت ہے جس سے اُن کے اِس گناہ عظیم کے بخشے جانے کی توقع ہے، دوسرا یہ کہ رسول کی عدالت کے ہوتے اُن کا 'تحاکم الی الطاغوت' رسول کی صریح توہین ہے۔ اِس وجہ سے یہ ضروری ہوا کہ وہ رسول کی رضا اور اُن کی دعا بھی حاصل کریں۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۳۲۹)

[۱۲۷] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اِس التفات خاص میں جو دل نوازی ہے، اُسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اُس کی بلاغت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے زبان و بیان کے ذوق سے کچھ بہرہ عطا فرمایا ہے۔

[۱۲۸] منافقین کی جھوٹی قسم اوپر آیت ۶۲ میں مذکور ہے۔ یہ قرآن نے سچی قسم سے اُس کی تردید کرتے ہوئے رسول کے مقام و مرتبہ کی آخری حد واضح کر دی ہے کہ دین و شریعت کے احکام تو ایک طرف، اپنے درمیان پیدا ہونے والی نزاعات تک میں رسول کے فیصلے کو بے چون و چرا اور پورے اطمینان کے ساتھ ماننا ضروری ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم کھا کر فرمایا کہ یہ لوگ اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے،

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ
مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ
لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿۶۶﴾ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ
اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۶۷﴾ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۶۸﴾ وَمَنْ يُّطِعِ
اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ
النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ

(یہ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں) اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم اِن پر فرض کر دیتے کہ اپنے لوگوں کو قتل کرو یا اپنے گھروں کو چھوڑ کر نکل آؤ، (جس طرح ہم نے موسیٰ کے زمانے میں کیا تھا)، تو اِن میں سے کم ہی اِس حکم کی تعمیل کرتے۔ اِس وقت جو نصیحت اِنھیں کی جا رہی ہے، یہ اگر اُس پر عمل کرتے تو اِن کے حق میں بہتر ہوتا اور (اِس کے نتیجے میں) یہ (دین پر) زیادہ ثابت قدمی کے ساتھ جمے رہتے۔ یہ ایسا کرتے تو اِنھیں ہم اپنی طرف سے بہت بڑا اجر عطا کرتے اور اِنھیں سیدھی راہ کی ہدایت بخش دیتے۔ (اِنھیں بتاؤ کہ) جو اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کریں گے، وہی ہیں جو اُن لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین[۱۲۹]— کیا ہی اچھے

جب تک یہ اپنے درمیان پیدا ہونے والی تمام نزاعات میں تمھی کو حکم نہ مانیں اور پھر ساتھ ہی اُن کے اندر یہ ذہنی تبدیلی نہ واقع ہو جائے کہ وہ تمھارے فیصلے کو بے چون و چرا پورے اطمینان قلب کے ساتھ مانیں اور اپنے آپ کو بلا کسی استثنا و تحفظ کے تمھارے حوالے کر دیں۔ رسول کی اطاعت خود خدا کی اطاعت کے ہم معنی ہے، اِس وجہ سے اِس کا حق صرف ظاہری اطاعت سے ادا نہیں ہوتا، بلکہ اِس کے لیے دل کی اطاعت بھی شرط ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۳۲۹)

رَفِيْقًا ﴿٦٩﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿٧٠﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ
اَوِانْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿٧١﴾ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ
اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ

ہیں یہ رفیق! یہ اللہ کی عنایت ہے اور (اِس کے لیے) اللہ کا علم کافی ہے۔[۱۳۰] ۶۰-۷۰

ایمان والو، اپنے اسلحہ سنبھالو[۱۳۱] اور (مظلوموں کی مدد کے لیے) نکلو، (جیسا موقع ہو)، الگ الگ دستوں کی صورت میں[۱۳۲] یا اکٹھے ہو کر۔ تم میں یقیناً وہ لوگ بھی ہیں جو (اِس طرح کے موقعوں پر) بالکل ڈھیلے پڑ جائیں گے،[۱۳۳] پھر اگر تمھیں کوئی گزند پہنچے تو کہیں

---

۱۲۹ اِن میں 'صِدِّیْقِیْن' سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے علم و عمل میں سچے ہوں اور ہر موقع پر یہ سچائی اپنے قول و فعل سے ثابت کر دیں اور 'شُھَدَآء' اُن لوگوں کو کہا گیا ہے جو جان کی بازی لگا کر بھی حق کی گواہی دینے والے ہوں۔

۱۳۰ یعنی اِس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے اللہ کا علم کافی ہے کہ کون اُس کی عنایتوں کا مستحق ہے۔ وہ اپنے بندوں کو جانتا ہے، اُن سے بے خبر نہیں ہے۔

۱۳۱ اصل میں لفظ 'حِذْر' آیا ہے۔ اِس کے معنی کسی خطرے اور آفت سے بچنے کے ہیں۔ اپنے اِسی مفہوم سے ترقی کر کے یہ زرہ، سپر اور خود وغیرہ کے لیے استعمال ہوا، اِس لیے کہ یہ چیزیں جنگ میں دشمن کے حملوں سے بچنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ اِس کا خاص استعمال ہے، لیکن اپنے عام استعمال میں یہ محض اسلحہ کے مفہوم میں بھی آ جاتا ہے۔ موقع کلام دلیل ہے کہ یہاں یہ اِسی مفہوم میں ہے۔

۱۳۲ یعنی ٹکڑیوں کی صورت میں دشمن پر چھاپے مارنے کے لیے۔ یہ حملے کا وہی طریقہ ہے

مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿٧٢﴾ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ
تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ
فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿٧٣﴾ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ
الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ

گے کہ اللہ نے مجھ پر بڑی عنایت کی کہ میں اِن کے ساتھ موجود نہ تھا اور اگر تم پر اللہ کا کوئی فضل ہو جائے تو لازماً کہیں گے ـــــ اور اِس طرح کہیں گے کہ گویا اُن کے اور تمھارے درمیان کبھی کوئی رشتۂ محبت نہ تھا[۱۳۴] ـــــ کہ اے کاش، میں بھی اِن کے ساتھ ہوتا تو بڑی کامیابی حاصل کر لیتا۔ (ایسے لوگوں کی اللہ کو کوئی ضرورت نہیں ہے[۱۳۵])، اِس لیے وہی لوگ اللہ کی راہ میں لڑنے کے لیے نکلیں جو دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلے میں

جسے اِس زمانے میں گوریلا جنگ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

[۱۳۳] اور اِس طرح خود بھی جنگ سے جی چرائیں گے اور دوسروں کو بھی پست ہمت کریں گے۔

[۱۳۴] یہ الفاظ اُن کے باطن کو نمایاں کرتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اپنی شامت اعمال سے کسی مہم میں شامل نہیں ہوتے تو ایمانی و اسلامی اخوت کا کم از کم تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کی کامیابی پر خوش ہوں کہ اللہ نے اُن کے دینی بھائیوں کو سرخ رو کیا، لیکن اُنھیں اِس بات کی کوئی خوشی نہیں ہوتی، بلکہ جس طرح حریف کی کسی کامیابی پر آدمی کا دل جلتا ہے کہ وہ اُس میں حصہ دار نہ ہو سکا، اُسی طرح یہ لوگ اِس کو اپنی کامیابی نہیں، بلکہ حریف کی کامیابی سمجھتے ہیں اور اپنی محرومی پر سر پیٹتے ہیں۔ گویا اسلام اور مسلمانوں سے اِن کا کوئی رشتہ ہی نہیں۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۳۳۵)

[۱۳۵] یعنی اُن لوگوں کی ضرورت نہیں ہے جو استاذ امام کے الفاظ میں صرف اُس جنگ کے غازی بننا چاہتے ہیں جس میں نکسیر بھی نہ پھوٹے اور مال غنیمت بھی بھرپور ہاتھ آئے۔

أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿٧٤﴾
وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ
الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ
هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا ۙۚ
وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ؕ﴿٧٥﴾

دے ڈالنے کے لیے تیار ہوں۔ (اُن کے لیے بشارت ہے کہ) جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا جائے گا یا غلبہ پائے گا، اُسے ہم ضرور اجرِ عظیم عطا کریں گے۔ ۷۱-۷۴

(ایمان والو)، تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے نہیں لڑتے جو فریاد کر رہے ہیں کہ پروردگار، ہمیں اِس بستی سے نکال کہ جس کے لوگ ظالم ہیں[۱۳۶] اور ہمارے لیے اپنے پاس سے[۱۳۷] ہم درد پیدا کر دے اور اپنے پاس سے حامی اور مددگار پیدا کر دے۔[۱۳۸] ۷۵

---

[۱۳۶] اِس سے معلوم ہوا کہ قتال فی سبیل اللہ کی سب سے نمایاں اور اولین صورت یہی ہے کہ اُن لوگوں کی مدد کی جائے جو دین کے لیے ستائے جا رہے ہوں۔ آیت میں ظالموں کی بستی کے الفاظ سے اشارہ اُن بستیوں کی طرف ہے جن میں بہت سے مرد، عورتیں اور بچے ایمان لا چکے تھے، مگر ایسے سرپرستوں اور زبردستوں کے چنگل میں تھے کہ اُن کے ظلم و ستم سے بچ کر اپنے دین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے کوئی راہ نہیں پاتے تھے۔

[۱۳۷] اصل میں 'مِنْ لَّدُنْکَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اِس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ اگرچہ بظاہر تو امید کی کرن نظر نہیں آتی، مگر اللہ تعالیٰ کے لیے کیا بعید ہے۔ وہ جب چاہے اپنے بندوں کے لیے کوئی راہ کھول دے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۚ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ ۚ اِنَّ کَیْدَ

(اِنھیں بتاؤ، اے پیغمبر کہ) ایمان والے خدا کی راہ میں لڑتے ہیں اور منکرین اپنے سرکشوں[۱۳۹] کی راہ میں۔ (یہ شیطان کے دوست ہیں)، سو تم شیطان کے اِن دوستوں سے

---

[۱۳۸] اِس پوری آیت سے جو باتیں ظاہر ہوتی ہیں، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُن کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”ایک یہ کہ ظالم کفار نے کم زور مسلمانوں پر خود اُن کے وطن کی زمین اِس طرح تنگ کر دی تھی کہ وہ وطن اُن کو کاٹے کھا رہا تھا اور باوجودیکہ وطن کی محبت ایک فطری چیز ہے، لیکن وہ اُس سے اِس قدر بے زار تھے کہ اُس کو ظالم باشندوں کی بستی کہتے ہیں، اُس کی طرف کسی قسم کا انتساب اپنے لیے گوارا کرنے پر تیار نہیں ہیں۔
>
> دوسری یہ کہ کوئی وطن اُسی وقت تک اہل ایمان کے لیے وطن کی حیثیت رکھتا ہے، جب تک اُس کے اندر اُن کے دین و ایمان کے لیے امن ہو۔ اگر دین و ایمان کو اُس میں امن حاصل نہ ہو تو وہ وطن نہیں، بلکہ وہ خوں خوار درندوں کا بھٹ، سانپوں اور اژدہوں کا مسکن اور شیطانوں کا مرکز ہے۔
>
> تیسری یہ کہ اُس زمانے میں حالات اِس قدر مایوس کن تھے کہ مظلوم مسلمانوں کو ظاہر میں نجات کی کوئی راہ بھی سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ سارا بھروسا بس اللہ کی مدد پر تھا کہ وہی غیب سے اُن کے لیے کوئی راہ کھولے تو کھولے۔ اِس کے باوجود یہ مسلمان اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے۔ اللہ اکبر! کیا شان تھی اُن کی استقامت کی! پہاڑ بھی اِس استقامت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔
>
> چوتھی یہ کہ اگر کہیں مسلمان اِس طرح کی مظلومیت کی حالت میں گھر جائیں تو اُن تمام مسلمانوں پر جو اُن کی مدد کرنے کی پوزیشن میں ہوں، جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اُن کی مدد کے لیے نہ اُٹھیں تو یہ صریح نفاق ہے۔“ (تدبر قرآن ۲/۳۳۶)

الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿٧٦﴾
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا
الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ
مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا
رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ

لڑو اور بے پروا ہو جاؤ، اِس لیے کہ شیطان کی چال بڑی کم زور ہے۔ ۷۶

تم نے دیکھا نہیں اِن لوگوں کو جن سے کہا جاتا تھا کہ (ابھی لڑنے کا وقت نہیں ہے، اِس لیے) اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز کا اہتمام کرو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو (تو یہ نماز اور زکوٰۃ سے جی چراتے اور جنگ کے لیے بے تاب ہوتے تھے[۱۴۰])، لیکن جب اِن پر جنگ فرض کر دی گئی تو اب اِن کی حالت یہ ہے کہ اِن میں سے ایک گروہ لوگوں سے اُسی طرح ڈرتا ہے، جس طرح اللہ سے ڈرا جاتا ہے یا اُس سے بھی زیادہ۔ کہتے ہیں[۱۴۱] کہ پروردگار، تو نے یہ لڑائی ہم پر کیوں فرض کر دی ہے؟ ہمیں کچھ تھوڑی سی مہلت اور کیوں

---

[۱۳۹] اشارہ ہے عرب کے ائمۂ کفر کی طرف جن کے لیے اصل میں لفظ 'طَاغُوْت' آیا ہے۔

[۱۴۰] یعنی جب کفار کے علاقوں میں مسلمانوں کی مظلومیت اور بے بسی کو دیکھ کر لوگوں کے اندر جنگ کا احساس پیدا ہوتا اور وہ اُس کا ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے تو یہ منافقین اپنے ایمان و اخلاص کی دھونس جمانے کے لیے دوسروں سے بڑھ کر جہاد و قتال کے لیے بے تاب ہوتے تھے، لیکن جو کام اُس وقت کرنے کے تھے، اُن سے جی چراتے اور گریز و فرار کے بہانے ڈھونڈتے تھے۔

[۱۴۱] اصل میں لفظ 'قَالُوْا' آیا ہے۔ یہ زبان کا قول نہیں ہے، بلکہ اُن کی ذہنی حالت کی تعبیر

قَرِيْبٍ ؕ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۟ قف
وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۷﴾ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ
فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ
عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ
قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ
حَدِيْثًا ﴿۷۸﴾ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ

نہیں دی؟ اِن سے کہہ دو: دنیا کا سرمایہ بہت تھوڑا ہے اور جو لوگ پرہیزگاری اختیار کریں، اُن کے لیے آخرت اُس سے کہیں بڑھ کر ہے اور وہاں تمھاری ذرا بھی حق تلفی نہ ہوگی۔ رہی موت تو تم جہاں کہیں بھی ہو، وہ ہر حال میں تمھیں آ کر رہے گی، خواہ تم کیسے ہی مضبوط اور بلند و بالا قلعوں[۱۴۲] میں ہو۔ (زبان سے یہ تمھاری رسالت کا اقرار کرتے ہیں) اور اگر اِنھیں کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو کہتے ہیں، یہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں، یہ تمھاری وجہ سے ہے۔ کہہ دو: ہر چیز اللہ ہی کی طرف سے ہے، (اِس لیے کہ جو کچھ ہوتا ہے، اُسی کے اذن سے ہوتا ہے)۔ آخر اِن لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ (یہ حقیقت ہے کہ) تمھیں جو بھلائی بھی پہنچتی ہے، اللہ کی عنایت سے پہنچتی ہے اور جو مصیبت

ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ اِس طرح کی تعبیرات کے لیے بھی آتا ہے۔

[۱۴۲] اصل میں 'بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِن میں 'مُشَيَّدَة' کی صفت بلندی اور استحکام، دونوں مفاہیم کو شامل ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۷۹ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ ۝۸۰

وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ؗ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ؕ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ

آتی ہے، وہ تمھارے اپنے نفس کی طرف سے آتی ہے۔[۱۴۳] (اِن کی اصل بیماری یہ ہے کہ یہ تمھاری رسالت کے بارے میں متردد ہیں۔ اِن کی پروا نہ کرو)، ہم نے تمھیں لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے اور (اِس کے لیے) اللہ کی گواہی کافی ہے۔ (اِنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) جو رسول کی اطاعت کرتا ہے، اُس نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی اور جس نے منہ موڑ لیا تو (اُس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، اِس لیے کہ) ہم نے تمھیں اِن پر نگران بنا کر تو نہیں بھیجا ہے۔[۱۴۴] ۷۷-۸۰

کہتے ہیں کہ سر تسلیم خم ہے۔[۱۴۵] پھر جب تمھارے پاس سے ہٹتے ہیں تو اِن میں سے ایک

---

[۱۴۳] یعنی اللہ کے اذن سے آتی ہے، مگر نفس کی کسی غلطی کی وجہ سے یا اُس کی کوئی کمزوری دور کرنے کے لیے آتی ہے یا اِس لیے آتی ہے کہ طبیعت کے اندر جو خیر و شر بھی دبا ہوا ہے، وہ ابھر کر سامنے آجائے۔

[۱۴۴] اِس میں بات اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کہی گئی ہے، مگر روے سخن، اگر غور کیجیے تو اِنھی منافقین کی طرف ہے۔

[۱۴۵] اصل میں لفظ 'طَاعَةٌ' آیا ہے۔ یہ خبر ہے جس کا مبتدا محذوف ہے۔ اِس سے مقصود یہ ہے کہ سارا زور خبر پر رہے۔

عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿٨١﴾ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿٨٢﴾

گروہ اپنی اِس بات کے بالکل برخلاف مشورے کرتا ہے۔[۱۴۶] اِن کی یہ تمام سرگوشیاں اللہ لکھ رہا ہے۔ سو اِن سے اعراض کرو اور اللہ پر بھروسا رکھو اور (جان لو کہ) اللہ بھروسے کے لیے کافی ہے۔ (تمھاری رسالت کے بارے میں اِنھیں تردد کیوں ہے)؟ پھر کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اِس میں وہ بہت کچھ اختلاف پاتے۔[۱۴۷] ۸۱-۸۲

---

[۱۴۶] اصل الفاظ ہیں: 'بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ'۔ اِن میں 'بَيَّتَ' کے معنی اصلاً تو رات میں کوئی کام کرنے کے ہیں، لیکن اپنے عام استعمال میں یہ لفظ رات کی قید سے مجرد ہو گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> "...الفاظ کے اِس طرح اپنے ابتدائی مفہوم سے مجرد ہو جانے کی مثالیں عربی زبان میں بہت ہیں۔ 'اضحٰی' اور 'بات' بھی اپنے عام استعمال میں دن اور رات کی قید سے مجرد ہو کر استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ نبی کی مجلس میں تو یہ ہر بات پر سر تسلیم خم کرتے ہیں، لیکن جب وہاں سے ہٹتے ہیں تو اپنی مجلسوں میں اُن آیات و احکام کے خلاف مشورے کرتے ہیں جن کو اپنی خواہشات اور اپنے مفاد ذاتی کے خلاف پاتے ہیں۔" (تدبر قرآن ۲/ ۳۴۶)

[۱۴۷] مطلب یہ ہے کہ اگر قرآن پر غور کرتے تو تمھاری نبوت کے بارے میں کبھی متردد نہیں ہو سکتے تھے، اِس لیے کہ دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہو سکتا جو سال ہا سال تک مختلف حالات میں اور مختلف موقعوں پر اِس طرح کے متنوع موضوعات پر تقریریں کرتا رہے اور شروع سے آخر تک اُس کی یہ تمام تقریریں جب مرتب کی جائیں تو ایک ایسے ہم رنگ اور متوافق مجموعۂ کلام کی صورت

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ
رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ

(ایمان والو، یہ تمھارے خیر خواہ نہیں ہیں، اِس لیے) اِنھیں جب امن یا خطرے کی کوئی بات پہنچتی ہے تو یہ اُسے پھیلا دیتے ہیں[۱۴۸]، دراں حالیکہ اگر یہ اللہ کے رسول اور اُن لوگوں کے سامنے اُسے پیش کرتے جو اُن میں سے معاملات کے ذمہ دار بنائے

اختیار کر لیں جس میں نہ خیالات کا کوئی تصادم ہو، نہ متکلم کے دل و دماغ میں پیدا ہونے والی کیفیات کی کوئی جھلک دکھائی دے اور نہ راے اور نقطۂ نظر کی تبدیلی کے کوئی آثار کہیں دیکھے جا سکتے ہوں۔ یہ تنہا قرآن ہی کی خصوصیت ہے اور اِس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ خدا کی کتاب ہے اور تم خدا کے پیغمبر ہو۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...قرآن کی ہر بات اپنے اصول اور فروع میں اتنی مستحکم اور مربوط ہے کہ ریاضی اور اقلیدس کے فارمولے بھی اتنے مستحکم و مربوط نہیں ہو سکتے۔ وہ جن عقائد کی تعلیم دیتا ہے، وہ ایک دوسرے سے اِس طرح وابستہ و پیوستہ ہیں کہ اگر اُن میں سے کسی ایک کو بھی الگ کر دیجیے تو پورا سلسلہ ہی درہم برہم ہو جائے۔ وہ جن عبادات و طاعات کا حکم دیتا ہے وہ عقائد سے اِس طرح پیدا ہوتی ہیں جس طرح تنے سے شاخیں پھوٹتی ہیں، وہ جن اعمال و اخلاق کی تلقین کرتا ہے، وہ اپنے اصول سے اِس طرح ظہور میں آتے ہیں، جس طرح ایک شے سے اُس کے قدرتی اور فطری لوازم ظہور میں آتے ہیں۔ اُس کی مجموعی تعلیم سے زندگی کا جو نظام بنتا ہے، وہ ایک بنیان مرصوص کی شکل میں نمایاں ہوتا ہے جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ سے اِس طرح جڑی ہوئی ہے کہ اُن میں سے کسی کو بھی الگ کرنا بغیر اِس کے ممکن نہیں کہ پوری عمارت میں خلا پیدا ہو جائے۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۳۴۷)

[۱۴۸] اِس طرح کی افواہیں عام حالات میں بھی بڑے خطرناک نتائج پیدا کرتی ہیں۔ اُس زمانے میں جنگ کے حالات تھے جن میں یہ خطرناکی اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ
لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾
فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ
الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ
وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً
حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً
يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾

گئے ہیں تو جو لوگ اُن میں سے بات کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، وہ اُس کو سمجھ لیتے[۱۴۹]۔ (مگر اِنھوں نے شیطان کی راہ اختیار کی ہے) اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت نہ ہوتی تو تھوڑے سے لوگوں کو چھوڑ کر تم سب شیطان کی پیروی کرتے۔ ۸۳

سو، (اے پیغمبر، اِنھیں چھوڑو اور) اللہ کی راہ میں جنگ کرو ـــــ تم پر اپنی ذات کے سوا کسی کی ذمہ داری نہیں ہے ـــــ اور ایمان والوں کو (جنگ کے لیے) ابھارو۔ بعید نہیں کہ اللہ اُن لوگوں کا زور توڑ دے جو منکر ہو گئے ہیں۔ اللہ کا زور سب سے زیادہ ہے اور (اِس طرح کے منکروں کو) وہ بڑی عبرت انگیز سزا دینے والا ہے۔ (یہ جہاد سے گریز کے مشورے دیتے ہیں۔ اِنھیں بتاؤ کہ) جو اچھی بات کے حق میں کہے گا، وہ اُس میں سے حصہ پائے گا اور جو برائی کے لیے کہے گا[۱۵۰]، وہ اُس میں سے حصہ پائے گا۔

---

[۱۴۹] اصل میں لفظ 'عَلِمَ' آیا ہے۔ یہ کسی چیز کے موقع و محل کو متعین کر لینے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یہاں یہ اِسی مفہوم میں ہے۔

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿۸۶﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ

(یہ اللہ کا فیصلہ ہے) اور اللہ ہر چیز کی طاقت رکھنے والا ہے۔ ۸۴-۸۵

(تم جنگ کے لیے نکلو) اور جب (کسی شخص کی طرف سے) تم کو سلام کہا جائے[۱۵۱] تو تم بھی سلام کہو، اُس سے بہتر یا اُسی طرح۔ اور کسی کے ساتھ زیادتی نہ کرو، اِس لیے کہ اللہ یقیناً ہر چیز کا حساب لینے والا ہے[۱۵۲]۔ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، وہ تم سب کو قیامت

۱۵۰۔ اصل الفاظ ہیں: 'یَشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً'۔ 'شَفَعَ' کے معنی ایک چیز کو دوسری چیز سے جوڑنے کے ہیں۔ اِسی مفہوم سے ترقی کر کے یہ کسی بات کی تائید وحمایت اور اُس کے حق میں کچھ کہنے کے لیے آتا ہے۔ وہ بات اچھی بھی ہو سکتی ہے اور بری بھی۔ چنانچہ دونوں کے لیے قرآن نے یہی لفظ اختیار فرمایا اور پہلی صورت کو 'شَفَاعَةٌ حَسَنَةٌ' اور دوسری کو 'شَفَاعَةٌ سَيِّئَةٌ' سے تعبیر کیا ہے۔

۱۵۱۔ اصل الفاظ ہیں: 'وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ'۔ استاذ امام نے اِن کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''حیاہ تحیۃ' کے اصل معنی کسی کو زندگی کی دعا دینے کے ہیں۔ اِسی سے دعائیہ کلمہ 'حیاك اللّٰہ' ہے جس کے معنی ہیں، اللہ تمھاری عمر دراز کرے۔ سلام اور اِس کے ہم معنی دوسرے دعائیہ کلمات بھی چونکہ کم وبیش یہی یا اِسی سے ملتے جلتے مفہوم اپنے اندر رکھتے ہیں، اِس وجہ سے لفظ کے عام مفہوم میں وہ سب اُس کے اندر شامل ہو جاتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۲/۳۵۶)

۱۵۲۔ یہ فوج کشی چونکہ اُن مظلوم مسلمانوں کی حمایت میں کی جا رہی تھی جو منکروں کے نرغے میں تھے، اِس لیے ہدایت کی گئی کہ سلام کو اُن کے اسلام کی علامت سمجھا جائے، اُسے خوش دلی کے ساتھ قبول کیا جائے اور اُس کا جواب بہتر طریقے سے دیا جائے۔ اُن کے ایمان و اسلام کی تحقیق

مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾
فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا
كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ
اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ

کے دن کی طرف لے جا کر رہے گا[۱۵۳] جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔ اور اللہ سے بڑھ کر سچی بات کہنے والا کون ہو سکتا ہے۔ ۸۶-۸۷

(تم اُن لوگوں کو جانتے ہو جو ایمان لا کر پلٹ گئے ہیں)، پھر تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ اِن منافقوں کے بارے میں دو گروہ ہو رہے ہو[۱۵۴]۔ اللہ نے تو اُن کے کیے کی پاداش میں اُنھیں الٹا پھیر دیا ہے[۱۵۵]۔ کیا تم اُنھیں ہدایت دینا چاہتے ہو جنھیں اللہ نے (اپنے

بعد میں ہو سکتی ہے۔ اِس وقت زیادہ اہمیت اِس چیز کی ہے کہ کوئی مخلص مسلمان تمھاری تلواروں کی زد میں نہ آ جائے۔

۱۵۳؎ اصل میں 'لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'لَيَجْمَعَنَّكُمْ' کے بعد 'اِلٰى' کا صلہ دلیل ہے کہ یہاں کوئی لفظ ہانکنے اور لے جانے کے معنی میں محذوف ہے۔

۱۵۴؎ اِس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں میں سے کچھ لوگ اُن کے ساتھ رشتہ و قرابت یا خاندان اور قبیلے کا تعلق رکھتے تھے، لہٰذا چاہتے تھے کہ نرمی کا رویہ اختیار کیا جائے۔ اُن کا خیال تھا کہ اُنھیں اگر اُن کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور کچھ ربط ضبط رکھا جائے تو آہستہ آہستہ یہ سچے مسلمان بن جائیں گے۔

۱۵۵؎ یعنی اسلام کی طرف جو قدم اُنھوں نے اٹھایا تھا، اُسے جب دنیا کی محبت میں اُنھوں نے پیچھے ہٹا لیا تو اللہ نے بھی اُن کے اِس جرم کی پاداش میں اُنھیں اُسی حالت کی طرف لوٹا دیا جس میں وہ یہ قدم اٹھانے سے پہلے تھے۔

سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا
مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ
وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ
اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ

قانون کے مطابق) گم راہ کر دیا ہے۔[۱۵۶] دراں حالیکہ جنھیں اللہ گم راہ کر دے، اُن کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح خود منکر ہیں، اُسی طرح تم بھی منکر ہو جاؤ تاکہ وہ اور تم سب برابر ہو جائیں۔ لہٰذا اُن میں سے کسی کو اپنا ساتھی نہ بناؤ، جب تک وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کر کے نہ آ جائیں۔ پھر اگر وہ اِس سے گریز کریں تو اُنھیں پکڑو اور جہاں پاؤ، قتل کرو اور اُن میں سے کسی کو اپنا ساتھی اور مددگار نہ بناؤ۔[۱۵۷] اِس سے وہ لوگ، البتہ مستثنیٰ ہیں جو کسی ایسی قوم سے جا ملے ہوں جن سے تمھارا کوئی معاہدہ ہے۔ اِسی طرح وہ لوگ بھی مستثنیٰ ہیں جو تمھارے پاس اِس طرح آئیں کہ نہ اپنے اندر تم سے لڑنے کی ہمت پاتے ہوں نہ اپنی قوم سے۔ اللہ چاہتا تو اُنھیں تم پر دلیر کر

---

[۱۵۶] یعنی اپنے اِس قانون کے مطابق کہ جانتے بوجھتے حق سے گریز کرنے والوں کو اللہ گم راہی کے حوالے کر دیتا ہے۔

[۱۵۷] مطلب یہ ہے کہ ہجرت کی دعوت کے بعد اب ہجرت ہی اُن کے ایمان و اسلام کی کسوٹی ہے۔ اگر وہ اِس کے لیے آمادہ نہیں ہوتے تو اُن کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

فَاِنِ اعۡتَزَلُوۡكُمۡ فَلَمۡ يُقَاتِلُوۡكُمۡ وَ اَلۡقَوۡا اِلَيۡكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ
اللّٰهُ لَكُمۡ عَلَيۡهِمۡ سَبِيۡلًا ﴿۹۰﴾
سَتَجِدُوۡنَ اٰخَرِيۡنَ يُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يَّاۡمَنُوۡكُمۡ وَ يَاۡمَنُوۡا
قَوۡمَهُمۡ ؕ كُلَّمَا رُدُّوۡۤا اِلَى الۡفِتۡنَةِ اُرۡكِسُوۡا فِيۡهَا ۚ فَاِنۡ لَّمۡ يَعۡتَزِلُوۡكُمۡ
وَ يُلۡقُوۡۤا اِلَيۡكُمُ السَّلَمَ وَ يَكُفُّوۡۤا اَيۡدِيَهُمۡ فَخُذُوۡهُمۡ وَاقۡتُلُوۡهُمۡ
حَيۡثُ ثَقِفۡتُمُوۡهُمۡ ؕ وَ اُولٰٓئِكُمۡ جَعَلۡنَا لَكُمۡ عَلَيۡهِمۡ سُلۡطٰنًا مُّبِيۡنًا ﴿۹۱﴾
وَمَا كَانَ لِمُؤۡمِنٍ اَنۡ يَّقۡتُلَ مُؤۡمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنۡ قَتَلَ

دیتا اور وہ بھی تم سے لڑتے۔ لہٰذا اگر وہ تم سے الگ رہیں اور جنگ نہ کریں اور تمھاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ تمھیں بھی اُن کے خلاف کسی اقدام کی اجازت نہیں دیتا۔ ۸۸-۹۰

(اِن کے علاوہ) کچھ دوسرے لوگ تم ایسے بھی دیکھو گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی، مگر جب کبھی فتنے کی طرف بلائے جاتے ہیں تو اوندھے منہ اُس میں جا گرتے ہیں۔[۱۵۸] سو اگر وہ تم سے کنارہ نہ کریں اور تمھاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ نہ بڑھائیں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو اُنھیں بھی پکڑو اور جہاں پاؤ، قتل کرو۔ یہ لوگ ہیں جن کے خلاف ہم نے تمھیں کھلا اختیار[۱۵۹] دیا ہے۔ ۹۱

---

[۱۵۸] یعنی جب قوم کے سرکشوں کا دباؤ پڑتا ہے تو اُن کی شرارتوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔

[۱۵۹] اصل میں لفظ ’سُلۡطَان‘ آیا ہے۔ اِس کے معنی دلیل و حجت کے بھی ہیں اور یہ اختیار و اقتدار کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اِس دوسرے معنی کی نظیریں سورۂ ابراہیم (۱۴) کی آیت ۲۲ اور سورۂ بنی اسرائیل (۱۷) کی آیت ۳۳ میں دیکھ لی جا سکتی ہیں۔

مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى
اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ط فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ

(لیکن کوئی بے احتیاطی نہیں ہونی چاہیے، اِس لیے کہ) کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان کو قتل کرے، الاّ یہ کہ اُس سے غلطی ہو جائے۔ اور جو کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کرے، اُس کے ذمے ہے کہ ایک مسلمان کو غلامی سے آزاد کرے[۱۶۰] اور اُس کے گھر والوں کو خوں بہا دے،[۱۶۱] الاّ یہ کہ وہ معاف کر دیں۔ پھر اگر

---

[۱۶۰] قرآن نے غلامی کو ختم کرنے کے لیے جو اقدامات کیے، یہ بھی اُنھی میں سے ہے۔ اِس زمانے میں غلامی ختم ہو چکی ہے۔ لہٰذا کوئی شخص اگر روزے نہ رکھ سکے تو غلام کی قیمت کے تناسب سے قیدیوں کا جرمانہ ادا کر کے وہ اُنھیں رہا کرا سکتا یا اِسی تناسب سے کسی مسلمان کا قرض ادا کر سکتا ہے۔

[۱۶۱] اصل میں 'دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'دِيَةٌ' کے معنی ہیں: وہ شے جو دیت کے نام سے معروف ہے اور 'دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ' کے الفاظ حکم کے جس منشا پر دلالت کرتے ہیں، وہ اِس کے سوا کچھ نہیں کہ مخاطب کے عرف میں جس چیز کا نام دیت ہے، وہ مقتول کے ورثہ کے سپرد کر دی جائے۔ قرآن مجید نے دیت کی کسی خاص مقدار کا تعین کیا ہے، نہ عورت اور مرد، غلام اور آزاد اور مسلم اور غیر مسلم کی دیتوں میں کسی فرق کی پابندی ہمارے لیے لازم ٹھیرائی ہے۔ اُس کا حکم یہی ہے کہ دیت معاشرے کے دستور اور رواج کے مطابق ادا کی جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کے فیصلے اپنے زمانے میں عرب کے دستور کے مطابق کیے۔ فقہ و حدیث کی کتابوں میں دیت کی جو مقداریں بیان ہوئی ہیں، وہ اِسی دستور کے مطابق ہیں۔ عرب کا یہ دستور اہل عرب کے تمدنی حالات اور تہذیبی روایات پر مبنی تھا۔ زمانے کی گردش نے کتاب تاریخ میں چودہ صدیوں کے ورق الٹ دیے ہیں۔ تمدنی حالات اور تہذیبی روایات میں زمین و آسمان کا تغیر واقع ہو گیا ہے۔ اب ہم دیت میں اونٹ دے سکتے ہیں، نہ اونٹوں کے لحاظ سے اِس دور میں

فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ
مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ
لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ

مقتول تمھاری کسی دشمن قوم سے تعلق رکھتا ہو، مگر مسلمان ہو تو ایک مسلمان کو غلامی سے آزاد کر دینا ہی کافی ہے۔ اور اگر وہ کسی ایسی قوم کا فرد ہے جس کے ساتھ تمھارا معاہدہ ہے تو اُس کے وارثوں کو دیت بھی دی جائے گی اور تم ایک مسلمان غلام بھی آزاد کرو گے۔ پھر جس کے پاس غلام نہ ہو، اُسے لگاتار دو مہینے کے روزے رکھنا ہوں گے۔[۱۶۲] (یہ اِس

دیت کا تعین کوئی دانش مندی ہے۔ عاقلہ کی نوعیت بالکل بدل گئی ہے اور قتل خطا کی وہ صورتیں وجود میں آ گئی ہیں جن کا تصور بھی اُس زمانے میں ممکن نہیں تھا۔ قرآن مجید کی ہدایت ہر دور اور ہر معاشرے کے لیے ہے۔ چنانچہ اُس نے اِس معاملے میں معروف کی پیروی کا حکم دیا ہے۔ پھر معروف پر مبنی قوانین کے بارے میں یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ حالات اور زمانہ کی تبدیلی سے اُن میں تغیر کیا جا سکتا ہے اور کسی معاشرے کے ارباب حل و عقد اگر چاہیں تو اپنے اجتماعی مصالح کے لحاظ سے اُنھیں نئے سرے سے مرتب کر سکتے ہیں۔

۱۶۲؎ اِس آیت میں قتل خطا کا جو قانون بیان ہوا ہے، وہ درج ذیل تین دفعات پر مبنی ہے:

اول یہ کہ مقتول اگر مسلمان ہے اور اپنی ہی ریاست کا شہری ہے یا اپنی ریاست کا شہری تو نہیں ہے، لیکن کسی معاہد قوم سے تعلق رکھتا ہے تو قاتل پر لازم ہے کہ اُسے اگر معاف نہیں کر دیا گیا تو دستور کے مطابق دیت ادا کرے اور اِس جرم کے کفارے میں اپنے پروردگار کے حضور میں توبہ کے لیے ایک مسلمان غلام آزاد کرے۔

دوم یہ کہ وہ اگر دشمن قوم کا کوئی مسلمان ہے تو قاتل پر دیت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اِس صورت میں یہی کافی ہے کہ اپنے گناہ کو دھونے کے لیے وہ ایک مسلمان غلام آزاد کر دے۔

اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (٩٢) وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ
جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ

گناہ کو بخشوانے کا طریقہ ہے)، اللہ کی طرف سے خاص عنایت کے طور پر اور اللہ علیم و حکیم ہے۔[١٦٣] اُس شخص کی سزا، البتہ جہنم ہے جو کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے، وہ اُس

سوم یہ کہ اِن دونوں صورتوں میں اگر غلام میسر نہ ہو تو اِس کے بدلے میں مسلسل دو مہینے کے روزے رکھے۔

یہ کسی شخص کے غلطی سے قتل ہو جانے کا حکم ہے، لیکن صاف واضح ہے کہ جراحات کا حکم بھی یہی ہونا چاہیے۔ چنانچہ اُن میں بھی دیت ادا کی جائے گی اور اِس کے ساتھ کفارے کے روزے بھی دیت کی مقدار کے لحاظ سے لازماً رکھے جائیں گے۔ یعنی، مثال کے طور پر، اگر کسی زخم کی دیت ایک تہائی مقرر کی گئی ہے تو کفارے کے بیس روزے بھی لازماً رکھنا ہوں گے۔

[١٦٣] آیت کا یہ حصہ خاص طور پر قابل غور ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”...جب مفعول اِس طرح فعل کے بغیر آئے تو اُس پر خاص تاکید اور عزم کے ساتھ زور دینا مقصود ہوتا ہے۔ یہاں خوں بہا کے ساتھ ساتھ ایک غلام آزاد کرنے اور غلام آزاد کرنے کی مقدرت نہ ہونے کی صورت میں مسلسل دو مہینے کے روزے رکھنے کی جو ہدایت ہوئی تو اُس پر خاص تاکید کے ساتھ زور دیا کہ یہ خدائے علیم و حکیم کی طرف سے مقرر کردہ توبہ ہے، نہ کوئی اِس کو شاق سمجھے، نہ اِس کی خلاف ورزی کرے۔ قتل مومن، غلطی ہی سے سہی، عظیم گناہ ہے۔ اِس گناہ کو دھونے کے لیے صرف خوں بہا کافی نہیں ہے، بلکہ غلام بھی آزاد کیا جائے اور اگر اِس کی مقدرت نہ ہو تو لگاتار دو مہینے کے روزے رکھے جائیں تاکہ دل پر سے ہر داغ اِس گناہ کا دھل جائے۔ گویا ایسے سنگین معاملے میں زبانی توبہ کافی نہیں ہے، بلکہ اِس کے ساتھ اُس کے مؤیدات بھی ہونے ضروری ہیں۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۳۶۲)

عَذَابًا عَظِیۡمًا ﴿۹۳﴾
یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا ضَرَبۡتُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ فَتَبَیَّنُوۡا
وَلَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ اَلۡقٰۤی اِلَیۡکُمُ السَّلٰمَ لَسۡتَ مُؤۡمِنًا ۚ تَبۡتَغُوۡنَ

میں ہمیشہ رہے گا، اُس پر اللہ کا غضب اور اُس کی لعنت ہے اور اُس کے لیے اُس نے ایک بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔[۱۶۴] ۹۲-۹۳

ایمان والو، جب تم اللہ کی راہ میں (اِس جنگ کے لیے) نکلو تو (کسی اقدام سے پہلے) تحقیق کر لیا کرو اور جو تمھیں سلام کرے، اُسے یہ نہ کہا کرو کہ تم مسلمان نہیں ہو۔

---

[۱۶۴] یہاں قتل عمد کی جو سزا بیان ہوئی ہے، وہ بعینہٖ وہی ہے جو بدترین منکرین حق کے لیے قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِس سزا کی سنگینی کی علت سمجھنے کے لیے اِس امر کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر سب سے بڑا حق اُس کی جان کا احترام ہے، کوئی مسلمان اگر دوسرے مسلمان کی جان لے لیتا ہے تو اِس کے معنی یہ ہوئے کہ حقوق العباد میں سے اُس نے سب سے بڑے حق کو تلف کیا جس کی تلافی و اصلاح کی بھی اب کوئی شکل باقی نہیں رہی، اِس لیے کہ جس شخص کے حق کو اُس نے تلف کیا، وہ دنیا سے رخصت ہو چکا اور حقوق العباد کی اصلاح کے لیے تلافی مافات ناگزیر ہے۔ پھر اِس کا ایک اور پہلو بھی بڑا اہم ہے۔ وہ یہ کہ یہ ایک ایسے مسلمان کے قتل کا معاملہ ہے جو دارالکفر اور دارالحرب میں گھرے ہوئے ہونے کی وجہ سے اسلامی شریعت کے اُن تحفظات سے بھی محروم تھا جو دارالاسلام میں ایک مسلمان کو حاصل ہوتی ہیں۔ اپنے دین اور اپنے نفس کے معاملے میں اُس کو اگر کسی سے خیر کی امید ہو سکتی تھی تو وہ مسلمانوں ہی سے ہو سکتی تھی۔ اب اگر کوئی مسلمان ہی اُس کو قتل کر دے اور وہ بھی عمداً اور ایسی جگہ پر جہاں اُس کو اسلامی قانون کی حفاظت بھی حاصل نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ نہ ایسے مقتول سے بڑھ کر کوئی مظلوم ہو سکتا ہے اور نہ ایسے قاتل سے بڑھ کر کوئی ظالم!“ (تدبر قرآن ۲/ ۳۶۱)

عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ز فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ
كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ
وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ
الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ
وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى
الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ

تم دنیوی زندگی کا ساز و سامان چاہتے ہو تو اللہ کے پاس (تمھارے لیے) بہت کچھ سامان غنیمت ہے۔[۱۶۵] اِس سے پہلے تم بھی اِسی حالت میں تھے، پھر اللہ نے تم پر احسان کیا۔ سو تحقیق کر لیا کرو، اِس لیے کہ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۹۴

(اِس جنگ کے لیے نکلو، کیونکہ) جن مسلمانوں کو کوئی معذوری نہیں ہے اور وہ گھروں میں بیٹھے رہیں اور جو اپنے جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں، دونوں برابر نہیں ہیں۔ اللہ نے بیٹھنے والوں پر اپنے جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو ایک درجہ فضیلت دی ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اِن میں سے ہر ایک کے لیے اللہ نے بھلائی کا وعدہ فرمایا

---

[۱۶۵] مطلب یہ ہے کہ مال غنیمت کی طمع میں کسی شخص کے ایمان کا انکار نہ کرو۔ تم یہ جنگ فتوحات حاصل کرنے اور مال غنیمت جمع کرنے کے لیے نہیں، بلکہ مظلوم مسلمانوں کو ظالموں کے پنجے سے چھڑانے کے لیے لڑ رہے ہو۔ خدا کے پاس تمھارے لیے غنیمت کے بڑے ذخیرے ہیں۔ وہ بھی عنقریب تمھیں حاصل ہو جائیں گے، لیکن کسی مسلمان کی جان تمھارے کسی اقدام کی

اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۹۶﴾
اِنَّ الَّذِيۡنَ تَوَفّٰٮهُمُ الۡمَلٰٓٮِٕكَةُ ظَالِمِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ قَالُوۡا فِيۡمَ كُنۡتُمۡ‌ؕ قَالُوۡا كُنَّا مُسۡتَضۡعَفِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ‌ؕ قَالُوۡۤا اَلَمۡ تَكُنۡ اَرۡضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوۡا فِيۡهَا‌ؕ فَاُولٰٓٮِٕكَ مَاۡوٰٮهُمۡ جَهَنَّمُ‌ؕ

ہے، مگر جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر اللہ نے ایک اجر عظیم کی فضیلت دی ہے ـــــ اُس کی طرف سے درجے اور مغفرت اور رحمت۔ اور اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔[۱۶۶] ۹۵-۹۶

(اِس موقع پر بھی جو لوگ اُن بستیوں سے نکلنے کے لیے تیار نہیں ہیں، جہاں اُنھیں دین کے لیے ستایا جا رہا ہے، اُنھیں بتاؤ، اے پیغمبر کہ) جن لوگوں کی جان فرشتے اِس حال میں قبض کریں گے کہ[۱۶۷] (اپنے ایمان کو خطرے میں ڈال کر) وہ اپنی جان پر ظلم کر رہے تھے، اُن سے وہ پوچھیں گے کہ یہ تم کس حال میں پڑے رہے؟ وہ جواب دیں گے کہ ہم تو اِس

وجہ سے خطرے میں نہیں پڑنی چاہیے۔

[۱۶۶] یہ مظلوم مسلمانوں کی مدد کے لیے ایک مرتبہ پھر جہاد کی ترغیب دی ہے، لیکن اُس وقت چونکہ نفیر عام کا موقع نہیں تھا، اِس لیے وضاحت کر دی ہے کہ اِس کی حیثیت ایک درجۂ فضیلت کی ہے۔ سچے مسلمان اگر کسی عذر معقول کے بغیر بھی اِس کے لیے نہیں اٹھیں گے تو جہاد کے اجر عظیم سے تو یقیناً محروم رہیں گے، مگر خدا کا وعدہ اُن سے بھی اچھا ہے۔ وہ جہاد سے جی چرانے والے منافقین نہیں ہیں۔ لہٰذا اپنے اخلاص اور حسن عمل کا اجر ضرور پائیں گے۔

[۱۶۷] اصل الفاظ ہیں: 'اِنَّ الَّذِيۡنَ تَوَفّٰهُمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ'۔ اِن میں لفظ 'الۡمَلٰٓئِكَةُ' جمع ہے۔ اِس سے مقصود یہاں جنس کا اظہار ہے۔ عربی زبان میں جمع بعض موقعوں پر اِس طریقے سے بھی آتی ہے۔

وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۙ﴿۹۷﴾ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ
وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۙ﴿۹۸﴾
فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾
وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ
وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ
الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۰﴾

ملک میں بالکل بے بس تھے۔ فرشتے کہیں گے: کیا خدا کی زمین ایسی وسیع نہ تھی کہ تم اُس میں ہجرت کر جاتے۔ سو یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔[۱۶۸] ہاں، وہ مرد، عورتیں اور بچے جو فی الواقع بے بس ہیں اور نہ کوئی تدبیر کر سکتے ہیں نہ راستہ پاتے ہیں، اُن کے لیے توقع ہے کہ اللہ اُن سے درگذر فرمائے۔ بے شک، اللہ معاف کرنے والا اور درگذر فرمانے والا ہے۔ (یہ لوگ گھروں سے نکلیں اور مطمئن رہیں کہ) جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا، وہ زمین میں پناہ کے لیے بڑے ٹھکانے اور بڑی گنجایش پائے گا۔ اور جو اپنے گھر سے اللہ اور اُس کے رسول کی طرف ہجرت کے لیے نکلے، پھر اُسے موت آجائے تو اُس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا، اور اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔[۱۶۹] ۹۷-۱۰۰

---

[۱۶۸] یہ وعید اِس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کے مطالبے کے باوجود یہ لوگ محض اپنے مفادات کی خاطر گریز و فرار کے بہانے تراش رہے تھے اور اِس طرح گویا ایک طرح کی منافقت میں مبتلا تھے۔ چنانچہ پیچھے اِسی بنا پر اِنھیں منافق کہا گیا ہے۔

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿١٠١﴾

تم لوگ (اِس جہاد کے لیے) سفر میں نکلو تو تم پر کوئی حرج نہیں کہ نماز میں کمی کر لو، اگر اندیشہ ہو کہ منکرین تمھیں ستائیں گے، اِس لیے کہ یہ منکرین تمھارے کھلے دشمن ہیں[۱۷۰]۔ ۱۰۱

۱۶۹۔ اِن آیتوں سے واضح ہے کہ بندۂ مومن کے لیے اگر کسی جگہ اپنے پروردگار کی عبادت پر قائم رہنا جان جوکھم کا کام بن جائے، اُسے دین کے لیے ستایا جائے، یہاں تک کہ اپنے اسلام کو ظاہر کرنا ہی اُس کے لیے ممکن نہ رہے تو ایمان کا تقاضا ہے کہ اُس جگہ کو چھوڑ کر وہ کسی ایسے مقام کی طرف منتقل ہو جائے جہاں وہ علانیہ اپنے دین پر عمل پیرا ہو سکے۔

۱۷۰۔ اِس سے نماز کی اہمیت واضح ہوتی ہے کہ جنگ کے خطرات میں بھی کوئی مسلمان اُسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ سورۂ بقرہ میں بیان ہو چکا ہے کہ خطرہ ہو تو نماز پیدل چلتے ہوئے یا سواری پر، جس طرح ممکن ہو، پڑھ لی جائے۔ یہاں فرمایا ہے کہ حالات کے لحاظ سے اِس میں کمی بھی ہو سکتی ہے۔ اصطلاح میں اِسے قصر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کے لیے یہ سنت قائم کی ہے کہ صرف چار رکعت والی نمازیں دو رکعت پڑھی جائیں گی۔ دو اور تین رکعت والی نمازوں میں کوئی کمی نہ ہو گی۔ چنانچہ فجر اور مغرب کی نمازیں اِس طرح کے موقعوں پر بھی پوری پڑھیں گے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ فجر پہلے ہی دو رکعت ہے اور مغرب دن کے وتر ہیں، اِن کی یہ حیثیت تبدیل نہیں ہو سکتی۔

نماز میں کمی کی یہ رخصت یہاں 'اِنْ خِفْتُمْ' (اگر تمھیں اندیشہ ہو) کی شرط کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے کے عام سفروں کی پریشانی، افراتفری اور آپا دھاپی کو بھی اِس پر قیاس فرمایا اور اُن میں بالعموم قصر نماز ہی پڑھی ہے۔

وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوٓا أَسْلِحَتَهُمْ ۚ قف فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۠ ص وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ۚ ج وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً

اور (اے پیغمبر)، جب تم اِن کے درمیان ہو اور (خطرے کی جگہوں پر) اِنھیں نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہو تو چاہیے کہ اُن میں سے ایک گروہ تمھارے ساتھ کھڑا ہو اور اپنا اسلحہ لیے رہے۔ پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو تمھارے پیچھے ہو جائیں اور دوسرا گروہ آئے، جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے اور تمھارے ساتھ نماز ادا کرے۔ وہ بھی

سیدنا عمر کا بیان ہے کہ اِس طرح بغیر کسی خطرے کے قصر کر لینے پر مجھے تعجب ہوا۔ چنانچہ میں نے پوچھا تو آپ نے فرمایا: یہ اللہ کی عنایت ہے جو اُس نے تم پر کی ہے، سو اللہ کی اِس عنایت کو قبول کرو۔*

نماز میں تخفیف کی اِس اجازت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے اوقات میں تخفیف کا استنباط بھی کیا ہے اور اِس طرح کے سفروں میں ظہر و عصر، اور مغرب اور عشا کی نمازیں جمع کر کے پڑھائی ہیں**۔ یہی معاملہ حج کا ہے۔ اِس میں چونکہ شیطان کے خلاف جنگ کو علامتوں کی زبان میں ممثل کیا جاتا ہے، اِس لیے تمثیل کے تقاضے سے آپ نے یہ سنت قائم فرمائی ہے کہ لوگ مقیم ہوں یا مسافر، وہ منیٰ میں قصر اور مزدلفہ اور عرفات میں جمع اور قصر، دونوں کریں گے۔

---

*مسلم، رقم ۶۸۶۔

**ابوداؤد، رقم ۱۲۲۰۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى
اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ج وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ
لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿١٠٢﴾

اپنی حفاظت کا سامان اور ضروری اسلحہ لیے ہوئے ہوں۔ یہ منکر تو چاہتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان سے ذرا غافل ہو تو تم پر یک بارگی ٹوٹ پڑیں۔ اِس میں، البتہ کوئی حرج نہیں کہ اگر بارش کی تکلیف محسوس کرو یا بیمار ہو تو اپنا اسلحہ اتار دو۔ ہاں، یہ ضروری ہے کہ حفاظت کا سامان لیے رہو۔ تم یقین رکھو کہ اللہ نے اِن منکروں کے لیے بڑی ذلت کی سزا تیار کر رکھی ہے[۱۷۱]۔ ۱۰۲

۱۷۱؎ یہ ایک مشکل کا حل ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات اگر خطرے کے موقعوں پر نماز کی جماعت کھڑی کی جائے اور حضور امامت کرائیں تو کوئی مسلمان اُس جماعت کی شرکت سے محروم رہنے پر راضی نہیں ہو سکتا تھا۔ ہر سپاہی کی یہ آرزو ہوتی کہ وہ آپ ہی کی اقتدا میں نماز ادا کرے۔ یہ آرزو ایک فطری آرزو تھی، لیکن اِس کے ساتھ دفاع کا اہتمام بھی ضروری تھا۔ اِس مشکل کا ایک حل تو یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود چار رکعتیں پڑھتے اور اہل لشکر دو حصوں میں تقسیم ہو کر دو دو رکعتوں میں آپ کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ بعض موقعوں پر یہ طریقہ اختیار کیا بھی گیا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اِس میں جو زحمت ہو سکتی تھی، اُس کے پیش نظر قرآن نے اِن آیتوں میں یہ تدبیر بتائی کہ امام اور مقتدی، دونوں قصر نماز ہی پڑھیں اور لشکر کے دونوں حصے یکے بعد دیگرے آپ کے ساتھ آدھی نماز میں شامل ہوں اور آدھی نماز اپنے طور پر ادا کر لیں۔ چنانچہ ایک حصہ پہلی رکعت کے سجدوں کے بعد پیچھے ہٹ کر حفاظت و نگرانی کا کام سنبھالے اور دوسرا حصہ، جس نے نماز نہیں پڑھی ہے، آپ کے پیچھے آ کر دوسری رکعت میں شامل ہو جائے۔

فَاِذَا قَضَيۡتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰى جُنُوۡبِكُمۡ ۚ فَاِذَا اطۡمَاۡنَنۡتُمۡ فَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتۡ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ كِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا ﴿۱۰۳﴾

پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے، (ہر حال میں) یاد کرتے رہو۔[۱۷۲] لیکن جب اطمینان میں ہو جاؤ تو اہتمام کے ساتھ پوری نماز پڑھو (اور اِس کے لیے جو وقت مقرر ہے، اُس کی پابندی کرو)، اِس لیے کہ نماز مسلمانوں پر وقت کی پابندی کے ساتھ فرض کی گئی ہے۔[۱۷۳] ۱۰۳

روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس حکم کی رو سے لشکر کو جو رکعت اپنے طور پر ادا کرنا تھی، اُس کے لیے حالات کے لحاظ سے مختلف طریقے اختیار کیے گئے۔ ایسا بھی ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توقف فرمایا اور لوگ نماز پوری کر کے پیچھے ہٹے اور ایسا بھی ہوا کہ اُنھوں نے بعد میں نماز پوری کر لی*۔ اِس کی تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت اب باقی نہیں رہی۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس تدبیر کا تعلق، جیسا کہ آیت میں 'وَاِذَا كُنۡتَ فِيۡهِمۡ' (اور جب تم اُن کے درمیان ہو) کے الفاظ سے واضح ہے، خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی سے تھا۔ آپ کے بعد کسی ایک ہی امام کی اقتدا کی خواہش نہ اتنی شدید ہو سکتی ہے اور نہ اُس کی اتنی اہمیت ہے۔ قیامِ جماعت کا موقع ہو تو لوگ اب الگ الگ اماموں کی اقتدا میں نہایت آسانی کے ساتھ نماز ادا کر سکتے ہیں۔

۱۷۲۔ نماز کی اصل حقیقت ذکرِ الٰہی ہے اور دین کی روح اِس ذکر کا دوام ہے۔ قصر کی اجازت سے اِس میں جو کسر ہوئی تھی، یہ اُس کے جبر کی ہدایت فرمائی ہے کہ میدانِ جنگ میں اور خطرے کے موقعوں پر بالخصوص اِس کا اہتمام کیا جائے، اِس لیے کہ تمام عزم و حوصلہ کا منبع درحقیقت اللہ تعالیٰ کی یاد ہی ہے۔

---

*بخاری، رقم ۳۹۰۰۔ مسلم، رقم ۸۴۲۔

وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ
يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾
اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ

(ایمان والو، اِس جنگ کے لیے نکلو) اور دشمن[۱۷۴] کے تعاقب میں کمزوری نہ دکھاؤ۔ اگر تم تکلیف اٹھا رہے ہو تو تمھاری طرح وہ بھی تکلیف اٹھا رہے ہیں، لیکن تم خدا سے وہ توقعات رکھتے ہو جو وہ نہیں رکھتے، اور (ہمیشہ یاد رکھو کہ) اللہ علیم و حکیم ہے[۱۷۵]۔ ۱۰۴

ہم نے یہ کتاب تمھاری طرف حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ اللہ نے جو کچھ تمھیں دکھایا ہے[۱۷۶]،

---

[۱۷۳] نماز کے اوقات میں تخفیف کی طرف یہ قرآن نے خود اشارہ کر دیا ہے۔ آیت میں 'اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا' کے الفاظ عربیت کی رو سے تقاضا کرتے ہیں کہ اِن سے پہلے 'اور وقت کی پابندی کرو' یا اِس طرح کا کوئی جملہ مقدر سمجھا جائے۔ اِس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہوئی کہ قصر کی اجازت کے بعد یہ بھی ممکن ہے کہ لوگ نماز کی رکعتوں کے ساتھ اُس کے اوقات میں بھی کمی کر لیں۔ چنانچہ ہدایت کی گئی کہ جب اطمینان میں ہو جاؤ تو پوری نماز پڑھو اور اُس کے لیے جو اوقات مقرر ہیں، اُن کی پابندی کرو، اِس لیے کہ نماز مسلمانوں پر وقت کی پابندی کے ساتھ فرض کی گئی ہے۔

[۱۷۴] اصل میں لفظ 'اَلْقَوْم' آیا ہے۔ یہ جب اِس طرح کے سیاق میں آتا ہے تو اِس سے مراد دشمن اور حریف ہوتا ہے۔ اِس کی مثالیں قرآن مجید اور کلام عرب، دونوں میں موجود ہیں۔

[۱۷۵] لہٰذا مطمئن رہو۔ تمھیں جو تکلیف بھی پہنچتی ہے تمھاری مصلحت کے لیے پہنچتی ہے اور خدا کے اِسی علم و حکمت کا تقاضا ہوتی ہے۔

اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا ﴿۱۰۵﴾ۙ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۶﴾ۚ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ
اَنْفُسَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ﴿۱۰۷﴾ۚۙ يَّسْتَخْفُوْنَ
مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ
مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾

اُس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو (کہ اِن میں سے کون مخلص ہے اور کون منافق)، اور اِن بدعہدوں کے حمایتی ہرگز نہ بنو۔ اور اللہ سے معافی کی درخواست کرتے رہو، بے شک، اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔[۱۷۷] اُن لوگوں کی وکالت نہ کرو[۱۷۸] جو اپنے آپ سے خیانت کر رہے ہیں۔ اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو بدعہد ہے اور حق تلفی کرنے والا ہے۔ یہ لوگوں سے چھپ سکتے ہیں، مگر اللہ سے نہیں چھپ سکتے۔ وہ تو اُس وقت بھی اُن کے ساتھ ہوتا ہے، جب وہ اُس کی مرضی کے

---

[۱۷۶] یعنی اِس طرح بتایا ہے کہ گویا بچشم سر دکھا دیا ہے۔

[۱۷۷] اِن آیتوں میں خطاب اگرچہ بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن عتاب کا رخ اُنھی مسلمانوں کی طرف ہے جو منافقین کی حمایت کر رہے تھے۔ آگے 'هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ' کے الفاظ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ یہ اسلوب اُس وقت اختیار کیا جاتا ہے، جب اُن لوگوں سے ایک قسم کی بے التفاتی اور بے پروائی کا اظہار کیا جاتا ہے جن کو سرزنش مقصود ہوتی ہے۔

[۱۷۸] اصل میں لفظ 'مُجَادَلَة' آیا ہے۔ اِس کے معنی جھگڑنے کے بھی ہیں اور الحاح و اصرار کے ساتھ کسی کی وکالت کرنے اور تذلل کے ساتھ شکوہ اور شکایت کرنے کے بھی۔ یہاں یہ اِسی دوسرے مفہوم میں ہے۔

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا قف فَمَنْ
يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿١٠٩﴾
وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ

خلاف باتوں کی سرگوشیاں کرتے ہیں۔ اور جو کچھ وہ کرتے ہیں، اللہ اُن میں سے ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ۱۰۵-۱۰۸

یہ تم ہو کہ دنیا کی زندگی میں تو اِن (مجرموں) کی طرف سے تم نے جھگڑا کر لیا، لیکن قیامت کے دن کون اِن کی طرف سے اللہ سے جھگڑا کرے گا یا کون اِن کا ذمہ دار بنے گا؟[۱۷۹] ہاں، جو کسی برائی کا ارتکاب کرے یا اپنی جان پر ظلم ڈھائے، پھر اللہ سے مغفرت

---

[۱۷۹] اصل میں لفظ 'وَکِیْل' آیا ہے۔ اِس کے ساتھ 'عَلٰی' کا صلہ ہو تو عربی زبان میں یہ جس طرح نگران اور ضامن کے معنی میں آتا ہے، اُسی طرح ذمہ دار اور مسئول کے معنی میں بھی آتا ہے۔ آیت میں اُن لوگوں کو تنبیہ فرمائی ہے جو اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر منافقین کی حمایت کرتے اور اُن کی صریح غلطیوں کے باوجود اُن کو بری قرار دینے کے لیے کوئی نہ کوئی عذر تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ آیت ۱۱۵ تک یہ پورا سلسلۂ بیان اِنھی لوگوں کے جواب میں ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس پر تبصرہ فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''میں جب یہ آیتیں پڑھتا ہوں تو میرا ذہن بار بار اِس طرف جاتا ہے کہ یہ اُن لوگوں کو جواب دیا گیا ہے جو اِن منافقین کی حمایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین مخلصین سے بحثیں اور مناظرے کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اِن منافقین کی اِن خفیہ مجلسوں اور درپردہ سازشوں کی اطلاعات جب حضور کو اور صحابہ کو پہنچتی رہی ہوں گی تو اُن پر کسی نہ کسی نوعیت سے گرفت بھی ہوتی رہی ہوگی۔ اُس وقت اُن کے یہ حمایتی، جن کا اوپر ذکر ہوا، اُن کی صفائی میں کہتے رہے ہوں گے کہ یہ لوگ تو بڑے مخلص ہیں، یہ تو ملت کے بڑے ہوا خواہ ہیں، اِن کی

غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓـَٔةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ
بِهٖ بَرِيْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾

چاہے تو وہ اللہ کو بخشنے والا اور بڑی شفقت کرنے والا پائے گا۔[۱۸۰] (اپنے گناہ دوسروں کو لگا کر یہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِنھیں بتاؤ کہ) جو برائی کماتا ہے تو اُس کی اِس کمائی کا وبال اُسی پر آتا ہے۔ (یہ اللہ کا قانون ہے) اور اللہ علیم و حکیم ہے۔[۱۸۱] (اِنھیں بتاؤ کہ) جو کسی غلطی یا گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، پھر اُس کی تہمت کسی بے گناہ پر لگا دیتا ہے، اُس نے تو ایک بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اپنے سر لے لیا ہے۔[۱۸۲] ۱۰۹-۱۱۲

مجلسوں میں جو باتیں ہوتی ہیں وہ اسلام اور مسلمانوں کی بہبود اور خیر خواہی کی ہوتی ہیں۔ اور اگر اِس ذیل میں کوئی ایسی بات گرفت میں آتی رہی ہوگی جس کا جواب نہ بن آتا ہوگا تو اُس کا الزام، جیسا کہ اوپر اشارہ گزرا، کسی ایسے بھلے مانس پر ٹھونک دیتے رہے ہوں گے جس کے حاشیۂ خیال میں بھی وہ بات کبھی نہیں آئی ہوگی۔ اِن لوگوں کی اِس وکالت کے جواب میں قرآن نے نہایت بلیغ طریقے سے اِن اندرون خانہ سرگوشیوں سے پردہ اٹھایا اور دیکھیے کتنی خوب صورتی سے پردہ اٹھایا ہے کہ ساری بات بھی سامنے آگئی اور مخاطب کے لیے کسی بحث و تردید کی گنجایش بھی باقی نہیں رہی۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۳۸۳)

[۱۸۰] یعنی خدا کی گرفت سے بچنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ مجرموں کی حمایت میں دوسرے لوگ اُن کے پشت پناہ بن کر کھڑے ہو جائیں، بلکہ یہ ہے کہ خود مجرم اللہ کی طرف متوجہ ہو، اپنے گناہ کا اعتراف کرے اور اُس سے مغفرت چاہے۔

[۱۸۱] اِس لیے وہ اِس بات کو کس طرح روا رکھ سکتا ہے کہ ایک کا بوجھ دوسرے پر ڈال دے۔

[۱۸۲] یہ منافقین کی ایک اور شرارت سے پردہ اٹھایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ
اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَیْءٍ ؕ
وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ
تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾
لَا خَيْرَ فِیْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ
مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ

تم پر اللہ کی عنایت اور اُس کی رحمت نہ ہوتی، (اے پیغمبر) تو اِن میں سے ایک گروہ نے تو فیصلہ کر لیا تھا کہ تمھیں راہ راست سے ہٹا کر رہے گا، دراں حالیکہ وہ اپنے سوا کسی کو راہ راست سے نہیں ہٹا رہے اور نہ تمھیں کوئی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ (وہ تمھیں کس طرح راہ راست سے ہٹا سکتے ہیں)؟ اللہ نے تم پر اپنا قانون اور اپنی حکمت نازل فرمائی ہے اور اِس طرح تمھیں وہ چیز سکھائی ہے جو تم نہیں جانتے تھے اور اللہ کی تم پر بڑی عنایت ہے۔۱۱۳

اِن کی زیادہ تر سرگوشیوں میں کوئی بھلائی نہیں ہوتی۔ ہاں، اُن لوگوں کی سرگوشی میں یقیناً بھلائی ہے جو صدقہ و خیرات کی تلقین کریں یا نیکی کی راہ سجھائیں یا لوگوں کے

”...یہ لوگ اپنی کسی غلطی یا کسی حق تلفی پر جب گرفت میں آجاتے ہیں تو اعتراف کے بجائے جھوٹ اور بہتان کی راہ اختیار کرتے ہیں اور اُس کا بوجھ کسی بے گناہ پر لادنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرمایا کہ خدا سے بریت کا یہ راستہ بھی غلط ہے۔ اِس بہتان اور جھوٹ سے دنیا کو دھوکا دیا جا سکتا ہے، خدا کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ خدا کے ہاں ایسے مجرم نہ صرف اپنے جرم کا بوجھ اٹھائیں گے، بلکہ اپنے اصل جرم پر بہتان اور جھوٹ کا بھی اضافہ کر لیں گے۔“ (تدبر قرآن ۲/۳۸۰)

مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا (۱۱۴) وَمَنْ یُّشَاقِقِ
الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰی وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ
الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا (۱۱۵)
اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ

معاملات کی اصلاح کے لیے کہیں۔ اور جو اللہ کی رضا جوئی کے لیے ایسا کریں گے، اُنھیں عنقریب ہم اجرِ عظیم عطا فرمائیں گے۔ اِس کے برخلاف جو راہ ہدایت کے اپنے اوپر پوری طرح واضح ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت کریں گے اور اُن لوگوں کے راستے کو چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کریں گے جو تم پر سچے دل سے ایمان لائے ہیں[۱۸۳]، اُنھیں ہم اُسی راستے پر ڈال دیں گے جس پر وہ خود گئے ہیں[۱۸۴] اور بالآخر دوزخ میں جھونکیں گے۔ وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔ ۱۱۴-۱۱۵

(چنانچہ یہی ہوا اور ایمان کا راستہ چھوڑ کر اب یہ مشرکوں سے جا ملے ہیں۔ اِنھیں

---

[۱۸۳] اِس سے مراد صحابۂ کرام ہیں۔ اُن کا راستہ یہ تھا کہ اُنھوں نے جب ایک مرتبہ اللہ کے پیغمبر کو مان لیا تو اُس کے بعد پھر کبھی بدعہدی، بے وفائی، مخالفت اور گریز و فرار کا رویہ اختیار نہیں کیا، بلکہ پورے اخلاص کے ساتھ آپ کی اتباع کی اور جو حکم دیا گیا، اُس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے رہے۔ لہٰذا یہ ایمان و اخلاص، اتباع و اطاعت اور تسلیم و انقیاد کا راستہ ہے جس کی پیروی ہر مسلمان کو کرنی چاہیے۔ دین کی تعبیر یا اُس کو سمجھنے میں کسی اختلاف سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

[۱۸۴] ہدایت و ضلالت کے باب میں یہ اللہ کا قانون ہے جو قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر بیان ہوا ہے کہ ہدایت اُنھیں ملتی ہے جو ہدایت کے سچے طالب ہیں اور گم راہی کے حوالے وہی لوگ کیے جاتے ہیں جو اپنے لیے خود گم راہی کا راستہ اختیار کر لیں۔

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾ اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ
دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ﴿۱۱۷﴾ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ

بتاؤ کہ) اللہ اِس چیز کو نہیں بخشے گا کہ اُس کے شریک ٹھیرائے جائیں[۱۸۵]۔ اِس کے نیچے، البتہ جس کے لیے چاہے گا، (اپنے قانون کے مطابق[۱۸۶]) بخش دے گا۔ (اِس لیے شرک سے دور رہو) اور (یاد رکھو کہ) جو اللہ کے شریک ٹھیرائے گا، وہ بہت دور کی گم راہی میں جا پڑا ہے۔ (اِن پر افسوس)، یہ اللہ کے سوا پکارتے بھی ہیں تو دیویوں[۱۸۷] کو پکارتے ہیں[۱۸۸]

---

[۱۸۵] اِس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...جس طرح تمام خیر کا منبع توحید ہے، یعنی خدا کی ذات، صفات اور اُس کے حقوق میں کسی کو ساجھی نہ ٹھیرانا، اُسی طرح تمام شر کا منبع شرک ہے، یعنی خدا کی ذات، صفات اور اُس کے حقوق میں کسی کو شریک ٹھیرانا۔ توحید پر قائم رہتے ہوئے انسان اگر کوئی ٹھوکر کھاتا ہے تو وہ غلبۂ نفس و جذبات سے اتفاقی ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی غلطی ہی کو اوڑھنا بچھونا بنا لے۔ اِس وجہ سے وہ گرنے کے بعد لازماً اٹھتا ہے۔ برعکس اِس کے شرک کے ساتھ اگر کسی سے کوئی نیکی ہوتی ہے تو وہ اتفاقی ہوتی ہے جس کا اصل منبع خیر، یعنی خدا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اِس وجہ سے وہ بے بنیاد ہوتی ہے۔ مشرک خدا سے کٹ جانے کی وجہ سے لازماً اپنی باگ نفس اور شیطان کے ہاتھ میں دے دیتا ہے، اِس وجہ سے وہ درجہ بدرجہ صراط مستقیم سے اتنا دور ہو جاتا ہے کہ اُس کے لیے خدا کی طرف لوٹنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا تا آنکہ وہ شرک سے توبہ کرے۔ اِس وجہ سے خدا کے ہاں شرک کی معافی نہیں ہے۔ البتہ توحید کے ساتھ اگر کسی سے گناہ ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہے گا، معاف فرما دے گا۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۳۸۷)

[۱۸۶] یعنی اپنے اُس قانون کے مطابق جو اُس نے اپنی کتاب میں بیان کر دیا ہے۔

[۱۸۷] اصل میں لفظ ’اِنَاث‘ آیا ہے۔ یہ ’انثی‘ کی جمع ہے جس کے معنی عورت کے ہیں۔ آیت کے سیاق سے واضح ہے کہ یہاں اِس سے مراد دیویاں ہیں۔

وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۱۱۸﴾ ۙ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ
وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ
فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

اور پکارتے بھی ہیں تو اُسی شیطان کو پکارتے ہیں[۱۸۹] جو سرکش ہو چکا ہے، جس پر خدا نے لعنت کی اور جس نے کہہ رکھا ہے کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک مقرر حصہ لے کر رہوں گا،[۱۹۰] میں اُنھیں ضرور بہکاؤں گا، اُنھیں آرزوؤں میں الجھاؤں گا،[۱۹۱] اُنھیں سکھاؤں گا[۱۹۲] تو وہ چوپایوں کے کان پھاڑیں گے[۱۹۳] اور اُنھیں سکھاؤں گا تو وہ خدا کی بنائی ہوئی ساخت کو

---

[۱۸۸] اِس آیت میں پکارنے سے مراد دعا، فریاد، استغاثہ، استعانت اور استرحام کے ارادے سے اُس معنی میں پکارنا ہے جس معنی میں کسی معبود کو پکارا جاتا ہے۔

[۱۸۹] شرک جہاں کہیں اور جس صورت میں بھی پایا جاتا ہے، اُس کا امام اور پیشوا درحقیقت شیطان ہی ہے۔ اُس کے پکارنے کا ذکر یہاں اِسی حیثیت سے ہوا ہے۔

[۱۹۰] یہ شیطان کی اُس دھمکی کا حوالہ ہے جو اُس نے اُس وقت دی، جب آدم کو سجدہ کرنے کے معاملے میں اُس کی سرکشی کے بعد اُسے راندۂ درگاہ قرار دیا گیا۔

[۱۹۱] یہ اُن جھوٹی آرزوؤں کی طرف اشارہ ہے جن میں مشرک قومیں بالعموم مبتلا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ عربوں کا یہ عقیدہ کہ دنیا اور آخرت کی نعمتیں اُن دیویوں اور دیوتاؤں کی سفارش سے ملتی ہیں جنھیں وہ پوجتے ہیں اور یہود کا یہ وہم کہ وہ ابراہیم خلیل اللہ کی اولاد ہیں، اِس لیے جنت اُن کے حق میں لکھ دی گئی ہے، اِنھی آرزوؤں کی مثالیں ہیں۔ یہی معاملہ نصاریٰ کا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا نے اپنے بیٹے کو انسان کے ازلی گناہ کا کفارہ بنا دیا ہے۔

[۱۹۲] اصل میں 'وَلَاٰمُرَنَّهُمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ جس طرح حکم دینے کے معنی میں آتے ہیں، اُسی طرح بتانے، سکھانے اور ترغیب دینے کے معنی میں بھی آتے ہیں۔

فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿١١٩﴾ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿١٢٠﴾ اُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۡ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿١٢١﴾

بگاڑیں گے۔[۱۹۴] (اِنھیں بتاؤ کہ) اللہ کو چھوڑ کر جس نے شیطان کو اپنا سرپرست بنالیا، اُس کے لیے کوئی سرپرستی نہیں ہے، سو وہ صریح نقصان میں پڑ گیا ہے۔ وہ اُن سے وعدے کرتا اور اُنھیں امیدیں دلاتا ہے، مگر اُن سے شیطان کے یہ وعدے سراسر فریب ہیں، لہٰذا یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور اُس سے بھاگنے کے لیے یہ کوئی راہ نہ پائیں گے۔[۱۹۵] ۱۱۶-۱۲۱

---

۱۹۳ شیطان کی یہ بات اِس طرح پوری ہوئی کہ مشرک قوموں نے خاص خاص جانوروں کو اپنے فرضی معبودوں کی نذر کیا اور اِس کی علامت کے طور پر اُن کے کان چیرے تاکہ کوئی اُن سے تعرض نہ کرے۔

۱۹۴ یعنی خدا نے جس فطرت پر انسان کو پیدا کیا ہے، اُس کو مسخ کریں گے۔ چنانچہ توحید کے بجاے شرک کے داعی اور علم بردار ہوں گے، پھر اِسی کے تحت وہ سب چیزیں اختیار کرلیں گے جو فطرت کی تبدیلی کے حکم میں ہیں۔ مثلاً رہبانیت، برہمچرج، عورتوں کا مرد اور مردوں کا عورت بننا اور اِس طرح کے دوسرے خرافات۔

۱۹۵ اوپر بیان ہوا ہے کہ شرک کی مغفرت نہیں ہوسکتی۔ قرآن نے یہ اِسی موقع کلام کی رعایت سے شرک کا بوداپن اور اُس کا حسب ونسب بھی واضح کر دیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”بودے پن کا ذکر دو پہلوؤں سے فرمایا: ایک تو یہ کہ شرک کا یہ سارا کارخانہ دیویوں کے بل بوتے پر قائم ہے، اول تو یہی پرلے سرے کی حماقت ہے کہ خداے واحد کے سوا کسی اور کا سہارا انسان ڈھونڈے، پھر حماقت درحماقت یہ کہ سہارا بھی فرضی عورتوں کا جن کی بے بسی اور ناتوانی خود ضرب المثل ہے۔ دوسرا یہ کہ اِس کی تمام تر بنیاد شیطان کی پیدا کی ہوئی جھوٹی آرزوؤں اور اُس کے پرفریب وعدوں پر ہے اور شیطان کے سارے وعدے بالکل بے حقیقت ہیں۔ جب

النسآء ۴

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ
وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾
لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا

اِس کے برخلاف جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، اُنھیں ہم عنقریب ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنی بات میں سچا ہو سکتا ہے۔ ۱۲۲
(تم لوگوں پر واضح ہونا چاہیے کہ نجات) نہ تمھاری آرزوؤں پر موقوف ہے نہ اہل کتاب

حقیقت کھلے گی تو نظر آئے گا کہ نہ ابراہیم کا حسب و نسب کچھ نافع ہے اور نہ لات و منات اور اُن کی شفاعت کا کوئی وجود ہے، بلکہ سارا معاملہ ایمان و عمل صالح پر منحصر ہے۔ جن کے پاس یہ متاع نہیں ہے، اُن کے لیے صرف جہنم ہے جس سے فرار کی کوئی راہ نہیں ہے۔

اُس کے حسب و نسب کا بیان اِس طرح فرمایا کہ اُس کا موجد اور امام ابلیس لعین ہے جس نے جوشِ حسد میں پہلے ہی روز یہ دھمکی دی تھی کہ میں تیرے بندوں میں سے اپنا حصہ بٹا کر رہوں گا، میں اُن کو گم راہ کروں گا، اُن کو طرح طرح کی جھوٹی آرزوؤں میں مبتلا کروں گا، وہ میرے حکم سے بتوں کو نذرانے پیش کریں گے اور میرے القا سے فطرت اللہ کو مسخ کریں گے۔ فرمایا کہ جو لوگ اِس شیطان لعین و متمرد کو اپنا مرجع اور کارساز بنائیں، اُن سے زیادہ بدبخت اور نامراد کون ہو سکتا ہے۔ فرمایا کہ شیطان اُن کو وعدوں کے سبز باغ دکھا رہا ہے اور آرزوؤں کے جال اُن کے آگے بچھا رہا ہے، حالاں کہ شیطان کے سارے وعدے محض فریب ہیں۔ نہ شفاعت اُن کے کام آنی ہے نہ بزرگوں سے نسبت۔ اُن کا ٹھکانا جہنم ہے جس سے کوئی مفر نہ ہوگا۔”

(تدبر قرآن ۲/ ۳۹۱)

يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۱۲۳) وَمَنْ
يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ
يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا (۱۲۴)

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ
وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا (۱۲۵) وَلِلّٰهِ

کی آرزووں پر[۱۹۶] (ہرگز نہیں)، بلکہ جو برائی کرے گا، اُس کا بدلہ پائے گا اور اللہ کے مقابلے میں وہ اپنے لیے کوئی حامی اور مددگار نہ پا سکے گا۔ اور جو نیکی کا کوئی کام کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان بھی رکھتا ہے تو ایسے ہی لوگ ہیں جو خدا کی جنت میں داخل ہوں گے اور اُن کی ذرا بھی حق تلفی نہ ہو گی۔ ۱۲۳-۱۲۴

(ایمان والوں کے مقابلے میں یہ منافق مشرکوں کو ترجیح دیتے ہیں) اور (نہیں سمجھتے کہ) اُس شخص سے بہتر کس کا دین ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے اور اچھے طریقے سے عمل کرنے والا ہو اور ابراہیم کے طریقے کی پیروی کرے جو بالکل یک سو تھا — اور ابراہیم کو اللہ نے (اِسی بنا پر) اپنا دوست بنایا تھا[۱۹۷]۔ (اللہ کے سوا کون اِس کا حق دار ہے کہ اپنے آپ کو اُس کے حوالے کر دیا جائے، اِس لیے کہ) زمین

---

[۱۹۶] یہ اُنھی آرزووں کا ذکر ہے جن کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔

[۱۹۷] یعنی اصل دین یہ ہے۔ ابراہیم اِسی کے پیرو تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اپنا دوست بنایا تو اِسی وجہ سے بنایا کہ ہر چیز سے الگ ہو کر اُنھوں نے اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا تھا۔ مسلمان اِسی امام توحید کی پیروی کر رہے ہیں۔ اِس کے برخلاف اِن مشرکوں کا حال یہ ہے کہ ابراہیم کے طریقے کو چھوڑ کر اِنھوں نے امام شرک ابلیس کی پیروی اختیار کر لی ہے۔

مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطًا (۱۲۶)
وَیَسْتَفْتُوْنَکَ فِی النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰہُ یُفْتِیْکُمْ فِیْہِنَّ ۙ وَمَا
یُتْلٰی عَلَیْکُمْ فِی الْکِتٰبِ فِیْ یَتٰمَی النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا تُؤْتُوْنَہُنَّ مَا کُتِبَ

اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، اللہ کا ہے اور اللہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ۱۲۵-۱۲۶

۱- وہ تم[۱۹۸] سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں[۱۹۹]۔ اُن سے کہہ دو کہ اللہ تمھیں اُن کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے اور جن عورتوں کے حقوق تم ادا نہیں کرنا چاہتے[۲۰۰]، مگر اُن سے نکاح کرنا چاہتے ہو، اُن کے یتیموں سے متعلق جو ہدایات اِس کتاب میں تمھیں دی

---

[۱۹۸] اپنے مضمون کے لحاظ سے سورہ یہاں ختم ہوئی۔ اِس سے آگے اب ایک ضمیمہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اُن سوالوں کا جواب دیا ہے جو اِس سورہ کے احکام سے متعلق لوگوں نے اِس کی تلاوت کے دوران میں کیے ہیں۔ آیت ۱۳۴ تک پہلے سوال کا جواب ہے۔ یہ اُن مسلمانوں نے کیا ہے جو ایمان واخلاق کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں ابھی کچھ کم زور ہیں۔ دوسرا سوال منافقین کا ہے۔ اِس کا جواب آیت ۱۵۲ پر ختم ہوا ہے۔ تیسرا سوال ایک مطالبے کی صورت میں ہے اور یہ اہل کتاب نے کیا ہے۔ آیت ۱۷۵ تک قرآن نے اِس کا جواب دیا ہے۔ آیت ۱۷۶ میں چوتھے اور آخری سوال کا جواب ہے۔ اِس کا تعلق میراث کے اُن احکام سے ہے جو اِس سورہ کی ابتدا میں بیان ہوئے ہیں۔

[۱۹۹] یہ استفتا کس نوعیت کا تھا؟ اِس کی وضاحت آگے اِس کے جواب سے ہو جاتی ہے۔ قرآن کا عام اسلوب ہے کہ اُس میں سوالات اِسی طرح اجمال کے ساتھ نقل ہوتے ہیں۔ غور کیجیے تو یہی طریقہ قرین بلاغت ہے، اِس لیے کہ سوال اگر جواب سے واضح ہے تو اُس کا نقل کرنا محض طول کلام کا باعث ہوگا۔

[۲۰۰] اصل الفاظ ہیں: 'لَا تُؤْتُوْنَہُنَّ مَا کُتِبَ لَہُنَّ'۔ یعنی اُن کو تم وہ نہیں دیتے جو اُن کے لیے لکھا گیا ہے۔ یہ مہر اور عدل کی اُس شرط کی طرف اشارہ ہے جو اِس سورہ کی آیات ۳-۴ میں

لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ
وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ

جارہی ہیں[۲۰۱]، اُن کے بارے میں اور (دوسرے) بے سہارا بچوں کے بارے میں بھی فتویٰ دیتا ہے کہ عورتوں کے حقوق ہر حال میں ادا کرو اور یتیموں کے ساتھ ہر حال میں انصاف پر قائم رہو[۲۰۲] اور (یاد رکھو کہ اِس کے علاوہ بھی) جو بھلائی تم کرو گے، اُس کا

یتیموں کی ماؤں کے ساتھ نکاح میں بھی ضروری قرار دی گئی ہے۔

۲۰۱۔ اصل میں 'وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِى الْكِتٰبِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن کا عطف ہمارے نزدیک 'فِيْهِنَّ' کی ضمیر مجرور پر ہے اور 'الْكِتٰب' سے مراد اِس جملے میں قرآن مجید ہے۔

۲۰۲۔ یہ وہ فتویٰ ہے جو لوگوں کے استفتا کے جواب میں ارشاد ہوا ہے۔ اِس کے لیے اصل میں 'وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن کا معطوف علیہ اِس جملے میں محذوف ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”... یہاں کلام میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں ہے جو 'وَاَنْ تَقُوْمُوْا' کا معطوف علیہ بن سکے۔ اِس وجہ سے لازماً یہاں محذوف ماننا پڑے گا اور یہ محذوف سیاق کلام کی روشنی میں معین کیا جائے گا۔ چنانچہ یہاں 'وَاَنْ تَقُوْمُوْا' سے پہلے یہ مضمون محذوف ہوگا کہ اِن عورتوں کو اِن کے مہر دو، اِن کے ساتھ عدل کا معاملہ کرو، پھر اِس کے اوپر 'وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ' کا عطف موزوں ہوگا۔ یعنی اور یتیموں کے لیے عدل کی حفاظت کرنے والے بنو۔ گویا فتوے میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ مہر اور عدل کی شرط جس طرح عام عورتوں کے معاملے میں ہے، اُسی طرح یتیموں کی ماؤں کے بارے میں بھی ہے اور آیت 'وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا' میں عورتوں کے ساتھ عدل کا اور آیت 'وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ' میں ادائے مہر کا جو حکم ہے تو وہ یتیموں کی ماؤں سے متعلق ہی ہے، جن سے تم نکاح تو کرنا چاہتے ہو، لیکن مہر اور عدل کی کھکیڑ میں پڑنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ اِس طرح گویا قرآن نے آیات ۳-۴ کے اجمال کو کھول دیا اور اِس

بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ
وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ

صلہ لازماً پاؤ گے، اِس لیے کہ وہ اللہ کے علم میں رہے گی۔ ہاں، اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے بے زاری[۲۰۳] یا بے پروائی کا اندیشہ ہو تو اُن پر گناہ نہیں کہ دونوں آپس میں کوئی سمجھوتا کر لیں۔ اِس لیے کہ سمجھوتا بہتر ہے[۲۰۴]۔ اور (یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ) حرص لوگوں

فتوے کے ذریعے سے اُن میں دیے ہوئے احکام کو مزید موکد کر دیا۔‘‘ (تدبر قرآن ۲/ ۳۹۷)

[۲۰۳] اصل میں ’نُشُوْز‘ کا لفظ آیا ہے۔ یہ اگر مرد کی طرف سے ہو تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بیوی کو بیوی سمجھ کر اُس سے معاملہ کرنے سے انکار کر رہا ہے۔

[۲۰۴] یہ عورت کو نصیحت فرمائی ہے کہ اگر اُسے اندیشہ ہو کہ بیویوں میں برابری کے حقوق پر اصرار کے نتیجے میں مرد اُس سے بے پروائی برتے گا یا پیچھا چھڑانے کی کوشش کرے گا تو اِس میں حرج نہیں کہ دونوں مل کر آپس میں کوئی سمجھوتا کر لیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ’’...یعنی عورت اپنے حق مہر، عدل اور نان نفقے کے معاملے میں ایسی رعایتیں شوہر کو دے دے کہ قطع تعلق کا اندیشہ رفع ہو جائے۔ فرمایا کہ صلح اور سمجھوتے ہی میں بہتری ہے، اِس لیے کہ میاں اور بیوی کا رشتہ ایک مرتبہ قائم ہو جانے کے بعد فریقین کی فلاح اِسی میں ہے کہ یہ قائم ہی رہے، اگرچہ اِس کے لیے کتنا ہی ایثار کرنا پڑے۔ فرمایا کہ حرص طبائع کی عام بیماری ہے جو باہمی تعلقات پر اثر انداز ہوتی ہے اور اِس کا علاج یہی ہے کہ یا تو دونوں فریق ایثار پر آمادہ ہوں اور اگر ایک فریق کا مرض لاعلاج ہے تو دوسرا قربانی پر آمادہ ہو۔ غرض رشتۂ نکاح کو برقرار رکھنے کے لیے اگر عورت کو قربانی بھی دینی پڑے تو بہتری اُس کے برقرار رہنے ہی میں ہے۔ اِس کے بعد ’وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَ تَتَّقُوْا‘ کے الفاظ سے مرد کو اُبھارا ہے کہ ایثار و قربانی اور احسان و تقویٰ کا میدان اصلاً اُسی کے شایانِ شان ہے، وہ اپنی فتوت اور مردانگی کی لاج رکھے اور

كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿١٢٨﴾
وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ
فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا
فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١٢٩﴾ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ

کی سرشت میں ہے۔[205] لیکن حسن سلوک سے پیش آؤ گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو صلہ پاؤ گے، اِس لیے کہ جو کچھ تم کرو گے، اللہ اُسے جانتا ہے۔ ۱۲۷-۱۲۸

بیویوں کے درمیان پورا انصاف تو اگر تم چاہو بھی تو نہیں کر سکتے، اِس لیے اتنا کافی ہے کہ ایک کی طرف بالکل اِس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری اَدھر میں لٹکتی رہ جائے۔ ہاں، اگر اپنے آپ کو درست کرتے رہو گے اور اللہ سے ڈرتے رہو گے تو اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔[206] اور اگر میاں بیوی، دونوں الگ ہی ہو جائیں گے تو اللہ اُن

عورت سے لینے والا بننے کی بجائے اُس کو دینے والا بنے۔ اللہ ہر ایک کے ہر عمل سے باخبر ہے اور ہر نیکی کا وہ بھرپور صلہ دے گا۔'' (تدبر قرآن ۲/۳۹۹)

[205] اصل الفاظ ہیں: 'وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ'۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... 'شُح' کے معنی بخل کے بھی ہیں اور حرص کے بھی۔ بخل تو یہ ہے کہ آدمی ادائے حقوق میں تنگ دلی برتے۔ یہ چیز ہر حال میں مذموم ہے۔ لیکن حرص اچھی چیز کی بھی ہو سکتی ہے، بری چیز کی بھی، حد کے اندر بھی ہو سکتی ہے اور حد سے باہر بھی، اِس وجہ سے اِس کا اچھا اور بُرا ہونا ایک امر اضافی ہے۔ اپنے اچھے پہلو کے اعتبار سے یہ انسانی فطرت کے اندر اپنا ایک مقام رکھتی ہے، لیکن اکثر طبائع پر اِس کا ایسا غلبہ ہو جاتا ہے کہ یہ ایک بیماری بن کے رہ جاتی ہے۔ 'اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ' میں اِس کے اِسی پہلو کی تعبیر ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/۳۹۸)

[206] اِس سے واضح ہے کہ بیویوں کے درمیان جس عدل کا تقاضا قرآن نے کیا ہے، اُس

سَعَتِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾

میں سے ہر ایک کو اپنی وسعت سے بے نیاز کر دے گا۔ اللہ بڑی وسعت رکھنے والا اور بڑی حکمت والا ہے۔[۲۰۷] ۱۲۹-۱۳۰

کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ظاہر کے برتاؤ اور دل کے لگاؤ میں کسی پہلو سے کوئی فرق باقی نہ رہے۔ اِس طرح کا عدل کسی کی طاقت میں نہیں ہے اور کوئی شخص یہ کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا۔ دل کے میلان پر آدمی کو اختیار نہیں ہوتا، لہٰذا قرآن کا تقاضا صرف یہ ہے کہ شوہر ایک بیوی کی طرف اِس طرح نہ جھک جائے کہ دوسری بالکل معلق ہو کر رہ جائے گویا کہ اُس کا کوئی شوہر نہیں ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ برتاؤ اور حقوق میں اپنی طرف سے توازن قائم رکھنے کی کوشش کرو، اگر کوئی حق تلفی یا کوتاہی ہو جائے تو فوراً تلافی کر کے اپنے رویے کی اصلاح کر لو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ تمھاری اِس کوشش کے باوجود اگر کوئی فروگذاشت ہو جاتی ہے تو اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی رحمت ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

۲۰۷ مدعا یہ ہے کہ گھر بچانے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے، اللہ تعالیٰ کو یہی مطلوب ہے، لیکن اگر حالات مجبور کر دیتے ہیں اور علیحدگی ہو ہی جاتی ہے تو اللہ سے اچھی امید رکھنی چاہیے۔ وہی رزق دینے والا ہے اور مصیبتوں اور تکلیفوں میں اپنے بندوں کا ہاتھ بھی وہی پکڑتا ہے۔ میاں اور بیوی، دونوں کو وہ اپنی عنایت سے مستغنی کر دے گا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...مطلب یہ ہے کہ اِس رشتے کو قائم رکھنے کے لیے میاں اور بیوی، دونوں سے ایثار اور کوشش تو مطلوب ہے، لیکن یہ غیرت اور خودداری کی حفاظت کے ساتھ مطلوب ہے۔ میاں اور بیوی میں سے کسی کے لیے جس طرح اکڑنا جائز نہیں ہے، اُسی طرح ایک حد خاص سے زیادہ دبنا بھی جائز نہیں ہے۔ اگرچہ الفاظ میں عمومیت ہے، لیکن سیاق کلام دلیل ہے کہ اِس میں عورتوں کی خاص طور پر حوصلہ افزائی ہے کہ وہ حتی الامکان نباہنے کی کوشش تو کریں اور مصالحت کے لیے ایثار بھی کریں، لیکن یہ حوصلہ رکھیں کہ اگر کوشش کے باوجود نباہ کی صورت پیدا نہ ہوئی تو رزاق

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا
فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا
حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ
وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ
عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ

(یہ خدا کے احکام ہیں۔ نہیں مانو گے تو اپنا ہی بُرا کرو گے، اِس لیے کہ) زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، سب اللہ کا ہے۔ تم سے پہلے جن لوگوں کو کتاب دی گئی، اُنھیں بھی ہم نے یہی ہدایت کی تھی اور تمھیں بھی یہی ہدایت کر رہے ہیں کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور (یاد رکھو کہ) نہیں مانو گے تو اللہ کا کچھ نہیں بگاڑو گے، اِس لیے کہ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، سب اللہ کا ہے اور اللہ بے نیاز ہے، ستودہ صفات ہے۔[۲۰۸] (ایک مرتبہ پھر سنو کہ) زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، سب اللہ کا ہے اور بھروسے کے لیے اللہ کافی ہے۔ (اِس لیے وہی سزاوار ہے کہ زندگی کے معاملات اُس کے حوالے کیے جائیں۔ تمھاری نافرمانی کی صورت میں) وہ اگر چاہے تو لوگو، تم سب کو فنا کر دے اور دوسروں کو (تمھاری جگہ) لے آئے، اللہ اِس چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ (اپنے

اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ اپنے خزانۂ جود سے اُن کو مستغنی کر دے گا۔" (تدبر قرآن ۲/ ۴۰۰)

[۲۰۸] یعنی خدا تمھارے لیے کسی چیز کو پسند کرتا ہے تو اِس لیے نہیں کہ اُس کو اِس کی احتیاج ہے، بلکہ اِس لیے کہ وہ حمید ہے اور اُس کی یہ صفت تقاضا کرتی ہے کہ بے نیاز ہونے کے باوجود تمام مخلوقات کو اپنے جود و کرم سے نوازتا رہے۔

الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيۡعًۢا بَصِيۡرًا (۱۳۴)
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِيۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ

مفادات کی خاطر تم اللہ کی شریعت سے فرار اختیار کرتے ہو۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) جو دنیا کا صلہ چاہتا ہے تو دنیا کا صلہ بھی اللہ کے پاس ہے اور جو آخرت کا صلہ چاہتا ہے تو اللہ کے پاس دنیا کا صلہ بھی ہے اور آخرت کا صلہ بھی، اور اللہ سمیع و بصیر ہے[209]۔ ۱۳۱-۱۳۴

۲- ایمان[210] والو، انصاف پر قائم رہو، اللہ کے لیے اُس کی گواہی دیتے ہوئے[211]، اگرچہ

---

[209] اِس آیت میں حذف کا اسلوب ہے جسے ہم نے ترجمے میں کھول دیا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”...عربی میں کلام کے دو متقابل اجزا میں سے بعض اجزا کو اِس طرح حذف کر دیتے ہیں کہ مذکور جزو، محذوف کی طرف خود اشارہ کر دیتا ہے۔ ہمارے نزدیک اِس آیت کے محذوفات کھول دیے جائیں تو تالیف کلام یہ ہوگی: مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ ثَوَابَ الدُّنۡيَا فَعِنۡدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنۡيَا، وَمَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ ثَوَابَ الۡاٰخِرَةِ فَعِنۡدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ۔ پہلے میں سے ’فَعِنۡدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنۡيَا‘ کو حذف کر دیا اور دوسرے میں سے ’وَمَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ ثَوَابَ الۡاٰخِرَةِ‘ کو۔ اِس حذف کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا کہ مذکور ٹکڑے محذوف ٹکڑوں کی نشان دہی خود کر رہے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۲/۴۰۱)

[210] یتیموں کی ماؤں سے نکاح کے بارے میں استفتا کا جواب پچھلی آیت پر ختم ہوا۔ یہاں سے آگے آیت ۱۵۲ تک اب اُن لوگوں کے سوال کا جواب ہے جو دوستی، تعلقات اور رشتہ و پیوند کو حق کے مقابلے میں ترجیح دیتے اور منکرین کے ہاں اپنے مقام و مرتبہ اور اپنی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے بار بار پوچھتے تھے کہ بیچ کی راہ تلاش کر لینے میں آخر حرج ہی کیا ہے؟ یہ کیوں ضروری ہے کہ اہل کتاب

وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا
فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا قف فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا
اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ

یہ گواہی خود تمھاری ذات، تمھارے ماں باپ اور تمھارے قرابت مندوں کے خلاف ہی پڑے۔ امیر ہو یا غریب، اللہ ہی دونوں کا زیادہ حق دار ہے (کہ اُس کے قانون کی پابندی کی جائے)۔ اِس لیے (اللہ کی ہدایت کو چھوڑ کر) تم خواہشوں کی پیروی نہ کرو کہ اِس کے نتیجے میں حق سے ہٹ جاؤ اور (یاد رکھو کہ) اگر (حق و انصاف کی بات کو) بگاڑنے یا (اُس سے) پہلو بچانے کی کوشش کرو گے[۲۱۲] تو اُس کی سزا لازماً پاؤ گے، اِس لیے

کے منکرین کو بھی اُنھی کافروں کی صف میں کھڑا کیا جائے جنھیں قرآن عذابِ الٰہی کا مستحق قرار دے رہا ہے؟ اُن کا خیال تھا کہ اہل کتاب بہت کچھ مانتے ہیں۔ اِس کی رعایت سے اُن کے ساتھ رعایت ہونی چاہیے؟ اِس سورہ کے مباحث سے متعلق اِس طرح کے سوالات اُن کے ذہنوں میں پیدا ہوتے تھے۔ قرآن نے اِن کے جواب میں پوری وضاحت کے ساتھ بتایا ہے کہ اِس کا کوئی امکان نہیں ہے، اِس لیے کہ کفر صرف یہ نہیں ہے کہ کوئی شخص صریح الفاظ میں اللہ اور اُس کے رسولوں کا انکار کرے، کفر اور صریح کفر یہ بھی ہے کہ اللہ اور اُس کے رسولوں کو اللہ کے شرائط پر نہیں، بلکہ اپنے شرائط پر ماننے کے لیے اصرار کیا جائے۔ چنانچہ خدا کا فیصلہ سننا چاہتے ہو تو سن لو کہ تمھیں ہر حال میں حق کہنا ہے، حق کی گواہی دینی ہے اور پورے دین کو بے کم و کاست، جس طرح کہ وہ ہے، قبول کرنا ہے۔ اِس کے سوا ہر رویہ منافقت کا رویہ ہے اور منافقت اور کفر میں اللہ کے نزدیک کوئی فرق نہیں ہے۔

[۲۱۱] یعنی مجرد یہی نہیں کہ تمھیں حق و انصاف پر قائم رہنا ہے، بلکہ دوسروں کے سامنے اُس کی گواہی بھی دینی ہے۔

[۲۱۲] یعنی اُس سے گریز و فرار کی کوئی راہ تلاش کرنے کی کوشش کرو گے۔

اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ
وَالْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ
وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ
يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾ؕ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ

کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے خوب واقف ہے۔ ایمان والو، اللہ پر ایمان لاؤ[۲۱۳] اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اُس کتاب پر جو اُس نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور اُس کتاب پر بھی جو وہ اِس سے پہلے نازل کر چکا ہے[۲۱۴] اور (جان رکھو کہ) جو اللہ اور اُس کے فرشتوں اور اُس کی کتابوں اور اُس کے رسولوں اور قیامت کے دن (اُس کے حضور میں پیشی) کے منکر ہوں، وہ بہت دور کی گم راہی میں جا پڑے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر اِسی کفر میں بڑھتے چلے گئے[۲۱۵]، تو اللہ نہ اُن

---

[۲۱۳] اصل الفاظ ہیں: 'یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا، اٰمِنُوْا'۔ اِن میں پہلا فعل اپنے ابتدائی اور دوسرا کامل معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی ایمان کا دعویٰ کرنے والو، اللہ پر ایمان لاؤ، جس طرح کہ ایمان لانے کا حق ہے۔

[۲۱۴] اِس آیت میں تورات کے لیے 'اَنْزَلَ' اور قرآن کے لیے 'نَزَّلَ' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اِس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''... جو لوگ عربی زبان کی باریکیوں سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ 'اَنْزَلَ' کا مفہوم تو مجرد اتار دینا ہے، لیکن 'نَزَّلَ' کے اندر اہتمام اور تدریج کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ لفظوں کا یہ فرق تورات اور قرآن، دونوں کے اُتارے جانے کی نوعیت کو واضح کر رہا ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/۴۰۸)

[۲۱۵] یہ بیان واقعہ ہے۔ اِس کی صورت یہ تھی کہ یہ لوگ آگے بڑھ کر ایمان کا اقرار کرتے اور

بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا (۱۳۸) الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ
مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ
الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ (۱۳۹)

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ
بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ
غَيْرِهٖۤ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ
فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَا (۱۴۰) الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ

کی مغفرت کرنے والا ہے اور نہ اُنھیں کبھی راہ دکھائے گا۔ اِن منافقوں کو خوش خبری دو، (اے پیغمبر)، جو ایمان والوں کو چھوڑ کر تمھارے منکرین کو اپنا دوست بنائے ہوئے ہیں کہ اِن کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ یہ اُن کے ہاں عزت چاہتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ عزت تو تمام تر اللہ ہی کے لیے ہے۔ ۱۳۵-۱۳۹

وہ اِسی کتاب میں تم پر یہ ہدایت نازل کر چکا ہے کہ جہاں تم سنو کہ آیاتِ الٰہی کا انکار کیا جا رہا ہے اور اُن کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، وہاں اُن (مذاق اڑانے والوں) کے ساتھ نہ بیٹھو، جب تک وہ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں، ورنہ تم بھی اُنھی کی طرح ہو جاؤ گے۔[۲۱۶] اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ اِس طرح کے سب منافقوں اور منکروں کو جہنم میں ایک ہی

اِس کے بعد قرآن، اسلام اور پیغمبر کے خلاف سازشوں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ اِن کے اِسی رویے کو یہاں کفر سے تعبیر کیا ہے۔

[۲۱۶] یہ سورۂ انعام (۶) کی آیت ۶۸ کا حوالہ ہے جس میں ہدایت کی گئی ہے کہ جب لوگ اللہ کی آیتوں میں کج بحثیاں کر رہے ہوں تو اُن ظالموں کے پاس نہ بیٹھو، یہاں تک کہ وہ کسی اور بات

فَتۡحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوۡۤا اَلَمۡ نَكُنۡ مَّعَكُمۡ ۖ وَاِنۡ كَانَ لِلۡكٰفِرِيۡنَ
نَصِيۡبٌ ۙ قَالُوۡۤا اَلَمۡ نَسۡتَحۡوِذۡ عَلَيۡكُمۡ وَنَمۡنَعۡكُمۡ مِّنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ؕ
فَاللّٰهُ يَحۡكُمُ بَيۡنَكُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ وَلَنۡ يَّجۡعَلَ اللّٰهُ لِلۡكٰفِرِيۡنَ
عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ سَبِيۡلًا ﴿۱۴۱﴾

جگہ جمع کر دے گا، اِن کو جو تمھارے لیے گردشوں کے منتظر ہیں[۲۱۷]۔ چنانچہ اللہ کی طرف سے تمھاری کوئی فتح ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے؟ اور اگر تمھارے منکروں کی جیت ہو جائے تو کہتے ہیں کہ کیا ہم تمھیں گھیرے میں لیے ہوئے نہیں رہے اور ہم نے مسلمانوں سے تم کو بچایا نہیں ہے؟ سو تمھارے درمیان اب اللہ ہی قیامت کے دن فیصلہ کرے گا اور اللہ (کا فیصلہ ہے کہ وہ) اِن منکروں کو ایمان والوں کے خلاف ہرگز کوئی راہ نہ دے گا[۲۱۸]۔ ۱۴۰-۱۴۱

میں لگ جائیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”جن مجلسوں میں اللہ کے دین اور اُس کی شریعت کا تمسخر ہو، اُن میں اگر کوئی مسلمان شریک ہو تو یہ اُس کی بے حمیتی اور بے غیرتی کی دلیل ہے۔ اگر کوئی شخص اِن میں شرکت کو اپنے لیے وجہ عزت و شرف سمجھے تو یہ صرف بے حمیتی کی ہی نہیں، بلکہ اُس کے مسلوب الایمان ہونے کی بھی دلیل ہے۔ اِس قسم کے منافقوں کا حشر اُنھی لوگوں کے ساتھ ہو گا جن کے ساتھ خدا کے دین کے استہزا میں یہ شریک رہے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۴۱۰)

[۲۱۷] اصل میں ’یَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ عربی زبان کا محاورہ ہے، یعنی ’یَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمُ الدَّوَائِرَ‘۔

[۲۱۸] یعنی اُس دن تمھارے مقابل میں اِن کی کوئی پیش نہ جائے گی اور جس طرح یہ لوگ یہاں ’اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ‘ (کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے) کہنے کی جسارت کرتے ہیں، وہاں اِس کا

إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَإِذَا قَامُوْٓا
إِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ
اللّٰهَ إِلَّا قَلِيْلًا (۱۴۲) ۙ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ
وَلَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۗ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا (۱۴۳)

یہ منافق خدا سے دھوکا کرنا چاہتے ہیں، دراں حالیکہ اُسی نے اِنھیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ (تم اِنھیں دیکھتے ہو)، یہ جب نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو جی ہارے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کے لیے اُٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔ درمیان ہی میں لٹک رہے ہیں، نہ اِدھر ہیں نہ اُدھر ہیں۔[۲۱۹] (اِن کے جرائم کی پاداش میں اللہ نے اِنھیں گم راہی میں ڈال دیا ہے) اور جسے اللہ گم راہ کر دے، اُس کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔ ۱۴۲-۱۴۳

تصور بھی نہ کرسکیں گے۔

[۲۱۹] یعنی نہ مسلمانوں کے ساتھ ہیں نہ اُن منکروں کے ساتھ جن کی وکالت کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے پاس ہوتے ہیں تو اُنھیں اطمینان دلاتے ہیں کہ اُن کے ساتھ ہیں اور منکروں سے ملتے ہیں تو اُنھیں یقین دلاتے ہیں کہ اُن کے ساتھ ہیں، حالاں کہ دل سے کسی کے ساتھ بھی نہیں ہیں۔ قرآن نے اِن کے لیے 'کُسَالٰی'، 'یُرَآءُ وْنَ' اور 'مُذَبْذَبِیْنَ' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہ تینوں حال واقع ہوئے ہیں۔ اِن کی حالت کا پورا نقشہ، اگر غور کیجیے تو اِن سے آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''مطلب یہ ہے کہ یہ منافقین صرف اللہ کے بندوں ہی کو دھوکا نہیں دے رہے ہیں، بلکہ خدا کو بھی دھوکا دینا چاہتے ہیں، حالاں کہ جو خدا کو دھوکا دینا چاہتا ہے، وہ خدا کو دھوکا نہیں دیتا، بلکہ خود اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے، اِس لیے کہ خدا اُس کی رسی دراز کر دیتا ہے جس سے وہ سمجھتا ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ
الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾
اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ
نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا
دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ

ایمان والو، (اِن کی باتوں میں آکر) تم مسلمانوں کو چھوڑ کر (پیغمبر کے) منکروں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجت دے دو۔ (تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) یہ منافق دوزخ کے سب سے نیچے طبقے میں ہوں گے اور تم اِن کے لیے کوئی مددگار نہ پاؤ گے۔ ہاں، جو توبہ کریں گے اور (اپنے طرزِ عمل کی) اصلاح کر لیں گے اور اللہ کو مضبوط پکڑیں گے اور اپنی اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر لیں گے،[۲۲۰] وہی

کہ اُس نے خدا کو دھوکا دے دیا ہے، حالاں کہ دھوکا اُس نے خدا سے کھایا۔ ’وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ‘، یہ اِن کی اِس دھوکا بازی کی مثال ہے، یعنی نماز کے لیے اُٹھتے ہیں تو طبیعت پر جبر کر کے، الکسائے ہوئے، مارے باندھے محض اِس ڈر سے اُٹھتے ہیں کہ اگر شریک جماعت نہ ہوئے تو مسلمانوں کے رجسٹر سے نام ہی خارج ہو جائے گا۔ یہ محض دکھاوے کی نماز ہوتی ہے کہ مسلمان اِن کو اپنے اندر شامل سمجھیں، اِس وجہ سے اِس میں اللہ کا ذکر اتنا ہی ہوتا ہے، جتنا مجبوری اور دکھاوے کی نماز میں ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اللہ کے ساتھ صریح دھوکا بازی ہے۔ فرمایا: یہ خدا کے راندے ہوئے ہیں، اُس نے اِن کو بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہے اور جن کو خدا نے بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہو، اب اُن کو راہ پر کون لا سکتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۲/۴۱۱)

[۲۲۰] اصل میں ’اَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ’دِيْن‘ کا لفظ اطاعت کے معنی میں ہے۔ سورۂ زمر (۳۹) کی آیت ۱۱ میں بھی یہ اِسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿١٤٦﴾

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ
اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿١٤٧﴾

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ
اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿١٤٨﴾ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ

مومنوں کے ساتھ ہوں گے اور اللہ مومنوں کو عنقریب اجر عظیم عطا فرمائے گا۔ ۱۴۴-۱۴۶

(خدا کے بندو)، اگر تم شکر گزاری اختیار کرو اور سچے مومن بن کر رہو[۲۲۱] تو اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمھیں عذاب دے۔ اللہ تو بڑا قبول کرنے والا اور (ہر چیز کا) جاننے والا ہے۔[۲۲۲] ۱۴۷

(ایمان والو، یہ منافق تم پر زیادتی کریں اور تم جواب دینا چاہو تو دے سکتے ہو، اِس لیے کہ) اللہ مظلوم کے سوا کسی کا بُری بات کہنا پسند نہیں کرتا اور اللہ سمیع و علیم ہے۔[۲۲۳] (لیکن اِس کے بجائے) اگر ظاہر و باطن میں نیکی ہی کیے جاؤ گے یا (کم سے کم) برائی

---

[۲۲۱] اِس آیت میں، اگر غور کیجیے تو شکر ایمان پر مقدم ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ فلسفۂ دین کے لحاظ سے شکر ہی سچے ایمان کا سرچشمہ ہے۔

[۲۲۲] اِس لیے اگر صحیح رویہ اختیار کرو گے تو وہ اُس کی قدر کرے گا اور تمھاری توقعات سے بڑھ کر اُس کا صلہ دے گا۔ وہ ہر شخص کے ایمان و عمل سے واقف ہے، لہٰذا تمھارا یہ رویہ بھی اُس سے چھپا نہ رہے گا۔

[۲۲۳] مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کہو گے یا کرو گے، اُس کے بارے میں متنبہ رہو، اِس لیے کہ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا (۱۴۹)
اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا
بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ
وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ (۱۵۰) اُولٰٓئِكَ هُمُ
الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا (۱۵۱) وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ
يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۱۵۲)
يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ

سے درگذر کرو گے تو یہی بہتر ہے، اِس لیے کہ اللہ (کی صفت بھی یہی ہے کہ وہ) معاف کرنے والا ہے، (اِس کے باوجود کہ) بڑی قدرت رکھنے والا ہے۔ ۱۴۸-۱۴۹

(یہ حقیقت، البتہ واضح رہنی چاہیے کہ) جو لوگ اللہ اور اُس کے رسولوں کے منکر ہو رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اُس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہیں مانیں گے اور چاہتے ہیں کہ ایمان اور کفر کے بیچ میں کوئی راہ نکالیں، وہی پکے منکر ہیں اور ہم نے اِن منکروں کے لیے رسوا کر دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اِس کے برخلاف جو اللہ اور اُس کے رسولوں کو مان رہے ہیں اور اُن میں سے کسی کے درمیان اُنھوں نے کوئی تفریق نہیں کی ہے، وہی ہیں جن کو اللہ ضرور اُن کا اجر عطا فرمائے گا اور اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۱۵۰-۱۵۲

۳- یہ[۲۲۴] اہل کتاب تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ (اِس قرآن کے بجاے) اِن پر

---

[۲۲۴] پہلا سوال عام مسلمانوں کی طرف سے تھا اور دوسرا منافقین کی طرف سے۔ اب یہ تیسرا

فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً
فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ

براہ راست آسمان سے ایک کتاب اتار لاؤ۔ سو اِس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے، اِنھوں نے موسیٰ سے اِس سے بھی بڑا مطالبہ کیا تھا۔ اِنھوں نے مطالبہ کیا تھا کہ ہمیں خدا کو سامنے دکھاؤ تو اِن کی اِس سرکشی کے باعث اِن کو کڑک نے آلیا تھا۔[۲۲۵] پھر اِنھوں نے بچھڑے کو

سوال ہے جو اِس سورہ کی دعوت کے جواب میں اہل کتاب کے اِس مطالبے کی صورت میں سامنے آیا ہے کہ اُنھیں قرآن نہیں، بلکہ ایک ایسی کتاب چاہیے جو آسمان سے براہ راست نازل کی جائے۔ وہ اِس کے بعد ہی ایمان لانے کے لیے تیار ہوں گے۔ اِس کا جواب اِس قدر سخت اور شدید تنبیہ کے ساتھ دیا گیا ہے کہ استاذ امام کے الفاظ میں لفظ لفظ سے جوش غضب ابلا پڑ رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”... پوری تقریر ازابتدا تا انتہا صرف فرد قرارداد جرائم پر مشتمل ہے اور کلام کے جوش اور روانی کا یہ عالم ہے کہ بات شروع ہونے کے بعد یہ متعین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ختم کہاں ہوئی۔ اِس قسم کے پر جوش اور پر غضب کلام میں عموماً خبر حذف ہو جاتی ہے، گویا متکلم کا جوش ہی خبر کا قائم مقام بن جاتا ہے اور مبتدا ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ متکلم کیا کہنا چاہتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۴۱۵)

[۲۲۵] اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی خواہش اگر شرح صدر اور اطمینان قلب کے لیے ہو تو کوئی قابل ملامت چیز نہیں ہے، لیکن بنی اسرائیل کا یہ مطالبہ محض اُن کی بے یقینی اور تشکیک کا مظاہرہ اور انکار و تکذیب کا بہانہ تھا۔ اُنھیں کسی طرح اِس بات کا یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرماتے ہیں، لہٰذا اُن پر عتاب ہوا۔ اِس کے لیے اصل میں ’فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ‘ کے جو الفاظ آئے ہیں، اُن کا مدعا یہ ہے کہ یہ اللہ نے اُن پر کوئی زیادتی نہیں کی، بلکہ اُنھوں نے خود اپنے اوپر زیادتی کی ہے۔ وہ ایک ایسے تجربے کے لیے بہ ضد ہوئے جس کی تاب وہ کسی طرح نہیں لا سکتے تھے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود ہی اُس کی زد میں آ گئے۔

مَاجَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا

معبود بنا لیا، اِس کے بعد کہ اِن کے پاس کھلی کھلی نشانیاں آچکی تھیں۔ اِس پر بھی ہم نے اِس سے درگذر کیا اور موسیٰ کو (اِن پر) صریح غلبہ عطا فرمایا تھا[۲۲۶]۔ اور ہم نے طور کو اِن پر اٹھا لیا تھا، اِن سے عہد کے ساتھ[۲۲۷] اور اِن کو حکم دیا تھا کہ (شہر کے) دروازے

---

۲۲۶ اِس کی صورت یہ ہوئی کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے حکم سے بنی اسرائیل کی جماعت کو مجرموں سے پاک کر دیا گیا اور کسی کو اُن کے سامنے چون و چرا کی جرأت نہیں ہوئی۔ بائیبل کی کتاب خروج میں یہ واقعہ اِس طرح بیان ہوا ہے:

> ”...موسیٰ نے لشکر گاہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا جو جو خداوند کی طرف ہے (یعنی اپنے ایمان پر قائم ہے)، وہ میرے پاس آجائے۔ تب سب بنی لاوی اُس کے پاس جمع ہو گئے اور اُس نے اُن سے کہا کہ خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی اپنی ران سے تلوار لٹکا کر پھاٹک پھاٹک گھوم گھوم کر سارے لشکر گاہ میں اپنے اپنے بھائیوں اور اپنے اپنے ساتھیوں اور اپنے اپنے پڑوسیوں کو قتل کرتے پھرو۔ اور بنی لاوی نے موسیٰ کے کہنے کے موافق عمل کیا۔ چنانچہ اُس دن لوگوں میں سے قریباً تین ہزار مرد کھیت آئے اور موسیٰ نے کہا کہ آج خداوند کے لیے اپنے آپ کو مخصوص کرو، (یعنی اپنے ایمان کی تجدید کرو)، بلکہ ہر شخص اپنے ہی بیٹے اور اپنے ہی بھائی کے خلاف ہو تا کہ وہ تم کو آج ہی برکت دے۔“ (۳۲:۲۶-۲۹)

۲۲۷ قرآن اور بائیبل، دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل سے یہ عہد پہاڑ کے دامن میں اِس طرح لیا گیا کہ طور اپنی جگہ سے اکھڑ کر سائبان کی طرح اُن کے سروں پر لٹک رہا تھا اور اُنھیں لگتا تھا کہ وہ اُن پر گر کر رہے گا۔ قرآن نے یہاں اِس حالت کو پہاڑ کے اُن پر اٹھا لینے سے تعبیر کیا ہے۔ اِس کے لیے اصل میں ’وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ’ب‘ ملابست کے لیے ہے۔ اِس سے جس حقیقت کو مصور کر کے پیش کرنا مقصود ہے، وہ استاذ

لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۱۵۴﴾

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا

میں سر جھکائے ہوئے داخل ہوں[۲۲۸] اور اِن سے کہا تھا کہ سبت کے معاملے میں نافرمانی نہ کرنا اور[۲۲۹] (اِن سب چیزوں پر) ہم نے اِن سے پختہ عہد لیا تھا۔ ۱۵۳-۱۵۴

پھر اِن کے اپنا عہد توڑ دینے کی وجہ سے (ہم نے اِن پر لعنت کر دی)، اور اِس وجہ سے کہ اِنھوں نے اللہ کی آیتوں کو نہیں مانا اور اِن کے نبیوں کو ناحق قتل کر دینے کی وجہ سے اور اِس وجہ سے کہ اِنھوں نے کہا کہ ہمارے دلوں پر تو غلاف ہیں ـــــ نہیں،

امام کے الفاظ میں یہ ہے کہ خدا نے اُن کے اوپر طور کو بھی اٹھایا اور اُس کے ساتھ معاہدے کو بھی کہ یہ معاہدہ ہے اور یہ پہاڑ، اگر اِس معاہدے کی بے حرمتی ہوئی تو اِسی پتھر سے تمھارا سر کچل دیا جائے گا۔

[۲۲۸] یہ سرزمین فلسطین ہی کا کوئی شہر تھا جس کی فتح کے بعد اُنھیں عجز اور فروتنی کے ساتھ اُس میں داخل ہونے کی ہدایت کی گئی۔

[۲۲۹] یہ اصلاً جمعہ کا دن تھا جسے بنی اسرائیل نے اُس کے اگلے دن سے بدل ڈالا۔ اُن کے ہاں یہ دن پشت در پشت تک دائمی عہد کے نشان کے طور پر خدا کی عبادت کے لیے خاص تھا اور اِس میں اُن کے لیے کام کاج، سیر و شکار، حتیٰ کہ گھروں میں آگ جلانا اور لونڈی غلاموں سے کوئی خدمت لینا بھی ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ اُن کی ایک بستی کے لوگوں نے اِس دن کی پابندیوں سے اپنے آپ کو آزاد کرنے کے لیے جو شرعی حیلے ایجاد کیے اور اِس طرح اللہ کی شریعت کا مذاق اڑایا، یہ اُسی کا ذکر ہے۔

بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵۵﴾ وَّ بِكُفْرِهِمْ وَ قَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿۱۵۶﴾ وَّ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ

بلکہ اِن کے کفر کی پاداش میں اللہ نے اِن کے دلوں پر مہر کر دی ہے، اِس لیے (اب) یہ کم ہی ایمان لائیں گے — اور اِن کے کفر کی وجہ سے[۲۳۰] اور مریم پر بہتان عظیم لگانے کی وجہ سے[۲۳۱] اور اِن کے اِس دعوے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم، رسول اللہ[۲۳۲] کو قتل کر دیا ہے — دراں حالیکہ اِنھوں نے نہ اُس کو قتل کیا اور نہ اُسے صلیب دی،[۲۳۳] بلکہ

---

[۲۳۰] اِس کا عطف اوپر کے سلسلۂ کلام پر ہے۔ اِس سے پہلے ایک جملۂ معترضہ ہے جس کے بعد اہل کتاب کے جرائم کا بیان ایک مرتبہ پھر شروع ہو گیا ہے۔

[۲۳۱] یہود نے یہ الزام سیدنا مسیح علیہ السلام کے بعد اُن کی ماں پر لگایا۔ اُن کے سامنے وہ اِس کی جرأت کبھی نہیں کر سکے۔

[۲۳۲] 'رَسُوْلَ اللّٰهِ' کا لفظ اِس آیت میں ہمارے نزدیک یہود کے قول کا جز نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تضمین ہے جس سے اُن کے جرم کی سنگینی کو واضح کرنا مقصود ہے۔

[۲۳۳] یہ پھر ایک جملۂ معترضہ ہے جس میں یہود کی طرف سے مسیح علیہ السلام کے دعویٰ قتل کی فوری تردید کی گئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... اِس فوری تردید سے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ کے رسول اُس کی حفاظت میں ہوتے ہیں، اُن کے خلاف اُن کے دشمنوں کی چالیں خدا کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ اِس وجہ سے یہود کا یہ دعویٰ کہ اُنھوں نے اُن کو قتل کیا یا سولی دی، بالکل بے بنیاد ہے۔ وہ اپنی اِس شرارت میں بالکل ناکام رہے۔ البتہ ایک جھوٹے دعوے کا بار اپنے سر لے کر ہمیشہ کے لیے مبغوض و ملعون بن گئے۔ دوسرا یہ کہ نہ کہیں مسیح کے قتل کا واقعہ پیش آیا نہ سولی کا،

لَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۙ ﴿۱۵۷﴾ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ

معاملہ اِن کے لیے مشتبہ بنا دیا گیا۔[۲۳۴] اِس میں جو لوگ اختلاف کر رہے ہیں،[۲۳۵] وہ اِس معاملے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں، اُن کو اِس کے متعلق کوئی علم نہیں، وہ صرف گمانوں کے پیچھے چل رہے ہیں۔ اِنھوں نے ہرگز اُس کو قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ ہی نے اُسے اپنی

> لیکن پال (Paul) کے متبع نصاریٰ نے اِس فرضی افسانے کو لے کر اِس پر ایک پوری دیو مالا (mythology) تصنیف کر ڈالی اور اِس طرح پرائے شگون پر خود اپنی ناک کٹوا بیٹھے۔“
>
> (تدبر قرآن ۲/ ۴۲۰)

۲۳۴؎ یعنی صورت حال ایسی بنا دی گئی کہ یہود یہی سمجھے کہ اُنھوں نے مسیح علیہ السلام کو سولی دلوا دی ہے۔ اِس کی صورت کیا ہوئی؟ اِس معاملے میں سب سے زیادہ قرین قیاس بیان انجیل برنباس کا ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب یہوداہ اسکریوتی یہودیوں کے سردار کاہن سے رشوت لے کر مسیح علیہ السلام کو گرفتار کرانے کے لیے سپاہیوں کو لے کر آیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے چار فرشتے آں جناب کو اٹھا کر لے گئے اور یہوداہ اسکریوتی کی صورت اور آواز بالکل وہی کر دی گئی جو سیدنا مسیح کی تھی۔ سولی اُسے ہی دی گئی۔ مسیح علیہ السلام کو ہاتھ لگانا بھی کسی کے لیے ممکن نہیں ہوا۔ قرآن نے غالباً اِسی کو یہاں 'معاملہ اُن کے لیے مشتبہ بنا دیا گیا' سے تعبیر کیا ہے۔

۲۳۵؎ اصل میں 'اِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن سے مراد نصاریٰ ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی اِن کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> ”... چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ نصاریٰ میں نفس واقعہ سے متعلق بھی ... بڑا اختلاف ہے اور اِس پر جو دیو مالا (mythology) اُنھوں نے تصنیف کی ہے، اُس میں بھی بڑے اختلافات ہیں اور یہ اختلاف قدرتی نتیجہ ہے اِس بات کا کہ اُنھوں نے اپنے سارے علم کلام کی بنیاد حقیقت کے بجائے محض ظن پر رکھی اور اِس طرح جس سولی سے اللہ تعالیٰ نے سیدنا مسیح کو محفوظ رکھا، نصاریٰ

وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۵۸﴾
وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿۱۵۹﴾ ۚ

طرف اٹھا لیا تھا[۲۳۶] اور اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔ ۱۵۵-۱۵۸

(یہ اِن کے جرائم ہیں، اِس لیے اب قرآن کے سوا یہ براہ راست آسمان سے اتری ہوئی کسی کتاب کا مطالبہ کر رہے ہیں تو اِن کی پروا نہ کرو، اے پیغمبر)، اِن اہل کتاب میں سے ہر ایک اپنی موت سے پہلے لازماً اِسی (قرآن) پر یقین کر لے گا[۲۳۷] اور قیامت کے

نے اُس پر خود چڑھ کر خودکشی کر لی۔'' (تدبر قرآن ۴۲۱/۲)

[۲۳۶] اصل الفاظ ہیں: 'بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ'۔ اِس رفع کی وضاحت قرآن نے سورۂ آل عمران (۳) کی آیت ۵۵ میں اِس طرح فرمائی ہے کہ وفات کے بعد اللہ تعالیٰ اُنھیں اپنی طرف اٹھا لیں گے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ روح قبض کر کے اُن کا جسم بھی اٹھا لیا جائے گا تاکہ اُن کے دشمن اُس کی توہین نہ کر سکیں۔ مسیح علیہ السلام اللہ کے رسول تھے اور رسولوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ قانون قرآن میں بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی حفاظت کرتا ہے اور جب تک اُن کا مشن پورا نہ ہو جائے، اُن کے دشمن ہرگز اُن کو کوئی نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ اِسی طرح اُن کی توہین و تذلیل بھی اللہ تعالیٰ گوارا نہیں کرتا اور جو لوگ اِس کے درپے ہوں، اُنھیں ایک خاص حد تک مہلت دینے کے بعد اپنے رسولوں کو لازماً اُن کی دست درازی سے محفوظ کر دیتا ہے۔

[۲۳۷] اصل الفاظ ہیں: 'لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ'۔ اِن میں لام تاکید اور قسم کا ہے اور ایمان کا لفظ یقین کرنے کے معنی میں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''... دین میں معتبر ایمان صرف وہ ہے جو یقین، تصدیق اور اقرار، تینوں اجزا پر مشتمل ہو۔ اِس کے علاوہ ایک وہ ایمان ہے جس کے اندر یقین اور تصدیق کے اجزا تو نہیں پائے جاتے،

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۙ﴿۱۶۰﴾ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ

دن یہ اِن پر گواہی دے گا۔[۲۳۸] ۱۵۹

پھر اِن یہودیوں کے ظلم ہی کی وجہ سے ہم نے ایسی پاکیزہ چیزیں بھی اِن پر حرام کر دی تھیں جو اِن کے لیے حلال تھیں[۲۳۹] اور اِس وجہ سے کہ یہ اللہ کی راہ سے بہت روکتے رہے ہیں اور اِس وجہ سے کہ سود لیتے رہے ہیں، دراں حالیکہ اِنھیں اِس سے روکا گیا

> لیکن اظہار واقرار کا جزو پایا جاتا ہے، یہ منافقین کا ایمان ہے۔ اِسی طرح ایک وہ ایمان بھی ہے جس کے اندر یقین تو پایا جاتا ہے، لیکن اِس کے اندر تصدیق اور اقرار کے اجزا مفقود ہوتے ہیں، یہ متکبرین اور متمردین کا ایمان ہے۔ اِن پر حق کا حق ہونا تو بالکل واضح ہو جاتا ہے، لیکن وہ اپنی رعونت اور شرارت کی وجہ سے اُس کی تصدیق واقرار سے گریز کرتے ہیں اور اپنی اِس شرارت کو مختلف بہانوں کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۴۲۲)

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہ تہدید اور وعید کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِس وقت جو باتیں اِنھیں دلیل سے سمجھائی جا رہی ہیں، وہی آنے والے دنوں میں واقعہ بن جائیں گی۔ اِنھیں سوچنا چاہیے کہ اُس وقت یہ کیا کریں گے۔ ماننے کے سوا اُس وقت اِن کے لیے کوئی چارہ نہ ہوگا۔

[۲۳۸] یہ جملہ بھی اُسی تہدید و وعید کا حامل ہے جس کا حامل پہلا جملہ ہے۔

[۲۳۹] سورۂ انعام (۶) کی آیت ۱۴۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن پر وہ تمام جانور حرام کر دیے گئے تھے جن کے ناخن ہوتے ہیں۔ اِسی طرح گاے اور بکری کی چربی بھی اُن پر حرام تھی۔ اِس کے لیے یہاں 'فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں لفظ 'ظُلْم' کی تقدیم سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ یہود پر یہ چیزیں خود اُنھی کے اپنی جانوں پر ظلم

مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿١٦١﴾ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ
وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ

تھا[۲۴۰] اور اِس وجہ سے کہ یہ لوگوں کا مال باطل طریقوں سے کھاتے رہے ہیں[۲۴۱]، اور یہ اِنھی کے منکرین ہیں جن کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے[۲۴۲]۔ اِن میں سے،

ڈھانے کی وجہ سے حرام کی گئیں، اللہ نے اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا۔

[۲۴۰] سود کی حرمت کا یہ حکم خروج باب ۲۲ کی آیات ۲۵ - ۲۷ اور احبار باب ۲۵ کی آیات ۳۵ - ۳۸ میں پوری صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

[۲۴۱] اِس سے مراد وہ طریقے ہیں جو عدل و انصاف، معروف، دیانت اور سچائی کے خلاف ہوں اور جن میں لین دین اور معاملت کی بنیاد فریقین کی حقیقی رضامندی پر نہ ہو، بلکہ ایک کا مفاد ہر حال میں محفوظ رہے اور دوسرے کی بے بسی اور مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اُسے ضرر یا غرر کا ہدف بنایا جائے۔

[۲۴۲] یہ سب باتیں بھی جرائم کی اُسی فہرست سے متعلق ہیں جو اوپر گزر چکی ہے۔ اِس پورے سلسلۂ بیان میں بلاغت کا جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے، وہ قابل توجہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... بنی اسرائیل کے جرائم کی ایک طویل فہرست تو سنا دی گئی ہے، لیکن الفاظ میں یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ اِس فہرست کے سنانے سے مدعا کیا ہے۔ جرائم کی فہرست کے بیچ میں ایک جملۂ معترضہ آ گیا ہے اور اِس کے ختم ہوتے ہی پھر اِن کے جرائم کے بیان کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ اِس کے بعد اقتضائے کلام سے ایک اور طویل جملۂ معترضہ آ گیا ہے اور اُس کے بند ہوتے ہی پھر فہرست جرائم شروع ہو گئی۔ یہ اسلوب بیان... متکلم کے زور بیان اور جوش، سامع کی ذہانت اور ہوش، دعوے کی قوت اور وضاحت اور فیصلے کے مستغنی عن البیان ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ خطبائے عرب کے خطبات میں اِس کی نہایت عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ قرآن میں بھی آگے اِس کی نہایت بلیغ مثالیں آئیں گی۔ اِس طرح کے پرزور کلام کو ایک صاحب ذوق سامع سمجھ تو سکتا ہے، لیکن اِس کے زور اور اِس کی بلاغت کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۴۱۹)

وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ط اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿١٦٢﴾

البتہ جو علم میں پختہ ہیں[۲۴۳] اور جو ایمان والے ہیں[۲۴۴]، وہ اُس چیز کو مانتے ہیں جو تمھاری طرف اتاری گئی اور جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے اور خاص کر نماز کا اہتمام کرنے والے ہیں،[۲۴۵] اور زکوٰۃ دینے والے اور اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں ہم عنقریب اجر عظیم عطا فرمائیں گے۔ ۱۶۰-۱۶۲

---

[۲۴۳] اِس سے مراد یہود کے وہ علما ہیں جو دین کے علم میں راسخ، عقیدہ و عمل میں پختہ اور اخلاق و کردار میں ہر پہلو سے جادۂ مستقیم پر استوار تھے۔

[۲۴۴] یعنی وہ عام لوگ جو علما تو نہیں ہیں، مگر اپنی سلامتیِ طبع اور پاکیزگیِ سیرت و کردار کے باعث اپنے علم کی حد تک تورات کی ہدایت پر قائم اور اِس لحاظ سے گویا سچے اہل ایمان ہیں۔ اہل کتاب کے اِس گروہ کا ذکر اِس سے پہلے آل عمران (۳) کی آیت ۱۱۳ کے تحت بھی گزر چکا ہے۔

[۲۴۵] اصل الفاظ ہیں: 'وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ'۔ اِن میں 'الْمُقِيْمِيْنَ' کا عطف اگرچہ 'الْمُؤْمِنُوْنَ' پر ہے، لیکن یہ عربیت کے اُس قاعدے کے مطابق منصوب ہو گیا ہے جس کو 'علی سبیل الاختصاص' یا 'علی سبیل المدح' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی بلاغت واضح فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "...اسلوب کی اِس تبدیلی کا لفظی اثر تو سامع پر یہ پڑتا ہے کہ یہ تنوع اُس کو لفظ پر متوجہ کر دیتا ہے اور معنوی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ محض اسلوب کی تبدیلی سے، بغیر ایک حرف کے اضافے کے، اُس کے اندر اختصاص اور مدح و تعریف کا مضمون پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً، یہی لفظ اپنے عام اسلوب کے مطابق 'والمقیمون الصلوة' ہوتا تو اِس کے معنی صرف یہ ہوتے کہ 'اور نماز کے قائم کرنے والے'، لیکن جب اسلوب بدل کر 'الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ' کہہ دیا تو اِس کے معنی یہ ہو گئے

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ
مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلٰٓى إِبْرٰهِيْمَ وَإِسْمٰعِيْلَ وَإِسْحٰقَ
وَيَعْقُوْبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَأَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ
وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۚ ﴿۱۶۳﴾ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ
عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ؕ وَكَلَّمَ اللّٰهُ

(اِن کی پروا نہ کرو، اے پیغمبر)، ہم نے تمھاری طرف اُسی طرح وحی کی ہے، جس طرح نوح کی طرف اور اُس کے بعد آنے والے پیغمبروں کی طرف کی تھی۔ ہم نے ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب، اولادِ یعقوب، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کی طرف بھی وحی کی اور داؤد کو ہم نے زبور عطا فرمائی تھی۔[۲۴۶] ہم نے اُن رسولوں کی طرف بھی اِسی طرح وحی بھیجی جن کا ذکر تم سے پہلے کر چکے ہیں اور اُن رسولوں کی طرف بھی جن کا ذکر تم سے نہیں کیا[۲۴۷] اور

کہ اور خاص کر نماز کو قائم کرنے والے، جس سے اِن موصوفین کی غیر معمولی تعریف اور اِن کی خصوصیت بھی واضح ہوئی اور نماز کی وہ اہمیت و عظمت بھی جو دین کے نظام میں اُس کو حاصل ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۴۲۵)

۲۴۶ زبور کا لفظ اِس آیت میں نکرہ آیا ہے۔ یہ تفخیم شان کے لیے ہے، جس سے الہامی کتابوں میں زبور کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

۲۴۷ انبیا علیہم السلام کے نام یہاں جس ترتیب سے گنائے گئے ہیں، اُس میں کیا چیز ملحوظ ہے اور اِس تمام حوالے کا مقصود کیا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِن کی ترتیب حضرت نوح سے لے کر حضرت یعقوب اور اُن کی اولاد کے ذکر تک تو تاریخی ہے، لیکن اِس کے بعد ترتیب صفاتی ہو گئی ہے۔ حضرت عیسیٰ، حضرت ایوب، حضرت یونس، حضرت ہارون اپنے خاص نوع کے ابتلا اور خاص نوع کی تائید الٰہی میں فی الجملہ اشتراک

مُوْسٰی تَکْلِیْمًا ﴿۱۶۴﴾ رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ
لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا ﴿۱۶۵﴾

موسیٰ سے تو اللہ نے کلام کیا تھا، جس طرح کلام کیا جاتا ہے۔[۲۴۸] یہ رسول جو بشارت دینے والے اور خبردار کرنے والے بنا کر بھیجے گئے تا کہ لوگوں کے لیے اِن رسولوں کے بعد اللہ کے سامنے کوئی عذر پیش کرنے کے لیے باقی نہ رہے۔[۲۴۹] اللہ زبردست ہے، وہ بڑی

رکھتے ہیں۔ حضرت سلیمان اور حضرت داوٗد، دونوں نبی بھی ہیں اور دونوں بادشاہ بھی۔ حضرت داوٗد علیہ السلام کا ذکر حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد لانے کی وجہ خاص اہتمام کے ساتھ زبور کی طرف توجہ دلانا ہے۔ سب سے آخر میں حضرت موسیٰ کا ذکر ہے، اِس لیے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ مماثل نبی ہیں۔ اِس بات کا ذکر قرآن اور احادیث، دونوں میں ہے۔

...اِس تمام حوالے سے قرآن کا مقصود یہ ہے کہ یہ انبیا ہیں جن کے نام اور کام تورات کے صحیفوں میں بھی بیان ہوئے ہیں اور یہ طریقہ رہا ہے جس طریقے پر اللہ نے اِن نبیوں کو اپنی وحی اور اپنے خطاب و کلام سے نوازا ہے۔ اِن سب سے اہل کتاب واقف ہیں، بھلا ہے اِس میں کہیں ذکر اِس بات کا کہ اللہ نے کسی نبی پر اِس طرح کتاب اتاری ہو کہ اُس کو اترتے سب نے دیکھا ہو؟ موسیٰ سے بے شک اللہ تعالیٰ نے کلام کیا، جس طرح کلام کیا جاتا ہے، لیکن اِن یہود کا اطمینان اِس سے بھی نہ ہوا۔ اُنھوں نے اِس پر بھی یہ شبہ وارد کر دیا کہ جب تک خدا ہم سے رودررو ہو کر کلام نہ کرے، ہم کس طرح باور کریں کہ وہ تم سے کلام کرتا ہے۔''

(تدبر قرآن ۲/ ۴۳۱)

[۲۴۸] یہ موسیٰ علیہ السلام کا خاص امتیاز ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن سے خطاب و کلام کی شان اُس سے مختلف تھی جو دوسرے انبیا کے ساتھ تھی۔ تاہم یہ خطاب و کلام بھی خدا سے رودررو نہیں، بلکہ 'مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ'، یعنی پردے کی اوٹ ہی سے تھا۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ
يَشْهَدُوْنَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۱۶۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿۱۶۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

حکمت والا ہے۔ ۱۶۳-۱۶۵

(یہ جھٹلاتے ہیں تو جھٹلائیں)، مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ اُس نے جو کچھ تمھاری طرف نازل کیا ہے[۲۵۰]، اُس کو اپنے علم کے ساتھ نازل کیا ہے، اور اُس کے فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور گواہی کے لیے تو اللہ ہی کافی ہے[۲۵۱]۔ جن لوگوں نے ماننے سے انکار کیا ہے اور

---

[۲۴۹] یہ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کی بعثت کا مقصد بھی بتا دیا ہے اور وہ ضرورت بھی جو اِن کے بھیجنے کی داعی ہوئی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے کہ وہ انذار و بشارت کے لیے آتے ہیں تاکہ لوگوں کو غفلت سے بیدار کیا جائے اور اُن کو بھیجنے کی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ علم و عقل کی شہادت کے بعد ایک دوسری شہادت بھی پیش کر دی جائے جو حق کو اِس درجہ واضح کر دے کہ کسی کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے۔

[۲۵۰] اِس جملے کی ابتدا حرف استدراک 'لٰکِن' سے ہوئی ہے۔ یہ استدراک اُس بات پر ہے جو اوپر کی آیتوں سے مفہوم ہوتی ہے۔

[۲۵۱] یعنی اِس بات کی گواہی کے لیے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، اُس نے اِس کو اپنے علم کے ساتھ اتارا ہے۔ لہٰذا یہ ہر لحاظ سے خالص اور بے آمیز ہے، اِس میں نفس اور شیطان کے کسی وسوسے کو کوئی دخل نہیں ہے۔

قرآن نے یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے فرمائی ہے، لیکن یہ وحی کی صداقت کے لیے ایک دلیل بھی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اوپر وحی کی صداقت کی جو دلیل بیان ہوئی ہے، اُس کی نوعیت تاریخی شہادت کی ہے۔

وَظَلَمُوْا لَمْ یَكُنِ اللّٰهُ لِیَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِیَهْدِیَهُمْ طَرِیْقًا ﴿۱۶۸﴾ اِلَّا
طَرِیْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرًا ﴿۱۶۹﴾
یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ

اللہ کی راہ سے روکا ہے، وہ بڑی دور کی گم راہی میں جا پڑے ہیں۔ جن لوگوں نے ماننے سے انکار کیا اور اِس طرح اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، اللہ اُنھیں بخشنے والا نہیں ہے اور نہ اُنھیں جہنم کے سوا کسی راستے کی ہدایت دینے والا ہے۔ یہ اُس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور اللہ کے لیے یہ بہت آسان ہے۔ ۱۶۶-۱۶۹

لوگو، تمھارے پاس یہ رسول تمھارے پروردگار کی طرف سے حق لے کر آ گیا ہے۔[۲۵۲]

یعنی انبیا کی تاریخ اور اُن کی وحی کی کسوٹی پر جانچ کر قرآن اور پیغمبر کا درجہ متعین کیا گیا ہے۔ اب یہ ایک دوسری دلیل بیان ہوئی ہے جس کی نوعیت ایک باطنی دلیل کی ہے۔ اِس کا مدعا یہ ہے کہ پیغمبر اپنے باطن میں خدا اور فرشتوں کی شہادت اِس طرح سنتا، سمجھتا اور پرکھتا ہے کہ اُس کے لیے اپنی وحی کی صداقت پر کسی شبہے کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی۔ اِس طرح کی شہادت کسی غیر نبی کو حاصل نہیں ہوتی۔ اِس وجہ سے کسی غیر نبی کے الہام اور نبی کی وحی میں آسمان و زمین کا فرق ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنی جس کیفیت کو الہام سمجھ رہا ہے، وہ محض ایک وسوسۂ نفسانی یا شیطانی ہو، لیکن پیغمبر پر وحی جس افق سے آتی ہے، جس زور و قوت کے ساتھ آتی ہے اور اللہ اور ملائکہ کی جس تائید و شہادت کے ساتھ آتی ہے، وہ بجائے خود ایک ایسی برہان ہوتی ہے جس کے بعد کسی شبہے کی گنجایش باقی نہیں رہ جاتی۔ وحی کی صداقت کا یہی پہلو ہے جس کی وجہ سے ساری خدائی بھی نبی کی تکذیب کرے، تب بھی اُس کے اعتماد میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ اُس کی بزم و انجمن اُس کے باطن کے اندر ہوتی ہے، جہاں اُس کو خدا اور روح القدس کی معیت حاصل ہوتی ہے۔” (تدبر قرآن ۲/ ۴۳۳)

فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷۰﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ
دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ
مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ

سو (اِس پر) ایمان لاؤ، اِسی میں تمھاری بہتری ہے۔ اور اگر انکار پر جمے رہو گے تو یاد رکھو کہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑو گے، اِس لیے کہ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، سب اللہ ہی کا ہے۔ (وہ ہر ایک کو اُس کے اعمال کی جزا دے گا، مگر اُسی وقت جو اُس نے طے کر رکھا ہے)، اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ اے اہل کتاب، اپنے دین میں غلو[۲۵۳] نہ کرو اور اللہ کے حق میں حق کے سوا کوئی بات نہ کہو۔[۲۵۴] حقیقت یہ ہے کہ مسیح عیسیٰ ابن مریم اللہ کا

---

۲۵۲ آیت میں خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن آگے کے مضمون سے واضح ہے کہ روے سخن اہل کتاب، خاص کر نصاریٰ کی طرف ہے۔

۲۵۳ یہ لفظ جب دین کے تعلق سے آتا ہے تو اِس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ دین میں جس چیز کا جو درجہ و مرتبہ اور جو وزن اور مقام ہے، اُسے بڑھا کر کچھ سے کچھ کر دیا جائے۔ یہاں اِس سے اشارہ اُس غلو کی طرف ہے جس کے سبب سے نصاریٰ نے پورے دین کا حلیہ بگاڑا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بندے اور اُس کے رسول تھے، اُن کو اُنھوں نے خدا کا بیٹا بنایا اور پھر اُن کو لے جا کر خدائی کے عرش پر بٹھا دیا۔ حضرت مریم حضرت عیسیٰ کی والدہ تھیں، اُن کو نعوذ باللہ خدا کی ماں بنایا۔ حضرت جبریل خدا کے بندے اور فرشتے ہیں، اُن کو بھی ایک اقنوم کی حیثیت دے کر خدائی کی تثلیث میں شریک کر دیا۔ سیدنا مسیح نے دنیا اور دنیوی زندگی کے زخارف سے بچتے رہنے کی تاکید فرمائی تو اُنھوں نے رہبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا۔ غرض اِس غلو کے ہاتھوں اُنھوں نے مذہب کی کوئی چیز بھی ایسی نہیں چھوڑی جو اپنی جگہ پر برقرار

فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوۡلُوۡا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنۡتَهُوۡا خَيۡرًا لَّـكُمۡ ؕ
اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبۡحٰنَهٗۤ اَنۡ يَّكُوۡنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَـهٗ
مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيۡلًا ﴿١٧١﴾ لَنۡ
يَّسۡتَنۡكِفَ الۡمَسِيۡحُ اَنۡ يَّكُوۡنَ عَبۡدًا لِّلّٰهِ وَلَا الۡمَلٰٓئِكَةُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ ؕ

ایک رسول اور اُس کا ایک قول ہی تھا جو اُس نے مریم کی طرف القا فرمایا تھا اور اُس کی جانب سے ایک روح تھا (جو اللہ نے اُس میں پھونک دی تھی)[۲۵۵]۔ سو اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور (اللہ کو) تین نہ بناؤ[۲۵۶]۔ باز آ جاؤ، یہی تمھارے حق میں بہتر ہے۔ اللہ ہی تنہا معبود ہے، وہ اِس سے پاک ہے کہ اُس کے اولاد ہو۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، اُسی کا ہے اور اُن کے معاملات کو دیکھنے کے لیے اللہ ہی کافی ہے[۲۵۷]۔ مسیح کو ہرگز اِس بات سے کوئی عار نہ ہوگی کہ وہ اللہ کا ایک بندہ ہو اور نہ اللہ کے مقرب فرشتے اِسے کبھی عار

رہ گئی ہو۔ فرش کی چیز عرش پر پہنچ گئی اور عرش کی چیز فرش پر آ رہی۔'' (تدبر قرآن ۲/۴۳۵)

[۲۵۴] دین میں غلو کا فتنہ اِسی سے پیدا ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف اگر وہی بات منسوب کی جائے جو اُس نے کہی ہے تو اِس طرح کا کوئی فتنہ کبھی پیدا نہیں ہوسکتا۔

[۲۵۵] یعنی خدا کا کلمۂ 'کن' اور اُس کی طرف سے ایک روح تھے جو اُسی طرح پھونکی گئی، جس طرح آدم و حوا میں پھونکی گئی تھی۔ اِس کی بنا پر اُنھیں خدائی کا درجہ آخر کس طرح دیا جا سکتا ہے؟

[۲۵۶] اِس سے مراد نصاریٰ کا عقیدۂ تثلیث ہے۔ یہ پال (Paul) کی اختراعات میں سے ہے اور اِس کی رو سے باپ، بیٹا اور روح القدس، تینوں الوہیت میں شریک ہیں۔ تاہم اِس کی تعبیر اِس طریقے سے کی گئی ہے کہ توحید پر ایمان کا دعویٰ بھی برقرار رہے۔

[۲۵۷] یعنی جب خلق اور خلق کے تمام معاملات کو دیکھنے کے لیے اللہ ہی کافی و وافی ہے تو کسی کو خدائی میں شریک کرنے کی گنجایش کہاں سے پیدا ہوتی ہے؟

وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ۵ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾

سمجھیں گے۔ اگر کوئی اللہ کی بندگی کو اپنے لیے عار سمجھتا اور تکبر کرتا ہے تو عنقریب وہ سب کو گھیر کر اپنے حضور میں اکٹھا کر لے گا۔ پھر جو ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے عمل کیے ہیں، اُنھیں وہ اُن کا پورا اجر دے گا اور اپنے فضل سے اُن کو زیادہ بھی عطا فرمائے گا۔ اور جن لوگوں نے اُس کی بندگی کو عار سمجھا اور تکبر کیا ہے، اُنھیں وہ دردناک سزا دے گا اور اللہ کے مقابل میں وہ اپنے لیے کوئی حمایتی اور کوئی مددگار نہ پائیں گے۔[۲۵۸] ۱۷۲-۱۷۳

---

[۲۵۸] اِس کا صحیح زور سمجھنے کے لیے 'لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ' کی آیت نگاہ میں رہنی چاہیے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"...غلو کے فتنے میں مبتلا ہونے کا بڑا سبب درحقیقت استکبار ہے۔ جو لوگ کسی چیز یا کسی شخص کو مان لیتے ہیں، وہ اگر حدود سے واقف یا اُن کو ملحوظ رکھنے والے نہ ہوں تو اُن کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ اُس چیز یا شخص کو سب چیزوں اور تمام اشخاص سے بڑھ کر ثابت کر دکھائیں۔ پھر وہ اپنے استکبار کے اعتبار سے اُس کو بڑھانا شروع کر دیتے ہیں، یہاں تک کہ اُس کو بڑھاتے بڑھاتے اُس حد تک پہنچا دیتے ہیں جہاں پہنچ کر اُن کے استکبار کو تسلی ہو جاتی ہے کہ اب برتری کے میدان میں کوئی اُن کا حریف نہیں رہا اور یہاں کوئی اُن کو چیلنج نہیں کر سکتا۔ عیسائیوں کو یہی فتنہ پیش آیا۔ اُنھوں نے جب حضرت عیسیٰ کو مانا تو صرف اتنے ہی پر قانع نہ رہ سکے کہ اُن کو اللہ کا بندہ اور اُس کا رسول مانیں۔ اُنھوں نے خیال کیا کہ اللہ کے بندے اور رسول تو بہت سے ہیں،

يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا (۱۷۴) فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا (۱۷۵)

لوگو، تمھارے پروردگار کی حجت تمھارے پاس آگئی ہے اور ہم نے تمھاری طرف ایک ایسی روشنی نازل کردی ہے جو (ہر چیز کو) واضح کر دینے والی ہے۔[۲۵۹] اِس لیے جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اُنھوں نے اُسے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا ہے، اُنھیں وہ عنقریب اپنی رحمت اور اپنی عنایتوں (کے سایے) میں داخل کرے گا اور اپنی طرف آنے کا سیدھا راستہ دکھا دے گا۔[۲۶۰] ۱۷۴-۱۷۵

اگر مسیح بھی اللہ کے بندے اور رسول ہی ہیں تو پھر اُن کا اور اُن کے ماننے والوں کا امتیاز کیا ہوا؟ اِس محرک نے، جو کھلا ہوا استکبار ہے، اُنھیں آمادہ کیا کہ وہ کھینچ تان کر اُن کو شریک خدا ثابت کریں۔" (تدبر قرآن ۲/ ۴۳۷)

۲۵۹۔ اِس سے مراد قرآن مجید ہے جس کے لیے اصل میں 'بُرْهَانٌ' اور 'نُوْرًا مُّبِيْنًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ پہلے لفظ سے قرآن کے عقلی اور استدلالی پہلو کو واضح فرمایا ہے کہ وہ ایک برہان قاطع ہے اور دوسرے سے اُس کے عملی پہلو کو کہ زندگی کے تمام معاملات میں وہ انسان کو ایسی رہنمائی عطا فرماتا ہے جو اُسے تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آتی ہے۔

۲۶۰۔ یعنی قیامت میں اپنے قرب کی طرف رہنمائی فرمائے گا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...یہ بات کہ اِس ہدایت کا تعلق آخرت سے ہے، اِس سے نکلتی ہے کہ اِس کا عطف 'فَسَيُدْخِلُهُمْ' پر ہے جس کا تعلق صریحاً آخرت سے ہے اور یہ بات کہ یہ ہدایت مطلوب و مقصود کی طرف ہے، 'اِلَيْهِ' کے لفظ سے نکلتی ہے۔ یعنی جو لوگ اللہ پر ایمان اور اُس حبل اللہ کو، جو قرآن کی شکل میں اُن کی طرف نازل ہوئی ہے، مضبوطی سے پکڑ لیں گے، خدا اُن کو اپنی رحمت

يَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ

۴- وہ تم سے فتویٰ پوچھتے ہیں۔ اِن سے کہو کہ اللہ تمھیں کلالہ رشتہ داروں کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے[۲۶۱]: اگر کوئی شخص بے اولاد مرے[۲۶۲] اور اُس کی ایک بہن ہی ہو تو

اور فضل بے پایاں سے بھی نوازے گا اور براہ مستقیم اور براہ راست اُن کی رہنمائی اپنے قرب کی طرف بھی فرمائے گا اور یہ آخرت کی نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت ہوگی۔ اِس لیے کہ تمام ہدایت و شریعت کی اصل غایت اور اہل ایمان کی تمام مساعی کا اصل مقصود و مطلوب یہی قرب الٰہی ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۴۳۸)

۲۶۱؎ لفظ 'اَلْکَلٰلَة' کی تحقیق اِس سے پہلے اِسی سورہ کی آیات ۱۱- ۱۲ کے تحت بیان ہو چکی ہے۔ یہ اب چوتھے اور آخری سوال کا جواب ہے جو اولاد کی عدم موجودگی میں بھائی بہنوں کی میراث کے بارے میں پیدا ہوا ہے۔ اِس کا اشارہ اگرچہ آیات ۱۱- ۱۲ میں بھی موجود تھا، لیکن جب لوگ نہیں سمجھے اور اُنھوں نے سوال کیا تو قرآن نے اُس کو پوری صراحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ آیت کی ابتدا 'قُلِ: اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ' کے الفاظ سے ہوئی ہے۔ اِس میں، اگر غور کیجیے تو وہی اسلوب ہے جو 'يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ' میں ہے۔ وہاں وصیت میت کی وارث اولاد کے بارے میں ہے اور یہاں فتویٰ میت کے وارث کلالہ رشتہ داروں کے بارے میں ہے۔ لفظ 'كَلٰلَة' پر الف لام دلیل ہے کہ سوال کلالہ وارثوں میں سے کچھ مخصوص اقربا سے متعلق ہے اور جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقربا میت کے بھائی بہن ہیں۔ تمام کلالہ رشتہ داروں، مثلاً چچا ماموں، بھائی بہن، خالہ پھوپھی میں سے کسی کو وارث بنا دینے کی اجازت آیات میراث میں بیان ہو چکی ہے۔ یہاں عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ یہ چیز ملحوظ رہے تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا: کہہ دو اللہ تمھیں کلالہ رشتہ داروں میں سے بھائی بہنوں کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔

۲۶۲؎ اصل میں 'اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ بھائی بہنوں کے

اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ
وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ
يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿١٧٦﴾

اُس کے لیے ترکے کا آدھا ہے اور اگر بہن بے اولاد مرے تو اُس کا وارث اُس کا بھائی ہے۔ اور بہنیں اگر دو ہوں تو اُس کے ترکے میں سے دو تہائی پائیں گی اور اگر کئی بھائی بہنیں ہوں تو مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے[۲۶۳]۔ اللہ تمھارے لیے وضاحت کرتا ہے تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ ۱۷۶

میراث پانے کے لیے اُسی طریقے پر شرط ہے، جس طرح 'فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ' میں ہے۔ وہاں معنی یہ ہیں کہ میت بے اولاد ہو اور ماں باپ ہی وارث ہوں تو اُن کا حصہ یہ ہے اور یہاں مفہوم یہ ہے کہ مرنے والے کے اولاد نہ ہو اور اُس کے بھائی بہن ہوں تو اُن کا حصہ اِس طرح ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ بھائی بہن صرف اولاد کی غیر موجودگی میں وارث ہوتے ہیں۔ اولاد موجود ہو تو میت کے ترکے میں اُن کا کوئی حصہ مقرر نہیں ہے، اِلّا یہ کہ مرنے والا آیت ۱۲ میں کلالہ کے حکم عام کے تحت اُن میں سے کسی کو بچے ہوئے ترکے کا وارث بنا دے۔

[۲۶۳] بھائی بہنوں کے جو حصے یہاں بیان ہوئے ہیں، اُن میں اور اولاد کے حصوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ آیت میں 'وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً، فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ' کا اسلوب دلیل ہے کہ یہ حصے بھی والدین اور بیوی یا شوہر کا حصہ دینے کے بعد باقی ترکے میں سے دیے جائیں گے۔ اِس کے دلائل آیت ۱۱ کی تفسیر میں بیان ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ترکے کا جو حصہ بھائی بہنوں میں تقسیم کیا جائے گا، میت کی صرف بہنیں ہی ہوں تو اُنھیں بھی اُسی کا دو تہائی اور اُسی کا نصف ادا ہو گا۔

سورة المائدة

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّى الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ①

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

ایمان والو، (اپنے پروردگار سے باندھے ہوئے سب) عہد و پیمان پورے کرو۔[۲۶۴] تمھارے لیے مویشی کی قسم کے تمام چوپایے[۲۶۵] حلال ٹھیرائے گئے ہیں،[۲۶۶] سوائے اُن کے جو تمھیں بتائے جا رہے ہیں۔ لیکن احرام کی حالت میں شکار کو حلال نہ کر لو۔[۲۶۷] (یہ اللہ کا حکم ہے اور) اللہ جو چاہتا ہے، حکم دیتا ہے۔[۲۶۸] ۱

---

[۲۶۴] اِس سے مراد وہ عہد و پیمان ہیں جو ایمان و اسلام کی دعوت قبول کر لینے کے بعد ہر بندۂ مومن اپنے پروردگار سے اُس کی شریعت کی پابندی کے لیے باندھ لیتا ہے۔

[۲۶۵] اصل میں 'بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'اَنْعَام' کا لفظ عربی زبان میں بھیڑ بکری، اونٹ اور گاے بیل کے لیے معروف ہے۔ اِس کی طرف 'بَهِيْمَة' کی اضافت سے اِس میں انعام کی قسم کے وحشی چوپایے، یعنی ہرن وغیرہ بھی شامل ہو گئے ہیں۔

[۲۶۶] یعنی اُن کا حلال ہونا واضح کر دیا گیا ہے اور وہ تمام پابندیاں جو لوگوں نے اپنے اوہام کی بنا پر یا پچھلے صحیفوں کی کسی روایت کی بنا پر اپنے اوپر عائد کر رکھی تھیں، ختم ہو گئی ہیں۔

[۲۶۷] اصل الفاظ ہیں: 'غَيْرَ مُحِلِّى الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ'۔ مطلب یہ ہے کہ تمام چوپایے حلال ہیں، مگر اِس پابندی کے ساتھ کہ حالت احرام میں شکار کو جائز کر لینے والے نہ بن جانا۔ یہ

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ
وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ
فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ؕ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَلَا
يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

ایمان والو، اللہ کے شعائر[٢٦٩] کی بے حرمتی نہ کرو، نہ حرام مہینوں کی، نہ ہدی[٢٧٠] کے جانوروں کی، نہ (اُن میں سے خاص کر) اُن جانوروں کی جن کے گلے میں نذر کے پٹے بندھے ہوئے ہوں، اور نہ بیت الحرام کے عازمین کی جو اپنے پروردگار کی عنایتوں اور اُس کی خوشنودی کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ ہاں، جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو شکار کر سکتے ہو۔ تمھارے لیے مسجد حرام کا راستہ کچھ لوگوں نے بند کر دیا تھا تو اُن کے

بالکل اُسی نوعیت کا حکم ہے جو یہود کو سبت سے متعلق دیا گیا تھا۔

[٢٦٨] اِس طرح کے احکام ابتلا اور امتحان کے لیے دیے جاتے ہیں۔ اِن میں بندوں کی مصلحت واضح نہیں ہوتی، اِس لیے جب تک یہ عقیدہ محکم نہ ہو کہ خدا حاکم مطلق ہے اور اُس کا کوئی حکم مصلحت سے خالی نہیں ہوتا، اُس وقت تک پوری وفاداری کے ساتھ کوئی شخص اِن کی تعمیل نہیں کر سکتا۔

[٢٦٩] یہ 'شَعِیْرَۃ' کی جمع ہے جس کے معنی علامت کے ہیں۔ اصطلاح میں اِس سے مراد وہ مظاہر ہیں جو اللہ اور رسول کی طرف سے کسی حقیقت کا شعور قائم رکھنے کے لیے بطور ایک نشان کے مقرر کیے گئے ہوں، مثلاً حجر اسود، استلام اور رمی وغیرہ۔

[٢٧٠] یہ لفظ قربانی کے اُن جانوروں کے لیے آتا ہے جو ہدیے کے طور پر اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرنے کے لیے بیت الحرام لے جائے جاتے ہیں۔

اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ②

ساتھ اِس بنا پر تمھاری دشمنی بھی تمھیں ایسا مشتعل نہ کر دے کہ تم حدود سے تجاوز کرو۔ (نہیں، ہر حال میں حدود الٰہی کے پابند رہو[۲۷۱])، اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو، مگر حق تلفی اور زیادتی میں تعاون نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، اِس لیے کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے[۲۷۲]۔ ۲

---

۲۷۱ مدعا یہ ہے کہ یہ اللہ کی حرمتیں ہیں، اِن کے توڑنے میں پہل ایک بدترین جرم ہے۔ اِس کا ارتکاب کسی حال میں بھی نہیں ہونا چاہیے۔ بیت الحرام پر حملہ خدا کے گھر پر حملہ ہے، جن جانوروں کے گلے میں خدا کی تخصیص کے پٹے بندھ گئے ہیں اور جو اللہ کے بندے اُس کے فضل اور اُس کی خوشنودی کی تلاش میں رخت سفر باندھ کر نکلے ہیں، اُن کو نقصان پہنچانے کے درپے ہونا خود اللہ، پروردگار عالم سے تعرض کرنے کے مترادف ہے۔ اِس وجہ سے کسی قوم کی دشمنی بھی مسلمانوں کو اِس پر آمادہ نہ کرے کہ وہ اِس معاملے میں حدود سے تجاوز کریں۔ اُن پر واضح رہنا چاہیے کہ جو پروردگار اپنے عہد و میثاق سے قوموں پر کرم فرماتا اور اُنھیں سرفرازی بخشتا ہے، اُس کے ہاں اِس عہد و میثاق کے توڑنے کی پاداش بھی بڑی ہی سخت ہے۔

۲۷۲ یہ ایک دوسرے پہلو سے اُسی بات کی تاکید ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...یعنی جس گروہ کو اللہ نے دنیا میں نیکی اور تقویٰ قائم کرنے کے لیے پیدا کیا ہے، اُس کے لیے پسندیدہ روش یہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں کی زیادتیوں سے مشتعل ہو کر خود اُسی طرح کی زیادتیاں کرنے لگے۔ وہ ایسا کرے تو اِس کے معنی یہ ہوئے کہ اُس نے گناہ اور زیادتی کے کام میں تعاون کیا اور شریروں نے برائی کی جو نیو جمائی، اُس پر اُس نے بھی چند ردّے رکھ دیے، حالاں کہ اُس کا کام نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرنا تھا۔“ (تدبر قرآن ۲/۴۵۵)

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ
اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ

تم پر[۲۷۳] مردار[۲۷۴] اور خون[۲۷۵] اور سؤر کا گوشت[۲۷۶] اور خدا کے سوا کسی اور کے نام کا ذبیحہ حرام ٹھیرایا گیا ہے اور (اِسی کے تحت) وہ جانور بھی جو گلا گھٹنے سے مرا ہو، جو چوٹ سے مرا ہو، جو

---

[۲۷۳] یہاں سے آگے اب اُنھی حرمتوں کی تفصیل ہے جن کا حوالہ اوپر 'اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ' کے الفاظ میں دیا گیا ہے۔

[۲۷۴] اصل میں لفظ 'مَیْتَة' آیا ہے۔ یہ اِن احکام میں عرف و عادت کی رعایت سے استعمال ہوا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ عربی زبان میں اِس کا ایک لغوی مفہوم بھی ہے، لیکن یہ جب اِس رعایت سے بولا جائے تو اردو کے لفظ مردار کی طرح اِس کے معنی ہر مردہ چیز کے نہیں ہوتے۔ اِس صورت میں ایک نوعیت کی تخصیص اِس لفظ کے مفہوم میں پیدا ہو جاتی ہے اور زبان کے اسالیب سے واقف کوئی شخص، مثال کے طور پر، مردہ ٹڈی اور مردہ مچھلی کو اِس میں شامل نہیں سمجھتا۔ یہ تخصیص کیوں پیدا ہوئی؟ اِس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ اِس طرح کے جانوروں میں بہتا ہوا خون نہیں ہوتا کہ نہ نکلے تو اُس سے یہ مردار ہو جائیں۔

[۲۷۵] سورۂ انعام (۶) کی آیت ۱۴۵ میں اِس کے لیے 'دَمًا مَّسْفُوْحًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن کا مفہوم وہی ہے جو عام بول چال میں اِن الفاظ سے سمجھا جاتا ہے۔ تلی اور جگر کے متعلق یہ بات اگرچہ کہی جا سکتی ہے کہ یہ بھی در حقیقت خون ہیں، لیکن عرف استعمال کا تقاضا ہے کہ اِن پر اِس کا اطلاق نہ کیا جائے۔ اِسی طرح 'مَسْفُوْحًا' کی قید سے معلوم ہوتا ہے کہ رگوں اور شریانوں میں رکا ہوا خون بھی حرمت کے اِس حکم سے مستثنیٰ ہے۔

[۲۷۶] یہ انعام کی قسم کے بہائم میں سے ہے، لیکن درندوں کی طرح گوشت بھی کھاتا ہے۔ اِس لیے یہ سوال پیدا ہوا کہ اِسے کھانے کا جانور سمجھا جائے یا نہ کھانے کا؟ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کے ذریعے سے وضاحت فرمائی ہے کہ اِس کا الحاق درندوں سے ہوگا اور اِسے حرام سمجھا جائے گا۔

وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۣ قف وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ؕ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ اَلْيَوْمَ

اوپر سے گر کر مرا ہو، جو سینگ لگ کر مرا ہو، جسے کسی درندے نے پھاڑ کھایا ہو،[۲۷۷] سوائے اُس کے جسے تم نے (زندہ پا کر) ذبح کر لیا۔[۲۷۸] اِسی طرح وہ جانور بھی حرام ہیں جو کسی آستانے پر ذبح کیے گئے ہوں اور یہ بھی کہ تم (اُن کا گوشت) جوے کے تیروں سے تقسیم کرو۔[۲۷۹] (تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) یہ سب خدا کی نافرمانی کے کام ہیں۔ یہ

---

[۲۷۷] اِس سے پہلے 'مَیْتَة' کی حرمت کا جو حکم بیان ہوا ہے، اُس کے بارے میں یہ شبہ بعض ذہنوں میں پیدا ہو سکتا تھا کہ طبعی موت سے مرے ہوئے اور ناگہانی حوادث سے مرے ہوئے جانور میں کیا کچھ فرق کیا جائے گا یا دونوں یکساں مردار قرار پائیں گے؟ قرآن نے جواب دیا ہے کہ دونوں کا حکم ایک ہی ہے۔

[۲۷۸] اصل میں 'اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'مَیْتَة' کی تفصیل کے بعد اِن الفاظ سے واضح ہے کہ یہ صرف تذکیہ ہی ہے جس سے کسی جانور کی موت اگر واقع ہو تو وہ مردار نہیں ہوتا۔ تذکیہ انبیا علیہم السلام کی قائم کردہ سنت ہے اور بطور اصطلاح جس مفہوم کے لیے بولا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ کسی تیز چیز سے جانور کو زخمی کر کے اُس کا خون اِس طرح بہا دیا جائے کہ اُس کی موت خون بہ جانے کے باعث ہی واقع ہو۔ جانور کو مارنے کی یہی صورت ہے جس میں اُس کا گوشت خون کی نجاست سے پوری طرح پاک ہو جاتا اور وہ علت باقی نہیں رہتی جس کی بنا پر مردار کو حرام ٹھیرایا گیا ہے۔ اِس کا اصل طریقہ ذبح یا نحر ہے۔ ذبح گائے، بکری اور اُن کے مانند جانوروں کے لیے خاص ہے اور نحر اونٹ اور اُس کے مانند جانوروں کے لیے۔ ذبح سے مراد یہ ہے کہ کسی تیز چیز سے حلقوم اور مری (غذا کی نالی) یا حلقوم اور ودجین (گردن کی رگوں) کو کاٹ دیا جائے اور نحر یہ ہے کہ جانور کے حلقوم میں نیزے جیسی کوئی تیز چیز اِس طرح چبھوئی جائے کہ اُس سے خون کا فوارہ چھوٹے اور خون بہ کر جانور بالآخر بے دم ہو کر گر جائے۔

۲۷۹ اوپر خدا کے سوا کسی اور کے نام کا ذبیحہ حرام ٹھیرایا گیا ہے۔ سورۂ انعام (۶) کی آیت ۱۴۵ میں قرآن نے واضح فرمایا ہے کہ اُس کی حرمت کا باعث خود جانور کا 'رِجس'، یعنی ظاہری نجاست نہیں، بلکہ ذبح کرنے والے کا 'فِسق' ہے۔ خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کرنا چونکہ ایک مشرکانہ فعل ہے، اِس لیے اُسے 'فِسق' سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ علم و عقیدہ کی نجاست ہے۔ اِس طرح کی نجاست جس چیز کو بھی لاحق ہو جائے، عقل کا تقاضا ہے کہ اُس کا حکم یہی سمجھا جائے۔ قرآن نے یہ دونوں چیزیں اِسی اصول کے تحت ممنوع قرار دی ہیں۔ اِن کے لیے اصل میں 'مَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ' اور 'اَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی اِن کی تفسیر لکھتے ہیں:

> ''وَمَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ'، 'نُصُب' تھان اور استھان کو کہتے ہیں۔ عرب میں ایسے تھان اور استھان بے شمار تھے جہاں دیویوں، دیوتاؤں، بھوتوں، جنوں کی خوشنودی کے لیے قربانیاں کی جاتی تھیں۔ قرآن نے اِس قسم کے ذبیحے بھی حرام قرار دیے۔ قرآن کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اِن کے اندر حرمت مجرد بارادۂ تقرب و خوشنودی استھانوں پر ذبح کیے جانے ہی سے پیدا ہو جاتی ہے، اِس سے بحث نہیں کہ اِن پر نام اللہ کا لیا گیا ہے یا کسی غیر اللہ کا۔ اگر غیر اللہ کا نام لینے کے سبب سے اِن کو حرمت لاحق ہوتی تو اِن کے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اوپر 'وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ' کا ذکر گزر چکا ہے، وہ کافی تھا۔ ہمارے نزدیک اِسی حکم میں وہ قربانیاں بھی داخل ہیں جو مزاروں اور قبروں پر پیش کی جاتی ہیں۔ اُن میں بھی صاحب مزار اور صاحب قبر کی خوشنودی مدنظر ہوتی ہے۔ ذبح کے وقت نام چاہے اللہ کا لیا جائے یا صاحب قبر و مزار کا، اُن کی حرمت میں دخل نام کو نہیں، بلکہ مقام کو حاصل ہے۔
>
> 'وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ'، 'اِسْتِقْسَام' کے معنی ہیں حصہ یا قسمت یا تقدیر معلوم کرنا۔ 'اَزْلَام' جوے یا فال کے تیروں کو کہتے ہیں۔ عرب میں فال کے تیروں کا بھی رواج تھا جن کے ذریعے سے وہ اپنے زعم کے مطابق غیب کے فیصلے معلوم کرتے تھے اور جوے کے تیروں کا بھی رواج تھا جن کے ذریعے سے وہ گوشت یا کسی چیز کے حصے حاصل کرتے تھے۔ ہم سورۂ بقرہ

يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ

منکر اب تمھارے دین کی طرف سے مایوس ہو گئے ہیں۔[۲۸۰] اِس لیے (اِن حرمتوں کے معاملے میں) اِن سے نہ ڈرو، مجھی سے ڈرو۔ تمھارے دین کو آج[۲۸۱] میں نے تمھارے لیے پورا کر دیا ہے[۲۸۲] اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی ہے اور تمھارے لیے دین کی حیثیت سے اسلام کو پسند فرمایا ہے۔[۲۸۳] (سو میرے اِن احکام کی پابندی کرو)، پھر جو بھوک سے

کی تفسیر میں 'خمر و میسر' کے تحت بیان کر آئے ہیں کہ عرب شراب نوشی کی مجلسیں منعقد کرتے، شراب کے نشے میں جس کا اونٹ چاہتے ذبح کر دیتے، مالک کو منہ مانگے دام دے کر راضی کر لیتے، پھر اُس کے گوشت پر جوا کھیلتے۔ گوشت کی جو ڈھیریاں جیتتے جاتے، اُن کو بھونتے، کھاتے، کھلاتے اور شرابیں پیتے اور بسا اوقات اِسی شغل بدمستی میں ایسے ایسے جھگڑے کھڑے کر لیتے کہ قبیلے کے قبیلے برسوں کے لیے آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے اور سیکڑوں جانیں اِس کی نذر ہو جاتیں ـــــ مجھے خیال ہوتا ہے کہ یہاں 'اِسْتِقْسَام بِالْاَزْلَام' سے یہی دوسری صورت مراد ہے۔" (تدبر قرآن ۲/ ۴۵۶)

[۲۸۰] یعنی اِس بات سے مایوس ہو گئے ہیں کہ وہ اِس دین کو کوئی نقصان پہنچا سکیں گے۔

[۲۸۱] اِس 'آج' سے مراد کوئی معین دن نہیں ہے، بلکہ وہ زمانہ ہے جس میں یہ سورہ نازل ہوئی ہے۔

[۲۸۲] یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پہلی وحی سے جو دین تمھیں دینا شروع کیا تھا، اُسے آج پورا کر دیا ہے۔

[۲۸۳] یعنی یہودیت اور نصرانیت کو نہیں، بلکہ اسلام کو پسند فرمایا ہے۔ اِس لیے کہ وہ اللہ کا دین نہیں، بلکہ دین سے انحراف کی مختلف صورتیں ہیں۔

غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ③
يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا

مجبور ہو کر اِن میں سے کوئی چیز کھا لے، بغیر اِس کے کہ وہ گناہ کا میلان رکھتا ہو تو اِس میں حرج نہیں، اِس لیے کہ اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔[۲۸۴] ۳

وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ اُن کے لیے کیا چیز حلال ٹھیرائی گئی ہے؟[۲۸۵] کہہ دو: تمام پاکیزہ

۲۸۴؎ مطلب یہ ہے کہ اِن محرمات سے استثنا صرف حالت اضطرار کا ہے اور وہ بھی اِس طرح کہ آدمی نہ خواہش مند ہو اور نہ ضرورت کی حد سے آگے بڑھنے والا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... ’مَخْمَصَة‘ کی قید سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جہاں دوسرے غذائی بدل موجود ہوں، وہاں مجرد اِس عذر پر کہ شرعی ذبیحہ کا گوشت میسر نہیں آتا، جیسا کہ یورپ اور امریکہ کے اکثر ملکوں کا حال ہے، ناجائز کو جائز بنا لینے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ گوشت زندگی کے بقا کے لیے ناگزیر نہیں ہے۔ دوسری غذاؤں سے نہ صرف زندگی، بلکہ صحت بھی نہایت اعلیٰ معیار پر قائم رکھی جا سکتی ہے۔ ’غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ‘ کی قید اِس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ رخصت بہرحال رخصت ہے اور حرام بہر شکل حرام ہے۔ نہ کوئی حرام چیز شیر مادر بن سکتی، نہ رخصت کوئی ابدی پروانہ ہے۔ اِس وجہ سے یہ بات کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ رفع اضطرار کی حد سے آگے بڑھے۔ اگر اِن پابندیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی شخص کسی حرام سے اپنی زندگی بچا لے گا تو اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اگر اِس اجازت سے فائدہ اٹھا کر اپنے حظ نفس کی راہیں کھولے گا تو اِس کی ذمہ داری خود اُس پر ہے۔ یہ اجازت اُس کے لیے قیامت کے دن عذر خواہ نہیں بنے گی۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۴۵۸)

۲۸۵؎ یہ سوال اِس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ اوپر کی آیتوں میں بعض ایسی چیزوں کی حرمت بیان ہوئی ہے جن کے حلال ہونے کا گمان ہو سکتا تھا۔ اِس کی ایک مثال درندے کے پھاڑے ہوئے جانور ہیں۔ اُن کے بارے میں جب یہ وضاحت کی گئی کہ وہ صرف اُسی صورت میں حلال ہیں،

عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۡ
فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ص وَاتَّقُوا

چیزیں تمھارے لیے حلال ہیں[۲۸۶] اور شکاری جانوروں[۲۸۷] میں سے جن کو تم نے شکار پر دوڑانے کے لیے سدھا لیا ہے، جنھیں تم اُس علم میں سے کچھ سکھا کر سدھاتے ہو جو اللہ نے تمھیں سکھایا ہے[۲۸۸] (اُن کا کیا ہوا شکار بھی حلال ہے)۔ اِس لیے جو وہ تمھارے لیے روک رکھیں، اُس میں سے کھاؤ[۲۸۹] اور (جانور کو شکار پر چھوڑنے سے پہلے) اُس پر اللہ کا نام لے لیا کرو[۲۹۰]

جب اُن کو زندہ حالت میں ذبح کر لیا جائے تو سدھائے ہوئے جانوروں کے شکار سے متعلق بھی بعض سوالات پیدا ہو گئے۔ اِس صورت حال میں لوگوں نے پوچھا ہے کہ پھر کیا مناسب نہیں کہ اُنھیں یہ بتا دیا جائے کہ اُن کے لیے حلال کیا کیا چیزیں ہیں؟

۲۸۶؎ اصل میں لفظ 'اَلطَّيِّبٰتُ' آیا ہے۔ یہ 'خبائث' کا ضد ہے۔ مدعا یہ ہے کہ وہ تمام چیزیں حلال ہیں جو اپنے مزاج اور اپنی سرشت کے لحاظ سے انسانیت کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں اور انسان کا ذوق سلیم جن کو کھانے کے لیے موزوں سمجھتا ہے، الّا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے اُس کی کسی غلطی کی اصلاح کر دے۔

۲۸۷؎ اصل میں لفظ 'الجَوَارِح' استعمال ہوا ہے۔ اِس سے مراد شکاری جانور ہیں، عام اِس سے کہ وہ درندوں میں سے ہوں یا پرندوں میں سے۔

۲۸۸؎ یعنی اپنی جبلتوں کو قواعد و ضوابط کا پابند بنا لینے کا جو سلیقہ اللہ نے تمھیں سکھایا ہے، وہی سلیقہ جن جانوروں کو سدھا کر تم نے اُن کے اندر بھی پیدا کر دیا ہے۔

۲۸۹؎ یہ اُس سوال کا جواب ہے جو اوپر کی آیتوں میں 'اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ' کی شرط سے پیدا ہوتا ہے۔ فرمایا ہے کہ سدھائے ہوئے جانور کا پھاڑنا ہی تذکیہ ہے، لہٰذا اُس کے شکار کو ذبح کیے بغیر کھایا جا سکتا ہے، تاہم اِس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اُسے اپنے مالک کے لیے روک رکھے۔ اُس

اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ④
اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۖ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ

اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک، اللہ بہت جلد حساب چکانے والا ہے۔ ۴

تمام پاکیزہ چیزیں اب تمھارے لیے حلال ٹھیرا دی گئی ہیں۔[۲۹۱] (چنانچہ) اہل کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے اور تمھارا کھانا اُن کے لیے حلال ہے۔[۲۹۲] اِسی طرح

میں سے اُس نے اگر کچھ کھا لیا ہے تو اُس کا کیا ہوا شکار جائز نہ ہوگا۔ اِس کے لیے اصل میں 'مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'اَمْسَكَ' کے معنی روکنے اور تھامنے کے ہیں۔ اِس کے ساتھ 'عَلٰى' آئے تو اِس کے اندر اختصاص کا مضمون پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہی مضمون ہے کہ شکار میں سے جو وہ خاص تمھارے لیے روک رکھیں۔

۲۹۰ اصل الفاظ ہیں: 'وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ'۔ اِن میں ضمیر کا مرجع ہمارے نزدیک 'مَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ' ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس کا مرجع اگر 'مِمَّآ اَمْسَكْنَ' کو مانا جائے تو یہ محض اُس بات کا اعادہ ہوگا جو اوپر 'اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ' کے الفاظ میں بیان ہو چکی ہے اور اِسے اگر 'فَكُلُوْا' سے متعلق مانا جائے تو عام آداب طعام سے متعلق ایک بات کا محل یہاں واضح نہیں ہوتا۔

۲۹۱ یعنی خبائث میں سے جن چیزوں کے بارے میں کوئی شبہ ہو سکتا تھا، اُسے پوری طرح دور کر دینے کے بعد اب تمام پاکیزہ چیزیں تمھارے لیے حلال کر دی گئی ہیں اور وہ تمام پابندیاں ختم ہو گئی ہیں جو یہود نے یا تو از خود اپنے اوپر عائد کر لی تھیں یا اُن کی ضد، ہٹ دھرمی اور سرکشی کے باعث اللہ تعالیٰ نے اُن پر لگا دی تھیں۔

۲۹۲ مطلب یہ ہے کہ حلال و حرام اور خبیث و طیب کے ہر لحاظ سے واضح ہو جانے کے بعد اب کوئی اندیشہ نہیں رہا کہ تم کسی حرام اور خبیث چیز سے آلودہ ہو سکتے ہو، اِس لیے طیبات تمھارے

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ

(شرک و توحید کے حدود بھی واضح ہو گئے ہیں، لہٰذا) مسلمانوں کی پاک دامن عورتیں تمھارے لیے حلال ہیں اور اُن لوگوں کی پاک دامن عورتیں بھی حلال ہیں جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی۔[۲۹۳] جب تم اُن کے مہر اُنھیں ادا کر دیتے ہو، اِس شرط کے ساتھ کہ تم بھی پاک دامن رہنے والے ہو، نہ بدکاری کرنے والے اور نہ چوری چھپے

دستر خوان پر ہوں یا اہل کتاب کے، دونوں کے لیے جائز ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ کا نام لے کر ذبح کیا جائے تو ایک دوسرے کا ذبیحہ بھی تمھارے لیے جائز ہے۔ اہل کتاب اِسے نہ مانیں تو یہ اُن کی بدقسمتی ہے۔ تمھارے پروردگار نے تو جو وعدہ اُن سے کیا تھا، وہ تمھارا کھانا اُن کے لیے جائز کر کے پورا کر دیا ہے اور خوردونوش کے معاملے میں وہ تمام پابندیاں اٹھا لی ہیں جو اُن کی سرکشی کے باعث اُن پر عائد کی گئی تھیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اُنھوں نے اِس کی قدر نہیں کی تو یہ اُن کی اپنی محرومی و بدقسمتی ہے۔ اُن کی نالائقی کی وجہ سے آخر خدا اپنے وعدے کو کیوں فراموش کرتا؟ سورج چمکتا ہے، خواہ کوئی اپنی آنکھیں بند رکھے یا کھلی رکھے۔ نسیم صبح اپنی عطر بیزیوں سے ہر مشام جان کو معطر کرنا چاہتی ہے اور اُس کے فیض عام کا تقاضا یہی ہے کہ وہ ہر ایک کو فیض یاب کرے، لیکن جو محروم القسمت اپنی ناک اور اپنے منہ بند کر لیتے ہیں، وہ اُس سے محروم ہی رہتے ہیں۔ اِسی طرح رب کریم نے جو سفرۂ نعمت اِس امت کے ذریعے سے تمام دنیا کے آگے بچھانا چاہا تھا، وہ بچھا دیا اور اُس سے متمتع ہونے کی دعوت اہل کتاب کو بھی دے دی۔ اُنھوں نے اِس سے فائدہ نہیں اٹھایا تو یہ اُن کی اپنی بدقسمتی ہے۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۴۶۴)

[۲۹۳] سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۲۲۱ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مسلمان نہ مشرک عورتوں سے نکاح کر سکتے ہیں اور نہ اپنی عورتیں مشرکین کے نکاح میں دے سکتے ہیں۔ یہ حکم جس طرح مشرکین عرب

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ز وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۵

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا

آشنائی کرنے والے۔ (اپنے ایمان کو، البتہ ہر حال میں خالص رکھو) اور (جانتے رہو کہ) جو ایمان کے منکر ہوں گے،[۲۹۴] اُن کی سب محنت ضائع ہوئی اور قیامت کے دن وہ نامرادوں میں سے ہوں گے۔ ۵

ایمان والو، (یہی پاکیزگی خدا کے حضور میں آنے کے لیے بھی چاہیے، لہٰذا)

سے متعلق تھا، اُسی طرح اشتراک علت کی بنا پر یہود و نصاریٰ سے بھی متعلق ہو سکتا تھا، کیونکہ علم و عمل، دونوں میں وہ بھی شرک جیسی نجاست سے پوری طرح آلودہ تھے، تاہم اصلاً چونکہ توحید ہی کے ماننے والے تھے، اِس لیے اللہ تعالیٰ نے رعایت فرمائی اور اُن کی پاک دامن عورتوں سے مسلمانوں کو نکاح کی اجازت دے دی ہے۔ آیت کے سیاق سے واضح ہے کہ یہ اجازت اُس وقت دی گئی، جب حلال و حرام اور شرک و توحید کے معاملے میں کوئی ابہام باقی نہیں رہا۔ اِس کے لیے آیت کے شروع میں لفظ 'اَلْيَوْمَ' کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس اجازت میں شرک و توحید کے وضوح اور شرک پر توحید کے غلبے کو بھی یقیناً دخل تھا، لہٰذا اِس بات کی پوری توقع تھی کہ مسلمان اِن عورتوں سے نکاح کریں گے تو یہ اُن سے لازماً متاثر ہوں گی اور شرک و توحید کے مابین کوئی تصادم نہ صرف یہ کہ پیدا نہیں ہوگا، بلکہ ہو سکتا ہے کہ اُن میں بہت سی ایمان و اسلام سے مشرف ہو جائیں۔ یہ چیز اِس اجازت سے فائدہ اٹھاتے وقت اِس زمانے میں بھی ملحوظ رہنی چاہیے۔

[۲۹۴] یعنی ایمان کا دعویٰ رکھتے ہوئے اپنے علم و عمل میں کفر و شرک اختیار کریں گے یا اُن کے

وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ
اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ
عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ

جب نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھو لو اور سروں کا مسح کرو اور ٹخنوں تک پاؤں بھی دھو لو۔[۲۹۵] اور اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ۔[۲۹۶] اور اگر (کبھی ایسا ہو کہ) تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی رفع حاجت کر کے آئے[۲۹۷] یا

ساتھ مصالحت روا رکھیں گے۔

۲۹۵؎ یہ نماز کے لیے وضو کا طریقہ بتایا ہے کہ پہلے منہ دھویا جائے، پھر کہنیوں تک ہاتھ دھوئے جائیں، پھر پورے سر کا مسح کیا جائے اور اِس کے بعد پاؤں دھو لیے جائیں۔ پورے سر کا مسح اِس لیے ضروری ہے کہ اِس حکم کے لیے آیت میں 'وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ' کے الفاظ آئے ہیں اور عربیت کے ادا شناس جانتے ہیں کہ 'ب' اِس طرح کے مواقع میں احاطے پر دلیل ہوتی ہے۔ اِسی طرح پاؤں کا حکم، اگرچہ بظاہر خیال ہوتا ہے کہ 'وَامْسَحُوْا' کے تحت ہے، لیکن 'اَرْجُلَکُمْ' منصوب ہے اور اِس کے بعد 'اِلَی الْکَعْبَیْنِ' کے الفاظ ہیں جو پوری قطعیت کے ساتھ فیصلہ کر دیتے ہیں کہ اِس کا عطف 'اَیْدِیَکُمْ' پر ہے، اِس لیے کہ یہ اگر 'بِرُءُوْسِکُمْ' پر ہوتا تو اِس کے ساتھ 'اِلَی الْکَعْبَیْنِ' کی قید غیر ضروری تھی۔ تیمّم میں دیکھ لیجیے کہ جہاں مسح کا حکم دیا گیا ہے، وہاں 'اِلَی الْمَرَافِقِ' کی قید اِسی بنا پر ختم کر دی ہے۔ چنانچہ پاؤں لازماً دھوئے جائیں گے۔ آیت میں اِن کا ذکر محض اِس وجہ سے موخر کر دیا گیا ہے کہ وضو میں اعضا کی ترتیب سے متعلق کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو جائے۔

۲۹۶؎ اِس سے واضح ہے کہ جنابت کے بعد غسل ضروری ہے، اِس کے بغیر نماز نہیں پڑھی جا سکتی۔ اِس غسل کے لیے یہاں 'فَاطَّهَّرُوْا' اور اِس سے پہلے سورۂ نساء (۴) کی آیت ۴۳ میں 'تَغْتَسِلُوْا' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ الفاظ تقاضا کرتے ہیں کہ جنابت کا یہ غسل پورے اہتمام کے

فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ
وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ
يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ⑥

عورتوں سے مباشرت کی ہو اور تم کو پانی نہ ملے تو کوئی پاک جگہ دیکھو اور اُس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کر لو۔[۲۹۸] اللہ تم پر کوئی تنگی نہیں ڈالنا چاہتا، لیکن یہ ضرور چاہتا ہے کہ تمھیں پاکیزہ بنائے، (اِس لیے وضو اور غسل کا پابند بناتا ہے) اور چاہتا ہے کہ اپنی نعمت تم پر تمام کرے، (اِس لیے مجبوری کی حالت میں تیمّم کی اجازت دیتا ہے) تاکہ تم اُس کے شکر گزار رہو۔ ۶

ساتھ کیا جائے۔

۲۹۷ اصل الفاظ ہیں: 'اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ'۔ لفظ 'غائط' عربی زبان میں نشیبی زمین کے لیے آتا ہے۔ یہاں یہ رفع حاجت سے کنایہ ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ دیہاتی زندگی میں لوگ اِس مقصد کے لیے بالعموم نشیبی زمینوں ہی میں جاتے ہیں۔

۲۹۸ سفر، مرض یا پانی کی نایابی کی صورت میں وضو اور غسل، دونوں مشکل ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ آدمی تیمّم کر سکتا ہے۔ اِس کا طریقہ اِن آیتوں میں اور اِس سے پہلے سورۂ نساء (۴) کی آیت ۴۳ میں یہ بتایا گیا ہے کہ کوئی پاک جگہ دیکھ کر اُس سے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کر لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے صراحت فرمائی ہے کہ تیمّم ہر قسم کی نجاست میں کفایت کرتا ہے۔ وضو کے نواقض میں سے کوئی چیز پیش آجائے تو اُس کے بعد بھی کیا جا سکتا ہے اور مباشرت کے بعد غسل جنابت کی جگہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اِسی طرح صراحت فرمائی ہے کہ مرض اور سفر کی حالت میں پانی موجود ہوتے ہوئے بھی آدمی تیمّم کر سکتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ
قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ⑦

(اِس رعایت سے فائدہ اٹھاؤ) اور اپنے اوپر اللہ کی اِس نعمت کو یاد رکھو[٢٩٩] اور اُس کے اُس عہد و میثاق کو بھی[٣٠٠] جو اُس نے تم سے ٹھیرایا تھا، جب تم نے کہا کہ ہم نے سن لیا اور ہم فرماں بردار ہیں، (اِسے یاد رکھو) اور اللہ سے ڈرو، اِس لیے کہ اللہ دلوں کے

> ''...مرض میں وضو یا غسل سے ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے، اِس وجہ سے یہ رعایت ہوئی ہے۔ اِسی طرح سفر میں مختلف حالتیں ایسی پیش آسکتی ہیں کہ آدمی کو تیمّم ہی پر قناعت کرنی پڑے۔ مثلاً یہ کہ پانی نایاب تو نہ ہو، لیکن کم یاب ہو، اندیشہ ہو کہ اگر غسل وغیرہ کے کام میں لایا گیا تو پینے کے لیے پانی تھڑ جائے گا یا یہ ڈر ہو کہ اگر نہانے کے اہتمام میں لگے تو قافلے کے ساتھیوں سے بچھڑ جائیں گے یا ریل اور جہاز کا ایسا سفر ہو کہ غسل کرنا شدید زحمت کا باعث ہو۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۳۰۳)

اِس میں شبہ نہیں کہ تیمّم سے بظاہر کوئی پاکیزگی تو حاصل نہیں ہوتی، لیکن اصل طریقۂ طہارت کی یادداشت ذہن میں قائم رکھنے کے پہلو سے اِس کی بڑی اہمیت ہے۔ شریعت میں یہ چیز بالعموم ملحوظ رکھی گئی ہے کہ جب اصلی صورت میں کسی حکم پر عمل کرنا ممکن نہ ہو تو شبہی صورت میں اُس کی یادگار باقی رکھی جائے۔ اِس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ حالات معمول پر آتے ہی طبیعت اصلی صورت کی طرف پلٹنے کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے۔

٢٩٩؎ یاد رکھنے کی یہ ہدایت اپنے حقیقی مفہوم میں ہے، یعنی ظاہر و باطن میں ہر پہلو سے اِس اتمامِ نعمت کا حق ادا کیا جائے۔

٣٠٠؎ یعنی اِس عہد و میثاق کو کہ سمع و طاعت پر قائم رہو گے تو اللہ تمھاری مغفرت کرے گا اور قیامت کے دن ایک اجرِ عظیم تمھیں عطا فرمائے گا۔ آگے آیت ۹ میں اِس کی وضاحت فرما دی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ز وَلَا
يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ط اِعْدِلُوْا قف هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ز
وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿٨﴾ وَعَدَ اللّٰهُ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿٩﴾

بھید تک جانتا ہے۔ ایمان والو، (اِس عہد و میثاق کا تقاضا ہے کہ) اللہ کے لیے کھڑے ہو جاؤ، انصاف کی گواہی دیتے ہوئے اور کسی قوم کی دشمنی بھی تمھیں اِس پر نہ ابھارے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ انصاف کرو، یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔[۱۰۳] اِس لیے کہ اللہ تمھارے ہر عمل سے باخبر ہے۔ اللہ نے اُن لوگوں سے وعدہ کر رکھا ہے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں کہ اُن کے لیے مغفرت

---

[۱۰۳] مطلب یہ ہے کہ تم میں سے ہر شخص نہ صرف یہ کہ حق و انصاف پر قائم رہے، بلکہ یہ اگر گواہی کا مطالبہ کریں تو جان کی بازی لگا کر اُن کا یہ مطالبہ پورا کرے۔ حق کہے، حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے۔ انصاف کرے، انصاف کی شہادت دے اور اپنے عقیدہ و عمل میں حق و انصاف کے سوا کبھی کوئی چیز اختیار نہ کرے۔ یہاں تک کہ کسی قوم کی دشمنی بھی اُسے آمادہ نہ کرے کہ وہ حق و انصاف کی راہ سے ہٹ جائے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...شیطان نے راہ حق سے گم راہ کرنے میں سب سے زیادہ جس حربے سے کام لیا، وہ یہی ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی کا حربہ ہے۔ یہود نے محض بنی اسمٰعیل اور مسلمانوں کی دشمنی میں اُس تمام عہد و پیمان کو خاک میں ملا دیا جس کے وہ گواہ اور ذمہ دار بنائے گئے تھے۔ اِس وجہ سے مسلمانوں سے یہ عہد لیا گیا کہ وہ شیطان کے اِس فتنے سے بچ کے رہیں۔ دوستوں اور دشمنوں، دونوں کے لیے اُن کے پاس بس ایک ہی باٹ اور ایک ہی ترازو ہو۔“

(تدبر قرآن ۲/ ۴۷۱)

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ⑩ يٰٓاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ
يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۗ وَعَلَى
اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ⑪

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ
اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۗ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ ۗ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ

اور اجر عظیم ہے۔ اِس کے برخلاف جو منکر ہیں اور اُنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہے، وہی دوزخ میں جانے والے ہیں۔ ایمان والو، اور اپنے اوپر اللہ کی یہ عنایت بھی یاد رکھو کہ جب ایک قوم[۳۰۲] نے تم پر دست درازی کا ارادہ کیا تو اللہ نے اُن کے ہاتھ تم سے روک دیے[۳۰۳] اور اللہ سے ڈرتے رہو اور (یاد رکھو کہ) ایمان والوں کو تو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔ ۷-۱۱

اللہ نے اِسی طرح بنی اسرائیل سے بھی عہد لیا تھا اور (اُس کی نگرانی کے لیے) ہم نے اُن میں سے بارہ نقیب[۳۰۴] اُن پر مقرر کیے تھے اور اللہ نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ میں

---

[۳۰۲] اشارہ ہے قریش مکہ کی طرف جن کی دست درازیوں کو روک کر اللہ تعالیٰ نے بالآخر مسلمانوں کو اُن پر غلبہ عطا فرمایا۔

[۳۰۳] یہ اُسی عہد کی واقعاتی شہادت پیش فرمائی ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب دنیا میں اللہ نے اپنا وعدہ اِس شان کے ساتھ پورا کیا ہے تو آخرت میں بھی یقیناً کرے گا۔

[۳۰۴] اِس لفظ کے اصل معنی کھوج لگانے والے اور حالات و معاملات کی جستجو کرنے والے کے ہیں، اِس لیے یہ قوم اور قبیلہ کے سردار اور نگران کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ استاذ امام

وَاٰتَيتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنتُم بِرُسُلِي وَعَزَّرتُمُوهُم وَاَقرَضتُمُ اللّٰهَ قَرضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنكُم سَيِّاٰتِكُم وَلَاُدخِلَنَّكُم جَنّٰتٍ تَجرِي مِن تَحتِهَا الاَنهٰرُ ۚ فَمَن كَفَرَ بَعدَ ذٰلِكَ مِنكُم

تمھارے ساتھ رہوں گا۔[305] اگر تم نے نماز کا اہتمام کیا اور زکوٰۃ ادا کی اور میرے رسولوں کو مانا[306] اور اُن کی مدد کی اور اللہ، (اپنے پروردگار) کو قرض دیتے رہے، اچھا قرض[307] تو یقین رکھو کہ میں تمھاری لغزشیں[308] تم سے دور کردوں گا اور تمھیں ضرور ایسے باغوں میں داخل

لکھتے ہیں:

> ''...بنی اسرائیل کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے شریعت کی پابندی اور اُس کی حفاظت کا عہد لینے کے بعد بنی اسرائیل کے ہر قبیلے پر ایک ایک نقیب اِس مقصد سے مقرر کیا کہ وہ لوگوں کی نگرانی رکھے کہ وہ شریعت کے حدود وقیود کی پابندی کریں اور کوئی ایسی چیز اُن کے اندر گھسنے نہ پائے جو اُن کو اللہ کے عہد سے روگردان کرے۔ بنی اسرائیل کے قبیلے چونکہ بارہ تھے، اِس وجہ سے نقیب بھی بارہ مقرر ہوئے۔ اُن کا تقرر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت کیا تھا، اِس وجہ سے اِس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا۔'' (تدبر قرآن ۲/۴۷۴)

[305] اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت کے لیے یہ ایک جامع تعبیر ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ جب خدا ساتھ ہے تو گویا پوری کائنات اُن کے ساتھ ہے۔

[306] یہ عہد چونکہ بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا، اِس لیے اِس میں خاص اشارہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے جن کا ذکر تورات میں نہایت واضح علامتوں کے ساتھ ہوا ہے۔

[307] یہ اُس انفاق کے لیے قرآن کی خاص تعبیر ہے جو دین کی خدمت اور اللہ کی راہ میں جہاد و قتال کے لیے کیا جائے۔

فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ⑫ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ
وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ
وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ

کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ پھر اِس (عہد و میثاق) کے بعد بھی جو تم میں سے منکر ہوں تو[٣٠٩] اُنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ سیدھی راہ سے بھٹک گئے ہیں۔ سو اپنے اِس عہد کو توڑ دینے ہی کی وجہ سے ہم نے اِن پر لعنت کی[٣١٠] اور اِن کے دل سخت کر دیے۔ (اب اِن کی حالت یہ ہے کہ) یہ کلام کو اُس کے موقع و محل سے ہٹا دیتے ہیں اور جس چیز کے ذریعے سے اِنھیں یاد دہانی کی گئی تھی، اُس کا ایک حصہ بھلا بیٹھے ہیں[٣١١] اور (یہ اِسی کا نتیجہ

---

[٣٠٨] اصل میں لفظ 'سَیِّات' آیا ہے۔ اِس سے مراد وہ لغزشیں اور کوتاہیاں ہیں جو اُن احکام کی خلاف ورزی سے پیدا ہوتی ہیں جو سد ذریعہ کے طور پر دیے جاتے ہیں۔

[٣٠٩] اِس سے واضح ہے کہ بنی اسرائیل کے لیے اِس معاہدے سے انحراف گویا خدا اور اُس کی ہدایت کا انکار کر دینے کے مترادف تھا۔ چنانچہ اِسی بنا پر اِسے کفر سے تعبیر کیا ہے۔

[٣١٠] یعنی اپنی رحمت سے دور کیا اور اپنی بارگاہ سے ذلت کے ساتھ دھتکار دیا۔ اِس مفہوم کے لیے جامع تعبیر یہی لعنت ہے۔ اِس کے نتائج کیا ہوتے ہیں؟ یہ آگے کی آیتوں میں بیان ہوئے ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِن کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''...راندۂ درگاہ ہونے کا پہلا اثر جو اُس قوم پر پڑتا ہے، وہ یہ ہے کہ اُس کے اندر سے خدا کی خشیت جو دل کی زندگی کی ضامن ہے، ختم ہو جاتی ہے اور دل پتھر ہو کر توبہ و انابت کی روئیدگی کے لیے بالکل بنجر ہو جاتا ہے۔ یہ حالت پیدا تو ہوتی ہے عہد شکن قوم کے اپنے عمل کے نتیجہ کے طور پر، لیکن چونکہ واقع ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کی مقررہ سنت کے مطابق، اِس وجہ سے اِس کو منسوب اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف فرمایا ہے۔ یہ قساوت عہد شکن قوم کے اندر جسارت پیدا کرتی ہے جس کا

إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٣﴾

ہے کہ) آئے دن تم اِن کی کسی نہ کسی خیانت کی خبر پاتے ہو۔ اِن میں سے بہت تھوڑے ہیں جو اِن چیزوں سے بچے ہوئے ہیں۔[۳۱۲] (اِن سے اب تم کسی خیر کی توقع نہیں کر سکتے)، سو معاف کرو، (اے پیغمبر)، اور اِن سے درگذر کرتے رہو،[۳۱۳] اِس لیے کہ اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو احسان کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ ۱۲-۱۳

> اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ میثاق الٰہی کی خلاف ورزی ہی پر بس نہیں کرتی، بلکہ وہ اُس معاہدے کو اپنی خواہشات کے مطابق بنانے کے لیے اُس کے الفاظ و کلمات کی تحریف بھی کرتی ہے۔''
>
> (تدبر قرآن ۲/ ۴۷۶)

۳۱۱ اِس سے تورات مراد ہے، اِس لیے کہ خدا کا یہی عہد نامہ تھا جس کے بنی اسرائیل پابند بنائے گئے اور جس کے ذریعے سے اُن کی یاددہانی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ یہود کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اِس میں لفظی تحریفات بھی کی ہیں، اپنی تاویلات کے ذریعے سے اِس کے حقائق کی قلب ماہیت بھی کی ہے اور اِس کی بعض چیزیں عام لوگوں سے چھپائی بھی ہیں۔ یہ اُن کے لیے گھر کا چراغ تھا اور استاذ امام کے الفاظ میں گھر کا چراغ ہی ہوتا ہے جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے۔ اگر اُسی کو بجھا دیا جائے یا چھپا دیا جائے تو اب دوسری کون سی چیز اجالا کرے گی۔

۳۱۲ یہود کے اندر صالحین کا یہی گروہ ہے جس کا ذکر اِس سے پہلے بقرہ و آل عمران میں بھی ہوا ہے۔

۳۱۳ اصل میں 'فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن سے مراد یہاں دل سے معاف کرنا نہیں، بلکہ محض درگذر کرنا ہے۔ یہی مفہوم ہم مہلت دینے اور نظر انداز کرنے کے الفاظ سے ادا کرتے ہیں۔ اِس معنی کی نظیر آگے آیت ۱۵ میں بھی ہے۔

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿١٤﴾

اِسی طرح ہم نے اُن سے بھی عہد لیا تھا جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔[٣١٤] پھر جس چیز کے ذریعے سے اُنھیں یاددہانی کی گئی، اُس کا ایک حصہ وہ بھی بھلا بیٹھے تو ہم نے قیامت تک کے لیے اِن دونوں کے درمیان بغض و عداوت کی آگ بھڑکا دی۔[٣١٥] (اب اُسی میں جل رہے ہیں) اور اللہ عنقریب اِنھیں بتا دے گا جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں۔ ١٤

---

[٣١٤] اِس سے واضح ہے کہ نصاریٰ کا نام بھی سیدنا مسیح علیہ السلام کے پیرووں نے اپنے لیے خود اختیار کیا تھا۔ یہ اللہ کا دیا ہوا نام نہیں ہے کہ اِس کی بنیاد پر لوگوں کو نصرانیت اختیار کرنے کی دعوت دی جائے۔ انبیا علیہم السلام کی دعوت کے لیے اللہ کا دیا ہوا نام ہمیشہ سے اسلام ہی ہے۔

[٣١٥] یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں تحریف اور اُس کے ایک حصے کو ضائع کر دینے کا نتیجہ بیان ہوا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...ملت کی شیرازہ بندی اللہ کے میثاق اور اُس کی کتاب ہی سے ہوتی ہے۔ اگر اُسی میں فساد و اختلال پیدا ہو جائے تو پھر ملت کو فساد و اختلال اور خون خرابے سے کیا چیز بچا سکتی ہے۔ یہ صورت حال عہد شکنی کا قدرتی نتیجہ بھی ہے اور اِس جرم کی سزا بھی، اِس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اِس کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔ نصاریٰ کے لیے اِس سے نجات کی واحد شکل یہ تھی کہ قرآن کی رہنمائی میں اِن تاریکیوں سے نکل کر ہدایت کی روشنی اور امن و سلامتی کی شاہراہ پر آ جاتے، لیکن اُن کے تعصب نے اُن کو یہ سیدھی راہ اختیار نہ کرنے دی۔ اب نہ کوئی کتاب آنی ہے اور نہ کوئی رسول، اِس وجہ سے اِس جنگ و جدل سے نکلنے کا اب اُن کے لیے قیامت تک کوئی امکان ہی باقی نہیں رہا۔“ (تدبر قرآن ٢/ ٤٧٨)

يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمۡ كَثِيۡرًا مِّمَّا
كُنۡتُمۡ تُخۡفُوۡنَ مِنَ الۡكِتٰبِ وَيَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ ؕ قَدۡ جَآءَكُمۡ
مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيۡنٌ ۙ ⑮ يَّهۡدِىۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ
سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ بِاِذۡنِهٖ
وَيَهۡدِيۡهِمۡ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ⑯

اے اہل کتاب، ہمارا پیغمبر تمھارے پاس آ گیا ہے جو کتاب الٰہی کی وہ بہت سی باتیں تمھارے لیے کھول رہا ہے جنھیں تم چھپاتے رہے ہو[٣١٦] اور بہت سی باتیں نظر انداز بھی کر رہا ہے[٣١٧]۔ تمھارے پاس یہ اللہ کی طرف سے ایک روشنی آ گئی ہے، یعنی ایک ایسی کتاب جو (دین و شریعت سے متعلق ہر چیز کو) واضح کر دینے والی ہے۔ اِس کے ذریعے سے اللہ اُن لوگوں کو جو اُس کی خوشنودی چاہتے ہیں، سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے اور اپنی توفیق و عنایت[٣١٨] سے اُنھیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے اور ایک سیدھی راہ کی طرف اُن کی رہنمائی کرتا ہے۔ ١٥-١٦

---

[٣١٦] یعنی کبھی لفظی اور معنوی تحریفات کے ذریعے سے اور کبھی عام لوگوں کو کتاب الٰہی کی اصل تعلیمات سے اندھیرے میں رکھ کر چھپاتے رہے ہو۔ اِس مفہوم کے لیے ایک ہی لفظ 'تُخْفُوْنَ' آیا ہے جس کے تحت یہ تمام صورتیں آ جاتی ہیں۔

[٣١٧] اِس لیے کہ اِن کے کھولنے کی کوئی حقیقی ضرورت نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ کے پیش نظر دین کی اصل حقیقت اور اُس کے مطالبات واضح کرنا ہوتا ہے۔ وہ بغیر ضرورت کے کسی کی تذلیل و تفضیح نہیں کرتا۔

[٣١٨] اصل میں لفظ 'بِاِذْنِهٖ' آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اندھیروں سے نکل کر روشنی میں آنے کی

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ
قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ
مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾

اِس میں شبہ نہیں کہ اُن لوگوں نے کفر کیا ہے جنھوں نے کہا کہ اللہ تو یہی مسیح ابن مریم ہے۔[۳۱۹] اِن سے پوچھو کہ اللہ کے آگے کس کا کچھ چلتا ہے، اگر وہ چاہے کہ مسیح ابن مریم کو، اُس کی ماں کو اور تمام زمین والوں کو ہلاک کر دے۔[۳۲۰] (اُس کے فیصلوں پر کوئی اثر انداز نہیں ہو سکتا، اِس لیے کہ) زمین اور آسمانوں اور اُن کے درمیان میں جو کچھ ہے، اُس کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے، پیدا کر دیتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔[۳۲۱] ۱۷

سعادت خدا کے اذن سے حاصل ہوتی ہے اور یہ اذن اُنھی کو ملتا ہے جو خدا کی رضا چاہتے ہیں۔ ہم نے اِس کا ترجمہ توفیق و عنایت اِسی رعایت سے کیا ہے۔

[۳۱۹] یعنی سینٹ پال کے پیرو جنھوں نے مسیح علیہ السلام کو خدا کا ظہور قرار دے کر اپنے اِس عقیدے کے لیے تثلیث کی وہ تعبیر اختیار کی جو مسیحیت کی بنیاد ہے۔ وحدت الوجودی صوفیوں کی طرح اِس میں بھی فرق مراتب کو قائم رکھنے کے لیے بہت کچھ زور بیان صرف کیا جاتا ہے، مگر قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ اِس طرح کی موشگافیوں کی اللہ کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ مسیح کو خدا بنانے کے مجرم ہیں اور اُنھوں نے یقیناً کفر کیا ہے۔

[۳۲۰] یہ مسیح علیہ السلام کو خدا بنانے والوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے غضب کا اظہار ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ

اِن یہود و نصاریٰ کا دعویٰ ہے کہ ہم خدا کے بیٹے اور اُس کے چہیتے ہیں۔[۳۲۲] اِن سے پوچھو، پھر تمھارے گناہوں پر وہ تمھیں سزا کیوں دیتا رہا ہے؟[۳۲۳] ہرگز نہیں، بلکہ تم بھی اُس کے پیدا کیے ہوئے انسانوں میں سے انسان ہی ہو۔ وہ (تم میں سے) جس کو

۳۲۱؎ مطلب یہ ہے کہ مسیح اگر بن باپ کے پیدا ہوئے ہیں تو اِس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ خدا بن گئے ہیں یا خدائی میں شریک ہو گئے ہیں۔ یہ بن باپ کے پیدا ہونا کیا چیز ہے، خدا چاہے تو کسی کو ماں اور باپ کے بغیر بھی پیدا کر سکتا ہے۔

۳۲۲؎ بیٹے کا لفظ محبوب اور برگزیدہ ہونے کے لیے بائیبل کی خاص تعبیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو جس منصب کے لیے منتخب کیا تھا، اُس کی ذمہ داریوں کو سمجھنے کے بجاے اُنھوں نے اِس سے یہ غلط نتیجہ نکالا اور اِس زعم باطل میں مبتلا ہو گئے کہ اب وہ جو چاہے کرتے رہیں، اللہ اُن کی کسی بات پر گرفت کرنے والا نہیں ہے۔

۳۲۳؎ یہ اُن کے زعم باطل کی تردید خود اُن کی تاریخ سے فرمائی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...مطلب یہ ہے کہ اگر خدا کے محبوب اور چہیتے ہونے کے سبب سے تم خدا کے مواخذے اور عذاب سے بری ہو تو تمھاری یہ محبوبیت اور تمھارا یہ چہیتا پن اِس دنیا میں تمھارے کچھ کام کیوں نہ آیا؟ یہاں تو تمھاری پوری تاریخ اِس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ جب جب تم نے خدا سے سرکشی کی ہے، اُس نے تمھیں نہایت عبرت انگیز سزائیں بھی دی ہیں، ایسی عبرت انگیز کہ دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں ایسی سزاؤں کی مثال نہیں مل سکتی۔ پوری قوم کی غلامی، پوری قوم کی صحرا گردی، پوری قوم کی جلاوطنی، متعدد بار پوری قوم کا قتل عام اور بیت المقدس کی عبرت انگیز تباہی۔ یہ سارے واقعات خود تورات میں موجود ہیں۔ اگر ابراہیم و اسحٰق کی اولاد ہونے کی وجہ سے تمھیں خدا کی طرف سے کوئی براءت نامہ حاصل ہے تو اِس براءت نامے نے تمھیں اِن عذابوں سے کیوں نہ بچایا؟“ (تدبر قرآن ۲/ ۴۸۳)

يَغۡفِرُ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ
وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا ۫ وَاِلَيۡهِ الۡمَصِيۡرُ ﴿۱۸﴾

يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا يُبَيِّنُ لَـكُمۡ عَلٰى فَتۡرَةٍ مِّنَ
الرُّسُلِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا جَآءَنَا مِنۡۢ بَشِيۡرٍ وَّلَا نَذِيۡرٍ ۫ فَقَدۡ جَآءَكُمۡ
بَشِيۡرٌ وَّنَذِيۡرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۹﴾

چاہے گا، بخش دے گا اور جس کو چاہے گا، (اپنے قانون کے مطابق) سزا دے گا۔[۳۲۴] (اُس کے فیصلوں پر کوئی اثر انداز نہیں ہو سکتا، اِس لیے کہ) زمین اور آسمانوں اور اُن کے درمیان میں جو کچھ ہے، اُس کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور (تم میں سے ہر ایک کو) اُسی کی طرف لوٹنا ہے۔[۳۲۵] ۱۸

اے اہل کتاب، ہمارا یہ پیغمبر رسولوں کی بعثت میں ایک وقفے کے بعد تمھارے پاس آیا ہے اور (دین کو ہر پہلو سے) تمھارے لیے واضح کر رہا ہے تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس تو کوئی بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا آیا ہی نہیں۔ سو دیکھ لو، وہ بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا تمھارے پاس آ گیا ہے (کہ گرفت سے پہلے اللہ تم پر اپنی حجت پوری کر دے) اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا

---

[۳۲۴] یعنی اُس کا کسی کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں ہے کہ وہ ضرور اُس کی مغفرت کرے گا۔ جزا و سزا کا انحصار اُس کی مشیت پر ہے اور اُس کی مشیت اُس کے قانون کی پابند ہے۔ وہ اُس کے مطابق ہی لوگوں کے لیے جزا و سزا کا فیصلہ کرتا ہے۔

[۳۲۵] یعنی قیامت کی پیشی کے لیے کوئی اور بارگاہ نہیں ہے جس سے امیدیں وابستہ کی جائیں۔ تمھیں ہر حال میں اُسی کی طرف لوٹنا ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ
اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ
اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ⑳ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ
كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ㉑

ہے۔ ۱۹

(اپنے جرائم کی پاداش سے ڈرو، اے اہل کتاب) اور یاد کرو وہ واقعہ جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: میری قوم کے لوگو، اپنے اوپر اللہ کی اِس نعمت کا خیال کرو کہ اُس نے تم میں نبی بنائے اور تمھیں بادشاہ ٹھیرایا ہے[۳۲۶] اور تمھیں وہ کچھ دے دیا ہے جو دنیا والوں میں سے اُس نے کسی کو نہیں دیا ہے۔[۳۲۷] میری قوم کے لوگو، (اِس کے لیے) اُس مقدس سرزمین میں[۳۲۸] داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمھارے لیے لکھ دی ہے اور اپنی پیٹھ پر

---

[۳۲۶] اصل میں 'جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں فعل ہمارے نزدیک فیصلہ ٔفعل کے معنی میں ہے، یعنی نبی اور بادشاہ بنانے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ یہ وعدوں کی قطعیت کو ظاہر کرنے کے لیے ایک بلیغ اسلوب ہے۔ آیت کے الفاظ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ بادشاہی کا منصب ایک اجتماعی منصب ہے جو پوری قوم کو دیا جاتا ہے۔ اِس میں کسی شخص یا خاندان کے استبداد اور مطلق العنانی کے لیے ہرگز کوئی گنجایش نہیں ہے۔ چنانچہ نبیوں کے لیے تو فرمایا ہے کہ 'جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ'، لیکن بادشاہی کے لیے 'جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا' کی تعبیر اختیار فرمائی ہے۔

[۳۲۷] اِس سے مراد شہادت علی الناس اور دنیا کی امامت کا وہ منصب ہے جس کے لیے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ذریت کو بالکل اُسی طرح منتخب کیا گیا، جس طرح اللہ تعالیٰ بنی آدم میں سے

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا

اُلٹے نہ پھرو، ورنہ نامراد ہو جاؤ گے۔[۳۲۹] اُنھوں نے جواب دیا: موسیٰ، اُس میں بڑے

بعض ہستیوں کو نبوت و رسالت کے لیے منتخب کرتا ہے۔

۳۲۸ـ اِس سے فلسطین کا علاقہ مراد ہے۔ اِس کو مقدس کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ذریت ابراہیم میں سے جس طرح بنی اسمٰعیل کی دعوت کے لیے سرزمین عرب کا انتخاب کیا گیا، اُسی طرح بنی اسحٰق کی دعوت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اِس علاقے کا انتخاب فرمایا اور اِس کو یہ تقدس بخشا کہ لوگ علم و عمل کی پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے اِس سرزمین کی طرف رجوع کریں۔ چنانچہ اِسی کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہاں وہ مسجد تعمیر ہوئی جسے بیت المقدس کہا جاتا ہے۔

۳۲۹ـ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے یہ تقریر اُس موقع پر کی ہے، جب اُنھوں نے دشت فاران میں بنی اسرائیل کو فلسطین پر حملے کی ہدایت فرمائی ہے۔ یہ حملہ اِس لیے ضروری تھا کہ فلسطین کے علاقے کو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی میراث کا علاقہ قرار دے کر اُنھیں حکم دیا تھا کہ اِس علاقے کو اپنی دعوت کا مرکز بنائیں۔ نبیوں کی قیادت میں جو حکومت قائم ہوتی ہے، وہ چونکہ براہ راست اللہ کی حکومت ہوتی ہے، اِس لیے اُس کو جس طرح اتمام حجت کے بعد لوگوں کی جزا و سزا کا حق حاصل ہو جاتا ہے، اُسی طرح یہ حق بھی آپ سے آپ حاصل ہو جاتا ہے کہ جس علاقے سے چاہے، لوگوں کی حکومت ختم کر کے اُس میں اپنی حکومت قائم کر دے۔ اِس کا عام انسانوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اُن کی حکومت کو یہ حق نہ حاصل ہے اور نہ کسی طرح حاصل ہو سکتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی یہ تقریر اگرچہ یہاں بالاجمال نقل ہوئی، لیکن غور کیجیے تو اِس میں وہ تمام پہلو موجود ہیں جو اِس موقع پر حوصلہ دینے اور پست حوصلگی کے برے انجام سے لوگوں کو خبردار کرنے کے لیے ضروری تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے اُن افضال و عنایات کا حوالہ دیا جو مصر سے خروج کے وقت سے لے کر اب تک برابر سایے کی طرح بنی اسرائیل کے ساتھ رہے، اُن قطعی اور

حَتّٰی یَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿۲۲﴾
قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمَا ادْخُلُوْا

زبردست لوگ رہتے ہیں، ہم اُس میں ہرگز داخل نہ ہوں گے، جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ ہاں، اگر وہ نکل جائیں تو ہم یقیناً داخل ہو جائیں گے۔[۳۳۰] اِن ڈرنے والوں میں دو شخص، البتہ ایسے تھے جن پر خدا کی عنایت تھی،[۳۳۱] اُنھوں نے کہا: تم (اِس شہر

حتمی وعدوں کا حوالہ دیا جو سلسلۂ نبوت کے اجرا اور بنی اسرائیل کو ایک عظیم حکمران قوم بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمائے، اُس میراث کا حوالہ دیا جو ایک شاداب و زرخیز علاقہ کی شکل میں اُن کو ملنے والی تھی اور جس کو اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے لکھ دیا تھا۔ اِن تمام وعدوں اور یقین دہانیوں کے ساتھ اُن کو ارض مقدس پر حملے کی دعوت دی اور ساتھ ہی بزدلی اور پست حوصلگی کے انجام بد سے بھی آگاہ کر دیا کہ قدم پیچھے ہٹایا تو بالکل ہی نامراد ہو کر رہ جاؤ گے۔ پیچھے مصر کی غلامی ہے اور آگے کے لیے ہمت نہ کی تو یہ صحرا گردی ہے جس میں مرکھپ کر فنا ہو جاؤ گے۔“

(تدبر قرآن ۲/۴۸۸)

۳۳۰۔ بائیبل کی کتاب گنتی باب ۱۳، ۱۴ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے یہ باتیں اُس وقت کہیں، جب بارہ سرداروں کی اُس جماعت نے اپنی رپورٹ آکر پیش کی جو موسیٰ علیہ السلام نے حملے سے پہلے علاقے کے حالات دریافت کرنے کے لیے بھیجی تھی۔ بائیبل میں یہ رپورٹ اِس طرح نقل ہوئی ہے:

”...وہ ملک جس کا حال دریافت کرنے کو ہم اُس میں سے گزرے، ایک ایسا ملک ہے جو اپنے باشندوں کو کھا جاتا ہے اور وہاں جتنے آدمی ہم نے دیکھے، وہ سب بڑے قد آور ہیں، اور ہم نے وہاں بنی عناق کو بھی دیکھا جو جبار ہیں اور جباروں کی نسل سے ہیں اور ہم تو اپنی ہی نگاہ میں ایسے تھے جیسے ٹڈے ہوتے ہیں اور ایسے ہی اُن کی نگاہ میں تھے۔“ (گنتی ۱۳: ۳۲-۳۳)

۳۳۱۔ اصل میں ’رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ’رَجُلٰنِ‘ (دو

عَلَیۡھِمُ الۡبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلۡتُمُوۡہُ فَاِنَّکُمۡ غٰلِبُوۡنَ ۬ۚ وَعَلَی اللّٰہِ فَتَوَکَّلُوۡۤا اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲۳﴾ قَالُوۡا یٰمُوۡسٰۤی اِنَّا لَنۡ نَّدۡخُلَھَاۤ

کے) لوگوں پر چڑھائی کر کے اِس کے دروازے میں گھس جاؤ۔ پھر جب اُس میں گھس جاؤ گے تو تمھی غالب رہو گے اور اللہ ہی پر بھروسا کرو، اگر تم اُس کے ماننے والے ہو۔[۳۳۲] لیکن

شخص) سے مراد یوشع اور کالب ہیں جو اُس مہم کے ارکان تھے جو فلسطین کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجی گئی تھی اور 'الَّذِیۡنَ یَخَافُوۡنَ' کے الفاظ بنی اسرائیل کے لیے آئے ہیں جو بنی عناق کے خوف سے ہمت ہار بیٹھے تھے اور اُن پر خوف اور بزدلی کی موت طاری ہو گئی تھی۔ اِس آیت میں عام طور پر لوگوں نے 'یَخَافُوۡنَ' کے مفعول کو محذوف مانا ہے، یعنی 'یَخَافُوۡنَ اللّٰہَ'، وہ اللہ سے ڈرنے والوں میں سے تھے، لیکن دو وجہ سے یہ تاویل محل نظر ہے۔ استاذ امام نے اِن کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "...ایک تو یہ کہ یہ موقع مفعول کے اظہار کا تھا نہ کہ اُس کے حذف کا، اِس لیے کہ یہاں التباس پیدا ہو سکتا ہے اور التباس کے مواقع میں اظہار مستحسن ہے نہ کہ حذف۔ دوسری یہ کہ اِس صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ اُس وقت خدا سے ڈرنے والوں کی ایک جماعت موجود تھی جن کے اندر یوشع اور کالب بھی تھے۔ اگر یہ بات ہے تو انعام الٰہی کی تخصیص اِنھی دو حضرات کے لیے کیوں ہوئی؟ پھر تو 'اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡھِمَا' کی جگہ 'اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡھِمۡ' ہونا تھا۔"
>
> (تدبر قرآن ۲/ ۴۸۹)

۳۳۲ یہ اُس تقریر کا خلاصہ ہے جو یوشع اور کالب نے اُس موقع پر کی، جب پوری قوم ہمت ہار چکی تھی۔ بائیبل میں یہ واقعہ اِس طرح بیان ہوا ہے:

> "اور نون کا بیٹا یشوع اور یفنّہ کا بیٹا کالب جو اُس ملک کا حال دریافت کرنے والوں میں سے تھے، اپنے اپنے کپڑے پھاڑ کر بنی اسرائیل کی ساری جماعت سے کہنے لگے کہ وہ ملک جس کا حال دریافت کرنے کو ہم اُس میں سے گزرے، نہایت اچھا ملک ہے۔ اگر خدا ہم سے

اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿٢٤﴾

اُنھوں نے پھر یہی کہا کہ موسیٰ، جب تک وہ وہاں موجود ہیں، ہم اُس میں ہرگز کبھی داخل نہ ہوں گے، اِس لیے تم اور تمھارا پروردگار، دونوں جاؤ اور لڑو، ہم تو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔[۳۳۳] ۲۰-۲۴

راضی رہے تو وہ ہم کو اُس ملک میں پہنچائے گا اور وہی ملک جس میں دودھ اور شہد بہتا ہے، ہم کو دے گا۔ فقط اتنا ہو کہ تم خداوند سے بغاوت نہ کرو اور نہ اُس ملک کے لوگوں سے ڈرو۔ وہ تو ہماری خوراک ہیں۔ اُن کی پناہ اُن کے سر پر سے جاتی رہی ہے اور ہمارے ساتھ خداوند ہے، سو اُن کا خوف نہ کرو۔'' (گنتی ۱۴: ۶-۹)

استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس تقریر پر تبصرہ فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...اِس میں شبہ نہیں کہ جب پوری قوم کی قوم اِس طرح ہمت ہار بیٹھے، جس طرح بنی اسرائیل ہار بیٹھے تو بہادر سے بہادر آدمی کے اعصاب بھی جواب دے جاتے ہیں۔ بڑا ہی باوفا اور صداقت شعار ہوتا ہے وہ مرد حق جو ایسے نازک موقع پر بھی اپنی وفاداری اور صداقت شعاری نباہ لے جائے۔ یوشع اور کالب کے کردار کا یہی پہلو ہے جس کے سبب سے عہد و میثاق کی اِس سورہ میں قرآن نے اِن کا ذکر کر کے اِن کو زندۂ جاوید بنا دیا تاکہ جو لوگ خدا کی راہ پر چلنے کا ارادہ کریں، وہ اُن کے اِس مثالی کردار سے یہ سبق لیں کہ جب سب سو جائیں تو جاگنے والے کس طرح جاگتے ہیں اور جب سب مر جاتے ہیں تو زندہ رہنے والے کس طرح زندہ رہتے ہیں۔ قرآن نے یہاں بزدلوں کے اندر کے بہادروں اور مردوں کے اندر کے زندوں کو اِس لیے نمایاں کیا ہے کہ بہادروں کے اندر بہادر اور زندوں کے اندر زندہ تو بہت نظر آ جائیں گے، لیکن وہ زندگی بخش ہستیاں بہت کم یاب ہیں جو مردوں کو زندگی بخشتی ہیں، اگرچہ اِسی راہ میں اُنھیں خود اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھونے پڑ جائیں۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۴۸۹-۴۹۰)

۳۳۳؎ یہ بنی اسرائیل کی طرف سے آخری جواب ہے۔ بائیبل میں یہ جواب اِن لفظوں میں تو

المائدة
٥

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ
الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ﴿٢٥﴾ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً ۚ
یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ فَلَا تَاْسَ عَلَی الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ﴿٢٦﴾

اِس پر موسیٰ نے دعا کی: پروردگار، میری ذات اور میرے بھائی کے سوا کسی پر میرا کوئی اختیار نہیں ہے، لہٰذا تو ہمیں اور اِن نافرمان لوگوں کو الگ الگ کر دے۔[۳۳۴] فرمایا: یہی بات ہے تو یہ سرزمین چالیس برسوں کے لیے اِن پر حرام ہے، یہ زمین میں مارے مارے پھریں گے، اِس لیے (اب) اِن نافرمانوں پر افسوس نہ کرو۔[۳۳۵] ۲۵-۲۶

نقل نہیں ہوا، مگر بنی اسرائیل کے گریہ و ماتم کا ذکر جس طریقے سے ہوا ہے، اُس سے واضح ہے کہ یوشع اور کالب کی اِس یقین دہانی کے جواب میں کہ ''ہمارے ساتھ خداوند ہے، سو اِن کا خوف نہ کرو''، اُنھوں نے یقیناً وہی بات کہی ہوگی جو قرآن نے یہاں نقل کی ہے۔

۳۳۴۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے اِس بات کی درخواست ہے کہ اُنھیں اِس نالائق قوم کی قیادت کے بارِ عظیم سے سبک دوش کر دیا جائے۔

۳۳۵۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے سبک دوشی کی درخواست تو قبول نہیں کی گئی، اِس لیے کہ اِس صورت میں تمام بنی اسرائیل ہلاک کر دیے جاتے، مگر اُن کے لیے سزا کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ بائیبل میں یہ فیصلہ اِس طرح بیان ہوا ہے:

> ''اور خداوند نے موسیٰ اور ہارون سے کہا: میں کب تک اِس خبیث گروہ کی جو میری شکایت کرتی رہتی ہے، برداشت کروں؟ بنی اسرائیل جو میرے برخلاف شکایتیں کرتے رہتے ہیں، میں نے وہ سب شکایتیں سنی ہیں۔ سو تم اُن سے کہہ دو: خداوند کہتا ہے، مجھے اپنی حیات کی قسم ہے کہ جیسا تم نے میرے سنتے کہا ہے، میں تم سے ضرور ویسا ہی کروں گا۔ تمھاری لاشیں اِسی بیابان میں پڑی رہیں گی اور تمھاری ساری تعداد میں سے، یعنی بیس برس سے لے کر اُس سے

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ م اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ

(تمھاری مخالفت میں اب یہ آمادۂ فساد ہیں، اے پیغمبر)، اِنھیں آدم کے دو بیٹوں کا قصہ سناؤ،[۳۳۶] ٹھیک ٹھیک،[۳۳۷] جب اُن دونوں نے قربانی پیش کی تو اُن میں سے ایک کی

> اوپر اوپر کی عمر کے تم سب جتنے گنے گئے اور مجھ پر شکایت کرتے رہے، اُن میں سے کوئی اُس ملک میں جس کی بابت میں نے قسم کھائی تھی کہ تم کو وہاں بساؤں گا، جانے نہ پائے گا، سوا یفنہ کے بیٹے کالب اور نون کے بیٹے یشوع کے۔ اور تمھارے بال بچے جن کی بابت تم نے یہ کہا کہ وہ تو لوٹ کا مال ٹھیریں گے، اُن کو میں وہاں پہنچاؤں گا اور جس ملک کو تم نے حقیر جانا، وہ اُس کی حقیقت پہچانیں گے۔ اور تمھارا یہ حال ہو گا کہ تمھاری لاشیں اِسی بیابان میں پڑی رہیں گی اور تمھارے لڑکے بالے چالیس برس تک بیابان میں آوارہ پھرتے اور تمھاری زناکاریوں، (یعنی بدعہدیوں) کا پھل پاتے رہیں گے۔" (گنتی ۱۴: ۲۶-۳۳)

استاذ امام لکھتے ہیں:

> "...تاریخ بنی اسرائیل کے اِس واقعے نے اُن کے اُس زعم کی پوری پوری تردید کر دی جس کا حوالہ اوپر گزرا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے محبوب اور چہیتے سمجھتے ہیں، اِس وجہ سے عمل و اطاعت کی ذمہ داریوں سے اپنے کو بری خیال کیے بیٹھے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تمھارا یہ گمان کچھ حقیقت رکھتا ہے تو موسیٰ کی موجودگی میں تو تم اور بھی زیادہ چہیتے تھے، پھر اُس وقت ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے ڈگ ڈال دیے تھے تو خدا خود تمھیں اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے جاتا اور فلسطین کا بادشاہ بنا دیتا۔ پھر خدا کی جنت کو تم یونہی مفت میں حاصل کرنے کے خبط میں کیوں مبتلا ہو!" (تدبر قرآن ۲/ ۴۹۲)

۳۳۶؎ اصل میں لفظ 'نَبَاَ' آیا ہے۔ عربی زبان میں یہ کسی اہم واقعے یا حادثے کی خبر کے لیے آتا ہے۔ خدا کی زمین پر ایک حق پرست کے خون ناحق کا یہ پہلا واقعہ ہے، اِس لیے قرآن نے اِس کو اِس لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ط قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ط قَالَ اِنَّمَا

قربانی قبول کر لی گئی اور دوسرے کی قبول نہیں کی گئی۔[۳۳۸] (پھر جس کی قربانی قبول نہیں کی گئی)، اُس نے کہا: میں تجھے مار ڈالوں گا۔[۳۳۹] دوسرے نے جواب دیا: اللہ تو اپنے

۳۳۷۔ یعنی بے کم و کاست اور ٹھیک اُن حقائق کے مطابق جو اُس سے متعلق ہیں۔

۳۳۸۔ اصل میں لفظ 'قُرْبَان' استعمال ہوا ہے۔ یہ صدقہ اور قربانی، دونوں کے لیے آتا ہے۔ اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے جو چیز بھی اُس کے حضور میں پیش کی جائے، وہ قربان ہے۔ یہاں قرآن نے یہ وضاحت نہیں کی کہ ہابیل اور قابیل کو قربانی کی قبولیت یا عدم قبولیت کا پتا کس طرح چلا۔ اِس کی ایک صورت قرآن مجید نے سورۂ آل عمران (۳) کی آیت ۱۸۳ میں یہ بیان فرمائی ہے کہ آسمان سے ایک آگ اترتی اور قبولیت کی علامت کے طور پر قربانی کو کھا لیتی تھی۔ بائیبل کا بیان، البتہ مختلف ہے، اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِس کی خبر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی تھی:

> ”...اور خداوند نے ہابل کو اور اُس کے ہدیے کو منظور کیا، پر قائن کو اور اُس کے ہدیے کو منظور نہ کیا، اِس لیے قائن نہایت غضب ناک ہوا اور اُس کا منہ بگڑا۔ اور خداوند نے قائن سے کہا: تو کیوں غضب ناک ہوا، اور تیرا منہ کیوں بگڑا ہوا ہے؟ اگر تو بھلا کرے تو کیا تو مقبول نہ ہوگا؟ اور اگر تو بھلا نہ کرے تو گناہ دروازے پر دبکا بیٹھا ہے اور تیرا مشتاق ہے۔ پر تو اُس پر غالب آ۔“ (پیدایش ۴: ۴-۷)

۳۳۹۔ یعنی بجائے اِس کے کہ وہ اپنی نیت کے کھوٹ کی طرف متوجہ ہوتا اور توبہ و اصلاح کے جذبے سے اپنے پروردگار کی طرف لوٹتا، اُس پر حسد کا دورہ پڑا اور اِس غصے میں کہ اُس کی قربانی قبول نہیں ہوئی، ہابیل کے درپے انتقام ہو گیا، دراں حالیکہ اُس کے قبول نہ ہونے میں ہابیل کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ بعینہٖ وہی ذہنیت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں یہود کی طرف سے ظاہر ہوئی۔ اپنے جرائم کی طرف متوجہ ہونے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرنے کے بجائے کہ نبوت کا

يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (۲۷) لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ
مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ
الْعٰلَمِيْنَ (۲۸) اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ

اُنھی بندوں کی قربانی قبول کرتا ہے جو اُس سے ڈرنے والے ہوں[۳۴۰]۔ تم مجھے قتل کرنے کے لیے اپنا ہاتھ مجھ پر اٹھاؤ گے تو بھی میں تمھارے قتل کے لیے تم پر اپنا ہاتھ اٹھانے والا نہیں ہوں، میں اللہ رب العٰلمین سے ڈرتا ہوں[۳۴۱]۔ میں چاہتا ہوں کہ (تم نے میرے قتل کا ارادہ کر لیا ہے تو) اپنے اور میرے گناہ کا بار تمھی لے جاؤ[۳۴۲] اور

منصب اُن سے لے کر بنی اسمٰعیل کو کیوں دیا گیا ہے، وہ اپنے اِن بھائیوں کے درپے آزار ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے قتل کے منصوبے بنانے لگے۔ قرآن نے یہ سرگذشت اِسی بنا پر اُن کو سنانے کے لیے کہا ہے۔

۳۴۰۔ ہابیل نے یہ بات اپنے بھائی کو اصل حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے لیے کہی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”...مطلب یہ ہے کہ تم اِس غصے میں کہ تمھاری قربانی قبول نہیں ہوئی، میرے قتل کے درپے ہو گئے ہو، حالاں کہ اِس میں نہ قصور میرا ہے نہ خداوند کا ہے، بلکہ سراسر قصور تمھارا اور تمھاری قربانی کا ہے۔ خداوند کے ہاں قربانی درخور قبول وہ ٹھیرتی ہے جو خدا سے ڈرنے والے بندے قربانی کے آداب و شرائط کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یہ ضابطہ جس طرح تمھارے لیے ہے، اُسی طرح میرے لیے بھی ہے تو قربانی رد ہونے کا غم و غصہ ہے تو فکر تقویٰ کی کرو، نہ کہ میرے قتل کرنے کی۔ میرے قتل کرنے سے تمھاری قربانی کی قبولیت کی راہ کس طرح کھلے گی۔“
>
> (تدبر قرآن ۲/ ۴۹۷)

۳۴۱۔ یعنی میں یہ جان لینے کے باوجود کہ تم میرے قتل کے درپے ہو، تمھارے قتل کے لیے

اَصۡحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيۡنَ ۚ ﴿۲۹﴾
فَطَوَّعَتۡ لَهٗ نَفۡسُهٗ قَتۡلَ اَخِيۡهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصۡبَحَ
مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۳۰﴾ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبۡحَثُ فِى الۡاَرۡضِ

دوزخی بن کر رہو۔ اِس طرح کے ظالموں کی یہی سزا ہے۔ ۲۷-۲۹

(اِس پر بھی وہ باز نہیں آیا اور) اُس کے نفس نے بالآخر اپنے بھائی کے قتل پر اُس کو آمادہ کر لیا[۳۴۳] اور اُسے مار کر وہ اُن لوگوں میں شامل ہو گیا جو نقصان اٹھانے والے ہیں۔[۳۴۴]

پہل نہیں کروں گا، اِس لیے کہ میں اُس خدا سے ڈرتا ہوں جو کائنات کا پروردگار ہے اور جس نے انسان کے جان و مال اور آبرو کو حرمت عطا فرمائی ہے۔

۳۴۲؎ اصل میں 'اَنۡ تَبُوۡٓاَ بِاِثۡمِیۡ وَاِثۡمِكَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ عربیت کی رو سے دونوں میں مضاف محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے ہوئے اگر کوئی نقصان تمھیں پہنچ جائے تو اِس کا گناہ بھی تمھارے سر ہی ہوگا، اِس لیے کہ اِس کا سبب میں نہیں، بلکہ تمھی ہو گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...یہ اُس اصول عدل کی طرف اشارہ ہے جو ایک حدیث میں 'فعلی البادی مالم یعتد المظلوم*' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ یعنی اگر مظلوم نے کوئی زیادتی نہیں کی ہے تو جو کچھ اُسے اپنی عزت کی حفاظت کے لیے کرنا پڑے، اُس کا بار گناہ پہل کرنے والے پر ہے۔ 'بِاِثۡمِیۡ' کے ساتھ 'بِاِثۡمِكَ' مماثلت کے اُس اصول پر فرمایا ہے جو عربی زبان میں نہایت معروف ہے۔ مثلاً 'دناهم کما دانوا' یا 'جزاء سیئة سیئة مثلها'۔'' (تدبر قرآن ۲/۴۹۸)

۳۴۳؎ اِس جملے سے قرآن نے اُس اندرونی کشمکش کو نمایاں کر دیا ہے جو اول اول اِس ارادۂ قتل سے قابیل کے اندر پیدا ہوئی۔

---

* مسلم، رقم ۶۶۸۳۔

لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰۤى اَعَجَزْتُ
اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ
فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ۚ ۛ ﴿۳۱﴾

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ
نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ
جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَقَدْ

پھر اللہ نے ایک کوے کو بھیجا جو زمین کھودنے لگا تاکہ اُس کو بتائے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کس طرح چھپائے۔[۳۴۵] (یہ دیکھ کر) وہ بولا: ہاے میری کم بختی، میں اِس کوے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش ہی چھپا لیتا۔ سو (اِس پر) وہ بے حد شرمندہ ہوا۔[۳۴۶] ۳۰-۳۱

(انسان کی) یہی (سرکشی) ہے جس کی وجہ سے ہم نے (موسیٰ کو شریعت دی تو اُس میں) بنی اسرائیل پر بھی اپنا یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ جس نے کسی ایک انسان کو قتل کیا، اِس کے بغیر کہ اُس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں کوئی فساد برپا کیا ہو تو اُس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی ایک انسان کو زندگی بخشی، اُس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی

۳۴۴؎ یعنی خیر و شر کی اِس کشمکش میں شر فتح مند رہا اور وہ خود اُس سے مغلوب ہو کر ہمیشہ کے لیے نامراد ہو گیا۔

۳۴۵؎ اللہ تعالیٰ کی طرف کوا بھیجنے کی یہ نسبت درحقیقت اُس سنت الٰہی کی نسبت ہے جس کے تحت خدا کی یاد سے غافل ہو جانے والے اِسی طرح شیطان کے حوالے کر دیے جاتے اور کووں سے الہام پاتے ہیں۔

۳۴۶؎ ہابیل و قابیل کی اِس سرگذشت سے واضح ہے کہ دین و اخلاق کے بنیادی تصورات

جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُنَا بِالۡبَيِّنٰتِ ز ثُمَّ اِنَّ كَثِيۡرًا مِّنۡهُمۡ بَعۡدَ ذٰلِكَ فِى الۡاَرۡضِ لَمُسۡرِفُوۡنَ ﴿۳۲﴾

بخش دی۔[۳۴۷] (پھر یہی نہیں، اِس کے ساتھ) یہ بھی حقیقت ہے کہ (اِن پر اتمام حجت کے لیے) ہمارے پیغمبر اِن کے پاس نہایت واضح نشانیاں لے کر آئے، لیکن اِس کے باوجود اِن میں سے بہت سے ہیں جو زمین میں زیادتیاں کرنے والے ہیں۔[۳۴۸] ۳۲

تک انسان کسی ارتقا کے ذریعے سے نہیں پہنچا، بلکہ یہ ابتدا ہی سے اُس کو تعلیم کر دیے گئے تھے۔

[۳۴۷] انبیا علیہم السلام کی شریعت میں یہ قانون ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ یہود کا حوالہ محض اُن کی شقاوت و شرارت کو نمایاں کرنے کے لیے آیا ہے۔ اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ بنی اسرائیل کے لیے خاص کوئی قانون ہے۔ چنانچہ نوح علیہ السلام اور اُن کی ذریت کو جو ہدایت اِس معاملے میں کی گئی تھی، وہ بائیبل کی کتاب پیدایش میں اِس طرح مذکور ہے:

> ”...آدمی کی جان کا بدلہ آدمی سے اور اُس کے بھائی بند سے لوں گا۔ جو آدمی کا خون کرے، اُس کا خون آدمی سے ہوگا، کیونکہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا ہے۔“ (۹: ۵-۶)

اِس قانون کی وضاحت آگے سلسلۂ بیان کے آخر میں ہوگی۔ قتل نفس کی سنگینی کو واضح کرنے کے لیے قصاص کا اصل فلسفہ یہاں بیان کر دیا ہے۔ اِس فلسفے کی رو سے جو فرائض اِس قانون کے ماننے والوں پر عائد ہوتے اور جن ذمہ داریوں کے وہ مکلّف ٹھیرتے ہیں، وہ استاذ امام امین احسن اصلاحی کے الفاظ میں یہ ہیں:

> ”ایک یہ کہ ہر حادثۂ قتل پوری قوم میں ایک ہلچل پیدا کر دے۔ جب تک اُس کا قصاص نہ لے لیا جائے، ہر شخص یہ محسوس کرے کہ وہ اُس تحفظ سے محروم ہو گیا ہے جو اُس کو اب تک حاصل تھا۔ قانون ہی سب کا محافظ ہوتا ہے۔ اگر قانون ہدم ہو گیا تو صرف مقتول ہی قتل نہیں ہوا، بلکہ ہر شخص قتل کی زد میں ہے۔
>
> دوسری یہ کہ قاتل کا کھوج لگانا صرف مقتول کے وارثوں ہی کی ذمہ داری نہیں ہے، بلکہ

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ

(اِنھیں بتا دیا جائے کہ) جو اللہ اور اُس کے رسول سے لڑیں گے اور اِس طرح زمین

> پوری جماعت کی ذمہ داری ہے، اِس لیے کہ قاتل نے صرف مقتول ہی کو قتل نہیں کیا، بلکہ سب کو قتل کیا ہے۔
>
> تیسری یہ کہ کوئی شخص اگر کسی کو خطرے میں دیکھے تو اُس کو پرایا جھگڑا سمجھ کر نظر انداز کرنا اُس کے لیے جائز نہیں ہے، بلکہ اُس کی حفاظت و حمایت تا بہ حد مقدور اُس کے لیے ضروری ہے، اگرچہ اِس کے لیے اُسے خود جوکھم برداشت کرنی پڑے۔ اِس لیے کہ جو شخص کسی مظلوم کی حمایت و مدافعت میں سینہ سپر ہوتا ہے، وہ صرف مظلوم ہی کی حمایت میں سینہ سپر نہیں ہوتا، بلکہ تمام خلق کی حمایت میں سینہ سپر ہوتا ہے جس میں وہ خود بھی شامل ہے۔
>
> چوتھی یہ کہ اگر کوئی شخص کسی قتل کو چھپاتا ہے یا قاتل کے حق میں جھوٹی گواہی دیتا ہے یا قاتل کا ضامن بنتا ہے یا قاتل کو پناہ دیتا ہے یا قاتل کی دانستہ وکالت کرتا ہے یا دانستہ اُس کو جرم سے بری کرتا ہے، وہ گویا خود اپنے اور اپنے باپ، بھائی، بیٹے کے قاتل کے لیے یہ سب کچھ کرتا ہے، کیونکہ ایک کا قاتل سب کا قاتل ہے۔
>
> پانچویں یہ کہ کسی مقتول کے قصاص کے معاملے میں مقتول کے وارثوں یا حکام کی مدد کرنا بھی، درحقیقت مقتول کو زندگی بخشنا ہے، اِس لیے کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ قصاص میں زندگی ہے۔" (تدبر قرآن ۲/ ۵۰۳)

یہ آیت اِس معاملے میں بھی بالکل صریح ہے کہ ریاست اور قانون کسی شخص کو موت کی سزا دینا چاہیں تو وہ بھی اُنھی دو صورتوں میں دی جا سکتی ہے جو آیت میں بیان کر دی گئی ہیں۔ اُن کے سوا یہ سزا کسی جرم کی پاداش میں بھی نہیں دی جا سکتی۔

۳۴۸ یعنی پہلے بھی حدود سے تجاوز کرتے رہے ہیں، اب بھی کر رہے ہیں اور خدا کے پیغمبروں کی طرف سے اتمام حجت کے باوجود سرکشی اور فساد کی وہ روش چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں جو اِنھوں نے ہمیشہ سے اختیار کر رکھی ہے۔

فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ

میں فساد پیدا کرنے کی کوشش کریں گے،[۳۴۹] اُن کی سزا پھر یہی ہے کہ عبرت ناک طریقے سے قتل کیے جائیں[۳۵۰] یا سولی پر چڑھائے جائیں[۳۵۱] یا اُن کے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹ

۳۴۹۔ اللہ کا رسول دنیا میں موجود ہو اور لوگ اُس کی حکومت میں اُس کے کسی حکم یا فیصلے کے خلاف سرکشی اختیار کر لیں تو یہ اللہ و رسول سے لڑائی ہے۔ اِسی طرح زمین میں فساد پیدا کرنے کی تعبیر ہے۔ یہ اُس صورت حال کے لیے آتی ہے، جب کوئی شخص یا گروہ قانون سے بغاوت کر کے لوگوں کی جان و مال، آبرو اور عقل و رائے کے خلاف برسر جنگ ہو جائے۔ چنانچہ قتل دہشت گردی، زنا، زنا بالجبر اور چوری ڈاکا بن جائے یا لوگ بدکاری کو پیشہ بنا لیں یا کھلم کھلا اوباشی پر اتر آئیں یا اپنی آوارہ منشی، بدمعاشی اور جنسی بے راہ روی کی بنا پر شریفوں کی عزت و آبرو کے لیے خطرہ بن جائیں یا نظم ریاست کے خلاف بغاوت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں یا اغوا، تخریب، ترہیب اور اِس طرح کے دوسرے سنگین جرائم سے حکومت کے لیے امن و امان کا مسئلہ پیدا کر دیں تو وہ اِسی فساد فی الارض کے مجرم ہوں گے۔

آیت میں اِس کے لیے 'یَسْعَوْنَ' اور 'یُحَارِبُوْنَ' وغیرہ کی صورت میں جمع کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جرم اگر جتھا بنا کر ہوا ہے تو اُس کی سزا بھی انفرادی حیثیت سے نہیں، بلکہ اُس جتھے کو جتھے ہی کی حیثیت سے دی جائے گی۔ چنانچہ مجرموں کا کوئی گروہ اگر فساد فی الارض کے طریقے پر قتل، اغوا، زنا، تخریب، ترہیب اور اِس طرح کے دوسرے جرائم کا مرتکب ہوا ہے تو اِس کی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے کہ متعین طور پر جرم کا ارتکاب کن ہاتھوں سے ہوا اور کن سے نہیں ہوا ہے، بلکہ جتھے کا ہر فرد اِس میں شریک سمجھا جائے گا اور اُس کے ساتھ معاملہ بھی لازماً اِسی حیثیت سے ہوگا۔

۳۵۰۔ اصل میں 'اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن کے معنی یہ ہیں کہ اللہ و رسول سے محاربہ

وَ اَرۡجُلُهُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ اَوۡ یُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمۡ خِزۡیٌ فِی

دیے جائیں[۳۵۲] یا اُنھیں علاقہ بدر کر دیا جائے[۳۵۳]۔ یہ اُن کے لیے دنیا میں رسوائی ہے[۳۵۴] اور

اور فساد فی الارض کے یہ مجرم صرف قتل ہی نہیں، بلکہ عبرت ناک طریقے سے قتل کر دیے جائیں۔ اِس کی دلیل یہ ہے کہ ’قتل‘ یہاں ’تقتیل‘ کی صورت میں آیا ہے۔ بنا میں یہ زیادت نفس فعل میں شدت اور مبالغہ کے لیے ہوئی ہے۔ اِس وجہ سے ’تقتیل‘ یہاں ’شر تقتیل‘ کے مفہوم میں ہے۔ چنانچہ حکم کا تقاضا یہ ہوگا کہ اِن مجرموں کو ایسے طریقے سے قتل کیا جائے جو دوسروں کے لیے عبرت انگیز اور سبق آموز ہو۔ رجم، یعنی سنگ ساری بھی اِسی کے تحت داخل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں اوباشی کے بعض مجرموں کو یہ سزا اِسی آیت کے حکم کی پیروی میں دی ہے۔

۳۵۱ یہ سزا ’صَلْب‘ سے ’تفعیل‘ میں بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: ’اَوْ یُصَلَّبُوْٓا‘، یعنی ایسے لوگوں کو صرف سولی ہی نہ دی جائے، بلکہ عبرت ناک طریقے سے سولی دی جائے۔ یہ سولی وہ چوبی آلہ ہے جس پر مجرم کے ہاتھوں اور پاؤں میں میخیں ٹھونک کر اُسے لٹکا دیتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اُسی پر لٹکا ہوا جان دے دیتا ہے۔ سزا کی یہ صورت کچھ کم عبرت انگیز نہیں ہے، لیکن آیت میں لفظ ’یُصَلَّبُوْٓا‘ کا تقاضا ہے کہ اِس کے لیے بھی وہ طریقے اختیار کیے جائیں جو زیادہ دردناک اور زیادہ عبرت انگیز ہوں۔

۳۵۲ بے ترتیب کاٹ دینے کا یہ حکم بھی عبرت انگیزی ہی کے نقطۂ نظر سے ہے اور اِس کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِس طرح کے کسی مجرم کی اگر جان بخشی بھی کی جائے تو اِس طرح کی جائے کہ اُسے عبرت کا ایک نمونہ بنا کر اُس کی شر انگیزی کے تمام اسلحہ بالکل بے کار کر دیے جائیں۔

۳۵۳ یہ سب سے کم سزا ہے جو اِن مجرموں کے لیے بیان ہوئی ہے۔ پہلی دو سزائیں مجرم کا خاتمہ کر دیتی ہیں۔ تیسری سزا کے نتیجے میں وہ ہاتھ پاؤں سے محروم ایک نمونۂ عبرت کے طور پر زندہ رہتا ہے اور یہ چوتھی اور آخری سزا اُس کے جسم و جان کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر محض اُس کے وطن

اور گھر بار سے اُسے محروم کرتی ہے۔ قرآن کے الفاظ کا تقاضا ہے کہ عام حالات میں یہ سزا اِسی صورت میں دی جائے، لیکن کسی وجہ سے اگر یہ ممکن نہ ہو تو مجرم کو کسی خاص علاقے میں پابند یا اُس کے گھر میں نظر بند کر دینے سے بھی حکم کا منشا یقیناً پورا ہو جائے گا۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ یہ اور اِس سے پہلے مذکور تمام سزائیں حرف 'اَوْ' کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن مجید نے حکومت کو اختیار دیا ہے کہ وہ جرم کی نوعیت، مجرم کے حالات اور جرم کے موجود اور متوقع اثرات کے لحاظ سے اِن میں سے جو سزا مناسب سمجھے، اِس طرح کے مجرموں کو دے سکتی ہے۔ تقتیل اور تصلیب جیسی سزاؤں کے ساتھ اِس میں نفی کی سزا اِس لیے رکھی گئی ہے کہ سزا میں انتہائی سختی کے ساتھ حالات کا تقاضا ہو تو مجرم کے ساتھ نرمی کے لیے بھی گنجایش باقی رکھی جائے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

> ”...اِس طرح کے حالات میں صرف اِسی امر کو ملحوظ نہیں رکھنا پڑتا ہے کہ جرم کرنے والے جتھے نے صرف مال کو نقصان پہنچایا ہے، بلکہ اِس سے بڑھ کر زمانہ، مقام اور جتھا بندی کرنے والے مجرموں کے عزائم اور اُن کے اثرات پر نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔ مثلاً، زمانہ جنگ یا بدامنی کا ہو تو اُس میں لازماً سخت اقدام کی ضرورت ہوگی۔ اِسی طرح مقام سرحدی یا دشمن کی سازشوں کا آماج گاہ ہو، تب بھی موثر کارروائی ضروری ہوگی۔ اگر شرارت کا سرغنہ کوئی بڑا خطرناک آدمی ہو اور اندیشہ ہو کہ اُس کو ڈھیل ملی تو بہتوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کو خطرہ پیش آ جائے گا، تب بھی حالات کے لحاظ سے موثر قدم اٹھانا پڑے گا۔ غرض اِس میں اصلی اہمیت جزوی واقعات کی نہیں، بلکہ بغاوت کے مجموعی اثر اور ملک و ملت کے مصالح کی ہے۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۵۰۶)

۳۵۴ یہ الفاظ اِس تنبیہ کے لیے آئے ہیں کہ اِس طرح کے مجرموں کو سزا دیتے وقت کسی شخص کے دل میں ہم دردی کے کوئی جذبات پیدا نہ ہوں۔ وہ پروردگار جو اُن کا خالق ہے، اِن جرائم کے بعد اُس کا فیصلہ یہی ہے کہ اُنھیں اِس دنیا میں بالکل رسوا کر دیا جائے۔ اِس سزا کا مقصد یہی ہے اور اِسے ہر حال میں پیش نظر رہنا چاہیے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...دنیا میں اِن کی یہ رسوائی دوسروں کے لیے ذریعۂ عبرت و بصیرت ہوگی اور اِس کے اثر

الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۳۳) اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا
مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۳۴)

آخرت میں اُن کے لیے ایک بڑا عذاب ہے، مگر اُن کے لیے نہیں جو تمھارے قابو پانے سے پہلے توبہ کر لیں۔ سو (اُن پر زیادتی نہ کرو اور) اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔[۳۵۵] ۳۳-۳۴

سے اُن لوگوں کے اندر بھی قانون کا ڈر اور احترام پیدا ہو گا جو یہ صلاحیت نہیں رکھتے کہ مجرد قانون کی افادیت و عظمت کی بنا پر اُس کا احترام کریں۔ موجودہ زمانے میں جرم اور مجرمین کے لیے فلسفہ کے نام سے جو ہمدردانہ اور رحم دلانہ نظریات پیدا ہو گئے ہیں، یہ اُنھی کی برکت ہے کہ انسان بظاہر جتنا ہی ترقی کرتا جاتا ہے، دنیا اتنی ہی جہنم بنتی جا رہی ہے۔ اسلام اِس قسم کے مہمل نظریات کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ اُس کا قانون ہوائی نظریات پر نہیں، بلکہ انسان کی فطرت پر مبنی ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/۵۰۷)

[۳۵۵] یعنی اِس طرح کے مجرم اگر حکومت کے کسی اقدام سے پہلے خود آگے بڑھ کر اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دیں تو اُن سے پھر عام مجرموں کا معاملہ کیا جائے گا۔ اِس صورت میں اُنھیں محاربہ یا فساد فی الارض کا مجرم قرار نہیں دیا جائے گا۔ استاذ امام نے لکھا ہے:

''... یہ خاص اختیارات صرف اُن باغیوں کے خلاف استعمال کیے جائیں گے جو حکومت کے حالات پر قابو پانے سے پہلے تک اپنی بغاوت پر اڑے رہے ہوں اور حکومت نے اپنی طاقت سے اُن کو مغلوب و مقہور کیا ہو۔ جو لوگ حکومت کے ایکشن سے پہلے ہی توبہ کر کے اپنے رویے کی اصلاح کر چکے ہوں، اُن کے خلاف اُن کے سابق رویے کی بنا پر اِس قسم کا کوئی اقدام جائز نہیں ہو گا، بلکہ اب اُن کے ساتھ عام قانون کے تحت معاملہ ہو گا۔ اگر اُن کے ہاتھوں عام شہریوں کے حقوق تلف ہوئے ہیں تو حتی الامکان اُن کی تلافی کرا دی جائے گی۔

آیت میں 'فَاعْلَمُوْٓا' کے لفظ کے زور کو اگر ذہن میں رکھیے تو یہ بات صاف نکلتی ہے کہ قابو

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْۤا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ
وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۳۵ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ
عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۳۶
يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ز

(یہ خدا کی شریعت ہے)۔ ایمان والو، تم (اِس کے بارے میں) خدا سے ڈرتے رہو، اُس کا تقرب ڈھونڈو اور اِس کے لیے اُس کی راہ میں برابر جدوجہد کرتے رہو[۳۵۶] تاکہ فلاح پاؤ۔ رہے وہ لوگ جو (پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے باوجود اِس کے) منکر ہیں تو اُنھیں اگر زمین کی ساری دولت حاصل ہو جائے اور اُس کے ساتھ اتنی ہی اور بھی، اِس لیے کہ اُسے فدیے میں دے کر وہ اپنے آپ کو روز قیامت کے عذاب سے چھڑا لیں تو اُن سے وہ قبول نہیں کی جائے گی اور اُنھیں دردناک سزا مل کر رہے گی۔ وہ آگ سے نکلنا چاہیں

میں آنے سے پہلے ہی توبہ و اصلاح کر لینے والوں کے معاملے میں حکومت کے لیے کوئی انتقامی کارروائی جائز نہیں ہے۔ خدا غفور اور رحیم ہے، جب وہ پکڑ سے پہلے توبہ و اصلاح کر لینے والوں کو معاف کر دیتا ہے تو اُس کے بندوں کا رویہ اِس سے الگ کیوں ہو؟‘‘

(تدبر قرآن ۲/ ۵۰۸)

[۳۵۶] اِس لیے کہ خدا سے قربت کا واسطہ یہی جدوجہد ہے۔ اِس کے سوا کسی دوسرے ذریعے سے یہ چیز حاصل نہیں ہو سکتی۔ اِس کے لیے اصل میں ’جَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں لفظ جہاد اپنے وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور اِس سے مراد ہر وہ سعی و جہد ہے جو خدا کے احکام کی پابندی، اُس کے دین کی اقامت، شریعت کی حفاظت اور اُس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کی جائے۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۷﴾
وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا
نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۳۸﴾ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ

گے، مگر اُس سے کبھی نکل نہ سکیں گے۔ اُن کے لیے وہاں دائمی عذاب ہے۔ ۳۵-۳۷

(یہ خدا کی شریعت ہے، اِسے مضبوطی سے پکڑو) اور چور مرد ہو یا عورت، (اُن کا جرم ثابت ہو جائے تو) اُن کے ہاتھ کاٹ دو[۳۵۷] اُن کے عمل کی پاداش میں اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا کے طور پر[۳۵۸] اور (یاد رکھو کہ) اللہ سب پر غالب ہے، وہ بڑی حکمت والا

---

[۳۵۷] اصل الفاظ ہیں: 'فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا'۔ لفظ 'يَد' کے قطعی اطلاق کی بنا پر ہاتھ ہمیشہ پونچے سے کاٹا جائے گا اور عمل اور پاداش عمل کی مناسبت سے دایاں ہاتھ کاٹا جائے گا، اِس لیے کہ انسانوں میں آلۂ کسب کی حیثیت اصلاً اِسی کو حاصل ہے۔ اِس سزا کے بارے میں یہ بات، البتہ واضح رہنی چاہیے کہ یہ چور مرد اور چور عورت کی سزا ہے۔ قرآن نے اِس کے لیے 'سَارِق' اور 'سَارِقَة' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ عربی زبان کے اسالیب بلاغت سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ یہ صفت کے صیغے ہیں جو وقوع فعل میں اہتمام پر دلالت کرتے ہیں۔ لہٰذا اِن کا اطلاق فعل سرقہ کی کسی ایسی ہی نوعیت پر کیا جا سکتا ہے جس کے ارتکاب کو چوری اور جس کے مرتکب کو چور قرار دیا جا سکے۔ چنانچہ اگر کوئی بچہ اپنے باپ یا کوئی عورت اپنے شوہر کی جیب سے چند روپے اڑا لیتی ہے یا کوئی شخص کسی کی بہت معمولی قدر و قیمت کی کوئی چیز چرا لے جاتا ہے یا کسی کے باغ سے کچھ پھل یا کسی کے کھیت سے کچھ سبزیاں توڑ لیتا ہے یا بغیر کسی حفاظت کے کسی جگہ ڈالا ہوا کوئی مال اچک لیتا ہے یا آوارہ چرتی ہوئی کوئی گاے یا بھینس ہانک کر لے جاتا ہے یا کسی اضطرار اور مجبوری کی بنا پر اِس فعل شنیع کا ارتکاب کرتا ہے تو بے شک، یہ سب ناشایستہ افعال ہیں اور اِن پر اُسے تادیب و تنبیہ بھی ہونی چاہیے، لیکن یہ وہ چوری نہیں ہے جس کا حکم اِن آیات میں بیان ہوا ہے۔ لہٰذا یہ

انتہائی سزا ہے اور صرف اُسی صورت میں دی جائے گی، جب مجرم اپنے جرم کی نوعیت اور اپنے حالات کے لحاظ سے کسی رعایت کا مستحق نہ رہا ہو۔

۳۵۸ یہ اِس سزا کا مقصد ہے۔ یعنی یہ پاداش عمل بھی ہے اور دوسروں کے لیے سامان عبرت بھی کہ وہ اِس سزا کو دیکھ کر جان لیں کہ جس خدا کی عقوبت دنیا میں یہ ہے، وہ آخرت میں اپنے نافرمانوں کے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہے۔ چنانچہ دنیا کی حرص میں اپنی آخرت برباد نہ کریں۔

سزا کا اصلی مقصد یہی ہے، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اِس طرح کی سزائیں کسی معاشرے میں نافذ ہوں تو اِس سے جرائم کی روک تھام میں مدد ملتی ہے۔ یہ ایک ضمنی فائدہ ہے، اِس کو بھی پیش نظر رہنا چاہیے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”...(اِس) میں قطع ید کے دو سبب بیان ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مجرم کے جرم کی سزا ہے، دوسرا یہ کہ یہ 'نَکَال' ہے۔ 'نَکَال' کے معنی کسی کو ایسی سزا دینے کے ہیں جس سے دوسرے عبرت پکڑیں۔ اِن دونوں کے درمیان حرف عطف کا نہ ہونا اِس بات کی دلیل ہے کہ یہ دونوں باتیں اِس سزا میں بہ یک وقت مطلوب ہیں۔ یعنی یہ پاداش عمل بھی ہے اور دوسروں کے لیے سامان عبرت بھی۔ جو لوگ اِس کے اِن دونوں ہی پہلوؤں پر بہ یک وقت نظر نہیں ڈالتے، وہ بسا اوقات اِس خلجان میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جرم کے اعتبار سے سزا زیادہ سخت ہے۔ حالاں کہ اِس سزا میں متعین اِس جرم ہی کی سزا نہیں ہے جو مجرم سے واقع ہوا، بلکہ اُن بہت سے جرائم کی روک تھام بھی اِس میں شامل ہے جن کا وہ اپنے فعل سے محرک بن سکتا ہے، اگر اُس کو ایسی سزا نہ دی جائے جو دوسروں کے حوصلے پست کر دے۔ جنس کی طرح مال کی بھوک بھی انسان کے اندر بڑی ہی شدید ہے۔ اگر اِس حرص کو ذرا ڈھیل مل جائے تو پھر اِس کے نتائج کیا کچھ نکل سکتے ہیں، اِس کا اندازہ کرنے کے لیے موجودہ زمانے کے حالات میں کافی سامان بصیرت موجود ہے، بشرطیکہ دیکھنے والی آنکھیں موجود ہوں۔ اِس زمانے کے کسی متمدن سے متمدن ملک کے صرف ایک سال کے وہ ہول ناک جرائم جمع کر لیے جائیں جو محض چوری کی وجہ سے پیش آئے تو وہ آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہیں، لیکن تہذیب جدید کے مارے ہوئے انسان کی پیشانی یہ سن کر تو عرق آلود ہو جاتی ہے کہ چوری پر کسی کا ہاتھ کٹ جائے، لیکن اُن ہزاروں دل ہلا دینے والے واقعات سے اُس کا دل نہیں پسیجتا جو بالواسطہ یا

ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۳۹)
اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ
يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (۴۰)

ہے۔[۳۵۹] پھر جس نے اپنے اِس ظلم کے بعد توبہ اور اصلاح کر لی تو اللہ اُس پر عنایت کی نظر کرے گا۔[۳۶۰] بے شک، اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے؟ وہ جس کو چاہے گا، سزا دے گا اور جس کو چاہے گا، (اپنے قانون اور اپنی حکمت کے مطابق) بخش دے گا۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔[۳۶۱] ۳۸-۴۰

> بلاواسطہ چوری کی راہ سے ظہور میں آتے ہیں۔ چوری کوئی مفرد جرم نہیں ہے، بلکہ یہ مجموعۂ جرائم ہے جس سے طرح طرح کے ہول ناک جرائم ظہور میں آتے ہیں۔ اگر چوری کی راہ مسدود ہو جائے تو یہ یا تو بالکل ہی ناپید ہو جائیں گے یا کم از کم یہ کہ انتہائی حد تک کم ہو جائیں گے۔ چنانچہ تجربہ گواہ ہے کہ چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا سے نہ صرف چوری کے واقعات انتہائی حد تک کم ہو گئے، بلکہ دوسرے جرائم میں بھی انتہائی کمی ہو گئی۔ پھر اگر چند ہاتھ کٹ جانے سے ہزاروں سر، ہزاروں گھر، ہزاروں آبروئیں محفوظ ہو جائیں؛ ظلم و شقاوت اور حرث و نسل کی بربادی کے بہت سے ابواب کا خاتمہ ہو جائے تو عقل سلیم تو یہی کہتی ہے کہ یہ مہنگا سودا نہیں ہے، بلکہ نہایت بابرکت سودا ہے، لیکن موجودہ زمانے کے دانش فروشوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔” (تدبر قرآن ۲/۵۱۲)

[۳۵۹] مطلب یہ ہے کہ وہ غالب ہے، اِس لیے حق رکھتا ہے کہ جس کو چاہے، حکم دے اور حکیم ہے، اِس لیے اُس کا کوئی حکم حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہو سکتا۔

[۳۶۰] اِس سے واضح ہے کہ اصلاح توبہ کے لیے ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔ اِسی طرح یہ بھی واضح ہے کہ آخرت میں نجات توبہ اور اصلاح ہی سے ہو سکتی ہے۔ دنیوی سزا نہ توبہ کا بدل ہے اور نہ توبہ اِس کے لیے بدل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ توبہ و اصلاح کے باوجود حکومت یہ سزا لازماً نافذ کرے گی اور دنیا میں یہ سزا پا لینے کے باوجود آخرت کا معاملہ توبہ اور اصلاح ہی سے درست ہو گا۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ

تمھیں وہ لوگ آزردہ نہ کریں، اے پیغمبر،[٣٦٢] جو (خدا کی شریعت کا) انکار کر دینے میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ بھی جو منہ سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں، دراں حالیکہ اُن کے دل ایمان نہیں لائے اور وہ بھی جو یہودی ہو چکے

---

٣٦١ یہ خطاب عام ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... یہ عام خطاب کے ساتھ تنبیہ ہے کہ آسمان و زمین میں سارا اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، وہی جس کو چاہے سزا دے گا، جس کو چاہے بخشے گا، کسی دوسرے کے لیے اِس میں کسی چون و چرا اور کسی مداخلت کی کوئی گنجایش نہیں ہوگی۔ اِس وجہ سے ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے قانون کے تابع اور اُس کے حوالے کرے۔ نہ کوئی اُس سے بھاگنے کی کوشش کرے، نہ کوئی اُس سے دوسروں کو بچانے کی تدبیریں سوچے اور نہ کسی کے زور و اثر اور کسی کی سعی و سفارش پر بھروسا کر کے خدا اور اُس کی شریعت سے بے پروا ہو۔ یہ تنبیہ اِس وجہ سے ضروری تھی کہ درحقیقت یہ سارے احکام جو قتل، قصاص، راہ زنی اور چوری وغیرہ سے متعلق اِس سورہ میں بیان ہو رہے ہیں، یہ سب دوسری امتوں کے لیے مزلۂ قدم ثابت ہوئے۔ اُنھوں نے اِن سے بچنے کے لیے بہت سے چور دروازے نکال لیے، یہاں تک کہ یہ تمام قوانین بالکل بے اثر ہو کر رہ گئے۔ اگر اِس کی علت کا سراغ لگایا جائے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ اِن قوموں نے توحید کی وہ حقیقت مستحضر نہیں رکھی جس کی اِس آیت میں یاددہانی کی گئی ہے۔“ (تدبر قرآن ٢/ ٥١٤)

٣٦٢ اصل الفاظ ہیں: ’یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ لَا یَحْزُنْکَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ‘۔ اِن میں لفظ رسول سے خطاب اِس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ دین کی تبلیغ اور انذار و بشارت سے زیادہ کوئی ذمہ داری آپ پر عائد نہیں کی گئی۔ آپ نے رسالت کا یہ فرض ادا کر دیا تو اپنی ذمہ داری سے

يَأْتُوْكَ ؕ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ؕ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ

ہیں۔ یہ جھوٹ پر کان لگاتے ہیں، اُن لوگوں کے جھوٹ پر جو اِن سے الگ ایک دوسرا گروہ ہیں، جو کبھی تمھارے پاس نہیں آئے۔[۳۶۳] بات کا موقع و محل متعین ہو جانے کے باوجود اُس کو اصل معنی سے پھیر دیتے ہیں۔[۳۶۴] کہتے ہیں کہ تمھارے معاملے کا فیصلہ یہ ہو تو مانو اور نہ

سبک دوش ہو گئے۔ لوگ نہیں مانتے تو اِس کی پرسش اُنھی سے ہوگی۔ آپ کو اِس معاملے میں آزردہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... یہاں چونکہ مقصود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین اور یہود کی مخالفانہ اور سازشانہ روش پر تسلی دینا اور اِس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ جن کا فتنہ میں پڑنا سنت الٰہی کے بموجب مقدر ہو چکا ہے، وہ فتنہ میں پڑ کے رہیں گے، اِس وجہ سے ’یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ‘ کے خطاب سے آپ کو مخاطب کرنا موزوں ہوا تاکہ خطاب ہی سے آپ کی ذمہ داری کی حد آپ پر واضح ہو جائے۔ آگے خطاب کی یہی مضمر حقیقت الفاظ میں یوں واضح فرما دی گئی ہے: ’مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ، فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا‘۔“ (تدبر قرآن ۲/۵۲۱)

[۳۶۳] اشارہ ہے یہود کے اُن علما اور لیڈروں کی طرف جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں شب و روز جھوٹ گھڑتے اور سامنے آ کر بات کرنے کے بجائے پردے کے پیچھے بیٹھ کر اپنے پیرووں کو آپ کی مخالفت میں سرگرم رکھتے تھے۔

[۳۶۴] اصل میں ’يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ایک مضاف عربیت کے عام قاعدے کے مطابق حذف ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بات کا موقع و محل اور محمل و مصداق متعین ہو جانے کے باوجود اُس کو موقع و محل سے ہٹا دیتے ہیں، اِس لیے صریح تحریف کے مرتکب ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ موقع و محل واضح نہیں ہوتا اور اُس کے انطباق میں غلطی

فِتۡنَتَهٗ فَلَنۡ تَمۡلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيۡـًٔا ؕ اُولٰٓـئِكَ الَّذِيۡنَ لَمۡ يُرِدِ اللّٰهُ
اَنۡ يُّطَهِّرَ قُلُوۡبَهُمۡ ؕ لَهُمۡ فِى الدُّنۡيَا خِزۡىٌ ۖۚ وَّلَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ
عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۴۱﴾ سَمّٰعُوۡنَ لِلۡكَذِبِ اَكّٰلُوۡنَ لِلسُّحۡتِ ؕ فَاِنۡ

ہو تو اُس سے بچ کر رہو۔[۳۶۵] (یہ فتنے میں پڑ چکے ہیں) اور جس کو اللہ فتنے میں ڈالنا چاہے، وہ اُس میں پڑ کر رہتا ہے۔ پھر اللہ کے مقابل میں تم اُس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔[۳۶۶] یہی ہیں جن کے بارے میں اللہ نے نہیں چاہا کہ اِن کے دلوں کو پاک کرے۔[۳۶۷] اِن کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ایک بڑی سزا ہے۔ یہ

کر جاتے ہیں، لہٰذا معذور ٹھیرائے جا سکتے ہیں۔

[۳۶۵] یعنی خدا کی شریعت کے مطابق اور حق و انصاف کا فیصلہ نہیں چاہتے، بلکہ اپنی مرضی کا فیصلہ چاہتے ہیں۔ چنانچہ آپس میں کہتے ہیں کہ فیصلہ حسب منشا ہو تو قبول کر لیں گے، ورنہ کترا جائیں گے۔

[۳۶۶] یہ اُس سنت الٰہی کا بیان ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں ہمیشہ سے قائم ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”...سنت الٰہی یہ ہے کہ جو لوگ جانتے بوجھتے اور دیکھتے سنتے شر کو خیر پر اور باطل کو حق پر ترجیح دیتے ہیں، نہ خدا کی تنبیہات سے سبق حاصل کرتے، نہ اہل حق کی نصیحتوں سے، وہ آہستہ آہستہ اپنے ضمیر اور اپنے عقل و ارادے کو اِس درجہ کند اور بے حس بنا لیتے ہیں کہ اُن کے اندر حق کی طرف بڑھنے کا کوئی عزم و حوصلہ سرے سے باقی رہ ہی نہیں جاتا، باطل ہی اُن کا اوڑھنا بچھونا بن جاتا ہے۔ اُن کو کتنا ہی جھنجھوڑیے اور جگایے، لیکن وہ یہ بستر چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ یہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اِن کو اِس فتنے ہی میں اوندھے منہ پڑے چھوڑ دیتا ہے جس میں وہ پڑ چکے ہوتے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۵۲۳)

[۳۶۷] اِس لیے نہیں چاہا کہ دلوں کی تطہیر کے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک خاص ضابطہ ہے جس کے

جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ۗ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۗ

جھوٹ پر کان لگاتے اور (جھوٹی گواہی کے لیے) بغیر کسی تردد کے حرام کھاتے ہیں۔[۳۶۸] لہٰذا (فیصلوں کے لیے) تمھارے پاس آئیں تو تمھیں اختیار ہے کہ اِن کا فیصلہ کرو یا ٹال دو۔ تم اِنھیں ٹال دو گے تو یہ تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے[۳۶۹] اور اگر فیصلہ کرو گے تو تم پر

مطابق یہ اِس کے مستحق نہیں رہے کہ اللہ اِن کے دلوں کو پاک کرے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...جو لوگ نیکی اور تقویٰ کی راہ پر چلتے ہیں، اگر اثناے راہ میں اُن کو کوئی ٹھوکر لگ جاتی ہے، وہ گر پڑتے ہیں، لیکن گرنے کے بعد پھر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور توبہ و اصلاح کے ذریعے سے دامن جھاڑ کے پھر چل کھڑے ہوتے ہیں، تو خواہ ہزار بار گریں اور اُٹھیں، لیکن اُن کے دامن دل پر میل جمنے نہیں پاتا، اللہ اُن کی توبہ و اصلاح کو اُن کے لیے کفارۂ سیئات بناتا رہتا ہے۔ لیکن جو لوگ برائی اور نافرمانی ہی کو اپنا پیشہ بنا لیتے ہیں اور گناہوں کی کیچڑ ہی میں لت پت رہتے ہیں، اُن میں لذت و راحت محسوس کرتے ہیں، آہستہ آہستہ اُن کے دلوں پر اتنی سیاہی جم جاتی ہے کہ اُن پر کوئی صیقل بھی کارگر نہیں ہوتا، پھر خدا اُنھیں جہنم کی بھٹی ہی کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۵۲۴)

[۳۶۸] یعنی جھوٹ کے رسیا ہیں۔ چنانچہ جھوٹی گواہی دین و شریعت کے کسی معاملے میں دینی پڑے یا کسی مقدمے میں، یہ ہر وقت تیار رہتے اور اِس کے لیے رشوت لینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

[۳۶۹] مطلب یہ ہے کہ اِن کی تمام سازشیں بے نقاب ہو جائیں گی۔ اللہ نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اِن کا پردہ اٹھا دے گا۔ چنانچہ تم اِنھیں ٹال بھی دو تو اِس کی بنا پر تمھارے خلاف پروپیگنڈا کر کے یہ تمھیں اور تمھاری دعوت کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔

آیت کے الفاظ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اہل کتاب اگر مسلمانوں کی حکومت میں

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (۴۲) وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَآ

لازم ہے کہ اُن کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ اِس لیے کہ اللہ اُنھی لوگوں کو پسند کرتا ہے جو انصاف کا فیصلہ کرتے ہیں۔ یہ تم سے کس طرح فیصلہ کراتے ہیں، دراں حالیکہ اِن کے پاس تورات ہے جس میں اللہ کا فیصلہ موجود ہے؟[۳۷] پھر فیصلے کے لیے رجوع کر لینے

اپنی شریعت کے مطابق اور اپنے علما و فقہا کی عدالتوں سے فیصلہ کرانا چاہیں تو اِس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، بلکہ آگے کی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی طریقہ اللہ تعالیٰ کو پسند بھی ہے۔ اِس لیے کہ جب تک وہ قرآن پر ایمان نہیں لاتے، اُن کے لیے زیبا یہی ہے کہ وہ تورات و انجیل کی طرف رجوع کریں۔ یہ اللہ کی کتابیں ہیں اور کوئی مسلمان اُنھیں اللہ کی کتابوں پر عمل کرنے سے روکنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔

[۳۷] یہ اِس بات پر اظہار تعجب ہے کہ تورات کو مانتے ہیں اور تم کو نہیں مانتے، لیکن محض اِس وجہ سے کہ تورات کا قانون کسی معاملے میں قابل قبول نہیں ہوتا تو اپنے مقدمات تمھارے پاس لے آتے ہیں تاکہ حسب منشا کوئی فیصلہ اگر حاصل ہو جائے تو کہہ سکیں کہ تورات کو چھوڑ کر ہم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ ہم نے تو خدا کے پیغمبر کا فیصلہ قبول کیا ہے۔

اِس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ خدا کا قانون اگر قانون کی حیثیت سے دیا گیا ہے تو اُس پر عمل بجائے خود مطلوب ہوتا ہے۔ اُس کے مقاصد کو سامنے رکھ کر کوئی شخص اُس کی جگہ کوئی دوسرا قانون نہیں بنا سکتا۔ آیت میں دیکھ لیجیے، نزول تورات کے کم و بیش دو ہزار سال بعد بھی اللہ تعالیٰ کا اصرار ہے کہ اُس کے ماننے والے اُس کے احکام کے پابند ہیں۔ اِس کے بعد کسی مسلمان کے لیے یہ بات کس طرح جائز ہو سکتی ہے کہ اللہ کے قانون کو ایک طرف رکھ کر وہ اُس کے مقاصد کی رعایت سے اپنے لیے خود کوئی قانون بنا لے؟ آیت کے سیاق و سباق سے واضح ہے

أُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۳﴾
إِنَّآ أَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ج يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ
الَّذِيْنَ أَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا
اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ج فَلَا تَخْشَوُا

کے بعد اُس سے بھی برگشتہ ہو جاتے ہیں[۳۷۱]؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ ماننے والے لوگ ہی نہیں ہیں۔ ۴۱-۴۳

یہ تورات ہمیں نے اتاری، جس میں ہدایت بھی تھی اور روشنی بھی[۳۷۲]۔ اللہ کے فرماں بردار نبی[۳۷۳]، ربانی عالم اور فقیہ اِن یہودیوں کے فیصلے اِسی کے مطابق کرتے تھے، اِس لیے کہ اُنھیں اِس کتاب الٰہی کا نگہبان اور اِس پر گواہ ٹھیرایا گیا تھا[۳۷۴]۔ پھر (یہ ہدایت بھی

کہ یہ حدود ہی کے احکام تھے جن سے فرار کے لیے یہود نے مختلف قسم کے حیلے نکالنے کی کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ یہ صرف ظالم، فاسق اور کافر ہی ہیں جو اُس کے احکام سے اِس طرح فرار کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔

[۳۷۱] یعنی حق و انصاف کا فیصلہ حاصل کرنے کی خواہش چونکہ شروع ہی سے نہیں تھی، اِس لیے پہلے رجوع کرتے ہیں، مگر تمھارا فیصلہ اگر مرضی کے مطابق نہ ہو تو اُس سے بھی برگشتہ ہو جاتے ہیں۔

[۳۷۲] یعنی صراط مستقیم کی ہدایت اور ایک ایسی روشنی جو اِنھیں خواہشات و بدعات اور جہالت کی تاریکیوں سے نکال دے۔

[۳۷۳] یہ علماے یہود پر ایک لطیف تعریض ہے۔ یعنی اللہ کے وہ پیغمبر جو یہود کے علما و فقہا کی طرح تورات کو صرف دوسروں کے لیے واجب العمل نہیں سمجھتے تھے، بلکہ خود بھی اپنے پروردگار کے فرماں بردار اور اُس کے احکام و قوانین کے پابند تھے۔

[۳۷۴] یہ ایک آئینہ ہے جو قرآن نے اپنے مخاطبین کے سامنے رکھ دیا ہے۔ استاذ امام کے

النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ
بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ
اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ

اِس کے بارے میں کی گئی تھی کہ) لوگوں سے نہ ڈرو، بلکہ مجھ سے ڈرو اور میری آیتوں کو تھوڑی قیمت کے عوض نہ بیچو[۳۷۵] اور (یاد رکھو کہ) جو لوگ اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں، وہی منکر ہیں[۳۷۶]۔ اور اِسی کتاب میں ہم نے اِن پر فرض کیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان

الفاظ میں مدعا یہ ہے کہ وہ ذرا اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ پاسبان ہو کر اُنھوں نے خدا کے حرم میں کس طرح نقب لگائی ہے اور گواہ ہو کر کس طرح کتمان شریعت میں مہارت دکھائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”... یہ آئینہ وقت کے یہود کے سامنے اِس غرض سے رکھا گیا ہے کہ وہ اِس میں دیکھیں کہ تورات سے متعلق اُن پر کیا ذمہ داریاں عائد تھیں، اُن کے صالح اسلاف نے اِن ذمہ داریوں کو کس طرح نبھایا اور اب اُنھوں نے کس طرح اِس عہد الٰہی کو بچوں کا کھیل بنا رکھا ہے۔“
>
> (تدبر قرآن ۲/۵۲۷)

۳۷۵؎ مطلب یہ ہے کہ جنھیں گواہ بنایا گیا تھا، اُنھیں یہ ہدایت بھی کی گئی تھی کہ اِس گواہی کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے صرف خدا سے ڈریں، دوسروں کا خوف اور رعب اپنے سینے سے نکال دیں اور اپنے دنیوی اغراض کے لیے خدا کی اِس امانت میں کوئی خیانت نہ کریں۔ یہ ہدایت تورات کے اُن تمام مقامات پر بڑی تاکید کے ساتھ کی گئی ہے، جہاں یہود سے احکام شریعت کی پابندی کا عہد لینے کا ذکر ہوا ہے۔ اِس کو غائب کے صیغے سے بیان کرنے کے بجائے حاضر کے صیغے میں اِس لیے فرمایا ہے کہ کلام کا تنوع اِسے سامعین کے لیے زیادہ

بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾

کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور اِسی طرح دوسرے زخموں کا بھی قصاص ہے[۳۷۷]۔ پھر جس نے اُسے معاف کر دیا تو اُس کے لیے وہ کفارہ بن جائے گا[۳۷۸]۔ (یہ اللہ کا قانون ہے) اور جو اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں، وہی ظالم ہیں[۳۷۹]۔ ۴۴-۴۵

موثر بنا دے۔

[۳۷۶] یہی حکم اُن مسلمانوں کا بھی ہوگا جو آزادی و اختیار رکھتے ہوئے اپنے فیصلے کتاب الٰہی کے مطابق نہیں کرتے۔

[۳۷۷] یہ اُس قانون کا حوالہ دیا ہے جس سے بچنے کے لیے یہود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرنا چاہتے تھے۔ قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ یہ خدا کی شریعت اور اُس کا ابدی حکم ہے۔ اِسے تورات میں اِسی طرح ثبت کیا گیا تھا۔ اِس سے فرار کی کوشش کرو گے تو خدا کی بارگاہ میں ظالم اور فاسق قرار دیے جاؤ گے۔

[۳۷۸] یہ مجروح یا مقتول کے اولیا کے لیے ترغیب ہے کہ وہ مجرم کو معاف کر دیں تو اُن کی یہ نیکی اُن کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گی اور جس درجے کی یہ معافی ہوگی، اُسی کے بقدر اُن کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ آیت کا انداز بیان دلیل ہے کہ یہی حکم ہمارے لیے بھی ہے۔ سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱۷۸ سے اِس کی تائید ہوتی ہے۔

[۳۷۹] اِس لیے کہ جو خدا کے قانون کو نظر انداز کرتا ہے، وہ اپنے اوپر خدا کے سب سے بڑے حق کو تلف کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ جن و بشر سب اِس کے پابند ہیں کہ اُس کے بندے بن کر رہیں۔ یہ بندگی خدا کا حق اور اطاعت و فرماں برداری اِس کا لازمی تقاضا ہے۔ خدا کے ماننے والوں میں سے اگر کوئی اِس سے انحراف کرتا ہے تو یقیناً ظالم ہے۔

المائدة
٥

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ
مِنَ التَّوْرٰىةِ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا
بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝٤٦ وَلْيَحْكُمْ
اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

اِنھی (پیغمبروں) کے نقش قدم پر ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا،[۳۸۰] اُس سے پہلے جو تورات موجود تھی، وہ اُس کی تصدیق کرنے والا تھا۔ اور ہم نے اُس کو انجیل عطا فرمائی جس میں ہدایت اور روشنی تھی اور وہ بھی تورات کی تصدیق کرنے والی تھی جو اُس سے پہلے موجود تھی،[۳۸۱] خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ہدایت اور نصیحت کے طور پر اور اِس فرمان کے ساتھ کہ اہل انجیل بھی اُسی کے مطابق فیصلے کریں جو اللہ نے اُس میں نازل کیا ہے

---

[۳۸۰] یعنی بعینہٖ اُسی مقصد کے ساتھ جس کے لیے اُن سے پہلے کے نبی آئے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...’عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ‘ کے لفظ سے انبیا کی دعوت، اُن کے مقصد، اُن کے مزاج، کردار اور طریق کار کی یکسانی اور اُن کی باہمی مشابہت کا اظہار ہو رہا ہے۔ یہ چیز من جملہ علامات نبوت کے ہے۔ جس طرح ایک ہی شجرۂ طیبہ کے برگ و بار میں مماثلت ہوتی ہے، اُسی طرح اِس مقدس گروہ کے افراد میں مماثلت ہوتی ہے کہ جو اُن میں سے ایک کو پہچان گیا، وہ گویا سب کو پہچان گیا۔ اُن کی شناخت کے معاملے میں التباس اُنھی کو پیش آتا ہے جو یا تو اندھے ہوتے ہیں یا اندھے بن جاتے ہیں۔ جن کے اندر بصیرت ہوتی ہے، وہ کبھی دھوکا نہیں کھاتے۔“ (تدبر قرآن ۲/۵۳۱)

[۳۸۱] اصل الفاظ ہیں: ’مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ‘۔ اِس سے پہلے ’فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ‘ کا جملہ حال واقع ہوا ہے۔ اِس کا عطف اُسی پر ہے۔ ’هُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ‘ کے الفاظ بھی اِس کے بعد اِسی محل میں ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ تورات و انجیل میں اور سیدنا موسیٰ اور سیدنا مسیح میں منبع و ماخذ اور علم و ہدایت کے لحاظ سے کوئی فرق نہ تھا اور مسیح علیہ السلام کوئی نئی شریعت لے کر

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ㊼

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا

اور جو اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں، وہی فاسق ہیں۔ ۴۶-۴۷

پھر ہم نے، (اے پیغمبر)، تمھاری طرف یہ کتاب نازل کی ہے، قول فیصل کے ساتھ اور اُس کتاب کی تصدیق میں جو اِس سے پہلے موجود ہے[۳۸۲] اور اُس کی نگہبان بنا کر۔[۳۸۳] اِس لیے تم اِن کا فیصلہ اُس قانون کے مطابق کرو جو اللہ نے اتارا ہے اور جو حق

نہیں آئے تھے، بلکہ اُنھوں نے اُسی شریعت کی تصدیق کی جو اُن سے پہلے تورات میں موجود تھی۔

اِس سے قرآن نے یہ حقیقت بھی بالکل آخری درجے میں واضح کر دی ہے کہ تورات کا قانون جس طرح یہود کے لیے واجب الاطاعت تھا، اُسی طرح مسیح علیہ السلام کے ماننے والوں کے لیے بھی ہے، الّا یہ کہ خود تورات ہی نے اُس کے کسی حصے کو یہود کے لیے خاص قرار دیا ہو۔ چنانچہ سینٹ پال کا یہ استدلال بالکل لغو اور باطل ہے کہ تمام شریعت صرف بنی اسرائیل کے لیے تھی۔

[۳۸۲] اِس سے تورات مراد ہے۔ انجیل کا ذکر اِس لیے نہیں ہوا کہ قرآن سے پہلے اصل کتاب کی حیثیت تورات ہی کو حاصل تھی۔ زبور، انجیل اور انبیا علیہم السلام کے دوسرے صحائف درحقیقت اُسی کے فروع ہیں۔

[۳۸۳] اصل میں لفظ 'مُهَيْمِن' استعمال ہوا ہے۔ یہ 'هيمن فلان على كذا' سے بنا ہوا اسم صفت ہے جو محافظ اور نگران کے معنی میں آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کتاب الٰہی کا اصل قابل اعتماد نسخہ اب قرآن ہی ہے۔ تورات اور دوسرے صحائف سے متعلق بھی کسی چیز کے حق و باطل کا فیصلہ کرنا ہو تو اُس کے لیے کسوٹی اور معیار یہی ہے۔ جو بات اِس پر کھری ثابت ہوگی، وہ کھری ہے اور جو اِس پر کھری ثابت نہ ہو سکے، وہ یقیناً کھوٹی ہے جسے ہر حال میں رد ہو جانا چاہیے۔

تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً
وَّمِنْهَاجًا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ
فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا

تمھارے پاس آچکا ہے، اُس سے ہٹ کر اب اِن کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو[۳۸۴] ——— تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک شریعت، یعنی ایک لائحۂ عمل مقرر کیا ہے[۳۸۵]۔ اللہ چاہتا تو تمھیں ایک ہی امت بنا دیتا، مگر اُس نے یہ نہیں کیا، اِس لیے کہ جو کچھ اُس نے تمھیں عطا فرمایا ہے، اُس میں تمھاری آزمایش کرے[۳۸۶]۔ سو بھلائیوں میں ایک دوسرے

---

[۳۸۴] اصل الفاظ ہیں: 'لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ'۔ اِن میں 'لَا تَتَّبِعْ' کے بعد 'عن' دلالت کرتا ہے کہ یہ 'لا تنحرف' یا اِس کے ہم معنی کسی لفظ کے مفہوم پر متضمن ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اپنے مقدمات لے کر یہ آپ کے پاس آئیں تو آپ کا فیصلہ اُس قانون کے مطابق ہونا چاہیے جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر نازل کیا ہے۔ آپ اُسی کے پابند ہیں۔ اُس سے منحرف ہو کر اِن کی خواہشات و بدعات کی پیروی میں آپ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ یہ اگر اپنے فقہا کے پاس جائیں تو جس طرح اُن کا فرض ہے کہ تورات و انجیل کے مطابق فیصلہ کریں، اُسی طرح آپ کے پاس آئیں تو آپ کو قرآن کے مطابق فیصلہ کرنا ہے۔ اِسے چھوڑ کر کسی دوسرے قانون کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرنا اُسی طرح کفر، ظلم اور فسق ہے، جس طرح اوپر تورات و انجیل سے متعلق ذکر ہوا ہے۔

[۳۸۵] اصل میں 'شِرْعَة' اور 'مِنْهَاج' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں دوسرا پہلے کے لیے بمنزلۂ تفسیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے جو شریعت دی ہے، وہ اُس کے ماننے والوں کے لیے زندگی گزارنے کا دستور، لائحۂ عمل اور طریق کار ہے جس سے دین کے حقائق زندگی کے احوال سے متعلق ہوتے ہیں۔

[۳۸۶] اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کو الگ الگ شریعت کیوں دی؟ یہ اُس کی وجہ بیان فرمائی

المائدة
٥

فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿٤٨﴾ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ
بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ
بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ط فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ

سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔[۳۸۷] تم سب کو (ایک دن) اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے، پھر وہ تمھیں بتا دے گا سب چیزیں جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو —— اور وہی بات کہ اِن کا فیصلہ اُس قانون کے مطابق کرو جو اللہ نے اتارا ہے اور اِن کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو اور اِن سے ہوشیار رہو کہ مبادا یہ لوگ تمھیں ہدایت کی کسی بات سے بہکا دیں جو اللہ نے تمھاری طرف نازل کی ہے۔[۳۸۸] پھر اگر اعراض کریں تو جان لو کہ اللہ اِن کو اِن

ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”جہاں تک دین کے حقائق کا تعلق ہے، وہ ہمیشہ سے غیر متغیر ہیں اور غیر متغیر ہی رہیں گے، لیکن شریعت کے ظواہر و رسوم ہر امت کے لیے اللہ تعالیٰ نے الگ الگ مقرر فرمائے تا کہ یہ چیز امتوں کے امتحان کا ذریعہ بنے اور وہ دیکھے کہ کون ظواہر و رسوم کے تعصب میں گرفتار ہو کر حقائق سے منہ موڑ لیتا ہے اور کون حقیقت کا طالب بنتا ہے اور اُس کو ہر اُس شکل میں قبول کرنے کے لیے آگے بڑھتا ہے جس میں وہ خدا اور اُس کے رسول کی طرف سے اُس کے سامنے آتی ہے۔“
>
> (تدبر قرآن ۲/ ۵۳۵)

[۳۸۷] مطلب یہ ہے کہ تم اِن یہود و نصاریٰ کی طرح لکیر کے فقیر اور رسوم و ظواہر کے غلام بن کر نہ رہ جاؤ، بلکہ دین کی اصل حقیقت کو سامنے رکھو اور اللہ کے پیغمبر نے نیکی، خیر اور حصول قرب الٰہی کے لیے جد و جہد کی جو راہ تمھارے لیے کھول دی ہے، اُس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ اللہ کا قانون جس صورت میں بھی آئے، تمھارے لیے زیبا یہی ہے کہ اُس کے سامنے سر تسلیم خم کر دو اور شرائع میں اختلاف کو بنیاد بنا کر دین کی اصل حقیقت، یعنی خدا کی بندگی

يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾

کے کچھ گناہوں کی سزا دینا چاہتا ہے[۳۸۹] اور حقیقت یہ ہے کہ اِن لوگوں میں سے زیادہ نافرمان ہیں۔ (خدا کی شریعت کو چھوڑ کر) پھر کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟[۳۹۰] دراں حالیکہ اُن لوگوں کے لیے اللہ سے بہتر فیصلہ کس کا ہوسکتا ہے جو (خدا اور آخرت پر) یقین رکھتے ہیں۔ ۴۸-۵۰

سے روگردانی نہ کرو۔

۳۸۸ اِس کا عطف ایک جملے پر ہے جو 'فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ' سے مفہوم ہوتا ہے۔ اِس سے اوپر دیکھیے تو یہی بات بیان ہوچکی ہے۔ یہاں ایک مرتبہ پھر اُس کا حوالہ دے کر تنبیہ فرمائی ہے کہ 'وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ'۔ استاذ امام نے اِس کی وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”... اِس مزید تنبیہ کی ضرورت اِس لیے تھی کہ یہ مرحلہ کوئی آسان مرحلہ نہیں تھا۔ مخالف قوتیں آسانی سے سپر انداز ہونے والی نہیں تھیں۔ فتنہ کا لفظ خود اشارہ کر رہا ہے کہ وہ پیغمبر اور مسلمانوں کو میثاق الٰہی سے ہٹانے کے لیے اپنا پورا زور لگا دیں گی۔ اِس خطرے سے بچانے کے لیے آگاہ فرما دیا کہ وہ خواہ کتنا ہی زور لگائیں اور کتنا ہی دباؤ ڈالیں، تمھیں بہر حال اللہ کی اتاری ہوئی شریعت ہی کی پیروی کرنی ہے۔ اِس کو چھوڑ کر اِن کی خواہشات و بدعات کی پیروی نہیں کرنی ہے۔“ (تدبر قرآن ۲/۵۳۶)

۳۸۹ مطلب یہ ہے کہ حق کے اِس طرح واضح ہوجانے کے بعد بھی اعراض کریں تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ اب یہ توفیق ہدایت سے محروم ہیں۔ چنانچہ اُس سنت الٰہی کی زد میں آچکے ہیں جو ذریت ابراہیم کے لیے مقرر ہے کہ اُن کے گناہوں کی سزا اللہ تعالیٰ اُنھیں دنیا ہی میں دیتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ

ایمان والو، تم اِن یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ،[۳۹۱] یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں،[۳۹۲] اور (یاد رکھو کہ) تم میں سے اگر کوئی (اِس تنبیہ کے باوجود) اِنھیں اپنا دوست بناتا ہے تو اُس کا شمار پھر اِنھی میں ہے۔ حقیت یہ ہے کہ اللہ اِس طرح کے ظالموں کو کبھی راہ نہیں

---

۳۹۰ اصل الفاظ ہیں: 'اَفَحُکْمَ الْجَاهِلِیَّةِ یَبْغُوْنَ'۔ یہ 'مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ' کے بالمقابل استعمال ہوئے ہیں۔ اِس سے واضح ہے کہ ہر وہ قانون جو خدا کے نازل کردہ قانون کو چھوڑ کر اختیار کیا جائے، وہ جاہلیت کا قانون ہے، خواہ وہ قدیم زمانے میں بنایا گیا ہو یا دورِ جدید میں، اور اُسے وہی لوگ اختیار کر سکتے ہیں جنھیں خدا اور آخرت، کسی چیز پر بھی یقین نہیں ہے۔

۳۹۱ آگے کی آیتوں سے واضح ہے کہ خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن روے سخن اُنھی منافقین کی طرف ہے جو یہود کے زیرِ اثر تھے اور جن کا ذکر اوپر آیت ۴۱ میں 'الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ' کے الفاظ میں ہوا ہے۔ اِنھیں موالات سے منع اِس لیے کیا گیا ہے کہ پیغمبر کی طرف سے اتمامِ حجت کے بعد اللہ کا فیصلہ اب اِن یہود و نصاریٰ کے بارے میں صادر ہونے والا تھا، جس سے پہلے ضروری تھا کہ منکرین، منافقین اور سچے اہلِ ایمان کو الگ الگ کر دیا جائے۔ اِس زمانے کے یہود و نصاریٰ سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

۳۹۲ یعنی اسلام اور مسلمانوں کو اپنے لیے ایک مشترک خطرہ سمجھتے ہیں اور اِن سے نمٹنے کے لیے اِن کے خلاف ملتِ واحدہ بن چکے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ اب مسلمانوں کو بھی اِن کے خلاف ملتِ واحدہ بن کر اِن کے ساتھ دوستی اور اعتماد پر مبنی تمام تعلقات و مراسم ختم کر دینے چاہییں۔

يُسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ
اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ

دکھاتا۔[۳۹۳] چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ جن کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے، وہ اِن سے پینگیں بڑھا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔[۳۹۴] سو بہت ممکن ہے[۳۹۵] کہ اللہ (تم کو) فتح دے[۳۹۶] یا اپنی طرف سے کوئی اور بات ظاہر کر دے[۳۹۷] تو اِنھیں اُس

۳۹۳ـ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایمان و اسلام کے اِن دشمنوں سے دوستی کر کے اپنی جان پر ظلم ڈھا رہے ہیں، وہ اُس منزل تک ہرگز نہ پہنچیں گے جو اللہ نے اپنے صاحب ایمان بندوں کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔ اِس طرح کے ظالموں کو وہ اِس کا راستہ کبھی نہیں دکھاتا۔

۳۹۴ـ اصل الفاظ ہیں: 'يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ'۔ لفظ 'قَالَ' جس طرح زبان سے کہنے کے لیے آتا ہے، اُسی طرح دل میں کوئی بات کہنے کے لیے بھی آتا ہے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں یہ اِسی دوسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ آگے 'فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ' کے الفاظ میں قرآن نے اِسے کھول بھی دیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''... مطلب یہ ہے کہ اِن منافقین کے دل میں یہ ڈر سمایا ہوا ہے کہ اِس وقت مسلمانوں اور اُن کے مخالفین میں جو کشمکش برپا ہے، معلوم نہیں یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے، ہوسکتا ہے کہ بالآخر فتح مخالفین ہی کی ہو، ایسی صورت میں اگر ہم مسلمانوں ہی کے ہو کے رہ گئے تو سخت مصیبت میں پھنس جائیں گے، اِس لیے بہتر یہی ہے کہ دونوں سے راہ و رسم باقی رکھنے کی کوشش کی جائے۔''
>
> (تدبر قرآن ۲/ ۵۴۴)

۳۹۵ـ اصل میں لفظ 'عَسٰى' استعمال ہوا ہے۔ اپنے عام مفہوم کے علاوہ یہ وعدے کی تعبیر کے لیے بھی ایک لطیف اسلوب ہے۔ یہاں، اگر غور کیجیے تو یہ اِسی دوسرے معنی میں ہے۔

۳۹۶ـ یعنی ایسی فتح جو حق و باطل کے معاملے میں فیصلہ کن ہو جائے۔

۳۹۷ـ یعنی کوئی ایسی بات جس سے اِن منافقین کے تمام راز کھل جائیں اور یہ کچھ کہنے کے

اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ
اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۭ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ
فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ
يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ
عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ

چیز پر پچھتانا پڑے جو اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ (یقین رکھو کہ اِن کے ساتھ یہی ہو گا) اور ایمان والے (اُس موقع پر) کہیں گے کہ کیا یہ وہی ہیں جو اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر یقین دلاتے تھے کہ وہ تمھارے ساتھ ہیں؟ (افسوس)، اِن کے سب اعمال ضائع ہوئے اور یہ نامراد ہو کر رہ گئے۔[۳۹۸] ۵۱-۵۳

ایمان والو، (یہ رویہ دین سے پھر جانے کا رویہ ہے۔ چنانچہ یاد رکھو کہ) تم میں سے جو اپنے دین سے پھرے گا، اللہ کو اُس کی کچھ پروا نہیں، اِس لیے کہ اللہ عنقریب ایسے لوگ اٹھا دے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اللہ سے محبت کریں گے،[۳۹۹] مسلمانوں کے لیے نرم اور اِن منکروں کے مقابل میں نہایت سخت ہوں گے،[۴۰۰] اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور (اِس میں) کسی ملامت کرنے والے کی پروا نہ کریں گے۔[۴۰۱] یہ

قابل نہ رہیں۔

[۳۹۸] یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کے انجام کی تصویر ہے کہ ایمان و اخلاص سے محرومی کے باعث اِن کے تمام اعمال بے نتیجہ ہو جائیں گے اور انجام کار ناکامی و نامرادی کے سوا کچھ بھی اِن کے ہاتھ نہ آئے گا۔

لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۵۴)

اللہ کا فضل ہے، وہ (اپنے قانون اور اپنی حکمت کے مطابق) جس کو چاہے گا، عطا فرمائے گا[۴۰۲]۔ اللہ بڑی وسعت رکھنے والا ہے، وہ سب کچھ جانتا ہے۔ ۵۴

۳۹۹؎ اِس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہوئی کہ یہ منافقین نہ خدا سے محبت کرتے ہیں اور نہ خدا اِن سے محبت کرتا ہے۔ اللہ و رسول اور مومنین مخلصین کو دوست بنانے کے بجاے اِنھوں نے ایمان و اسلام کے مخالفین سے دوستی کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ چنانچہ اللہ بھی اِن سے بے پروا اور اِن کے رویے سے سخت بے زار ہے۔

۴۰۰؎ یعنی مسلمانوں کے لیے نرم خو، متواضع اور سہل الانقیاد اور منکروں کے مقابل میں پتھر کی چٹان ہوں گے۔ وہ اپنے اغراض کے لیے اِن کو کبھی استعمال نہ کر سکیں گے۔ اِن منافقین کی طرح مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لیے ہوشیار اور منکروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی نہیں ہوں گے کہ اللہ و رسول کے دشمن اِن کو جس طرح چاہیں، نچاتے پھریں۔ اِس میں 'اَذِلَّة' اور 'اَعِزَّة'، دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ استاذ امام نے اِن کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''...'اَذِلَّة'، 'ذلیل' کی جمع ہے۔ عربی میں یہ لفظ... اچھے اور برے، دونوں معنوں میں آتا ہے۔ جب یہ اچھے معنوں میں آتا ہے، جیسا کہ یہاں ہے تو اِس کے معنی نرم خو، نرم مزاج، فرماں بردار، متواضع اور سہل الانقیاد کے ہوتے ہیں۔ 'ذلول' کا لفظ بھی اِسی معنی میں آتا ہے۔ فرماں بردار اونٹنی کو 'ناقہ ذلول' کہتے ہیں۔
>
> 'اَعِزَّة'، 'عزیز' کی جمع ہے۔ یہ لفظ بالکل 'ذلیل' کے مقابل لفظ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس کے معنی ہیں: سخت، مشکل، بھاری، ناقابل شکست، ناقابل عبور، عسیر الانقیاد۔ اگر کسی چیز کے متعلق کہیں کہ 'ھو عزیز علیّ' تو اِس کے معنی ہوں گے کہ وہ چیز مجھ پر بھاری اور مشکل ہے۔ اُس کو رام کرنا اور قابو میں کرنا میرے لیے دشوار ہے۔ یہی مفہوم 'شدید علیّ' کا بھی ہوتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۵۴۶)

۴۰۱؎ مطلب یہ ہے کہ محض راہ عشق کے مسافر ہونے کا ڈھنڈورا نہیں پیٹیں گے، بلکہ ہر اُس

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ

(یہ تمھارے دوست نہیں ہیں)۔ تمھارے دوست تو حقیقت میں اللہ اور اُس کا رسول اور وہ ایمان والے ہیں جو عجز و نیاز مندی اور فروتنی کے ساتھ نماز کا اہتمام

جدوجہد کا ہراول ہوں گے جو دین کی اقامت اور اُس کی دعوت کے فروغ کے لیے کی جائے گی۔ تمام نصیحتوں اور ملامتوں سے بے پروا ہو کر یہ جدوجہد کریں گے۔ منافقین جن مفادات اور خواہشات و رغبات کے اسیر ہیں، یہ اُن کو کوئی اہمیت نہ دیں گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِس میدان میں اترنے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی اپنے تمام دوسرے مفادات اور دوسری دل چسپیوں سے منہ موڑ کر اور دوسروں کی نصیحتوں اور ملامتوں سے کان بالکل بند کر کے اترے۔ جو شخص ہر گام پر پیچھے مڑ مڑ کے بھی دیکھے گا اور اپنے ناصحوں اور ملامت گروں کی نصیحتوں اور ملامتوں کو بھی اہمیت دے گا، وہ اگر ایک قدم آگے بڑھائے گا تو دو قدم پیچھے ہٹائے گا۔ عرب شعرا جب اولوالعزمی، بہادری اور فیاضی کا مضمون باندھتے ہیں تو اُس کی تمہید میں ملامت کرنے والیوں کی ملامت کا ذکر ضرور کرتے ہیں، اِس لیے کہ اِس راہ کی یہ سب سے پرانی اور ناگزیر آفت ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ آدمی کوئی عزم و جزم کا کام کرنے اُٹھے اور دہنے بائیں سے کچھ ناصح اور کچھ ملامت گر دامن گیر نہ ہو جائیں۔ یہ اِس راہ کی پہلی آزمایش ہوتی ہے۔ اگر کوئی آدمی دامن جھٹک کے آگے بڑھنے کا حوصلہ نہ رکھتا ہو تو اکثر وہ اِس پہلے ہی مرحلے میں مار کھا جاتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۵۴۷)

۲۰۲؎ یہ پوری آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مخلص ساتھیوں کے لیے تسلی ہے کہ کفر اور اہل کفر کی طرف اِن منافقین کے میلان سے غم زدہ نہ ہوں۔ یہ دین سے پھرے تو اُس کا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ اللہ اِن کی جگہ اُن لوگوں کو ایمان و اسلام کی توفیق دے گا جو اُن کم زوریوں سے پاک ہوں گے جو اِن کے اندر موجود ہیں۔

وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿٥٦﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ
هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ

کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں[۴۰۳]۔ اور جو اللہ اور اُس کے رسول اور سچے ایمان والوں کو اپنا دوست بنا لیں، وہی غالب ہوں گے[۴۰۴]، اِس لیے کہ اللہ کی جماعت ہی ہے جو غالب رہنے والی ہے[۴۰۵]۔ ۵۵-۵۶

ایمان والو، تم سے پہلے جنھیں کتاب دی گئی، اُن میں سے جن لوگوں نے تمھارے

---

[۴۰۳] اِس سے معلوم ہوا کہ نماز اور زکوٰۃ ایمان کی عملی تعبیر ہے۔ اِسے 'الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' پر عطف کرنے کے بجائے بدل کا اسلوب اِسی حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ اِس کے ساتھ عجز و نیازمندی اور فروتنی کے الفاظ نماز اور زکوٰۃ، دونوں کی اصل روح کی طرف اشارہ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کے بغیر جس طرح ایمان بے روح ہے، اُسی طرح عجز و فروتنی نہ ہو تو نماز اور زکوٰۃ بھی محض رسم بن کر رہ جاتے ہیں۔

[۴۰۴] اوپر فرمایا تھا کہ جو لوگ یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست بنائیں گے، اُن کے اعمال ضائع ہوں گے اور وہ نامراد ہو کر رہ جائیں گے۔ اب یہ اُس کے مقابل میں فرمایا ہے کہ رسول کے ساتھیوں کو لازماً غلبہ حاصل ہو گا اور اُن کے دشمن اِس سرزمین میں لازماً شکست کھائیں گے۔

[۴۰۵] یہ وجہ بیان فرمائی ہے کہ رسول اور اُس کے ساتھی کیوں غالب ہوں گے؟ فرمایا ہے کہ وہ 'حزب اللہ'، یعنی اللہ کی جماعت ہیں جو براہ راست اللہ کی رہنمائی میں کام کر رہی ہے اور اللہ کی جماعت کبھی مغلوب نہیں ہوتی۔ رسولوں کے باب میں یہ اُسی سنت الٰہی کا بیان ہے جو قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُنھیں لازماً غلبہ عطا فرماتے ہیں۔ اِس سے واضح ہے کہ رسول کی جماعت ہی 'حزب اللہ' ہوتی ہے۔ اُس کے بعد کی کسی جماعت کے لیے یہ تعبیر کسی طرح موزوں نہیں ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ
اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾ قُلْ
يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ
اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۵۹﴾ قُلْ

دین کو ہنسی اور کھیل بنا لیا ہے، اُنھیں اور دوسرے منکروں کو اپنا دوست نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرو، اگر تم مومن ہو۔[۱۰۶] (تم دیکھتے نہیں ہو کہ) جب تم نماز کے لیے پکارتے ہو تو وہ اُس کا مذاق اڑاتے اور اُسے کھیل بنا لیتے ہیں۔[۱۰۷] اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔[۱۰۸] اِن سے کہو، اے اہل کتاب، کیا اِسی بات کا غصہ ہم پر نکال رہے ہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور اُس چیز پر ایمان لائے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور اُس پر بھی جو اِس سے پہلے اتاری گئی، اور اِس کا کہ تم میں اکثر نافرمان ہیں۔[۱۰۹] اِن

۱۰۶؎ یہ دین کے لیے مسلمانوں کی حمیت کو ابھارا ہے کہ جو لوگ تمھارے دین کا مذاق اڑاتے اور تمھارے دینی شعائر کو کھیل تماشا بناتے ہیں، وہ تمھارے دوست کس طرح ہو سکتے ہیں؟ انسان کی فطرت تو یہ ہے کہ وہ اپنی کسی چیز کی توہین برداشت نہیں کرتا۔ تم پر حیف ہے کہ اِسے برداشت کرتے ہو، بلکہ توہین کرنے والوں کو دوست بھی بناتے ہو۔

۱۰۷؎ یہ اُس چیز کا بیان ہے جسے وہ مذاق کا نشانہ بناتے تھے، یعنی اذان جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی منادی کے لیے ایک سنت کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔ یہود کے اشرار بھونڈے طریقے سے اُس کی نقلیں اتارتے اور اُس پر ہنستے ہنساتے تھے۔

۱۰۸؎ اِس لیے کہ کوئی معقول شخص یہ پسند نہیں کر سکتا کہ کوئی گروہ خدا کی عبادت کے لیے بلائے اور وہ اُس کا مذاق اڑائے یا نیکی اور بھلائی کی کسی دعوت کے بارے میں ہنسی، ٹھٹھے اور مسخرے پن کا رویہ اختیار کرے۔

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ
وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ
الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿٦٠﴾

سے کہو، میں تمھیں اُن لوگوں کا پتا دوں جن کا انجام خدا کے ہاں اُس سے بھی بُرا ہے (جو تم ہمارے لیے سوچتے ہو)؟[۱۱۰] یہ وہ ہیں کہ جن پر خدا نے لعنت کی، جن پر اُس کا غضب ہوا، جن کے اندر سے اُس نے بندر اور سؤر بنائے[۱۱۱] اور جنھوں نے شیطان کی پرستش کی ہے۔ یہ درجے میں بدتر اور صحیح راستے سے بہت زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔[۱۱۲] ۵۷-۶۰

۱۰۹؎ یعنی اِس بات کا غصہ کہ تم میں سے اکثر نافرمان ہیں اور نہیں چاہتے کہ کوئی دوسرا فرماں برداری کا رویہ اختیار کرے اور اِس کے نتیجے میں خدا کی خوشنودی حاصل کرلے۔

۱۱۰؎ یہ قرآن نے نہایت لطیف طریقے سے مذاق اڑانے والوں کے اپنے جرائم اُن کے سامنے رکھ دیے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے لیے بُرا انجام سوچ رہے ہیں، مگر اپنے کرتوتوں سے صرف نظر کیے ہوئے ہیں۔ اُنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کے نزدیک سب سے بُرا انجام اُن لوگوں کا ہے جو اِس طرح کے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں، نہ کہ اُن لوگوں کا جو اللہ کے تمام رسولوں اور اُس کی تمام کتابوں پر ایمان رکھتے اور اُن کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۱۱۱؎ اشارہ ہے اُس واقعے کی طرف جس میں یہود کی ایک بستی کے لوگوں نے سبت کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں پہلے اُن کی سیرت مسخ ہوئی، پھر اُن میں اور جانوروں میں ایک ظاہری فرق جو تھوڑا سا رہ گیا تھا، وہ بھی مٹ گیا۔ یہاں تک کہ خدا کی لعنت نے اُن کے ظاہر و باطن ہر چیز کا احاطہ کرلیا۔

۱۱۲؎ یہ دوسری بات پہلی بات کے لیے دلیل ہے۔ یعنی راستے سے بہت زیادہ بھٹکے ہوئے

وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ﴿٦١﴾ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٦٢﴾ لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ

یہ جب تمھارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں، دراں حالیکہ کفر لیے ہوئے آتے اور اُسی کے ساتھ واپس چلے جاتے ہیں اور (نہیں سمجھتے کہ) اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔[۱۴۳] تم دیکھتے ہو کہ اِن میں سے اکثر حق تلفی، ظلم و زیادتی اور اپنی حرام خوری کے لیے سرگرم عمل ہیں۔[۱۴۴] کیا ہی بُرا

ہیں، اِس لیے آخرت میں اپنے انجام کے لحاظ سے بھی لازماً بدتر ٹھیریں گے۔

[۱۴۳] یہ بھی یہود ہی کا ذکر ہے، لیکن یہ اُن کے وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار کرتے تھے، مگر اپنے دل میں یہی سمجھتے تھے کہ وہ اگر آپ کو مان رہے ہیں تو امیوں کے لیے اللہ کا رسول مان رہے ہیں۔ رہے وہ تو اُن کے لیے اُن کے اپنے نبی اور اپنے صحیفے ہی کافی ہیں۔ وہ اِس دائرے سے باہر کی کسی ہدایت کو ماننے کے مکلّف نہیں ہیں۔ قرآن نے صاف واضح کر دیا کہ یہ صریح کفر ہے۔ اِس طرح کا ایمان کسی درجے میں بھی قابل قبول نہیں ہے۔

[۱۴۴] یہ قرآن نے اِن کے دعویٰ ایمان کی قلعی کھول دی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِس سے یہ بات نکلتی ہے کہ ایمان کے ساتھ کسی ظلم و زیادتی کا صادر ہو جانا یا کسی حرام سے آلودہ ہو جانا تو بعید نہیں ہے، لیکن حرام خوری ہی کسی کا اوڑھنا بچھونا بن جائے اور اُس کی ہر وقت کی تگ و دو ظلم و زیادتی ہی کی راہ میں ہو تو بہت ہی برا عمل ہے یہ جو ایمان کے دعوے کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اِس بات کو دوسرے مقام میں یوں بھی فرمایا گیا ہے کہ اگر اِن کا ایمان اِنھی باتوں کا حکم دے رہا ہے تو بہت ہی بری باتوں کا حکم دے رہا ہے۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۵۵۳)

المائدة
٥

عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿٦٣﴾
وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا
قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ
كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ؕ وَاَلْقَيْنَا

ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔ اِن کے علما اور فقہا اِنھیں گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے؟ کیا ہی بُرا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔[۱۱۵] ۶۱-۶۳

یہودی کہتے ہیں کہ خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں[۱۱۶] — اِنھی کے ہاتھ بندھیں اور اِن کی اِس بات کی وجہ سے اِن پر لعنت ہو[۱۱۷] — ہرگز نہیں، بلکہ اُس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں، وہ جس طرح چاہتا ہے، عطا فرماتا ہے۔[۱۱۸] حقیقت یہ ہے کہ اِن میں سے بہتوں کی سرکشی اور اِن کے کفر کو وہ چیز بڑھا کر رہے گی جو تم پر تمھارے پروردگار کی

---

[۱۱۵] یعنی عام لوگ تو ایک طرف، اِن کے علما اور فقہا بھی ایمان و اخلاق کے لحاظ سے ایسے مردہ ہو چکے ہیں کہ اِن کو اِن جرائم سے نہیں روکتے۔ اِس کی وجہ اِس کے سوا کیا ہے کہ وہ خود بھی یہی کر رہے ہیں۔

[۱۱۶] یعنی اِس بات کے لیے بندھے ہوئے ہیں کہ وہ ہمارے سوا کسی اور پر اپنا کلام نازل کرے اور اُسے نبوت اور کتاب عطا فرمائے۔

[۱۱۷] یہ جملۂ معترضہ کے طور پر فوراً اُن پر لعنت کی ہے، اِس لیے کہ یہود کی یہ بات صرف احمقانہ نہیں، اِس کے ساتھ آخری درجے کی گستاخی بھی ہے۔ ایمان کا دعویٰ رکھنے والا کوئی شخص اِس طرح کی بات اپنے پروردگار کے بارے میں کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔

[۱۱۸] یعنی اِن کا پابند نہیں ہے کہ فلاں کو نبوت دے اور فلاں کو نہ دے۔ وہ اپنے قانون اور اپنی حکمت کے مطابق جس پر چاہتا ہے، یہ عنایت فرماتا ہے۔

بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ كُلَّمَاۤ اَوْقَدُوْا
نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ
وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٦٤﴾
وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ
وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿٦٥﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ

طرف سے نازل ہوئی ہے۔[۴۱۹] (اِن کا یہی رویہ ہے جس کے باعث) ہم نے قیامت کے دن تک کے لیے اِن کے درمیان دشمنی اور عداوت ڈال دی ہے۔[۴۲۰] یہ جب کبھی جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں، اللہ اُسے بجھا دیتا ہے، (ورنہ یہ تو اِسی طرح بغاوت پھیلاتے) اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر اللہ اِن فساد برپا کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ ٦٤

اِس کے برخلاف اگر یہ اہل کتاب (ہمارے پیغمبر پر) ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو (اِس کے صلے میں) ہم اِن کی برائیاں اِن سے دور کر دیتے اور اِن کو راحت کے باغوں میں پہنچاتے۔ اور اگر (اپنی اجتماعی حیثیت میں) تورات و انجیل پر

---

[۴۱۹] اِس سے واضح ہے کہ 'يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ' میں جس انفاق کا ذکر ہے، وہ یہی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ یہ اِس بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اللہ اِن کے علاوہ بھی کسی کو اپنی کتاب اور نبوت کے لیے خاص کر سکتا ہے۔ چنانچہ اُس نے یہ نعمت بنی اسمٰعیل کو دینے کا فیصلہ کیا ہے تو اب یہی چیز اِن کے کفر اور طغیان کو بڑھانے کا باعث بن جائے گی۔

[۴۲۰] اِس سورہ کی آیت ۱۴ میں نصاریٰ سے متعلق بھی یہی فرمایا ہے۔ فرقہ بندی کا جنگ و جدال اِسی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ صورت حال حق کے مقابلے میں سرکشی کا قدرتی نتیجہ ہے اور اِس

وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ
اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۶﴾

اور اُس چیز پر قائم ہو جاتے جو اِن کے پروردگار کی طرف سے اِن پر اتاری گئی ہے[۴۲۱] تو اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے رزق پاتے۔[۴۲۲] (اِس میں شبہ نہیں کہ) اِن میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو راستی پر قائم ہے، لیکن اِن میں زیادہ وہی ہیں جن کے اعمال بہت بُرے ہیں۔ ۶۵-۶۶

جرم کی سزا بھی۔ اللہ تعالیٰ نے اِسی بنا پر اِس کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

[۴۲۱] یعنی قرآن مجید۔ اِس سے واضح ہے کہ اِن کتابوں میں اِس کے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ بعد میں آنے والی کتاب قانون سے متعلق بعض چیزوں میں ترمیم و اضافہ کر دیتی ہے۔ اپنی اصل کے لحاظ سے دین ایمان و اخلاق کی دعوت ہے۔ تورات و انجیل اور قرآن میں اصلاً یہی دعوت بیان ہوئی ہے اور مسلمان ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ آدمی نے اللہ کی سب کتابوں اور سب پیغمبروں کو ماننے اور اُن کی تعلیمات پر قائم ہو جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اہل کتاب کو یہ دعوت اِسی لحاظ سے دی گئی ہے۔

[۴۲۲] بنی اسرائیل سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اگر حق پر قائم ہوں تو اللہ تعالیٰ اِسی دنیا میں اپنی برکتوں کے دروازے اُن کے لیے کھول دے گا۔ یہ اِسی وعدے کا ذکر ہے۔ استثنا میں یہ وعدہ اِس طرح بیان ہوا ہے:

> ”اور اگر تو خداوند اپنے خدا کی بات کو جاں فشانی سے مان کر اُس کے اُن سب حکموں پر جو آج کے دن میں تجھ کو دیتا ہوں، احتیاط سے عمل کرے تو خداوند تیرا خدا دنیا کی سب قوموں سے زیادہ تجھ کو سرفراز کرے گا۔ اور اگر تو خداوند اپنے خدا کی بات سنے تو یہ سب برکتیں تجھ پر نازل ہوں گی اور تجھ کو ملیں گی۔ شہر میں بھی تو مبارک ہوگا اور کھیت میں بھی مبارک ہوگا... خداوند تیرے دشمنوں کو جو تجھ پر حملہ کریں، تیرے روبرو شکست دلائے گا۔ وہ تیرے مقابلے کو تو ایک

يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ

(اِن کی پروا نہ کرو)، اے پیغمبر، (اور) جو کچھ تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے، وہ اِنھیں پہنچا دو[۴۲۳]، جس طرح کہ پہنچانے کا حق ہے اور (یاد رکھو کہ) اگر

ہی راستے سے آئیں گے، پر سات سات راستوں سے ہو کر ترے آگے سے بھاگیں گے... اور دنیا کی سب قومیں یہ دیکھ کر کہ تو خداوند کے نام سے کہلاتا ہے، تجھ سے ڈر جائیں گی... اور خداوند تجھ کو دُم نہیں، بلکہ سر ٹھیرائے گا اور تو پست نہیں، بلکہ سرفراز ہی رہے گا... لیکن اگر تو ایسا نہ کرے کہ خداوند اپنے خدا کی بات سن کر اُس کے سب احکام اور آئین پر جو آج کے دن میں تجھ کو دیتا ہوں، احتیاط سے عمل کرے تو یہ سب لعنتیں تجھ پر نازل ہوں گی اور تجھ کو لگیں گی۔ شہر میں بھی تو لعنتی ہوگا اور کھیت میں بھی لعنتی ہوگا... خداوند تجھ کو تیرے دشمنوں کے آگے شکست دلائے گا۔ تو اُن کے مقابلے کے لیے تو ایک ہی راستے سے جائے گا اور اُن کے سامنے سے سات سات راستوں سے ہو کر بھاگے گا اور دنیا کی تمام سلطنتوں میں تو مارا مارا پھرے گا۔“ (۲۸: ۱-۲۵)

[۴۲۳] یہ اُس پیغام کی تمہید ہے جو آگے نقل ہوا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہ پیغام آگے آیت ۶۸ سے لے کر آیت ۸۶ تک پھیلا ہوا ہے اور اِس میں نہایت واضح طور پر اِن دونوں گروہوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ جب تک تم تورات و انجیل اور اللہ کی اِس آخری کتاب، قرآن کو قائم نہ کرو، تمھاری کوئی دینی حیثیت نہیں ہے۔ خدا کے ساتھ کسی کو کوئی نسبت کسی گروہ سے نسبت کی بنا پر حاصل نہیں ہوتی، بلکہ ایمان اور عمل صالح کی بنا پر حاصل ہوتی ہے اور اِس سے تم بالکل محروم ہو چکے ہو... یہ پیغام بڑا اہم تھا، یہود و نصاریٰ، دونوں کی دینی حیثیت پر یہ آخری ضرب لگائی جا رہی تھی اور عین اُس وقت لگائی جا رہی تھی، جب کہ وہ پورا زور اِس بات کے لیے لگا رہے تھے کہ مسلمان اُن کی دینی حیثیت تسلیم کر لیں، اِس وجہ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص طور پر 'رسول' کے لفظ سے خطاب کر کے یہ پیغام آپ کے حوالے کیا گیا جس میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رسول خدا کا پیغام بر ہوتا ہے، اِس وجہ سے یہ اُس کا فرض منصبی

فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۷﴾

تم نے ایسا نہ کیا تو یہی سمجھا جائے گا کہ تم نے خدا کا پیغام نہیں پہنچایا۔[۴۲۴] (تم مطمئن رہو)، اللہ اِن لوگوں سے تمھاری حفاظت کرے گا۔[۴۲۵] اِس لیے کہ اللہ اِس منکر قوم کو ہرگز کامیابی کا راستہ نہ دکھائے گا۔[۴۲۶] ۶۷

> ہے کہ خدا کی طرف سے جو کچھ اُس پر اتارا جائے، وہ بے کم و کاست اُس کے مخاطبوں تک پہنچا دے، قطع نظر اِس سے کہ اِس پیغام سے اُن کے اندر کیا ہلچل برپا ہوتی ہے اور وہ پیغام اور پیغام بر کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۵۶۲)

۴۲۴؎ یہ اُس بات کی تاکید مزید ہے جو پچھلے جملے میں بیان ہوئی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اللہ نے اپنا پیغام پہنچانے کے لیے تمھیں رسول مقرر کیا ہے، اِس لیے اِن کے کسی ردعمل کے اندیشے سے اِس میں کوتاہی ہوئی تو یہ عین اُس فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی ہو گی جس کے لیے یہ منصب تمھیں دیا گیا ہے۔ اِس میں خطاب بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر روے سخن، اگر غور کیجیے تو اُنھی یہود و نصاریٰ کی طرف ہے جن کے لیے یہ پیغام آپ کے سپرد کیا جا رہا ہے تاکہ اِس کی اہمیت ہر لحاظ سے اُن پر واضح ہو جائے۔

۴۲۵؎ یہ اُس حفاظت کا بیان ہے جو سنت الٰہی کے مطابق اللہ کے رسولوں کو اُن کے پروردگار کی طرف سے لازماً حاصل ہوتی ہے۔

۴۲۶؎ اصل میں 'اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'هدى يهدى' کا لفظ کسی کو اُس کی تدبیروں میں بامراد کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یہاں یہ اِسی مفہوم میں ہے۔ مدعا یہ ہے کہ تم خدا کے رسول ہو، اِس لیے اِن شیاطین کے ہر شر سے وہ تمھاری حفاظت کرے گا اور اِن کی کسی تدبیر کو تمھارے خلاف بامراد نہ ہونے دے گا۔

قُلۡ یٰۤاَہۡلَ الۡکِتٰبِ لَسۡتُمۡ عَلٰی شَیۡءٍ حَتّٰی تُقِیۡمُوا التَّوۡرٰىةَ
وَالۡاِنۡجِیۡلَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ ؕ وَلَیَزِیۡدَنَّ کَثِیۡرًا مِّنۡہُمۡ
مَّاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ طُغۡیَانًا وَّکُفۡرًا ۚ فَلَا تَاۡسَ عَلَی

اِن[۴۲۷] سے صاف کہہ دو: اے اہل کتاب، تمھاری کوئی بنیاد نہیں ہے، جب تک تم تورات و انجیل پر اور اُس چیز پر قائم نہ ہو جاؤ جو تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر اتاری گئی ہے۔[۴۲۸] لیکن ہو گا یہی کہ اِن میں سے بہتوں کی سرکشی اور اُن کے کفر کو وہ چیز ضرور بڑھا دے گی جو تم پر تمھارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔[۴۲۹] اِس لیے

---

۴۲۷ یہاں سے وہ پیغام شروع ہو رہا ہے جو اتمام حجت کے اِس آخری مرحلے میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے کم و کاست اور پوری قطعیت کے ساتھ یہود و نصاریٰ تک پہنچا دینے کی ہدایت فرمائی ہے۔

۴۲۸ اِس سے قرآن مجید مراد ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اُس وقت تک تمھاری کوئی بنیاد نہیں ہے، جب تک تم تورات و انجیل کے ساتھ خدا کی اُس کتاب کو بھی اپنا دستور حیات نہیں بناتے جو خدا نے اپنے پیغمبر کی وساطت سے تم پر نازل کر دی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...قرآن مجید کے سوا کوئی اور چیز مراد لینے کی یہاں گنجایش نہیں ہے۔ آگے فوراً ہی اِس چیز کو ’مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ‘ کے الفاظ سے تعبیر کر کے بالکل واضح بھی کر دیا ہے کہ اِس سے مراد قرآن ہی ہے۔ یہاں قرآن کی تعبیر ’وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ‘ کے الفاظ سے کرنے میں اہل کتاب پر اتمام حجت کا ایک پہلو ہے۔ وہ یہ کہ تورات اور انجیل، دونوں میں اہل کتاب سے اللہ تعالیٰ نے یہ عہد لیا تھا کہ تمھارے پاس اِن اِن صفات کا پیغمبر خدا کا آخری اور کامل صحیفہ لے کر آئے گا تو تم اُس پر ایمان لانا، اُس کی پیروی کرنا، اُس کی مدد کرنا اور اُس کی گواہی دینا۔ اِسی پہلو کی طرف یہاں اشارہ ہے اور اِس موقع پر جب کہ قرآن اُن تمام صفات کے مطابق، جو سابق صحیفوں میں اُس کی بیان ہوئیں، نازل ہو چکا تو تورات اور انجیل کا قائم کرنا یہی ہے کہ خدا

الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٦٨﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٩﴾

اِن منکرلوگوں پر افسوس نہ کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ (خدا کی نجات پر کسی کا اجارہ نہیں ہے، لٰہذا) جو مسلمان ہیں اور جو (اِن سے پہلے) یہودی ہوئے اور جو صابی اور نصاریٰ[۴۳۰] کہلاتے ہیں، اِن میں سے جو لوگ بھی اللہ پر ایمان لائے ہیں اور قیامت کے دن پر ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، اُن کے لیے نہ (خدا کے حضور میں) کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ وہ کبھی غم زدہ ہوں گے۔[۴۳۱] ۶۸-۶۹

کی اتاری ہوئی اِس چیز کو اہل کتاب قائم کریں۔ اِس کا قائم ہونا ہی تورات اور انجیل، سب کا قائم ہونا ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۵۶۴)

[۴۲۹] مطلب یہ ہے کہ اِنھیں اِس بات پر غصہ تو پہلے سے تھا کہ خدا کے آخری رسول کی بعثت بنی اسمٰعیل میں ہوگی، لیکن یہ چیز واقعہ بن گئی ہے تو اِن کے حسد کی آگ کو اِس نے اور بھڑکا دیا ہے۔ چنانچہ اعتراف حق کی سعادت حاصل کرنے کے بجاے اب یہ سرکشی اور کفر میں بھی اور بڑھیں گے، دراں حالیکہ یہ اگر قرآن پر قائم ہو جاتے تو صرف قرآن پر قائم نہ ہوتے، اِس کے ساتھ تورات و انجیل پر بھی قائم ہو جاتے، اِس لیے کہ وہ اِن کی پیشین گوئیوں کا مصداق بن کر اُسی ہدایت کی طرف بلا رہا ہے جو اِن کتابوں میں بیان ہوئی ہے۔

[۴۳۰] اصل الفاظ ہیں: 'الصّٰبِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰى'۔ اِن میں 'الصّٰبِئُوْنَ' محل پر معطوف ہے، اِس لیے حالت رفع میں ہے۔

[۴۳۱] یہ بشارت اِس شرط کے ساتھ ہے کہ اِن میں سے کسی نے کوئی ایسا جرم نہ کیا ہو جو ایمان و عمل کو اکارت کر دے سکتا ہے۔ مثلاً، کسی بے گناہ کو قتل کرنا یا جانتے بوجھتے خدا کے کسی سچے پیغمبر کو

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ۝۷۰ وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا

یہ حقیقت ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل سے (شریعت کی پابندی کا) عہد لیا اور (اُس کی یاددہانی کے لیے) بہت سے پیغمبر اُن کی طرف بھیجے، (مگر ہوا یہ کہ) جب کبھی کوئی پیغمبر اُن کی خواہشات نفس کے خلاف کچھ لے کر اُن کے پاس آیا تو کسی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کرتے رہے[۴۳۲] اور یہی سمجھا کہ اِس پر کوئی پکڑ نہ ہوگی۔[۴۳۳] چنانچہ اندھے اور

ماننے سے انکار کر دینا۔ قرآن نے یہ بات یہاں بھی اُسی سیاق و سباق میں کہی ہے جس میں یہ سورۂ بقرہ میں آئی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی شخص کو فلاح محض اِس بنیاد پر حاصل نہ ہوگی کہ وہ یہود و نصاریٰ میں سے ہے یا مسلمانوں کے کسی گروہ سے تعلق رکھتا ہے یا صابی ہے، بلکہ اِس بنیاد پر حاصل ہوگی کہ وہ اللہ کو اور قیامت کے دن کو فی الواقع مانتا ہے اور اُس نے نیک عمل کیے ہیں۔ ہر مذہب کے لوگوں کو اِسی کسوٹی پر پرکھا جائے گا، اِس سے کوئی بھی مستثنیٰ نہ ہوگا۔ یہود کا یہ زعم محض زعم باطل ہے کہ وہ یہودی ہونے ہی کو نجات کی سند سمجھ رہے ہیں۔ اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ ہوں یا مسلمان یا کسی اور مذہب و ملت کے پیرو، اِن میں سے کوئی بھی محض پیغمبروں کو ماننے والے کسی گروہ میں شامل ہو جانے سے جنت کا مستحق نہیں ہو جاتا، بلکہ اللہ اور آخرت پر حقیقی ایمان اور عمل صالح ہی اُس کے لیے نجات کا باعث بنتا ہے۔

[۴۳۲] اصل الفاظ ہیں: ’وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ‘۔ اِن کے معطوف علیہ سے واضح ہے کہ ’يَّقْتُلُوْنَ‘ سے پہلے ایک فعل ناقص عربی قاعدے کے مطابق حذف ہو گیا ہے۔

[۴۳۳] اصل میں لفظ ’فِتْنَةٌ‘ آیا ہے۔ اِس کے معنی آزمایش اور ابتلا کے ہیں۔ ہم نے اِس کے معنی پکڑ کے لیے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ آزمایش پکڑ کی صورت میں بھی ہوتی ہے اور یہاں اِسی کا موقع ہے۔

ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ (۷۱)

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (۷۲) لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ

بہرے بن گئے۔ پھر اللہ نے عنایت فرمائی اور اُن کی توبہ قبول کر لی۔ اِس کے بعد بھی اُن میں سے اکثر اندھے اور بہرے ہی بنتے چلے گئے۔[۴۳۴] (اب بھی یہی صورت ہے) اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔[۴۳۵] ۷۰-۷۱

اُن لوگوں نے بھی یقیناً کفر کیا ہے جنھوں نے کہا کہ خدا تو یہی مسیح ابن مریم ہے،[۴۳۶] دراں حالیکہ مسیح نے تو کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل، اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمھارا بھی۔ (اُنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) جو اللہ کے شریک ٹھیرائے گا، اُس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اُس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ایسے ظالموں کا وہاں کوئی مددگار

---

[۴۳۴] یعنی پہلی مرتبہ اندھے اور بہرے بن جانے کے بعد جب اللہ نے پکڑا تو توبہ و اصلاح کر لی، مگر دوسری مرتبہ اِس کی توفیق بھی نہیں ہوئی۔ اِس میں غالباً بنی اسرائیل کی تاریخ کی اُن دو بڑی تباہیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن میں یہ شاہ اسور اور شاہ بابل نبوخذ نضر کے ہاتھوں مبتلا ہوئے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں یہ واقعات تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

[۴۳۵] یعنی دیکھ رہا ہے تو یقیناً سزا بھی دے گا۔ اُس کی گرفت سے یہ کسی طرح بچ نہ سکیں گے۔

[۴۳۶] یعنی مسیح ابن مریم خدا سے الگ کوئی شخصیت نہیں، بلکہ خدا ہی کا جسدی ظہور ہیں۔

ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ
لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ
اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷۴﴾ مَا الْمَسِيْحُ
ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ
كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ

نہ ہوگا۔ اِسی طرح اُن لوگوں نے بھی یقیناً کفر کیا ہے جنھوں نے کہا کہ اللہ تین میں سے تیسرا ہے،[۴۳۷] دراں حالیکہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ یہ اپنی باتوں سے باز نہ آئے تو اِن میں سے جو (پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے بعد بھی) اپنے کفر پر قائم رہیں گے، اُنھیں ایک دردناک عذاب آ پکڑے گا۔[۴۳۸] پھر کیا یہ اللہ کی طرف رجوع نہ کریں گے اور اُس سے معافی نہ مانگیں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ مغفرت فرمانے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ مسیح ابن مریم ایک رسول ہی تھے، اُن سے پہلے بھی بہت سے رسول گزرے ہیں اور اُن کی ماں (خدا کی) ایک صداقت شعار بندی تھی، وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔[۴۳۹] دیکھو، ہم اپنی آیتیں اِن کے سامنے کس طرح کھول کر بیان کر

صوفیانہ مذاہب میں یہی بات پوری کائنات کے بارے میں کہی جاتی ہے۔ قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ یہ صریح کفر ہے۔ اِس کی تعبیر جس طریقے سے بھی کی جائے، اُسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔

[۴۳۷] یہ ایک دوسری تعبیر ہے جس کے مطابق باپ، بیٹا اور روح القدس، تینوں اقنوم الگ الگ بھی خدا ہیں اور تینوں مل کر بھی خدا ہیں۔ قرآن نے اِس پر تنقید کے لیے یہ اسلوب اِس لیے اختیار کیا ہے کہ اِس کا گھنونا پن پوری طرح واضح ہو جائے۔ مدعا یہ ہے کہ عالم کا پروردگار تو وحدہ لا شریک خدا ہے۔ یہ اِن کی سفاہت ہے کہ اِنھوں نے اُس کی خدائی کو تین میں تقسیم کر کے اُسے تین میں سے تیسرے کا درجہ دے دیا ہے۔

اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٧٥﴾ قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ
لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ؕ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٧٦﴾ قُلْ يٰۤاَهْلَ
الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ

رہے ہیں۔ پھر دیکھو کہ یہ کس طرح الٹے پھرے جاتے ہیں۔ اِن سے کہو، کیا تم اللہ کو چھوڑ کر اُن کی بندگی کرتے ہو جو تمھارے لیے کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے؟ دراں حالیکہ اللہ ہی سمیع و علیم ہے۔[۴۴۰] کہہ دو، اے اہل کتاب، اپنے دین میں ناحق غلو نہ

۴۳۸۔ یہ اُس عذاب کی وعید ہے جو رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُن کے منکرین پر لازماً آجاتا ہے۔

۴۳۹۔ یعنی مسیح علیہ السلام اور اُن کی ماں خدا کس طرح ہو سکتے ہیں، جب کہ زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے وہ اُسی طرح کھانے اور پینے کے محتاج تھے، جس طرح ہر انسان اِن کا محتاج ہوتا ہے۔ اہل کتاب کے ہاں یہ ایک مسلم دلیل بشریت ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کے بارے میں بیان ہوا ہے کہ اُن کے شاگرد جب اُنھیں ایک روح سمجھ کر اُن سے ڈرے تو اُنھوں نے بھنی ہوئی مچھلی کا ایک قتلہ کھا کر اُنھیں اطمینان دلایا کہ وہ روح نہیں، بلکہ آدمی ہیں۔ لوقا میں ہے:

> ”وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ یسوع آپ اُن کے بیچ میں آ کھڑا ہوا اور اُن سے کہا: تمھاری سلامتی ہو، مگر اُنھوں نے گھبرا کر اور خوف کھا کر یہ سمجھا کہ کسی روح کو دیکھتے ہیں۔ اُس نے اُن سے کہا: تم کیوں گھبراتے ہو اور کس واسطے تمھارے دل میں شک پیدا ہوتے ہیں۔ میرے ہاتھ اور میرے پاؤں دیکھو کہ میں ہی ہوں۔ مجھے چھو کر دیکھو، کیونکہ روح کے گوشت اور ہڈی نہیں ہوتی، جیسا مجھ میں دیکھتے ہو اور یہ کہہ کر اُس نے اُنھیں اپنے ہاتھ اور پاؤں دکھائے۔ جب مارے خوشی کے اُن کو یقین نہ آیا اور تعجب کرتے تھے تو اُس نے اُن سے کہا: کیا یہاں تمھارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟ اُنھوں نے اُسے بھنی ہوئی مچھلی کا قتلہ دیا۔ اُس نے لے کر اُن کے روبرو کھایا۔“ (۲۴: ۳۶-۴۳)

ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۷۷﴾

کرو[۴۴۱] اور اُن لوگوں کے بدعات[۴۴۲] کی پیروی نہ کرو جو پہلے ہی گم راہ ہو چکے تھے اور جنھوں نے بہتوں کو گم راہ کیا اور جو سیدھی راہ سے بھٹک گئے[۴۴۳]۔ ۷۶-۷۷

---

۴۴۰ یعنی سمیع و علیم ہے، اِس لیے حقیقی معنوں میں وہی نافع و ضار بھی ہے، لیکن تعجب ہے کہ اُس کو چھوڑ کر تم ایسی ہستیوں کی عبادت کرتے ہو جو نہ سنتی ہیں، نہ جانتی ہیں اور نہ کسی کو کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتی ہیں۔

۴۴۱ اِس میں روے سخن نصاریٰ کی طرف ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... جس طرح یہود کی عام بیماری دین کے معاملے میں تفریط کی رہی ہے، اُسی طرح نصاریٰ کی عام بیماری افراط اور غلو کی رہی ہے، اور یہ افراط و تفریط، دونوں ہی چیزیں دین کو برباد کرنے والی ہیں۔ اِسی غلو کا کرشمہ ہے کہ نصاریٰ نے حضرت مسیح کو رسول سے خدا بنا ڈالا، پھر اُن کی ماں اور روح القدس کو بھی خدائی میں شریک کر دیا۔ رہبانیت کا نظام جو اُنھوں نے کھڑا کیا، اُس کے متعلق بھی قرآن نے تصریح فرمائی ہے کہ یہ اُن کے غلو ہی کا کرشمہ ہے۔“

(تدبر قرآن ۲/ ۵۶۹)

۴۴۲ اصل میں لفظ ’اَهْوَآء‘ آیا ہے۔ اِس کے معنی خواہشات کے ہیں، لیکن اِس سے مراد یہاں اِن کا نتیجہ ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ بدعات تمام تر خواہشات سے پیدا ہوتی ہیں۔ قرآن نے یہ لفظ استعمال کر کے اِن کے اصل ماخذ کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

۴۴۳ یہ پال (Paul) اور اُس کے ساتھیوں کی طرف اشارہ ہے جنھوں نے سیدنا مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کو مسخ کر کے اُن فلسفیانہ ضلالتوں کی ایک شاخ بنا دیا جن میں وہ پہلے سے مبتلا تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... نصرانیت میں داخل ہونے سے قبل وہ جن گم راہیوں میں مبتلا رہے تھے، اُنھی گم راہیوں پر

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ
وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (۷۸) كَانُوْا
لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (۷۹)
تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے (اِس سے پہلے) کفر کیا، اُن پر داوٗد کی زبان سے اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی[۴۴۴]، اِس لیے کہ اُنھوں نے (خدا کی) نافرمانی کی اور (بندوں کے معاملے میں بھی) وہ (خدا کے مقرر کردہ) حدود سے آگے بڑھ جایا کرتے تھے۔ وہ جن برائیوں کا ارتکاب کرتے، اُن سے کسی طرح باز نہیں آتے تھے۔ نہایت بُرا طرزِ عمل تھا جو اُنھوں نے اختیار کر لیا تھا۔ (اِس وقت بھی) تم اُن میں بکثرت لوگوں کو دیکھتے ہو کہ وہ منکروں[۴۴۵] کو اپنا دوست بناتے ہیں۔ نہایت بُرا سامان

اُنھوں نے نصرانیت کا ملمع چڑھانے کی کوشش کی اور اِس طرح وہ خود بھی شاہراہ حق سے بھٹکے اور دوسروں کو بھی اُنھوں نے گم راہ کیا۔ اِس اسلوب بیان میں درپردہ نصاریٰ کے لیے یہ تلقین ہے کہ آج جس چیز کو تم نصرانیت سمجھ رہے ہو، یہ تمھارے اپنے گھر کی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ تمام تر بت پرست قوموں سے برآمد کردہ چیز ہے جو تم پر لاد دی گئی ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۵۶۹)

[۴۴۴] سیدنا داوٗد سے بنی اسرائیل کی سیاسی عظمت کی ابتدا ہوئی اور سیدنا مسیح علیہ السلام اُن کے آخری پیغمبر ہیں۔ اِن دونوں کے ذکر سے قرآن نے اشارہ کر دیا ہے کہ ابتدا سے انتہا تک اُن کے تمام پیغمبر اُن کی سرکشی کے باعث اُن پر لعنت کرتے رہے ہیں۔ انبیا علیہم السلام کے جو صحیفے بائیبل کے مجموعے میں شامل ہیں، اُن سے یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ خاص مسیح و داوٗد کی جس لعنت کا یہاں حوالہ دیا گیا ہے، اُس کے لیے ملاحظہ ہو: زبور باب ۱۲: ۱-۳، باب ۲۸: ۳-۶، باب ۴۰: ۱۰-۱۷، باب ۵۹، باب ۶۸: ۱-۴، باب ۱۰۹، باب ۱۴۰: ۶-۱۱۔ متی باب ۲۳: ۱۴-۳۹۔

لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ (٨٠)
وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ
اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (٨١)
لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ
اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا

ہے جو اُنھوں نے اپنے حق میں آگے کے لیے تیار کر کے بھیجا ہے۔ یہی کہ اُن پر خدا کا غضب ہوا اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہنے والے ہیں[۴۴۶]۔ اگر یہ فی الواقع اللہ اور اُس کے پیغمبر اور اُس چیز کے ماننے والے ہوتے جو پیغمبر کی طرف نازل ہوئی[۴۴۷] تو کبھی اِن (منکروں) کو اپنا دوست نہ بناتے، مگر اِن میں سے زیادہ تر نافرمان ہو چکے ہیں۔ ۸۰-۸۱

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی دشمنی میں تم سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے[۴۴۸] اور مسلمانوں کی دوستی میں سب سے زیادہ قریب اُن لوگوں کو پاؤ گے جنھوں

---

[۴۴۵] یعنی مشرکین مکہ جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت کے باوجود آپ کو ماننے سے انکار کر دیا۔

[۴۴۶] یہ عمل کے بجائے اُس کا نتیجہ سامنے رکھ دیا ہے کہ وہ اپنے کرتوتوں کا انجام دیکھ لیں۔

[۴۴۷] یعنی موسیٰ علیہ السلام اور تورات جو اُن پر نازل ہوئی اور جس پر یہود ایمان کا دعویٰ کرتے تھے۔

[۴۴۸] اوپر فرمایا تھا کہ تم اُن میں بکثرت لوگوں کو دیکھتے ہو کہ وہ منکروں کو اپنا دوست بناتے ہیں۔ یہ اُس کی تصریح مزید ہے کہ مسلمانوں کی دشمنی میں وہ بالکل مشرکین سے ہم آہنگ ہو چکے ہیں اور اِس طرح ایمان و اخلاق کے لحاظ سے اِس پستی میں گر چکے ہیں کہ حامل کتاب ہو کر

اِنَّا نَصٰرٰی ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّ مِنۡہُمۡ قِسِّیۡسِیۡنَ وَ رُہۡبَانًا وَّ اَنَّہُمۡ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ ﴿۸۲﴾
وَ اِذَا سَمِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَی الرَّسُوۡلِ تَرٰۤی اَعۡیُنَہُمۡ تَفِیۡضُ
مِنَ الدَّمۡعِ مِمَّا عَرَفُوۡا مِنَ الۡحَقِّ ۚ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاکۡتُبۡنَا
مَعَ الشّٰہِدِیۡنَ ﴿۸۳﴾ وَ مَا لَنَا لَا نُؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَ مَا جَآءَنَا مِنَ الۡحَقِّ ۙ
وَ نَطۡمَعُ اَنۡ یُّدۡخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الۡقَوۡمِ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۸۴﴾ فَاَثَابَہُمُ اللّٰہُ بِمَا

نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں[۴۴۹]۔ یہ اِس لیے کہ اُن کے اندر علما اور راہب ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے اور جب اُس چیز کو سنتے ہیں جو خدا کے رسول پر اتری ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق کو پہچان لینے کے باعث اُن کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلتے ہیں[۴۵۰]۔ وہ پکار اُٹھتے ہیں کہ پروردگار، ہم نے مان لیا، سو ہمارا نام تو اِس کی گواہی دینے والوں میں لکھ لے[۴۵۱]۔ اور ہم اللہ کو اور اُس حق کو کیوں نہ مانیں جو ہمارے پاس آ گیا ہے، جب کہ ہم توقع رکھتے ہیں

بت پرستوں سے دوستی کی پینگیں بڑھا رہے ہیں۔

[۴۴۹] اِس سے واضح ہے کہ اِس سے مراد عام مسیحی نہیں ہیں جنھوں نے پال کی ایجاد کردہ مسیحیت کو اپنے مذہب کے طور پر اختیار کر رکھا ہے، بلکہ مسیح علیہ السلام کے خلیفۂ راشد شمعون صفا کے پیرو ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ بعثت میں بڑی حد تک سیدنا مسیح کی اصل تعلیمات پر قائم تھے۔ قرآن نے اِسی بنا پر اِن کی نسبت فرمایا ہے کہ 'اَلَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا: اِنَّا نَصٰرٰی' (جنھوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں)، جب کہ پال اور اُس کے پیرو نصاریٰ کے لفظ کو حقیر خیال کرتے اور اپنا تعارف مسیحی کے نام سے کرانا پسند کرتے تھے۔

[۴۵۰] سیدنا مسیح کے اِن سچے پیرووں نے قرآن کا استقبال جس والہانہ انداز سے کیا، یہ اُس کی تصویر ہے۔

[۴۵۱] یعنی اِس بات کی گواہی کہ یہی وہ کتاب ہے جس کے آنے کی پیشین گوئی ہمارے صحیفوں

قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ
جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ
اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۸۶﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ

کہ ہمارا پروردگار ہمیں نیک لوگوں میں شامل کرے گا۔[۴۵۲] سو اللہ کا فیصلہ ہے کہ اُن کی اِس بات کے صلے میں اُن کو ایسے باغ عطا فرمائے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اُن لوگوں کی جزا ہے جو خوبی کا رویہ اختیار کرنے والے ہوں۔ رہے وہ جو منکر ہوئے اور جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا ہے تو وہی دوزخ کے لوگ ہیں۔ ۸۲-۸۶

۱۔ ایمان[۴۵۳] والو، جو پاکیزہ چیزیں اللہ نے تمھارے لیے جائز کی ہیں،[۴۵۴] اُنھیں حرام نہ

میں کی گئی تھی۔

[۴۵۲] یہ قرآن کی تصدیق اور اُس پر ایمان لانے کے لیے اُن کے اقدام کی دلیل ہے۔ اِس کے ساتھ، اگر غور کیجیے تو یہ یہود و نصاریٰ کے اُن لوگوں پر ایک لطیف تعریض بھی ہے جو پیغمبر کی گواہی چھپا کر بیٹھے تھے اور اِس کے باوجود خدا کے حضور میں سرفرازی کی توقع رکھتے تھے۔

[۴۵۳] اپنے مضمون کے لحاظ سے سورہ یہاں ختم ہوئی۔ اِس سے آگے اب اُسی طرح ایک ضمیمہ ہے، جس طرح سورۂ نساء کے آخر میں ہے۔ اِس میں اللہ تعالیٰ نے اُن سوالوں کا جواب دیا ہے جو اِس سورہ کے مباحث سے متعلق لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوئے ہیں۔ اِن میں سے ہر سوال کا جواب 'یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' کے خطاب سے شروع ہوتا ہے۔ قرآن نے سوالات نقل نہیں کیے، اِن کا جواب، البتہ ایک ترتیب کے ساتھ دیا ہے اور درمیان میں اشارہ بھی کر دیا ہے کہ یہ لوگوں

کے سوالات ہی ہیں جن کا جواب اِس ضمیمے میں دیا گیا ہے۔ نساء اور مائدہ توام سورتیں ہیں۔ اِن کے خاتمے کی یہ مماثلت بتاتی ہے کہ قرآن میں سورتیں کس کس پہلو سے توام ہوتی ہیں۔

پہلا سوال آیات ۱-۲ میں عہد و پیمان کی پابندی کی تمہید کے بعد یہ بتانے سے پیدا ہوا ہے کہ چند مستثنیات کے سوا تمام چوپایے حلال ٹھیرائے گئے ہیں۔ لوگوں نے پوچھنا چاہا ہے کہ اگر اللہ کے نام پر باندھے گئے عہد و پیمان کی اہمیت دین میں اِس درجہ غیر معمولی ہے تو کوئی شخص اگر شریعت کی حرمتوں کے علاوہ کسی چیز کو اپنے اوپر حرام ٹھیرانے کی قسم کھا بیٹھے تو اس کا کیا حکم ہے؟

دوسرا سوال اِنھی آیات سے یہ پیدا ہوا ہے کہ اِن میں بیان کردہ حرمتوں کے سوا اگر ہر چیز حلال ہے تو شراب اور جوے کے بارے میں کیا ہدایت ہے؟ اِس سوال کا جواب اگر یہ ہے کہ یہ دونوں حرام ہیں تو جو لوگ اِس سے پہلے اِن چیزوں میں ملوث رہے ہیں، اُن کے ساتھ کیا معاملہ ہو گا؟

تیسرا سوال بھی اِنھی آیات میں حالت احرام کے شکار کی حرمت کے ذکر سے پیدا ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اِس حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے تو اُس کو کیا کرنا چاہیے؟ نیز یہ کہ احرام کی حالت میں سمندر کے شکار کا کیا حکم ہے؟ اِس لیے کہ سمندر کے سفر میں تو بعض اوقات شکار کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

چوتھا سوال بھی اِنھی آیات سے متعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہدی، قلائد اور اِسی طرح کے دوسرے شعائر کی حرمت اِن آیتوں میں بڑی تاکید کے ساتھ بیان فرمائی ہے۔ اِس سے یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام وغیرہ کے نام سے جن جانوروں کی حرمت قدیم زمانے سے مذہبی رسوم کی بنا پر مسلم چلی آرہی ہے، اُن کے متعلق اب آخری فیصلہ کیا ہے؟ ہدی اور قلائد کی طرح اُن کی یہ حرمت بھی قائم ہے یا ختم کر دی گئی ہے؟

پانچواں اور آخری سوال کتمان شہادت کے اُس رویے پر قرآن کے تبصرے سے پیدا ہوا ہے جو خدا کی شریعت اور آخری بعثت کے معاملے میں یہود و نصاریٰ اختیار کیے ہوئے تھے۔ لوگوں کو تشویش ہوئی ہے کہ اِس کے بعد وہ اپنی وصیت پر گواہی کے لیے کیا اہتمام کریں؟ یہ اُن سوالوں

وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ
حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ لَا

ٹھیراؤ[۴۵۵] اور نہ حدود سے تجاوز کرو۔[۴۵۶] اللہ حدود سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔[۴۵۷] جو حلال و طیب چیزیں اللہ نے تمھیں بخشی ہیں، اُنھیں کھاؤ پیو اور (اپنے) اُس اللہ سے ڈرو جس پر تم ایمان لائے ہو۔ (تم میں سے بعض لوگ کسی چیز کو اپنے اوپر حرام کر لینے

میں سے ہے جو کسی بات کے ذکر سے ذہن کے دوسری طرف منتقل ہو جانے سے پیدا ہو جاتے ہیں۔

[۴۵۴] یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ بعض چیزیں فی الاصل پاکیزہ ہیں، مگر کوئی خارجی سبب بعض اوقات ایسا پیش آ جاتا ہے جس سے اُن کو خباثت لاحق ہو جاتی ہے۔ مثلاً، ایک جانور حلال ہے، لیکن اُس کو ذبح نہیں کیا گیا یا ذبح تو کیا گیا ہے، مگر اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کر دیا گیا ہے۔

[۴۵۵] اِس سے مراد کسی چیز کو اِس دعوے کے ساتھ ممنوع ٹھیرانا ہے کہ یہ خدا کا حکم ہے یا نیکی اور فضیلت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے یا اِس پر عذاب و ثواب مترتب ہو سکتا ہے۔ اِس میں زیادہ دخل مشرکانہ عقائد و اوہام کو ہوتا ہے۔ تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اِس طرح کے کسی ادعا یا گمان کے بغیر کسی چیز کے کھانے سے اجتناب بھی اِسی کے تحت ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اگر اِس قسم کی کوئی بات نہ ہو، بلکہ مجرد ذوق یا باقتضاے صحت یا بربناے احتیاط و کفایت کسی چیز کا استعمال کوئی شخص ترک کر دے تو یہ چیز تحریم میں داخل نہیں ہے۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۵۸۸)

[۴۵۶] یہ الفاظ یہاں ’حرام نہ ٹھیراؤ‘ کے مقابل میں آئے ہیں، اِس لیے مدعا یہ ہے کہ پاکیزہ چیزوں کو حرام نہ ٹھیراؤ اور حلال و حرام کے معاملے میں اللہ کے قائم کردہ حدود سے تجاوز کر کے اُس کی حرام کردہ چیزوں کو حلال بنا لینے کی جسارت بھی نہ کرو۔

[۴۵۷] قرآن میں اِس تعبیر سے بالعموم اِس کا لازم مراد ہوتا ہے، یعنی اُن سے نفرت کرتا ہے۔

يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ
الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا
تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ
فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا

کی قسم کھا بیٹھتے ہیں، سو جان لو کہ) اللہ تمھاری اُن قسموں پر کوئی مواخذہ نہ کرے گا جو تم بے ارادہ کھا لیتے ہو،[۴۵۸] لیکن جو قسمیں دل کے پختہ ارادے سے کھاتے ہو، اُن پر ضرور تمھارا مواخذہ کرے گا۔[۴۵۹] سو اِس طرح کی قسم اگر توڑ دی جائے تو اُس کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو اُس معیار کا کھانا کھلایا جائے جو تم عام طور پر اپنے اہل و عیال کو کھلاتے ہو یا اُنھیں پہننے کے کپڑے دیے جائیں یا ایک غلام آزاد کیا جائے۔ پھر جسے یہ میسر نہ ہو، اُس کے لیے تین دن کے روزے ہیں۔ یہ تمھاری قسموں کا کفارہ ہے، جب تم قسم کھا

---

[۴۵۸] قسم بعض اوقات بالکل لغو، بے فائدہ اور مہمل ہوتی ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ بندۂ مومن کو اِس سے بھی اجتناب کرنا چاہیے، لیکن اپنے بندوں پر یہ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں عنایت ہے کہ وہ اِس طرح کی قسموں پر دنیا اور آخرت میں کوئی مواخذہ نہ کرے گا۔

[۴۵۹] دین میں قسم کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ عہد پورا کرنا اسلام کے بنیادی اخلاقیات میں سے ہے۔ اِس سورہ کی ابتدا اِسی تاکید سے ہوتی ہے۔ قسم اِس عہد کو بالکل آخری درجے میں محکم کر دیتی ہے۔ مسلمان جب اپنے کسی عزم، ارادے یا عہد پر اللہ کی قسم کھاتا ہے تو وہ گویا اپنے پروردگار اور عالم کے بادشاہ کو اپنی بات پر گواہ ٹھیراتا ہے۔ انسانی تمدن میں تمام معاشرتی، سماجی اور سیاسی معاملات اور معاہدوں میں استحکام کا ذریعہ ہمیشہ سے قسم ہی رہی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ قسم اگر پختہ عزم کے ساتھ اور دل کے ارادے سے کھائی گئی ہے، اُس کے ذریعے سے کوئی عہد و پیمان باندھا گیا ہے، اُس سے حقوق و فرائض پر کوئی اثر مترتب ہوتا ہے یا وہ خدا کی کسی تحلیل و تحریم پر

اَيْمَانِكُمْ ۚ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٨٩﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ
وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٩٠﴾
اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي

بیٹھتے ہو۔[۶۰] (اِسے ادا کرو) اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔ اللہ اِسی طرح تمھارے لیے اپنی آیتوں کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم اُس کے شکر گزار رہو۔[۶۱] ۸۷-۸۹

۲۔ ایمان والو، یہ شراب[۶۲] اور جوا اور تھان اور قسمت کے تیر، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، سو اِن سے بچو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمھیں شراب اور

اثرانداز ہو سکتی ہے تو اُس پر اللہ تعالیٰ لازماً مواخذہ فرمائے گا۔

۶۰؎ قسم کی جو اہمیت اوپر بیان ہوئی ہے، اُس کے باوجود بارہا ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ آدمی کے لیے اپنی قسم پوری کرنا ممکن نہیں رہتا یا وہ محسوس کرتا ہے کہ اُس سے اللہ کا یا اُس کے نفس کا یا دوسروں کا کوئی حق تلف ہو جائے گا۔ آیت سے واضح ہے کہ اِس صورت میں قسم توڑی جا سکتی ہے، بلکہ بعض صورتوں میں قسم توڑ دینا دین و اخلاق کی رو سے ضروری ہو جاتا ہے۔ کفارے کا یہ طریقہ اِسی مقصد سے مقرر کیا گیا ہے۔

۶۱؎ اِس سے واضح ہے کہ یہ توضیحی آیات ہیں جو اِس سورہ کے مباحث سے متعلق پیدا ہونے والے بعض سوالوں کے جواب میں نازل ہوئی ہیں۔ اِن کے بعد اگلی آیت سے دوسرے سوال کا جواب شروع ہو جاتا ہے۔

۶۲؎ سورۂ نساء کی آیت ۴۳ سے واضح ہے اور عقل عام بھی یہی کہتی ہے کہ شراب کی حرمت میں اصل علت اُس کے اندر نشے کا پایا جانا ہے۔ اِس وجہ سے ہر نشہ آور چیز کا حکم یہی ہوگا اور سد ذریعہ کے اصول پر اُس کی مقدار قلیل بھی اُسی طرح حرام ہوگی، جس طرح مقدار کثیر حرام ہے۔

الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ
فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ

جوے میں لگا کر تمھارے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دے[۴۶۳] اور تمھیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے[۴۶۴]۔ پھر کیا (اِن چیزوں سے) باز آتے ہو؟[۴۶۵] (اِن سے باز آجاؤ) اور

---

[۴۶۳] اصل الفاظ ہیں: 'فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ'۔ اِن میں 'فی' انہماک واشتغال کے مفہوم پر دلالت کرتا ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔ جوے اور شراب سے لوگوں کے درمیان دشمنی اور انتقام کی آگ کس طرح بھڑکتی ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''...یہ حقیقت ہے کہ جس معاشرے میں یہ وبا پھیل جائے، اُس میں یا تو عفت، عزت، ناموس اور وفا و حیا کا احساس مٹ جائے گا، جیسا کہ مغرب زدہ سوسائٹی میں آج مشاہدہ ہو رہا ہے اور یہ بجاے خود ایک عظیم حادثہ ہے اور اگر اِن کی کوئی رمق باقی رہے گی تو ناگزیر ہے کہ آئے دن اِن کی بدولت تلواریں کھنچی رہیں۔ عرب عفت و عصمت، خودداری اور غیرت کے معاملے میں بڑے حساس تھے اور یہ اِن کی بہت بڑی خوبی تھی، لیکن ساتھ ہی شراب اور جوے کے بھی رسیا تھے، اِس وجہ سے جام وسنداں کی یہ بازی اُن کے لیے بڑی مہنگی پڑ رہی تھی۔ جہاں کسی نے شراب کی بدمستی میں کسی کے عزت و ناموس پر حملہ کیا، کسی کی تحقیر کی، کسی کو چھیڑا یا جوے میں کوئی چیند کی (اور یہ چیزیں جوے اور شراب کے لوازم میں سے ہیں)، وہیں تلواریں سونت لیتے اور افراد کی یہ لڑائی چشم زدن میں قوموں اور قبیلوں کی جنگ بن جاتی اور انتقام در انتقام کا ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا کہ صرف مہینے اور سال نہیں، بلکہ پوری صدی گزار کر بھی یہ آگ ٹھنڈی نہ پڑتی۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۵۹۰)

[۴۶۴] خدا کی یاد کے بعد نماز کا ذکر عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ جوا اور شراب انسان کو خدا سے غافل کرتے ہیں اور انسان خدا سے غافل ہو جائے تو اُس پر شیطان مسلط ہو کر رہتا ہے۔ اُس

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿٩٢﴾ لَيْسَ
عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا
اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا

اللہ کی اطاعت کرو اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو اور (نافرمانی سے) بچتے رہو۔ لیکن (ہماری اِس ہدایت سے) منہ موڑو گے تو جان لو کہ ہمارے پیغمبر پر تو اِس کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے کہ وضاحت کے ساتھ پہنچا دے۔[۴٦٦] (تم میں سے) جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور اچھے عمل کرنے لگے ہیں، اُنھوں نے پہلے جو کچھ کھایا پیا تھا، اُس میں اُن پر کوئی گناہ نہیں ہے، جب کہ اُنھوں نے تقویٰ اختیار کیا، ایمان لائے اور اچھا

کی گرفت سے بچنا پھر اُس کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شیطان اُسے خواب دکھاتا اور زندگی کی اصل حقیقتوں سے رودررو ہونے کی جرأت اُس کے اندر سے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا ہے۔

۴٦٥ استفہام یہاں امر کے مفہوم میں ہے۔ امر کا سادہ اسلوب اختیار کرنے کے بجائے استفہام کا یہ اسلوب کیوں اختیار کیا گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِس اسلوب میں امر کے ساتھ زجر، موعظت، تاکید و تنبیہ اور اتمام حجت کا مضمون بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں غور کیجیے تو اسلوب کلام اِس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ شراب اور جوے کے مفاسد کی تفصیل اتنے مختلف مواقع پر اور اتنے مختلف پہلوؤں سے تمھارے سامنے آچکی ہے کہ اب اِس معاملے میں کسی کے لیے بھی کسی اشتباہ کی گنجایش باقی نہیں رہی ہے تو بتاؤ، اب بھی اِس سے باز آتے ہو یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ امر کے سادہ اسلوب میں یہ سارا مضمون نہیں سما سکتا تھا۔“ (تدبر قرآن ۲/۵۹۱)

۴٦٦ یعنی پیغمبر کا فرض پورا ہو گیا۔ اِس کے بعد تمھاری ذمہ داری ہے۔ نہیں سمجھتے تو اِس کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہو۔

وَّاَحْسَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗۤ

عمل کرتے رہے، پھر مزید یہ کہ تقویٰ اختیار کیا اور اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے، پھر یہی نہیں، تقویٰ اختیار کیا اور (خدا کے ہر حکم پر) خوبی کے ساتھ عمل پیرا ہوئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ خوبی کا رویہ اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے[۴۶۷]۔ ۹۰-۹۳

۳۔ ایمان[۴۶۸] والو، اللہ کچھ ایسے شکار[۴۶۹] کے ذریعے سے تمھیں ضرور آزمایش میں ڈالے

---

[۴۶۷] یہ ایک ضمنی سوال کا جواب ہے کہ شراب اگر ایسی ناپسندیدہ چیز ہے تو اُن لوگوں کا کیا ہوگا جو اِس سے پہلے پیتے رہے ہیں یا پیتے تھے اور اِس دوران میں وفات پا چکے ہیں؟ اِن لوگوں کے لیے تو اب توبہ واصلاح کا بھی کوئی موقع باقی نہیں رہا۔ قرآن نے اِس کا جواب دیا ہے کہ اِس طرح کے معاملات میں اللہ تعالیٰ اتمام حجت کے بغیر گرفت نہیں کرتے۔ چنانچہ جو لوگ ہر حال میں تقویٰ پر قائم رہے اور اللہ تعالیٰ کی تمام ہدایات پر ایمان واخلاص کے ساتھ عمل کرتے رہے ہیں، اُن سے اُن چیزوں کے کھانے پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا جو اُنھوں نے اُس وقت کھائی تھیں، جب اُن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے صراحت کے ساتھ اپنا حکم بیان نہیں کیا تھا۔

[۴۶۸] یہ تیسرے سوال کا جواب ہے۔ احرام کی حالت میں اچانک کوئی شکار نظر آجانے سے جو آزمایش، خاص کر عرب کے لوگوں کو پیش آسکتی تھی، اُس سے آگاہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے ایمان وتقویٰ کو جانچنا چاہتا ہے، اِس لیے خبردار رہو، سبت کے دن جس طرح مچھلیاں دریا سے سر اُٹھا اُٹھا کر بنی اسرائیل کو دعوت شکار دیتی تھیں، وہی صورت تمھیں بھی پیش آسکتی ہے۔ یہ تنبیہ جس اہمیت کی حامل ہے، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کے بعض پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ”اِس تنبیہ کی اہمیت اچھی طرح سمجھنے کے لیے چند باتیں ذہن میں مستحضر کر لیجیے۔ ایک تو یہ کہ شکار بجائے خود بڑی رغبت کی چیز ہے، بالخصوص اہل عرب کے لیے جن کی تفریح اور معاش،

اَيۡدِيۡكُمۡ وَرِمَاحُكُمۡ لِيَعۡلَمَ اللّٰهُ مَنۡ يَّخَافُهٗ بِالۡغَيۡبِ ۚ فَمَنِ
اعۡتَدٰى بَعۡدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿٩٤﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا
لَا تَقۡتُلُوا الصَّيۡدَ وَاَنۡتُمۡ حُرُمٌ ؕ وَمَنۡ قَتَلَهٗ مِنۡكُمۡ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ
مِّثۡلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحۡكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدۡلٍ مِّنۡكُمۡ هَدۡيًاۢ بٰلِغَ الۡكَعۡبَةِ

گا جو تمھارے ہاتھوں اور نیزوں کی زد میں ہوگا تاکہ اللہ دیکھ لے کہ (تم میں سے) کون بن دیکھے اُس سے ڈرتا ہے (اور کون نہیں ڈرتا)[٧٠]۔ پھر جس نے اِس تنبیہ کے بعد بھی اللہ کے مقرر کیے ہوئے حدود سے تجاوز کیا، اُس کے لیے ایک دردناک سزا ہے۔ ایمان والو، احرام کی حالت میں شکار نہ مارو۔ (یہ ممنوع ہے)، اور (یاد رکھو کہ) تم میں سے جس نے جانتے بوجھتے اُسے مارا، اُس کا بدلہ تمھارے مواشی میں سے اُسی کے ہم پلہ کوئی جانور ہے، جیسا اُس نے مارا ہے، جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے

> دونوں چیزوں کا انحصار بڑی حد تک اُس زمانے میں شکار ہی پر تھا۔ دوسری یہ کہ جب کسی مرغوب چیز پر کوئی پابندی عائد ہو جائے تو اُس کی رغبت اور زیادہ قوی ہو جاتی ہے۔ عربی میں مثل ہے: 'الانسان حریص علی ما منع' انسان جس چیز سے روک دیا جائے، اُس کا بڑا حریص ہو جایا کرتا ہے۔ اِس حرص کا نفسیاتی اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ جس طرح ساون کے اندھے کو ہر جگہ ہرا ہرا نظر آتا ہے، اُسی طرح اُس کو بھی ہر جگہ وہی چیز نظر آتی ہے جس سے وہ اپنے کو محروم پاتا ہے۔ تیسری یہ کہ یہ مناہی جب اصلاً امتحان کے لیے ہوئی ہے تو بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے مواقع پیدا فرمائے کہ اِس امتحان کا مقصد پورا ہو۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۵۹۴)

٦٩؎ اصل میں 'بِشَیۡءٍ مِّنَ الصَّیۡدِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'شَیۡء' کا لفظ، خاص کر اِس کی تنکیر اشارہ کرتی ہے کہ ہرچند یہ آزمایش پیش آئے گی، مگر یہ بہت سخت نہیں، بلکہ ہلکی ہوگی۔

٧٠؎ اِس سے واضح ہے کہ احرام کی حالت میں شکار کی حرمت کا حکم اپنی نوعیت کے لحاظ سے

اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ
اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَاللّٰهُ
عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ (۹۵) اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ
وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ؕ وَاتَّقُوا
اللّٰهَ الَّذِيْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (۹۶) جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ

اور یہ نیاز کی حیثیت سے کعبہ پہنچایا جائے گا۔ یا نہیں تو اِس گناہ کے کفارے میں مسکینوں کو کھانا کھلانا ہوگا یا اِسی کے برابر روزے رکھنا ہوں گے تاکہ وہ اپنے کیے کی سزا چکھے۔ اِس سے پہلے جو کچھ ہو چکا، اُسے اللہ نے معاف کر دیا ہے، لیکن اب اگر کسی نے اُسے دہرایا تو اللہ اُس سے بدلہ لے گا۔ اللہ زبردست ہے، وہ بدلہ لینے والا ہے[۱۷۲]۔ تمھارے لیے دریا کا شکار اور اُس کا کھانا جائز ہے، تمھارے اور تمھارے قافلوں کے زادراہ کے لیے۔ جب تک تم احرام کی حالت میں ہو، خشکی کا شکار، البتہ تم پر حرام کیا گیا ہے۔ (اِس کے قریب نہ جاؤ) اور اللہ سے ڈرتے رہو جس کے حضور میں تم سب حاضر

ابتلا کے احکام میں سے ہے، یعنی وہ احکام جو محض بندوں کی وفاداری کا امتحان کرنے کے لیے دیے جاتے ہیں۔ بندوں کے مصالح کے نقطۂ نظر سے وہ چونکہ بے حکمت نظر آتے ہیں، اِس لیے خدا کو بن دیکھے ماننے اور اُس سے بن دیکھے ڈرنے والوں کو دوسروں سے الگ کر دینے کے لیے ایک کسوٹی بن جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ یہ آزمایش اِس لیے پیش آئے گی کہ اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو ممیّز کر لے جو غیب میں رہتے ہوئے اُس سے ڈرتے ہیں۔

[۱۷۲] یہ تنبیہ نہایت سخت ہے۔ ابتلا کے احکام چونکہ بندوں کی وفاداری کا امتحان ہوتے ہیں، اِس لیے اُن کی خلاف ورزی یا اُن سے بے پروائی کی سزا بھی نہایت سخت ہوتی ہے۔ خدا کے

قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ

کیے جاؤ گے۔[۲۷۳] اللہ نے حرمت والے گھر، کعبہ کو لوگوں کے لیے مرکز بنایا ہے[۲۷۴] اور حرمت

ماننے والوں کو اِس پر ہمیشہ متنبہ رہنا چاہیے۔

۲۷۳ اِس پورے حکم کا خلاصہ یہ ہے کہ حالت احرام میں شکار کی ممانعت صرف خشکی کے جانوروں کے لیے ہے، دریائی جانوروں کا شکار کرنا یا دوسروں کا کیا ہوا خشکی کا شکار کھالینا، دونوں جائز ہیں۔ دریائی جانوروں کے معاملے میں یہ رخصت اِس لیے دی گئی ہے کہ خشکی کے سفر میں اگر زادراہ تھڑ جائے تو اُسے کسی نہ کسی طرح حاصل کیا جا سکتا ہے، لیکن دریائی سفر میں اِس طرح کے موقعوں پر شکار کے سوا کوئی دوسرا راستہ باقی نہیں رہتا۔ تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ لوگ اِس رخصت سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ خشکی کا شکار ہر حال میں ممنوع ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص جانتے بوجھتے اِس گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اُسے کفارہ ادا کرنا چاہیے۔ اِس کی تین صورتیں ہیں:

جس طرح کا جانور شکار کیا گیا ہے، اُسی قبیل کا کوئی جانور گھریلو چوپایوں میں سے قربانی کے لیے بیت اللہ بھیجا جائے۔

اگر یہ ممکن نہ ہو تو اُس جانور کی قیمت کی نسبت سے مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے۔

یہ بھی دشوار ہو تو اتنے روزے رکھے جائیں، جتنے مسکینوں کو کھانا کھلانا کسی شخص پر عائد ہوتا ہے۔

رہی یہ بات کہ جانوروں کا بدل کیا ہے یا اگر جانور کی قربانی متعذر ہے تو اُس کی قیمت کیا ہو گی یا اُس کے بدلے میں کتنے مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے گا یا کتنے روزے رکھے جائیں گے تو اِس کا فیصلہ مسلمانوں میں سے دو ثقہ آدمی کریں گے تاکہ جرم کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے اپنے نفس کی جانب داری کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

۲۷۴ اصل میں لفظ 'قِيٰمًا لِّلنَّاسِ' آیا ہے۔ سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱۲۵ میں یہی مفہوم لفظ 'مَثَابَة' سے ادا کیا گیا ہے، یعنی ایک ایسی جگہ جو لوگوں، خاص کر ذریت ابراہیم کے لیے اُسی طرح دینی سیادت کا مرکز ہے، جس طرح مختلف قوموں کے دار الحکومت اُن کی سیاسی قیادت کا مرکز

لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۹۷﴾ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ؕ ﴿۹۸﴾ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ
مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾ قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ

کے مہینوں[۲۷۴]، قربانی کے جانوروں اور اُن سب جانوروں کو شعیرہ ٹھیرا دیا ہے[۲۷۵] جن کے گلے میں (نذر کی علامت کے طور پر) پٹے ڈال دیے گئے ہوں۔ یہ اِس لیے (شعیرہ ٹھیرائے گئے ہیں) کہ تم پر واضح رہے کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ زمین اور آسمانوں میں ہے اور یہ بھی کہ اللہ ہر چیز سے واقف ہے[۲۷۶]۔ خبردار ہو جاؤ، اللہ سخت سزا دینے والا ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا اور مہربان بھی ہے۔ پیغمبر پر تو صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے اور

ہوتے ہیں۔

[۲۷۴] اصل میں 'اَلشَّھْرَ الْحَرَامَ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِس سے مراد یہاں کوئی مخصوص مہینا نہیں، بلکہ تمام اشہر حرم کے لیے یہ لفظ ایک اسم جنس کے طور پر آیا ہے۔

[۲۷۵] لفظ 'شعائر' اِس جملے میں حذف ہے، اِس لیے کہ سیاق کلام سے یہ صاف واضح ہو جاتا ہے۔

[۲۷۶] آیت میں جن شعائر کا ذکر ہوا ہے، وہ نذر کی تمثیل ہیں۔ انسان جب اِس تمثیل کا حصہ بن کر بیت الحرام کا سفر کرتا ہے تو قدم قدم پر جس حقیقت کی یاددہانی حاصل کرتا ہے، وہ یہی ہے کہ اللہ علیم و خبیر ہے اور وہ زمین و آسمان کی ہر چیز کو جانتا ہے۔ تمام خشیت و تقویٰ اِسی سے پیدا ہوتا ہے اور یہی ایمان و اسلام کی روح ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کو فعلاً بھی بیان کیا ہے اور صفتاً بھی، اِس لیے کہ خدا کا علم ماضی، حاضر، مستقبل، ظاہر، باطن، غائب، موجود، مضمر، سب پر محیط ہے اور انسان کا خدا کے علم کے متعلق یہی عقیدہ ہے جو اُس کے اندر خشیت بالغیب پیدا کرتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۵۹۸)

وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي
الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ

اللہ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔ کہہ دو کہ پاک اور ناپاک، دونوں یکساں نہیں ہیں، اگرچہ ناپاک کی کثرت تمھیں کتنا ہی فریفتہ کرنے والی ہو۔ سو اللہ سے ڈرتے رہو، عقل والو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔[۴۷۷] ۹۴—۱۰۰

۴۔ ایمان[۴۷۸] والو، ایسی باتیں نہ پوچھا کرو جو اگر تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمھیں گراں

---

[۴۷۷] یہ تنبیہ کے بعد تنبیہ کا اسلوب جس چیز کو واضح کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ جب اللہ ہر چیز کو جانتا ہے تو خبردار رہو، تمھارا کوئی عمل بھی اُس سے پوشیدہ نہ رہے گا اور وہ جس طرح بخشنے والا اور مہربان ہے، اُسی طرح سخت سزا دینے والا بھی ہے۔ ہمارے پیغمبر نے یہ حقیقت تم پر واضح کر دی ہے۔ اب آگے تمھاری ذمہ داری ہے۔ یاد رکھو، خدا خیر مطلق اور سراپا حق و عدل ہے۔ وہ برائی اور بھلائی کے ساتھ یکساں معاملہ نہیں کر سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ برائی کی کثرت تمھیں فریفتہ کر لے، مگر خدا کے ہاں یہ کثرت کوئی وزن نہیں رکھتی۔ وہ صرف پاکیزگی کو قبول کرے گا اور اُس کے حضور میں وہی لوگ فلاح پائیں گے جو نیکی اور خیر کو اختیار کریں۔ علم و عمل کی ناپاکی اور خباثت کے لیے اُس کے ہاں دوزخ کی آگ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

[۴۷۸] یہ چوتھے سوال کا جواب ہے جس کی ابتدا ایک برسر موقع تنبیہ سے ہوئی ہے۔ فرمایا ہے کہ لوگ غیر ضروری سوالوں سے اجتناب کریں۔ اِس تنبیہ کی ضرورت اِس لیے محسوس ہوئی کہ اِس طرح کے سوالات حکم کے حدود و قیود بڑھا دیتے ہیں، پھر لوگ اُنھیں نباہ نہیں پاتے اور اِس کے نتیجے میں اللہ کے غضب کو دعوت دے بیٹھتے ہیں۔ اللہ چاہتا ہے کہ جو حکم جس طرح دیا گیا ہے، اُس پر اُسی طرح عمل کیا جائے، ہر مجمل کی تفصیل اور ہر مطلق کی تعیین و تقیید سے اپنے لیے مشکلات نہ

تَسُؤْكُمْ ج وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ط عَفَا
اللّٰهُ عَنْهَا ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (۱۰۱) قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ
اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ (۱۰۲) مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ
وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ لا وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ

ہوں، اور ایسے وقت میں کہ قرآن نازل ہو رہا ہے، تم اُنھیں پوچھو گے تو وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں گی۔ (اِس وقت تو) یہ چیزیں اللہ نے معاف کر دی ہیں اور اللہ بخشنے والا ہے، وہ بڑا بردبار ہے۔ تم سے پہلے ایک قوم[۴۷۹] نے اِسی طرح کی باتیں پوچھیں[۴۸۰]، پھر اُنھی کے منکر ہو کر رہ گئے تھے۔ (تمھارے سوال کا جواب بہرحال یہ ہے کہ) اللہ نے نہ کوئی بحیرہ مقرر کیا ہے، نہ سائبہ، نہ وصیلہ، نہ حام[۴۸۱]، مگر یہ منکرین اللہ پر جھوٹ باندھتے

پیدا کی جائیں۔ پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ خدا کی آخری شریعت قیامت تک کے لیے ہے، اِس میں فقہ و اجتہاد کی وسعتیں محدود نہیں ہو سکتیں۔ غیر ضروری سوالوں سے اندیشہ ہے کہ یہ محدود ہو جائیں گی اور آنے والی نسلوں کے لیے مشکلات کا باعث ہوں گی۔

[۴۷۹] یہ حوالہ بطور مثال ہے اور قوم سے مراد یہود ہیں۔ اُن کا ذکر نکرہ کے ساتھ کیا ہے جس سے فی الجملہ نفرت اور اعراض کا اظہار ہوتا ہے۔ اُن کے سوالوں کی ایک مثال گاے کا قصہ ہے جو سورۂ بقرہ (۲) کی آیات ۶۷-۷۱ میں بیان ہوا ہے۔

[۴۸۰] اصل میں 'قَدْ سَاَلَهَا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ضمیر بیان نوعیت کے لیے ہے۔ قرآن کے نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں ضمیریں اِس طرح بھی آتی ہیں۔

[۴۸۱] اِس جملے میں فعل 'جَعَلَ' استعمال ہوا ہے۔ ہم نے اِس کا ترجمہ 'مقرر کرنے' کے الفاظ سے کیا ہے۔ اِس سے مراد یہاں مشروع کرنا ہے، یعنی 'بحیرة'، 'سائبة'، 'وصیلة' اور 'حام' کے نام سے بعض جانوروں کے لیے جو ممنوعات مشرکین نے قائم کر رکھے ہیں، اُنھیں اللہ نے

الْكَذِبَ ؕ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا
اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ
اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ يٰۤاَيُّهَا

ہیں اور اِن میں زیادہ وہ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ اور جب اِن سے کہا جاتا
ہے کہ اللہ نے جو کچھ اتارا ہے، اُس کی طرف آؤ اور اللہ کے رسول کی طرف آؤ تو
کہتے ہیں کہ ہمارے لیے وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا
اُس صورت میں بھی جب کہ اُن کے باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور نہ راہ ہدایت

مشروع نہیں فرمایا ہے۔

’بحيرة‘ اُس اونٹنی کو کہتے تھے جس سے پانچ بچے پیدا ہو چکے ہوتے اور اُن میں آخری نر ہوتا۔ اِس اونٹنی کے کان چیر کر اُسے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔

’سائبة‘ اُس اونٹنی کو کہتے تھے جسے کسی منت کے پورا ہو جانے کے بعد آزاد چھوڑ دیتے تھے۔

’وصيلة‘ بعض لوگ نذر مانتے تھے کہ بکری اگر نر جنے گی تو اُسے بتوں کے حضور پیش کریں گے اور اگر مادہ جنے گی تو اپنے پاس رکھیں گے۔ پھر اگر وہ نر و مادہ، دونوں ایک ساتھ جنتی تو اُس کو وصیلہ کہتے اور ایسے نر کو بتوں کی نذر نہیں کرتے تھے۔

’حام‘ اُس سانڈ کو کہتے تھے جس کی صلب سے کئی پشتیں پیدا ہو چکی ہوتیں، اُسے بھی آزاد چھوڑ دیتے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”یہ سب عرب جاہلیت کی نذریں اور منتیں تھیں۔ اِس قسم کے جانور آزاد چھوٹے پھرتے، جس گھاٹ سے چاہتے، پانی پیتے اور جس کی چراگاہ میں چاہتے، پھرتے۔ نہ اُن کو کوئی روک سکتا نہ چھیڑ سکتا۔ اُن کو مذہبی تقدس کا ایسا درجہ حاصل تھا کہ ہر شخص اُن کے چھیڑنے کے وبال سے لرزہ براندام رہتا۔ قرآن نے واضح فرما دیا کہ اُن کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ شرعی حیثیت صرف ہدی اور قلائد کی ہے۔ یہ چیزیں صرف اوہام کی ایجاد ہیں جن کو شریعت کی طرف منسوب

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٠٥﴾

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ۭ

پر رہے ہوں؟ ایمان والو، تم اپنی فکر کرو، تم راہ ہدایت پر ہو تو جنھوں نے گم راہی اختیار کر لی ہے، وہ تمھارا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ تم سب کو اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے، پھر وہ تمھیں بتا دے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔[۴۸۲] ۱۰۱-۱۰۵

۵۔ ایمان[۴۸۳] والو، تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے اور وہ وصیت کر رہا ہو تو اُس کے لیے تمھارے درمیان گواہی اِس طرح ہو گی کہ تم میں سے دو ثقہ آدمی گواہ بنائے

کرنا اللہ اور اُس کی شریعت پر صریح اتہام ہے۔ جو لوگ عقل سے عاری ہیں اُنھوں نے اِن احمقانہ چیزوں کو اللہ سے نسبت دے رکھی ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۶۰۲)

[۴۸۲] اوپر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی تھی کہ رسول کی حیثیت سے آپ کی ذمہ داری صرف حق پہنچا دینے کی ہے۔ یہ اُسی طرح اب مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ تمھاری ذمہ داری بھی اِس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ نہیں سنبھلتے تو اِس میں تمھارا کوئی قصور نہیں ہے، بلکہ اِن کے مزاج کا فساد ہے جو حقائق کی تکذیب کا باعث بن رہا ہے۔ تم نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی تو اِن کے بارے میں پھر تم سے کوئی پرسش نہیں ہونی ہے۔

[۴۸۳] یہ پانچویں اور آخری سوال کا جواب ہے۔ انبیا علیہم السلام کی گواہی سے متعلق جن حقائق کی یاددہانی اِس جواب کے آخر میں کی گئی ہے، اُس سے واضح ہے کہ جس سوال کا یہ جواب ہے، وہ کس طرح پیدا ہوا ہے۔

تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا
نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّاۤ
اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ
يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ
بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ

جائیں یا اگر تم کہیں سفر میں ہو اور وہاں موت کی مصیبت آ پہنچے تو تمھارے غیروں میں سے[۴۸۴] دو گواہ لے لیے جائیں۔ (پہلی صورت میں)، اگر تمھیں (اُن کے بارے میں) کوئی شبہ ہو جائے تو تم اُنھیں نماز کے بعد روک لو گے،[۴۸۵] پھر وہ اللہ کی قسم کھائیں گے کہ ہم اِس گواہی کے بدلے میں کوئی قیمت قبول نہ کریں گے، اگرچہ کوئی قرابت مند ہی کیوں نہ ہو، اور نہ ہم اللہ کی گواہی کو چھپائیں گے۔ ہم نے ایسا کیا تو گناہ گاروں میں شمار ہوں گے۔ پھر اگر پتا چلے کہ یہ دونوں کسی حق تلفی کے مرتکب ہوئے ہیں تو اُن کی جگہ دو دوسرے آدمی اُن لوگوں میں سے کھڑے ہوں، جن کی مقدم گواہوں[۴۸۶] نے حق تلفی کی ہے۔ پھر وہ اللہ

---

[۴۸۴] یعنی غیر مسلموں میں سے۔

[۴۸۵] یعنی کسی نماز کے بعد۔ نماز کا لفظ یہاں اسم جنس کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اِس سے مراد کوئی مخصوص نماز نہیں ہے۔

[۴۸۶] اصل میں ’الْاَوْلَیٰنِ‘ کا لفظ ہے۔ یہ ’اَوْلٰی‘ کا مثنیٰ ہے جس کے معنی احق کے ہیں، یعنی الاولٰی بالشہادۃ۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِن سے مراد وہ دونوں گواہ ہیں جو وصیت کے ابتدائی گواہ بنائے گئے۔ چونکہ اپنے منصب کے اعتبار سے گواہی کے اصل حق دار وہی ہیں، اِس وجہ سے اُن کو ’الْاَوْلَیٰنِ‘ کے لفظ سے

الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٠٧﴾ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَآ اَوْ يَخَافُوْٓا
اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ۭ وَاللّٰهُ

کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی اِن دونوں کی گواہی سے زیادہ برحق ہے اور ہم نے اپنی گواہی میں کوئی زیادتی نہیں کی ہے۔ ہم نے ایسا کیا ہو تو ہم ظالموں میں سے ہوں گے۔ اِس طریقے سے زیادہ توقع ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک گواہی دیں یا کم سے کم اِس بات سے ڈریں کہ اُن کی قسمیں دوسروں کی قسم کے بعد رد ہو جائیں گی۔[۴۸۷] اللہ سے ڈرو اور

تعبیر فرمایا۔ یہاں اِس میں اِس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ جب وہ اولیٰ بالشہادۃ ہیں تو اُنھیں چاہیے کہ وہ اپنے اِس منصب کی لاج رکھیں اور کسی ایسی بدعنوانی کے مرتکب نہ ہوں کہ اولیٰ بالشہادۃ ہوتے ہوئے بھی اُن کی شہادت دوسروں کی قسم سے باطل ہو جائے۔" (تدبر قرآن ۲/۶۰۵)

[۴۸۷] اِس حکم کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ کسی شخص کی موت آجائے اور اُسے اپنے مال سے متعلق کوئی وصیت کرنی ہو تو اُسے چاہیے کہ اپنے مسلمان بھائیوں میں سے دو ثقہ آدمیوں کو گواہ بنا لے۔

۲۔ موت کا یہ مرحلہ اگر کسی شخص کو سفر میں پیش آئے اور گواہ بنانے کے لیے وہاں دو مسلمان میسر نہ ہوں تو مجبوری کی حالت میں وہ دو غیر مسلموں کو بھی گواہ بنا سکتا ہے۔

۳۔ مسلمانوں میں سے جن دو آدمیوں کو گواہی کے لیے منتخب کیا جائے، اُن کے بارے میں اگر یہ اندیشہ ہو کہ کسی شخص کی جانب داری میں وہ اپنی گواہی میں کوئی ردوبدل کر دیں گے تو اِس کے سدباب کی غرض سے یہ تدبیر کی جا سکتی ہے کہ کسی نماز کے بعد اُنھیں مسجد میں روک لیا جائے اور اُن سے اللہ کے نام پر قسم لی جائے کہ اپنے کسی دنیوی فائدے کے لیے یا کسی کی جانب داری میں، خواہ وہ اُن کا کوئی قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو، وہ اپنی گواہی میں کوئی تبدیلی نہ کریں گے اور اگر کریں گے تو گناہ گار ٹھیریں گے۔

۴۔ گواہوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ گواہی 'شَهَادَةُ اللّٰهِ'، یعنی اللہ کی گواہی ہے، لہٰذا اِس میں

لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۱۰۸﴾

یَوۡمَ یَجۡمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ فَیَقُوۡلُ مَاذَاۤ اُجِبۡتُمۡ ؕ قَالُوۡا لَا عِلۡمَ
لَنَا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ عَلَّامُ الۡغُیُوۡبِ ﴿۱۰۹﴾ اِذۡ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ اذۡکُرۡ
نِعۡمَتِیۡ عَلَیۡکَ وَعَلٰی وَالِدَتِکَ ۘ اِذۡ اَیَّدۡتُّکَ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ ۟ قف تُکَلِّمُ

(جو حکم دیا جائے، اُس کو) سنو۔ (ایسا نہیں کرو گے تو یہ صریح نافرمانی ہے) اور اللہ نافرمان لوگوں کو کبھی راستہ نہیں دکھاتا۔ ۱۰۶-۱۰۸

(اللہ کی گواہی جن لوگوں نے چھپائی ہے، وہ) اُس دن کو یاد رکھیں، جب اللہ سب رسولوں کو جمع کرے گا، پھر پوچھے گا کہ (تمھاری امتوں کی طرف سے) تمھیں کیا جواب دیا گیا؟ وہ کہیں گے: ہمیں کچھ علم نہیں، تمام چھپی ہوئی باتوں کے جاننے والے تو آپ ہی ہیں۔[۴۸۸] جب اللہ کہے گا: اے مریم کے بیٹے عیسیٰ، میری اُس عنایت کو یاد کرو

کوئی ادنیٰ خیانت بھی اگر اُن سے صادر ہوئی تو وہ نہ صرف بندوں کے، بلکہ خدا کے بھی خائن قرار پائیں گے۔

۵۔ اِس کے باوجود اگر یہ بات علم میں آجائے کہ اِن گواہوں نے وصیت کرنے والے کی وصیت کے خلاف کسی کے ساتھ جانب داری برتی ہے یا کسی کی حق تلفی کی ہے تو جن کی حق تلفی ہوئی ہے، اُن میں سے دو آدمی اٹھ کر قسم کھائیں کہ ہم اِن اولیٰ بالشہادت گواہوں سے زیادہ سچے ہیں۔ ہم نے اِس معاملے میں حق سے کوئی تجاوز نہیں کیا اور ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے ایسا کیا تو خدا کے حضور میں ہم ظالم قرار پائیں گے۔

۶۔ گواہوں پر اِس مزید احتساب کا فائدہ یہ ہے کہ اِس کے خیال سے، توقع ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک گواہی دیں گے۔ ورنہ اُنھیں ڈر ہو گا کہ اُنھوں نے اگر کسی بدعنوانی کا ارتکاب کیا تو اُن کی قسمیں دوسروں کی قسموں سے باطل قرار پائیں گی اور اولیٰ بالشہادت ہونے کے باوجود اُن کی

النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ
وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ
فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ
وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ

جو میں نے تم پر اور تمھاری ماں پر کی تھی، اُس وقت، جب میں نے روح القدس سے تمھاری مدد کی، تم گھوارے میں بھی (اپنی نبوت کا) کلام کرتے تھے اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی۔[۴۸۹] اور اُس وقت، جب میں نے تمھیں قانون اور حکمت سکھائی، یعنی تورات و انجیل کی تعلیم دی۔[۴۹۰] اور اُس وقت، جب تم میرے حکم سے پرندے کی ایک صورت مٹی سے بناتے تھے، پھر اُس میں پھونکتے تھے اور وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتی تھی اور مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کر دیتے تھے۔ اور اُس وقت، جب تم مُردوں کو میرے حکم

گواہی رد ہو جائے گی۔

[۴۸۸] اِس سے واضح ہے کہ یہ سوال و جواب ہر پیغمبر سے ہوں گے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کے سوال و جواب کا ذکر آگے، خاص کر اِس لیے ہوا ہے کہ اُن کے ماننے والے جس گم راہی میں مبتلا ہوئے، وہ غیر معمولی ہے۔ اُن کے سوا کسی پیغمبر اور اُس کی ماں کو اِس طرح معبود بنا کر اُن کی پرستش نہیں کی گئی۔

[۴۸۹] مسیح علیہ السلام کے معاملے میں یہ غیر معمولی واقعہ اِس لیے ہوا کہ یہود پر اتمام حجت ہو اور سیدہ مریم پر کسی تہمت کی گنجایش نہ رہے۔

[۴۹۰] تورات میں زیادہ تر شریعت اور انجیل میں ایمان و اخلاق کے مباحث بیان ہوئے ہیں۔ پہلی چیز کے لیے قرآن نے یہاں 'الْكِتٰب' اور دوسری کے لیے 'الْحِكْمَة' کی تعبیر اختیار فرمائی ہے۔ قرآن کا یہ جملہ، اگر غور کیجیے تو اِس تعبیر کو ہر لحاظ سے واضح کر دیتا ہے۔

عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ
اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۰﴾ وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ
وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ اِذْ قَالَ

سے نکال کھڑا کرتے تھے۔ اور اُس وقت، جب میں نے بنی اسرائیل کے ہاتھ تم سے روک دیے،[۴۹۱] جب تم کھلی ہوئی نشانیاں لے کر اُن کے پاس آئے اور اُن کے منکروں نے کہا کہ کچھ نہیں، یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔[۴۹۲] اور اُس وقت، جب میں نے حواریوں کو ایما کیا[۴۹۳] کہ مجھ پر اور میرے پیغمبر پر ایمان لاؤ تو اُنھوں نے کہا: ہم ایمان لائے اور آپ گواہ رہیے کہ

۴۹۱؎ اِس کی صورت یہ ہوئی کہ جب یہود آپ کے قتل کے درپے ہو گئے تو اللہ نے آپ کو وفات دی اور آپ کا جسم مبارک بھی اپنی طرف اٹھا لیا۔ چنانچہ اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لیے آپ کو ہاتھ لگانا بھی یہود کے لیے ممکن نہیں ہوا۔

۴۹۲؎ اللہ تعالیٰ یہ تمام باتیں جو یہاں تک بیان ہوئی ہیں، نصاریٰ پر اتمام حجت اور اُن کی فضیحت کے لیے فرمائے گا۔ چنانچہ حضرت مسیح کے سامنے اور خود اُن کے اعترافات سے یہ حقیقت نصاریٰ پر واضح کر دی جائے گی کہ اُنھوں نے جو کچھ کیا، وہ صریح گم راہی تھی۔ مسیح علیہ السلام کے کسی قول و فعل یا اُن کی تعلیمات سے اِس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

۴۹۳؎ مسیح علیہ السلام کی دعوت میں حواریوں کو جو اہمیت حاصل ہے، یہ واقعہ اُسی کے پیش نظر نصاریٰ کو سنایا جائے گا۔ اتمام حجت کے جو پہلو اِس میں ملحوظ ہیں، وہ استاذ امام امین احسن اصلاحی کے الفاظ میں درج ذیل ہیں:

> ”...ایک یہ کہ حوارین نے جس دین کو قبول کیا، وہ نصرانیت و مجوسیت نہیں، بلکہ اسلام ہے۔
>
> دوسرا یہ کہ حوارین حضرت عیسیٰ کو عیسیٰ ابن مریم کہتے تھے۔ اُن کی الوہیت کا کوئی تصور اُن کے ذہن میں نہیں تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ ہی کو حضرت عیسیٰ اور تمام کائنات کا رب مانتے تھے۔
>
> تیسرا یہ کہ وہ حضرت عیسیٰ کو بالذات معجزات کا دکھانے والا نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اُن کو صرف اُن

الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ
يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ط قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ
اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ عِيْسَى
ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا

ہم مسلمان ہیں۔ اُس وقت، جب حواریوں نے کہا: اے عیسیٰ ابن مریم، کیا تمھارا پروردگار یہ کر سکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے (کھانے کا) ایک خوان اتارے[۴۹۴]؟ عیسیٰ نے کہا: خدا سے ڈرو، اگر تم سچے مومن ہو۔ اُنھوں نے جواب دیا: ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ اِس خوان سے کھائیں اور اِس کے نتیجے میں ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہم یہ جان لیں کہ تو نے ہم سے سچی بات کہی تھی اور ہم اِس پر گواہی دینے والے بن جائیں۔ اِس پر عیسیٰ ابن مریم نے دعا کی: اے اللہ، اے ہمارے پروردگار، تو ہم پر آسمان سے ایک خوان

کے ظہور کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے مائدہ کے اتارے جانے کے لیے جو درخواست کی، وہ حضرت عیسیٰ سے نہیں کی کہ آپ ہمارے لیے مائدہ اتاریں، بلکہ یہ درخواست کی کہ اگر یہ بات آپ کے خداوند کی حکمت کے خلاف نہ ہو تو آپ اُس سے درخواست کیجیے کہ وہ ہمارے لیے مائدہ اتارے تاکہ اِس سے ہمارے دلوں کو طمانیت حاصل ہو۔“ (تدبر قرآن ۲/۶۰۸)

[۴۹۴] اصل الفاظ ہیں: ’هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ‘۔ یہ سوال خدا کی قدرت سے متعلق نہیں، بلکہ اُس کی حکمت سے متعلق ہے، یعنی کیا یہ بات اُس کی حکمت کے مطابق ہے کہ وہ اِس طرح کی کھلی ہوئی نشانی دکھائے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...معجزات ہر چند خارق عادت ہوتے ہیں، تاہم وہ اسباب کے پردے ہی میں ظاہر ہوتے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ تمام پردے اٹھا دیے جائیں۔ اِسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اِس طرح کے

عِيۡدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنۡكَ‌ۚ وَارۡزُقۡنَا وَاَنۡتَ خَيۡرُ الرّٰزِقِيۡنَ ﴿۱۱۴﴾
قَالَ اللّٰهُ اِنِّىۡ مُنَزِّلُهَا عَلَيۡكُمۡ‌ۚ فَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بَعۡدُ مِنۡكُمۡ فَاِنِّىۡۤ
اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۱۵﴾
وَاِذۡ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ ءَاَنۡتَ قُلۡتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوۡنِىۡ
وَاُمِّىَ اِلٰهَيۡنِ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ‌ؕ قَالَ سُبۡحٰنَكَ مَا يَكُوۡنُ لِىۡۤ اَنۡ اَقُوۡلَ
مَا لَـيۡسَ لِىۡ بِحَقٍّ‌ؕ اِنۡ كُنۡتُ قُلۡتُهٗ فَقَدۡ عَلِمۡتَهٗ‌ؕ تَعۡلَمُ مَا فِىۡ نَفۡسِىۡ
وَلَاۤ اَعۡلَمُ مَا فِىۡ نَفۡسِكَ‌ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ عَلَّامُ الۡغُيُوۡبِ ﴿۱۱۶﴾ مَا قُلۡتُ

نازل کر دے جو ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لیے ایک یادگار بن جائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو۔ (پروردگار)، ہم کو عطا فرما اور تو بہترین عطا فرمانے والا ہے۔ اللہ نے فرمایا: میں اِس کو تم پر ضرور نازل کر دوں گا، مگر اِس کے بعد جو تم میں سے منکر ہوں گے، اُنھیں ایسی سخت سزا دوں گا جو دنیا میں کسی کو نہ دی ہو گی۔[۲۹۵] ۱۰۹-۱۱۵

(اللہ کی گواہی جن لوگوں نے چھپائی ہے، وہ اُس دن کو یاد رکھیں، جب یہ باتیں ہوں گی) اور یہ بھی کہ جب (اِنھیں یاد دلا کر) اللہ پوچھے گا: اے مریم کے بیٹے عیسیٰ، کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا تم مجھے اور میری ماں کو معبود بنا لو۔ وہ عرض کرے گا: سبحان اللہ، یہ کس طرح روا تھا کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں ہے۔ اگر میں نے یہ بات کہی ہوتی تو آپ کے علم میں ہوتی، (اِس لیے کہ) آپ جانتے ہیں جو کچھ میرے دل میں ہے اور آپ کے دل کی باتیں میں نہیں جانتا۔ تمام چھپی ہوئی

مطالبات کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں فرمائی جن میں خواہش اُن حدود سے متجاوز ہو جائے جو معجزات کے ظہور کے لیے سنت اللہ میں مقرر ہیں۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۶۰۸)

المائدة
٥

لَهُمۡ اِلَّا مَاۤ اَمَرۡتَنِیۡ بِهٖۤ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیۡ وَرَبَّكُمۡ ۚ وَكُنۡتُ
عَلَیۡهِمۡ شَهِیۡدًا مَّا دُمۡتُ فِیۡهِمۡ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیۡتَنِیۡ كُنۡتَ اَنۡتَ
الرَّقِیۡبَ عَلَیۡهِمۡ ؕ وَاَنۡتَ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ شَهِیۡدٌ ﴿۱۱۷﴾ اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ
فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ ۚ وَاِنۡ تَغۡفِرۡ لَهُمۡ فَاِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَكِیۡمُ ﴿۱۱۸﴾
قَالَ اللّٰهُ هٰذَا یَوۡمُ یَنۡفَعُ الصّٰدِقِیۡنَ صِدۡقُهُمۡ ؕ لَهُمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ

باتوں کے جاننے والے تو آپ ہی ہیں۔ میں نے تو اُن سے وہی بات کہی تھی جس کا آپ نے مجھے حکم دیا تھا کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمھارا بھی[۴۹۶]۔ میں اُن پر نگران رہا، جب تک میں اُن کے درمیان تھا۔ پھر جب آپ نے مجھے وفات دی تو اُس کے بعد آپ ہی اُن کے نگران رہے ہیں اور آپ ہر چیز پر گواہ ہیں۔ اب اگر آپ اُنھیں سزا دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر معاف کر دیں تو آپ ہی زبردست ہیں، بڑی حکمت والے ہیں[۴۹۷]۔ اللہ فرمائے گا: یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کی سچائی[۴۹۸] اُن

---

[۴۹۵] اِس کے بعد ظاہر ہے کہ حواری اِس درخواست سے باز آ گئے ہوں گے۔ چنانچہ انجیلوں میں اِس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ اِس طرح کا خوان اتارا گیا تھا۔

[۴۹۶] یہ قرآن نے اُس تعبیر کی تصحیح کر دی ہے جو انجیل میں میرا باپ اور تمھارا باپ کے الفاظ میں آئی ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام نے جو بات کہی، وہ یہ تھی، مگر عبرانی زبان میں 'اب' اور 'ابن' کے الفاظ چونکہ باپ اور بیٹے اور رب اور بندے کے معنی میں مشترک تھے، اِس لیے نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کی الوہیت کا عقیدہ ایجاد کیا تو اِس اشتراک سے فائدہ اٹھا کر اِنھیں وہ صورت دے دی جو اب ہم انجیل میں دیکھتے ہیں۔

[۴۹۷] سیدنا مسیح علیہ السلام کا یہ فقرہ غیر معمولی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا
عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا

کے کام آئے گی۔ اُن کے لیے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں، وہ اُن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔[۴۹۹] زمین و آسمان اور اُن کے اندر تمام موجودات کی بادشاہی اللہ

”...اِس فقرے کی بلاغت کی تعبیر نہیں ہو سکتی۔ بظاہر دل چاہتا ہے کہ فقرہ یوں ہوتا: 'اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ، وَاِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ'، لیکن اگر یوں ہوتا تو یہ نہایت واضح الفاظ میں نصاریٰ کے لیے شفاعت بن جاتا اور انبیا علیہم السلام کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ مشرکین کے لیے سفارش نہیں فرمائیں گے۔ اِس وجہ سے سیدنا مسیح بات ایسے اسلوب میں فرمائیں گے کہ بات سچی بھی ہو، دربار الٰہی کے شایان شان بھی ہو، دردمندانہ بھی ہو اور اُن پر اُس سے مشرکین و محرفین دین کی سفارش کی کوئی ذمہ داری بھی عائد نہ ہو۔ چنانچہ 'اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ، وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ' کے الفاظ پر غور فرمائیے تو معلوم ہوگا کہ اِس فقرے میں وہ تمام خوبیاں بھی موجود ہیں جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا اور ساتھ ہی یہ پہلو بھی موجود ہے کہ سیدنا مسیح اپنے آپ کو اُن کی شفاعت کی ذمہ داری سے بری کر لیں گے۔“ (تدبر قرآن ۲/۶۰۹)

[۴۹۸] اصل میں لفظ 'صِدْق' آیا ہے۔ یہ قول و فعل اور ارادہ، تینوں کی مطابقت اور استواری کی تعبیر کے لیے آتا ہے۔ آدمی کے منہ سے کوئی حرف صداقت کے خلاف نہ نکلے، اُس کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہ ہو اور وہ اپنی ہر بات کو نباہ دے تو یہ زبان اور عمل کی سچائی ہے، لیکن اِس کے ساتھ نیت اور ارادے کی سچائی بھی لازماً شامل ہونی چاہیے۔ قرآن نے اِس کے ضد کردار کو نفاق اور اِسے اخلاص سے تعبیر کیا ہے، پھر جگہ جگہ وضاحت فرمائی ہے کہ خدا کے نزدیک عمل کا اصلی پیکر وہی ہے جو کارگاہ قلب میں تیار کیا جائے۔ لٰہذا صدق کا درجۂ کمال قول و فعل اور ارادے کی اِسی

فِيْهِنَّ ۭ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ١٢٠

ہی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ ۱۱۶-۱۲۰

مطابقت سے حاصل ہوتا ہے۔ سورۂ احزاب (۳۳) کی آیت ۲۳: 'صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ' (اللہ سے جو عہد اُنھوں نے باندھا، اُسے پورا کر دکھایا) کے الفاظ اِسی حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔ یعنی زبان کا حرف، دل کا ارادہ اور عمل کی ہر جنبش حق و صداقت کا مظہر بن جائے۔

۱۹۹ مطلب یہ ہے کہ تمھارے پیرووں میں سے جو لوگ اپنے قول و قرار اور عہد و میثاق میں سچے ثابت ہوئے اور اُنھوں نے جانتے بوجھتے کسی گم راہی پر اصرار نہیں کیا، بلکہ جو کچھ سمجھا، دیانت داری کے ساتھ سمجھا، اُس میں دانستہ کوئی تبدیلی یا تحریف نہیں کی، پھر اپنی استطاعت کے مطابق اُس پر عمل پیرا رہے، اُن کے لیے جنت کی بشارت ہے۔ مگر جنھوں نے جانتے بوجھتے بدعہدی اور خیانت کا ارتکاب کیا اور خدا کی طرف سے بار بار کی تنبیہات کے باوجود اپنے عقیدہ و عمل کی اصلاح کے لیے تیار نہیں ہوئے، اُن کے لیے کوئی رعایت نہیں ہے۔ وہ اپنے جرائم کی سزا لازماً بھگتیں گے۔

لاہور
۸ر مئی ۲۰۰۹ء